کارل مارکس
فریڈرک اینگلس

دنیا کے مزدورو، ایک ہو!

کارل مارکس

فریڈرک اینگلس

منتخب تصانیف

حصہ سوم

دارالاشاعت ترقی ماسکو

ترجمہ : ظ انصاری

К. МАРКС и Ф. ЭНГЕЛЬС

ИЗБРАННЫЕ ПРОИЗВЕДЕНИЯ

(часть III)

На языке урду

© اردو میں ترجمہ - دارالاشاعت ترقی - ۱۹۷۳ء

فہرست

صفحہ

فریڈرک اینگلس۔ بن‌مانس سے آدمی تک پہنچنے میں محنت نے کیا خدمت انجام دی ۷

فریڈرک اینگلس۔ کارل مارکس ۲۶

فریڈرک اینگلس۔ یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم

۱۸۹۲ء کے انگریزی ایڈیشن کے لئے مخصوص مقدمہ ۴۲

یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم ۴۲

کارل مارکس کو دفن کرتے وقت اینگلس کی تقریر ۷۶

فریڈرک اینگلس۔ کمیونسٹ لیگ کی تاریخ پر ۱۳۵

فریڈرک اینگلس۔ خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز ۱۳۸

۱۸۸۴ء کے پہلے ایڈیشن کا دیباچہ ۱۶۶

۱۸۹۱ء کے چوتھے ایڈیشن کا دیباچہ ۱۶۶

خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز ۱۸۸

تشریحی نوٹ ۱۸۹

ناموں کا اشاریہ ۲۱۵

ادبی اور افسانوی شخصیتیں ۳۵۵

فریڈرک اینگلس

بن‌مانس سے آدمی تک پہنچنے میں محنت نے کیا خدمت انجام دی؟

سیاسی معاشیات کے ماہرین اس پر زور دیتے ہیں کہ محنت ہر قسم کی دولت کا سرچشمہ ہے ۔ واقعی ہے بھی ایسا ہی ۔ فطرت کے بعد محنت کا ہی نمبر آتا ہے کہ فطرت وہ سروسامان مہیا کرتی ہے جسے محنت دولت میں ڈھال لیتی ہے ۔ مگر اس کے سوا محنت غیر محدود لحاظ سے اور بہت کچھ ہے ۔ تمام انسانی وجود کے لئے محنت ایک بنیادی اور اولین شرط ہے ، اس کی بنیادی اہمیت اس درجہ ہے کہ ایک معنی میں ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ محنت نے خود انسان کو تخلیق کیا ہے ۔

آج سے لاکھوں سال پہلے جب وہ دور تھا جس کا ہم دوٹوک طریقے سے ابھی تک تعین نہیں کر سکتے ، زمین کی تاریخ کا وہ دور جسے طبقات الارض‌والے تیسرے جگ کا (Tertiary) زمانہ کہتے ہیں ، غالباً اس کے ختم ہوتے وقت انسان سے ملتےجلتے بن‌مانسوں کی کوئی نہایت ترقی‌یافتہ نسل کہیں گرم آب‌وہوا کے علاقوں میں آباد تھی — غالباً اس لمبے چوڑے براعظم پر آباد رہی ہوگی جو بعد میں بحر ہند میں غرقاب ہو گیا ۔ ڈارون نے ہمارے ان اسلاف کا لگ بھگ نقشہ کھینچ دیا ہے ۔ ان کے جسم پر بال ہی بال تھے، ڈاڑھیاں تھیں، اٹھے ہوئے کان تھے اور درختوں پر جھنڈ کے جھنڈ رہا کرتے تھے (دیکھئے نوٹ نمبر ۲) ۔

قیاساً ان کے رہن سہن کے ڈھنگ کے سبب اوپر چڑھنے میں ہاتھوں کو پاؤں کے بہ‌نسبت مختلف عمل کرنا پڑا ہے۔ جب یہ بن‌مانس ہموار زمینوں پر چلتے تو ہاتھوں کی مدد سے چلنے کی عادت سے رفتہ رفتہ آزاد ہوتے گئے اور انہوں نے کھڑے قد سے چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ یہی فیصلہ کن مرحلہ تھا بندر سے آدمی تک پہنچنے کا۔

ابھی تک جتنی قسموں کے بھی بن‌مانس ملتے ہیں، وہ سب سیدھے کھڑے ہو سکتے ہیں اور کھڑے قد سے چل پھر سکتے ہیں لیکن صرف اشد ضرورت کے وقت اور وہ بھی بےڈول طریقے سے۔ ان کی قدرتی چال کچھ کھڑی، کچھ جھکی ہوئی ہوتی ہے اور اس میں ہاتھوں کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اکثر تو زمین پر بندپنجہ ٹیکتے ہیں اور ٹانگیں اچکا کر، اپنے لمبے بازوؤں کے درمیان جسم جھلاتے ہیں، بالکل ایسے جیسے لنجے لوگ بیساکھی کے سہارے سرکتے ہیں۔ مختصراً چار ہاتھ پاؤں پر چلنے سے لے کر دو پاؤں پر چلنے کے طریقے تک جتنے مرحلے درمیان میں گزرے ہیں، ان سب کی کوئی نہ کوئی جھلک انسان نما بندروں میں آج بھی نظر آتی ہے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کے لئے کھڑے قد کی چال صرف ایک مجبوری کا معاملہ ہے۔

ہمارے ان اسلاف بن‌مانسوں میں یہ کھڑے قد کی چال پہلے تو ایک قاعدہ بنی اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک ضرورت بنتی گئی۔ چنانچہ ہاتھ زیادہ سے زیادہ مختلف قسم کے دوسرے کام کرنے لگے۔ بن‌مانسوں میں آج بھی ہاتھ اور پاؤں کا جس‌طرح استعمال ہوتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ تخصیص موجود ہے۔ اوپر چڑھنے میں ہاتھ ایک کام انجام دیتے ہیں اور پاؤں دوسرا کام۔ ہاتھوں سے خاص کر خوراک بٹورنے اور سنبھالنے کا کام اسی طرح لیا جاتا ہے جیسے نچلے درجے کے دودھ پلانےوالے جانور (mammals) اگلے پنجوں سے لیتے ہیں۔ بہت سے بن‌مانس ہاتھوں کا استعمال درختوں پر اپنا ٹھکانہ بنانے میں یا ٹہنیوں کے درمیان ایسی چھت لگانے میں کرتے ہیں جس میں وہ خود کو موسم کی سختیوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ مثال کے طور پر چمپانزے (بغیردم کا بندر) یہی کرتا ہے۔ ہاتھ میں ڈنڈا پکڑ کر وہ دشمن سے اپنا بچاؤ کرتے ہیں اور انہی ہاتھوں سے دشمن پر پھلوں اور پتھروں کے گولے

برساتے ھیں ۔ جب آدمی انھیں پکڑ کر رکھتا ھے تو وہ آدمی کی نقل میں ھاتھوں سے چھوٹے موٹے کئی کام لینے لگتے ھیں ۔ یہیں سے نظر آتا ھے کہ آدمی سے سب سے زیادہ ملتے جلتے بن‌مانسوں کے ناپختہ ھاتھوں میں اور ان انسانی ھاتھوں میں کتنا بڑا فاصلہ حائل ھے جو لاکھوں سال کی محنت سے سدھر کر ، ترقی کرکے اس درجے کو پہنچے ھیں ۔ دونوں کے ھاتھوں میں ھڈیوں اور عضلات کی تعداد بھی برابر ھے اور ان کے جوڑ بند بھی ایک سے ھیں ۔ پھر بھی سب سے پست سطح کا وحشی اپنے ھاتھوں سے سیکڑوں ایسے چھوٹے موٹے کام کر لیتا ھے کہ بن‌مانس ان کی نقل نہیں کر پاتا ۔ کسی بن‌مانس نے اپنے ھاتھوں سے پتھر کا ایک کھردرا سا چاقو بھی نہیں بنایا ۔

شروع شروع میں ھمارے ان اسلاف نے ھزاروں سال میں بندر سے آدمی تک کا فاصلہ طے کرتے وقت جن کاموں کے لئے آھستہ آھستہ اپنے ھاتھوں کا استعمال سیکھا ھوگا وہ بڑے سیدھے سادے کام رھے ھوں‌گے ۔ سب سے پست سطح کے ایسے وحشی بھی جن کے متعلق قیاس کیا جاسکتا ھے کہ تنزل کے سبب جانوروں جیسی حالت کے ساتھ ساتھ وہ جسمانی انحطاط سے بھی دوچار ھیں، وہ بھی ان عبوری دور کی نیم‌انسانی مخلوق کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی‌یافتہ ھیں ۔ پہلے پہل جب انسانی ھاتھوں نے سخت پتھر کو چاقو میں ڈھالنے کی تدبیر کی ھوگی ، اس وقت تک اتنا زمانہ گزر گیا ھوگا جس کے سامنے ھمارے علم میں آیا ھوا تمام تاریخی زمانہ ھیچ معلوم ھوتا ھے ۔ مگر ایک بار پتھر کا چاقو بنا تو فیصلہ کن قدم اٹھ گیا ، ھاتھ کھل گئے ، اور چابک دستی تو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی ھی تھی ۔ اس طرح جو لوچ اور لچک آتی گئی وہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل بھی ھوتی گئی ، بڑھتی بھی چلی گئی ۔

اب دیکھئے تو ھاتھ صرف محنت کرنے کا ایک عضو نہیں بلکہ خود محنت کی ھی پیداوار بھی ھے ۔ محنت نے ، نئے نئے کاموں کی سادھن نے ، پختہ ھوتے ھوئے عضلوں اور ھڈی پوٹی کے جوڑوں کی ، اور بڑی مدت میں جاکر ھڈی کی بھی وراثت نے، اس وراثت میں پائی ھوئی نفاست کے نئے اور زیادہ سے زیادہ پیچیدہ کاموں کے مسلسل استعمال نے مل ملا کر انسانی ھاتھ کو کمال کے اس درجے پر پہنچا دیا جہاں وہ مصور

رفائیل کی تصویریں ، بت تراش تھوروالڈسن کے مجسمے اور نغمہ‌نگار پگانینی کی موسیقی وجود میں لا سکے ۔

مگر خود ہاتھ کا وجود تنہا نہیں تھا ۔ ہاتھ تو بہت ہی مرکب اور کل جاندار جسم کا محض ایک جزو تھے ۔ جس شے سے ہاتھ کو فیض پہنچا اسی سے پورے جسم کو پہنچا جو ہاتھ سے خدمت لیتا تھا۔ اور یہ عمل دو طرح سے تھا ۔

پہلے ، ڈارون کے لفظوں میں نشوونما کی ہم‌آہنگی کے قانون کے تحت ۔ یہ قانون کہتا ہے کہ ایک مرکب جاندار وجود کے الگ الگ اعضا کی جو خاص شکلیں بن جاتی ہیں وہ ہمیشہ دوسرے اعضا کی اپنی خاص شکلوں سے گہرا ربط رکھتی ہیں جن کا بظاہر آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا ۔ چناں‌چہ وہ تمام جانور جن میں خون کے سرخ خلیے بغیر مرکزوں کے (cell nuclei) موجود ہوتے ہیں اور جن میں سر کا ریڑھ کی پہلی ہڈی سے جوڑ دو قفلیوں (condyles) کے ذریعے ہوتا ہے ، ان سب میں بلااستثنا ایسے غدود پائے جاتے ہیں جن سے بچوں کو دودھ پلایا جا سکے ۔ اسی طرح دودھ پلانے‌والے جانوروں میں اگر سم نہیں، کھر ہوں‌گے تو ان کے معدے بھی جگالی کے لئے کئی منزلہ ہونگے ۔ بعض شکلوں میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ، ان سے جسم کے دوسرے حصوں کی شکلوں میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں اگرچہ ہم اس رابطے کی وجہ بیان نہیں کر سکتے ۔ جو بلیاں سر سے پاؤں تک سفید اور نیلی آنکھوالی ہیں وہ ہمیشہ یا تقریباً ہمیشہ بہری ہوتی ہیں ۔ انسانی ہاتھوں کا رفتہ رفتہ کمال حاصل کرتے جانا اور اسی نسبت سے پیروں کا کھڑے قد کی چال کے مطابق ڈھلتے جانا اور ان کا باہمی ربط جسم کے دوسرے اعضا پر بھی یقیناً اثرانداز ہوتا رہا ہے ۔ لیکن یہ عمل ابھی تک اتنا تحقیق طلب ہے کہ ہم اس حقیقت کو یوں ہی بیان کردینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے ۔

اس سے بھی کہیں زیادہ اہم یہ ہے کہ ہاتھ کی نشو و نما نے باقی جسم پر براہ‌راست ایسا اثر ڈالا جو نظر میں بھی آتا ہے ۔ معلوم ہے کہ ہمارے بندر سے مشابہہ پیشرو جھنڈ بنا کر رہنے کے عادی تھے ۔ ظاہر ہے کہ اس کا پتہ لگانا قطعی ممکن نہیں کہ تمام حیوانات میں سب سے

زیادہ گھل مل کر رہنےوالا حیوان — یعنی انسان اپنے سے زرا پہلے کے الگ تھلگ رہنےوالے پیشرو سے کہاں ، کس مرحلے پر الگ ہوا ۔ ہاتھ کی نشوونما کے ساتھ اور محنت سے آدمی کا قابو فطرت پر بڑھنا شروع ہوا اور اس نے بڑھتے ہوئے ہر ایک قدم پر اس کی نگاہ کو وسعت بخشی ، قدرت کی دی ہوئی چیزوں میں وہ برابر نئی ، اچھوتی ، انجانی خاصیتوں کا پتہ لگاتا گیا ۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ محنت کی ترقی نے باہمی سہارے اور مل جل کر کام انجام دینے کی بدولت لازمی طور سے سماج کے الگ الگ لوگوں کو جوڑنے میں مدد دی کیوں کہ مل‌جل کر کام کرنے میں ہر ایک فرد بشر کو فائدے نظر آنے لگے ۔ مختصر یہ کہ آدمی اپنی بناوٹ یا اٹھان کے دور میں ہی اس مقام پر پہنچ گیا جہاں ایک کو دوسرے سے کچھ نہ کچھ کہنے کی ضرورت

پیش آئی ۔ اس ضرورت نے خاص عضو بخشا : بن‌مانس کے بےتربیت حلق میں آہستہ آہستہ زبان کے گھماؤ اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے قطعی طور پر تبدیلی ہوئی اور وہ اس قابل ہو گیا کہ زیادہ ترقی‌یافتہ آوازیں حلق سے نکال سکے اور منہ کے اعضا ایک کے بعد ایک حرف کا تلفظ ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کرتے گئے ۔

جانوروں سے آدمی کا تقابل کیجئے تو ثابت ہو جائےگا کہ محنت کے عمل سے اور اسی عمل کے سلسلے میں زبان کی ابتدا کو سمجھنا درست ہوگا ۔ سب سے زیادہ ترقی‌یافتہ جانوروں کو بھی جو تھوڑا بہت ایک دوسرے پر ظاہر کرنا (یا کہنا) ہوتا ہے ، اسے بھی مختلف تلفظ والی آوازوں کی ضرورت پیش نہیں آتی ۔ اپنی قدرتی حالت میں کسی جانور کو یہ کوتاہی یا بےبسی نہیں معلوم ہوتی کہ وہ آدمی کی بولی نہ ادا کر سکتا ہے ، نہ سمجھ سکتا ہے ۔ البتہ جب آدمی اسے پال لے تو اور بات ہے ۔ کتا اور گھوڑا آدمی کے ساتھ رہتے رہتے تلفظ والی آوازوں کے سننےاور سمجھنے کی ایسی عمدہ صفت پیدا کر لیتے ہیں کہ اپنی سوجھ بوجھ کے دائرے میں کوئی بھی زبان آسانی سے سمجھنے لگتے ہیں ۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایسے جذبات کی وہ صلاحیت بھی حاصل کر لی ہے — مثلاً انسان سے محبت اور شکرگزاری وغیرہ ، جو کسی زمانے میں ان کے لئے بالکل اجنبی رہے ہوں گے ۔ جس شخص کو ایسے جانوروں سے

کافی زیادہ واسطہ رہ چکا ہے وہ اس یقین سے بمشکل انکار کر سکتا ہے کہ اکثر موقعوں پر ان جانوروں کو کچھہ نہ کچھہ کہنے کی بےتابی ہونے لگتی ہے اور اب وہ نہ کہہ سکنے کو ایک بڑا عیب یا معذوری محسوس کرتے ہیں ، اگرچہ بدقسمتی سے یہ بےبسی لاعلاج ہے کیوں کہ ان کے صوتی اعضا دوسری سمت میں پہلے ہی پختہ ہو چکے ہیں ۔ مگر جب حیوانوں میں صوتی اعضا موجود ہیں ان میں خاص حدود کے اندر یہ معذوری بھی دور ہو جاتی ہے ۔ پرندوں کے دہنی اعضا کی ساخت آدمی سے انتہائی مختلف ہے ۔ تاہم پرندے ایسے جانور ہیں جو بولنے کی صلاحیت رکھتے ہیں — اور پرندوں میں بھی سب سے ہولناک آواز کا پرندہ طوطا ہے، جو بولنے میں سب سے تیز ہے ۔ اس پر یہ اعتراض اٹھایا جا سکتا ہے کہ طوطا جو بولتا ہے وہ سمجھتا نہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ محض لذت گفتار کی خاطر اور انسانوں سے قربت کے لطف میں طوطا گھنٹوں ایک سانس بولتا چلا جاتا ہے اور جتنے لفظ اسے معلوم ہوں سب دھرا ڈالتا ہے ۔ لیکن اپنی سمجھ بوجھ کے دائرے میں وہ جو کہتا ہے اسے سمجھنا بھی سیکھ لیتا ہے ۔ کسی طوطے کو گالی کوسنے کے لفظ اس ڈھب سے سکھا کر دیکھئے کہ وہ ان کا مطلب بھی سمجھتا جائے (گرم ملکوں سے واپس آتے ہوئے جہازی اپنی تفریح کے لئے یہ شغل اختیار کر لیتے ہیں) اور پھر زرا طوطے کو ستا کر دیکھئے ، وہ ایسی برمحل کھری کھری ملاحیاں سنا ڈالے گا جیسے برلن کا کوئی کنجڑا ۔ یہی بات کھانے کی چھوٹی موٹی چیزوں کے مانگنے پر بھی صادق آتی ہے ۔

اول تو محنت اور پھر بعد میں اس کے ساتھ ساتھ قوت ناطقہ (گویائی) یہ دو سب سے اہم محرک تھے جو اپنے اثر سے بن‌مانس کے دماغ کو رفتہ رفتہ اس انسانی دماغ تک لائے جو اپنی مشابہت کے باوجود بن‌مانس کے دماغ سے بڑا بھی ہے اور زیادہ مکمل بھی ۔ دماغ کی نشوونما ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے فوری اوزاروں ، یعنی حواسوں کے اعضا کی ترقی بھی ہوئی ۔ جیسے قوت ناطقہ کی رفتہ رفتہ ترقی سے قوت سماعت کے عضو کا نکھرنا اور سدھرنا تال میل رکھتا ہے ، ٹھیک اسی طرح دماغ کی ترقی بھی مجموعی طور پر تمام حواسوں کی ترقی اور نکھار کے ساتھ چلتی ہے ۔ عقاب کی آنکھ آدمی کی نظر سے کہیں دور پہنچتی ہے لیکن انسانی آنکھ

کو چیزوں کی شناخت عقاب سے کہیں زیادہ ہوتی ہے ۔ کتے کو آدمی سے زیادہ سونگھنے کی حس (شامہ) میسر ہے لیکن بو اور بو کا فرق، جو انسان کو مختلف چیزوں کی شناخت دلاتا ہے، کتے کو اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملا ۔ اسی طرح چھونے کی قوت (لامسہ) جو بن‌مانس کو بالکل ابتدائی شکل میں بمشکل کسی قدر حاصل ہوتی ہے، خود انسانی ہاتھ کی نشوونما کے ساتھ ساتھ اور محنت کی راہ سے بڑھتی گئی ہے۔

محنت اور قوت گفتار پر دماغ کی نشوونما کا، اس سے وابستہ احساسات کی ترقی کا، شعور، کلیے بنانے اور فیصلے کرنے کی قوت کے بڑھتے ہوئے نکھار کا جو اثر ہوا وہ محنت اور گفتار دونوں کو برابر آگے کی طرف بڑھتے رہنے کی تحریک دیتا رہا ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جوں ہی آدمی آخر کار بن‌مانس سے علاحدہ ایک وجود بن کر ابھرا تو یہ ترقی اپنے انجام کو پہنچ گئی بلکہ مجموعی طور پر وہ اور بھی زبردست اگلا قدم اٹھاتی رہی ۔ البتہ آدمی کے مختلف گروہوں اور مختلف زمانوں میں ترقی کے درجے اور ترقی کی سمت کا فرق بھی باقی رہا، ایسا بھی ہوتا رہا کہ کبھی کبھی اور کسی کسی جگہ ترقی کے بجائے عارضی تنزل آگیا ۔ تاہم وہ عام طور پر آگے بڑھتا رہا ۔ اس کے علاوہ ایک نیا عنصر زندگی میں داخل ہوا جس نے ایک طرف تو اس ترقی کا زبردست تقاضا کیا اور دوسری طرف اسے خاص ڈگر پر آگے بڑھایا، یہ نیا عنصر مکمل انسانی وجود کے ساتھ ابھرا اور اس کا نام تھا سماج ۔

درختوں پر کود پھاند مچانے‌والے بندروں کے جھنڈ سے ہوتے ہوتے انسانی سماج تک پہنچنے میں لازمی طور پر لاکھوں سال لگے ہوں‌گے جو کرۂارض کی تاریخ میں اس سے زیادہ وقفے کی اہمیت نہیں رکھتے جتنا آدمی کی مدت حیات میں ایک سیکنڈ *، لیکن بہرحال وہ وقت بھی آ ہی گیا، انسانی سماج ابھرا ۔ وہ خاص بات کیا ہے جو بندروں کے جھنڈ اور

---

* علم کی اس شاخ کے ایک بڑے فاضل سر ولیم ٹامسن نے تخمینہ نکالا ہے کہ زمین کے اتنا ٹھنڈا ہونے میں دس کروڑ سال سے کچھ زیادہ عرصہ لگا ہوگا جتنے میں نباتات اور حیوانات اس پر زندگی پانے کے قابل ہو جائیں ۔

انسانی سماج میں وجہ امتیاز بنتی ہے ؟ وہ محنت ہے ۔ بندروں کی کھیپ اتنے میں ہی خوش تھی کہ جغرافیائی حالات اور پڑوس کی کھیپ کے مقابلے یا ٹکراؤ سے جتنی کچھ جگہ اسے اپنا پیٹ بھرنے کو میسر آجائے اسی پر بسر کرلے ۔ پیٹ بھرنے کی نئی جگہیں حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے ٹھکانے بھی بدلے ، مقابلے بھی کئے لیکن یہ بس کی بات نہ تھی کہ قدرتی حالت میں جو کچھ ان ٹھکانوں سے میسر آ جاتا ، اس سے کچھ زیادہ نکال لے ، سوائے اس کے کہ بےخبری میں وہ زمین کو اپنے فضلے سے اور زرخیز بنا دے ۔ جب منہ مارنے کی ساری جگہیں بھر گئیں تو بن‌مانسوں کی آبادی بھی تھم گئی ۔ حد سے حد یہ کہ جتنے جانور موجود ہیں ، اتنے ہی رہ جائیں ۔ لیکن جانوروں کے وجود سے خوراک بہت ضائع ہوتی ہے ، نہ صرف خوراک بلکہ اس کی کونپل بھی پنپنے سے پہلے برباد ہو جاتی ہے ۔ شکاری تو چھوڑ بھی‌دے لیکن بھیڑیا اس ہرنی کو زندہ نہیں چھوڑتا جس کے بچے اگلے سال خوراک بن سکتے ۔ یونان میں بھیڑ بکریوں نے چھوٹی جھاڑیاں بھی تناور ہونے سے پہلے کھا لیں اور تمام پہاڑیوں کی ہریالی چٹ کر گئیں جس کے سبب سے پہاڑ بنجر رہ گئے ۔ جانوروں کی اس ”غارت گرانہ معیشت“ نے حیوانوں کی نوع میں تبدیلیاں لانے کی بڑی خدمت انجام دی ہے ، کیوں کہ اس کی مجبوری سے انھیں اپنی روزمرہ کی خوراک کی عادت میں فرق پیدا کرنا پڑا اور یوں خوراک کی تبدیلی کی بدولت ان کے خون میں اجزائے ترکیبی ادل بدل کر تمام جسمانی ترکیب رفتہ رفتہ دوسرے سانچوں میں ڈھل گئی ۔ جانوروں کی جو نوعیں یہ تبدیلی اپنے اندر نہیں لاسکیں وہ ناپید ہو گئیں ۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اسی غارت گرانہ معیشت کی زبردست تاثیر تھی جس نے ہمارے اسلاف کو بن‌مانس سے انسان کے درجے تک پہنچا دیا ۔ بن‌مانسوں کی وہ نسل جو ذہانت میں اور خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت میں اپنے ہم جنسوں سے سبقت لے گئی ہوگی ، اس پر غارت گرانہ معیشت کا اثر یہ ہونا چاہئے کہ جن پھل پودوں سے وہ اپنا پیٹ بھرتی رہی ہوگی اب ان میں اور پھل پودے ملا لئے ہوں‌گے اور خوراک کے درختوں میں زیادہ سے زیادہ غذائی حصوں کو شریک کر لیا ہوگا ۔ نتیجہ یہ کہ خوراک کا میل برابر بدلتا چلا گیا اور اسی کے

ساتھ جو غذائی اشیا بدن میں پہنچتی تھیں ، وہ بھی بدلتی گئیں — یعنی وہ مادے جزوبدن ہوتے گئے جو بن‌مانس سے بدلتے بدلتے آدمی میں ڈھل جانے کی کیمیائی ضرورت کی تسکین کرتے تھے۔ یہ سب تو ہوا لیکن ابھی صحیح معنی میں محنت کا عمل دخل شروع نہیں ہوا تھا۔ محنت اوزار بنانے کے ساتھ ظہور میں آتی ہے۔ کون سے ہیں وہ سب سے قدیم اوزار جو آج ہمیں ملتے ہیں ؟ ماقبل تاریخی زمانےوالے آدمی کی جو قدیم سے قدیم وراثت دستیاب ہوئی ہے ، اس کو نظر میں رکھتے ہوئے ، اور اولین تاریخی آبادیوں کے رہن سہن اور آج تک کے انتہائی خام وحشیوں کے طور طریق کو دیکھتے ہوئے ہمیں جن قدیم سے قدیم اوزاروں کا پتہ چلتا ہے وہ شکار اور مچھلی پکڑنے کے اوزار ہیں ، شکاروالے اوزار تو ہتھیار کے کام بھی آتے تھے۔ لیکن شکار اور ماہی گیری سے یہ بھی نکلتا ہے کہ تب تک جو محض سبزی ترکاری کی غذا رہی تھی ، اس کے ساتھ ساتھ گوشت‌خوری آتی گئی اور یہ تبدیلی ایک اور اہم قدم تھا بن‌مانس سے آدمی کی طرف سفر کی جانب۔ گوشت کی خوراک جسم کو تقریباً تیار حالت میں وہ انتہائی ضروری اجزا مہیا کر دیتی ہے جو جزو بدن ہو جاتے ہیں۔ اس نے نہ صرف ہاضمے کا وقت بلکہ آدمی کے جسم میں نباتاتی زندگی سے مطابقت رکھنےوالے اور کئی نباتاتی عمل کا وقت بھی کم کر دیا اور اس ترکیب سے اتنا وقت، سروسامان اور جذبہ شوق حاصل ہوا جس سے حیوانی زندگی زیادہ بھرپور اور زیادہ سرگرم عمل ہوسکے۔ یوں یہ تشکیل پاتا ہوا آدمی نباتات کی دنیا سے جتنا دور نکلتا گیا اتنا ہی وہ حیوانات سے بلند و برتر ہوتا گیا۔ جس طرح جنگلی کتے بلی گوشت کی غذا کے ساتھ سبزی ترکاری کے عادی ہوتے ہی آدمی کی خدمت میں لگ جاتے ہیں ، اسی طرح وہ آدمی جو بن‌مانس سے آگے کی جانب سفر کر رہا تھا سبزی ترکاری کی غذا کے ساتھ گوشت کھانے کی طرف مائل ہوا تو اس کے بدن کو طاقت اور جسم کو آزادی دینے میں اس خوراک سے بہت مدد ملی۔ گوشت کی خوراک کا دماغ پر سب سے گہرا اثر پڑا کہ دماغ کو غذائیت اور اٹھان کے لئے جن اجزا کی شدید ضرورت تھی وہ پہلے سے بھرپور مقدار میں نصیب ہونے لگے اور اب دماغ ایک نسل کے بعد دوسری نسل میں زیادہ تیزی سے اور زیادہ خوبی کے ساتھ بڑھنے پنپنے لگا۔ جو لوگ

سبزی‌خوری کے حامی ہیں ، ان کا احترام کرتے ہوئے ، یہ بھی کہنا ہے کہ گوشت کی خوراک کے بغیر آدمی وجود میں نہیں آیا ہے ۔ اور اگر اس کے کارن وہ سب جاتیاں ، جو ہمارے علم میں ہیں کسی نہ کسی وقت میں آدم‌خوری میں مبتلا رہی ہیں تو آج ہمیں اس بات سے کوئی نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے (برلن‌والوں کے اسلاف ، ویلےٹبی‌والے اور ویلز (weletabians and wilzians) تو دسویں صدی عیسوی تک میں اپنے والدین کا گوشت کھا لیا کرتے تھے) ۔

گوشت کی غذا آئی تو اس کے دم سے دو نئی ترقیاں ہوئیں جن کی زبردست اہمیت ہے : ایک تو آگ سے کام لینا اور دوسرے جانور پالنا ۔ آگ کے استعمال نے ہاضمے کے عمل کو اور مختصر کر دیا کیوں کہ جب لقمہ پک کر منھ کے پاس پہنچا تو گویا وہ نیم ہضم شدہ تھا ، جانور پالنے کی بدولت گوشت کی غذا اور بھی زیادہ استعمال ہونے لگی کیوں کہ اس نے شکار کے علاوہ خوراک کی سپلائی کی ایک تازہ اور باقاعدہ راہ کھول دی ۔ اس کے علاوہ دودھ اور دودھ کی اشیاء کی صورت میں غذا کی ایک ایسی نئی چیز مہیا کر دی جو اپنی غذائی ترکیب میں گوشت سے کچھ کم مفید نہیں تھی ۔ تو گویا یہ دونوں ترقیاں بجائے خود انسان کو فطرت کی پابندیوں سے آزاد کرنے میں نیا براہ‌راست ذریعہ ثابت ہوئیں ۔ خواہ انسان اور اس کے سماج کی ترقی میں گوشت‌خوری کے بالواسطہ اثرات نے کتنی ہی بڑی خدمت انجام دی ہو ، تاہم اگر تفصیل سے انھیں بیان کرنے بیٹھیں تو ہم اپنے موضوع سے دور نکل جائیں‌گے ۔

جس طرح انسان نے قابل خوراک ہر ایک شے کو گلے اتارنا سیکھا ، ایسے ہی یہ بھی معلوم کر لیا کہ کسی بھی آب و ہوا میں کیسے رہا جائے ۔ دنیا میں جہاں بھی رہنے بسنے کی گنجائش دیکھی وہیں پھیل گیا اور وہی ایک ایسا حیوان تھا جو اپنی مرضی سے کہیں ٹھکانا کر سکتا تھا ۔ اور باقی حیوان مثلاً پالتو جانور اور کیڑے مکوڑے جو ہر قسم کی آب و ہوا میں رہنے کے عادی ہو چکے ہیں وہ اپنے آپ سے اس قابل نہیں ہوئے بلکہ آدمی کی بدولت ہوئے ہیں ۔ ایک سی گرم آب و ہوا کے علاقوں سے ، جہاں آدمی شروع سے رہتا آیا تھا ، جب وہ ایسے سرد علاقوں کی طرف ڈھلنا شروع ہوا ، جہاں سال میں گرمی اور سردی

دونوں کا دور ہوتا تھا تو اس کی ضرورتیں بھی بڑھنے لگیں ، اب اسے سردی اور رطوبت سے بچاؤ کی خاطر سر چھپانے اور بدن ڈھانکنے کا سامان کرنا پڑا ۔ چناں‌چہ محنت کے نئے میدان کھلے ، عمل کی نئی شکلیں سامنے آئیں جو آگے چل کر آدمی کو باقی حیوانات سے اور بھی جدا کرتی چلی گئیں ۔

نہ صرف فرد بلکہ سوسائٹی میں بھی ہاتھوں ، قوت گویائی کے اعضا اور دماغ ان تینوں کے مل‌جل کر کام کرنے سے انسان میں یہ صلاحیت اور سکت پیدا ہوئی کہ زیادہ سے زیادہ الجھے ہوئے کام کر سکے ، اور ایک سے ایک بڑے مقصد کو نظر کے سامنے رکھ کر اسے حاصل کر سکے ۔ ہر نسل جو آتی گئی ، اپنے ذمے پچھلی نسل سے زیادہ مختلف کام لیتی گئی ، زیادہ خوبی سے اور زیادہ رنگا رنگی سے اپنا کام کرتی گئی ۔ اب تک شکار کرنا اور مویشی پالنا تھا اور اب اس میں زراعت کا جوڑ بھی لگ گیا ۔ پھر کتائی ، بنائی کا نمبر آیا ، دھات کا کام، برتن بنانا اور کشتی کھینا بھی شامل ہو گیا ۔ تجارت اور صنعت کی جلو میں آرٹ اور سائنس نے ظہور کیا ۔ قبیلے تھے ، بڑھ کر قومیں اور ریاستیں بن گئیں ۔ قانون اور سیاست کی باری آئی اور انھی کے ساتھ ساتھ انسانی چیزوں کی ذہن انسانی میں خیالی شبیہ نمودار ہوئی ، یعنی مذہب ۔ ان ساری تخلیقوں کے مقابل ، جو یوں معلوم ہوتی تھیں گویا اول ذہن انسانی کی پیداوار ہیں اور پھر انسانی سماج پر چھائی ہوئی ہیں ، دست محنت کا تیار کیا ہوا سیدھا سادہ سامان کم حیثیت ہوتا چلا گیا اور پس منظر میں اس کے کھسک جانے کی زیادہ‌تر وجہ یہ ہوئی کہ وہ دماغ ، جو محنت کا ڈول ڈالتا تھا ، وہ سماج کے اٹھان کے بالکل ابتدائی مرحلے میں ہی (مثلاً شروع کے خاندان میں ہی) اس قابل ہو گیا کہ محنت کا جو نقشہ اس نے تیار کیا ہے وہ اپنے ہاتھ کے بجائے دوسروں کے ہاتھوں پورا کرائے ۔ تمدن کی تیزرفتار ترقی کا سہرا ذہن انسانی کے سر باندھ دیا گیا کہ یہ دماغ کی ہی ترقی اور سرگرمی کا حاصل حصول ہے ۔ لوگ اس کے عادی ہو گئے کہ اپنے عمل کو ضرورتوں کا نتیجہ بتانے کے بجائے اپنے خیالات کا پھل سمجھا اور سمجھایا کریں (حالاں کہ ضرورت ہی اپنا پرتو دماغ پر ڈالتی اور وہاں تحریک پیدا کرتی ہے) ۔ چناں‌چہ وقت گزرتا گیا اور کائنات کا

عینیت‌پرست (idealistic) نقطۂ‌نظر جگہ بناتا گیا جس نے خاص کر کلاسیکی قدیم دنیا کے زوال کے بعد سے انسانی دماغوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اس کا اثر دماغوں پر آج تک اتنا چھایا ہوا ہے کہ ڈارون کے مکتب خیال کے سب سے خاص مادیت‌پسند علمائے فطرت بھی انسان کی ابتدا یا آغاز کے متعلق کوئی دوٹوک خیال پیش کرنے سے کتراتے ہیں کیوں کہ عینیت‌پرستی کے اثر نے انھیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ ارتقا کے عمل میں اس کارنامے کو تسلیم کر لیں جو محنت نے انجام دیا ہے۔

جیسا کہ مذکور ہوا ہے، جانور بھی آدمی ہی کی طرح اپنے عمل سے فطرت کے ماحول میں تبدیلی لاتے ہیں، اگرچہ اس حد تک تبدیلی نہیں کر پاتے، اور یہ تبدیلیاں، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں بعد میں خود انھی پر اثر کرتی ہیں اور ان کو بھی بدل دیتی ہیں۔ فطرت میں کوئی واقعہ الگ تھلگ نہیں رہتا۔ ہر شے کا دوسری پر اثر پڑتا ہے اور وہ دوسری ہر شے سے خود بھی متاثر ہوتی ہے۔ عالم فطرت کے ہمارے سائنس‌داں جو معمولی سی معمولی چیزوں کی تہہ میں نہیں اتر پاتے، اس کی بیشتر وجہ یہی ہے کہ وہ عالم فطرت میں اس ہمہ‌پہلو حرکت اور عمل در عمل کے سلسلے کو بھول بیٹھتے ہیں۔ ذکر آ چکا ہے کہ یونان میں بکریوں نے جنگل کے پھر سے اگنے کی راہ بند کر دی؛ سینٹ ہیلینا کے جزیرے میں شروع کے نووارد اپنے ساتھ جو بکریوں اور سوروں کے گلے لائے تھے انھوں نے وہاں کی پرانی ہریالی کا تقریباً بالکل ہی صفایا کر دیا اور اس طرح بعد کے جہازیوں اور آبادکاروں کے لائے ہوئے پودوں کے پھیلنے کے لئے زمین بھی ہموار کر دی۔ جانور انجانے میں اپنے ارد گرد کی دنیا پر ایک پائدار اثر چھوڑتے ہیں اور خود ان کی ذات تک یہ عمل محض اتفاقی ہوتا ہے۔ آدمی جتنا جتنا جانوروں سے دور ہوتا جاتا ہے، فطرت پر اس کا اثر بےخبری میں یا اتفاقیہ نہیں، بلکہ سوچا سمجھا، باقاعدہ ایسا عمل ہوتا ہے جس سے کچھ طےشدہ مقاصد مراد ہوتے ہیں۔ جانور جب کسی سرزمین کی ہریالی کا صفایا کرے تو اسے خبر نہیں ہوتی کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ آدمی یہی عمل اس نیت سے کرتا ہے کہ زمین صاف ہو تو فصل کی بوائی کی جائے، یا درخت لگائے جائیں یا

انگور کی بیلیں چڑھائی جائیں جو اگنے پر اپنے سے کئی گنا زیادہ حاصل دیں‌گی۔ وہ مفید پودوں اور پالتو جانوروں کو ایک ملک سے دوسرے میں پہنچاتا ہے اور یوں پورے کے پورے براعظم کا نباتیہ و حیاتیہ تبدیل کر دیتا ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مصنوعی نسل کشی کے ذریعے، آدمی کے ہاتھوں پودے اور جانور اس قدر ادل بدل جاتے ہیں کہ ان کی اصلیت کی پہچان نہیں رہتی۔ وہ جنگلی پودے جن سے ہمارے موجودہ اناج نکلے ہیں ایسے غائب ہوئے کہ ان کی تلاش فضول ہے۔ ان جنگلی جانوروں پر بھی اختلاف رائے چلا آتا ہے جن سے کتوں کی مختلف موجودہ نسلیں اور ویسے ہی آجکل کے گھوڑوں کی بےشمار نسلیں نکلی ہیں۔

یہ کہنا غیرضروری ہے کہ جانوروں میں سوچ سمجھ کر باقاعدہ کارروائی کرنے کی جو صلاحیت ہے اس پر اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ جہاں بھی مادہ حیات (protoplasm) یا زندہ سفید مادہ (albumen) موجود ہے وہیں ابتدائی شکل میں عمل کا باقاعدہ انداز موجود ہوتا ہے، اور وہ متاثر ہوتا ہے یعنی اگر خارج میں کوئی خاص محرک ہے تو خاص قسم کی جوابی حرکت کرتا ہے چاہے وہ کتنی ہی سادہ کیوں نہ ہو۔ یہ جوابی کارروائی ان جسموں تک میں پائی جاتی ہے جن میں اعصابی خلیے کا کیا ذکر، خلیوں کا ہی وجود نہیں ہوتا۔ کیڑے مکوڑے چاٹ جانےوالے پیڑ پودے جس طرح اپنے شکار کو پکڑتے ہیں اگرچہ وہ انجانے میں ایسا کرتے ہیں، خود اسی طریقے میں ایک باقاعدہ کارروائی ہوتی ہے۔ جانوروں میں جتنا ان کا اعصابی نظام ترقی‌یافتہ ہوتا ہے، سوچی سمجھی باقاعدہ کارروائی اسی تناسب سے بڑھتی ہے اور دودھ پلانےوالے جانوروں میں وہ اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ انگلینڈ میں آدمی شکار پر نکلے تو یہ روزمرہ کا معمولی مشاہدہ ہوتا ہے کہ لومڑی کو اس علاقے کی اونچ نیچ کا جو لاجواب علم ہے وہ اس کا کتنا نپاتلا استعمال کرکے شکاری کو غچہ دے کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے، اسے زمین کا مفید مطلب موقع محل اچھی طرح معلوم ہوتا ہے اور وہ اس سے کام لیتی ہے تاکہ اس کی مہک بھی نہ پھوٹنے پائے۔ ہمارے یہاں پالتو جانوروں میں بھی، جو آدمی کے ساتھ رہنے سے کافی ترقی کر گئے ہیں، شرارت کی ویسی ہی سوچی

سمجھی حرکتیں نظر آجائیں‌گی جیسی بچے کیا کرتے ہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ جس طرح ماں کے رحم میں انسانی جنین کے ارتقا کی تاریخ اس لاکھوں برس پر پھیلی ہوئی ارتقائی تاریخ کا ایک خلاصے میں دھرایا جانا ہے، جس میں ہمارے حیوانی اسلاف کیڑے سے ہوتے ہوتے جسمانی ارتقا کے تمام مرحلوں سے گزر چکے ہیں ، ٹھیک اسی طرح آدمی کے بچے کا ذہنی نشوونما انھی اسلاف کی ، یا کم‌ازکم ان میں جو بہت بعد کے تھے ، ان کی ذہنی نشوونما کا اور بھی زیادہ خلاصے کی صورت میں دھرایا جانا ہے ۔ کچھ بھی ہو ، لیکن سبھی قسم کے جانوروں کی باقاعدہ کارروائی زمین پر اپنے ارادے کی چھاپ لگانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکی ۔ یہ کام صرف آدمی کے بس کا تھا ۔

مختصر یہ کہ جانور فطری ماحول کا محض استعمال کرتا ہے اور صرف اپنی موجودگی سے اس میں تبدیلیاں لاتا ہے ؛ آدمی اپنی لائی ہوئی تبدیلیوں کے ذریعے فطرت سے اپنے مقاصد پورے کراتا ہے ، اس کی تسخیر کرتا ہے ۔ آدمی اور دوسرے حیوانوں میں یہی آخری اور مکمل حد فاصل ہے اور پھر دیکھئے تو محنت ہی ہے جو یہ حد فاصل کھینچتی ہے ۔*

تاہم انسان نے فطرت پر جو فتوحات پائی ہیں ، ان کی بنا پر کچھ زیادہ خودستائی نہیں کرنی چاہئے کیوں کہ ایسی ہر ایک فتح پر فطرت ہم سے انتقام لئے بغیر نہیں رہتی ۔ یہ صحیح ہے کہ شروع میں تو ہر ایک فتح سے ہماری توقع کے مطابق نتیجہ نکلتا ہے لیکن دوسری تیسری باری میں بالکل ہی دوسرے قسم کے اور غیرمتوقع اثرات ظاہر ہوتے ہیں جو اکثر و بیشتر پہلے نتیجے کو دھو ڈالتے ہیں ۔ وہ لوگ جنھوں نے میسوپوٹامیا ، یونان اور ایشیائے کوچک وغیرہ مقامات پر جنگل اس خیال سے صاف کئے تھے کہ زمین پر کاشت کریں‌گے ، انھیں وہم‌وگمان بھی نہ ہوگا کہ جنگلوں کا صفایا کرتے وقت وہ بادل سمٹنے اور پانی اکٹھا ہونے کے مرکز بھی غائب کئے دے رہے ہیں اور یوں ان ملکوں میں مفت کی وہ مصیبت مول لے رہے ہیں جس میں آجکل مبتلا ہیں ۔ جب الپس

---

* مسودے کے حاشیے پر اینگلس نے ایک لفظ لکھا ہے «Veredlung» یعنی ترقی ۔ (ایڈیٹر)

کوھستانی سلسلے کے اطالویوں نے جنوبی ڈھلانوں پر دیودار کے وہ جنگل خرچ کر لئے جو شمالی ڈھلانوں پر ایسی بہار دیتے ھیں ، تو انھیں کیا خبر تھی کہ جنگلوں کا صفایا کر کے وہ اپنے علاقے کی ڈیری صنعت کی جڑوں پر کلھاڑی چلا رھے ھیں ، جنگل تو اڑا دئے لیکن یہ خیال تک نہ آیا کہ اس حرکت سے وہ پہاڑی چشموں کو اس پانی سے محروم کر لیں گے جو سال کے زیادہ دنوں تک میسر آتا اور یہ راستہ بنا دیں گے کہ برسات کے دنوں میں پہاڑی ندی نالے ان پر اور زیادہ طوفانی دھارے چھوڑ دیں ۔ یورپ میں آلو کی فصل پھیلانےوالوں نے یہ کب سوچا تھا کہ نشاستہ بھرے ان جڑیلے گولوں سے وہ بچوں میں کنٹھ مالا کی بیماری (scrofula) پھیلائے دے رھے ھیں ۔ چناں‌چہ ھر قدم پر ھمیں یاد دھانی کی جاتی ھے کہ فطرت پر باھر سے ھم اس طرح حکم نہیں چلا سکتے جیسے کوئی فاتح غیرملکی مفتوح پر من مانی حکمرانی کرتا ھے ، ھم فطرت کے باھر نہیں ، گوشت‌پوست ، خون اور دماغ کے ساتھ ھم بھی فطرت سے وابستہ اور اسی کے درمیان سانس لیتے ھیں ۔ فطرت پر ھمارا جتنا قابو ھے اس کا مطلب یہ ھے کہ اور مخلوق پر ھمیں یہ فضیلت حاصل ھے کہ فطرت کے قاعدے قانون سیکھ سکتے ھیں اور ان کا صحیح استعمال کر سکتے ھیں ۔

حقیقت یہ ھے کہ روز بروز فطرت کے ان قاعدوں کی‌سوجھ بوجھ بڑھتی جاتی ھے اور ھم اچھی طرح ذھن‌نشین کرتے جا رھے ھیں کہ فطرت جس ڈگر پر چلی آرھی ھے ، جب ھم اس میں دخل‌اندازی کرتے ھیں تو فوراً اس کا اثر کیا پڑتا ھے اور بہت دور جا کر اس کے کیا نتیجے نکلتے ھیں ۔ خاص کر ھماری انیسویں صدی میں نیچرل سائنسوں نے جو زبردست ترقیاں کی ھیں ، ان کی بدولت اب ھم پہلے سے کہیں زیادہ اس قابل ھیں کہ اور کچھ نہیں تو ھماری روزمرہ کی پیداواری سرگرمیوں کے فطرت پر جو دوراز کار اثرات پڑنےوالے ھیں ، ان کا پہلے سے اندازہ کر لیں اور اندازہ کر کے قابو پاسکیں ۔ لیکن اس سمت میں جتنی ترقی ھوتی جائے گی، اسی قدر آدمی نہ صرف احساس کرے گا بلکہ اچھی طرح جانے گا کہ فطرت میں اور اس میں دوئی نہیں ھے اور اتنا ھی اس بے‌تکے اور نامعقول خیال کا قائم رھنا ناممکن ھوتا جائے گا جو ذھن انسانی اور مادے کے درمیان ،

آدمی اور فطرت کے درمیان ، روح اور جسم کے درمیان تقابل کا قائل تھا ، وہ خیال جو یورپ میں کلاسیکی قدامت کے زوال کے بعد ابھرا تھا اور جس خیال نے مسیحی اعتقاد میں اپنی معراج حاصل کرلی تھی ۔

ہزاروں سال لگتے تھے تب کہیں جا کر ہمیں تھوڑی سی آگاہی نصیب ہوتی تھی اس بات کی کہ پیداوار کے عمل میں ہماری سرگرمی سے بہت آگے چل کر کیا قدرتی اثرات ہونےوالے ہیں ، لیکن اس سرگرمی کے دور از کار سماجی اثرات کیا ہوں‌گے ، ان کا پہلے سے اندازہ لگانا اور بھی زیادہ دشوار رہا ہے ۔ ابھی اوپر ہم نے آلو کی خوراک اور اس سے کنٹھمالا کی بیماری پھیلنے کا ذکر کیا ۔ مگر اس بیماری کی کیا حیثیت رہتی ہے اگر اس کا مقابلہ کیا جائے اس سے کہ مزدور جب آلو کی خوراک پر اتر آئے تو پورے پورے ملک میں عام آبادی کے رہن سہن پر ایسی خوراک کا کیا اثر پڑا یا اس واقعے سے کہ آلو کی فصل میں پت روگ لگ جانے کے باعث ۱۸۴۷ء میں آئرلینڈ میں قحط پڑ گیا تھا جس سے آلو پر گزر بسر کرنےوالی دس لاکھ کے قریب آبادی موت کے منھ میں اتر گئی اور بیس لاکھ آدمی وطن چھوڑ کر نکل گئے ! جب عربوں نے شراب کشید کرنا سیکھا تھا تو انھیں کیا معلوم تھا کہ اس دریافت کے ذریعے وہ تب تک نا معلوم امریکی براعظم کے خانہ‌بدوش قبیلوں کو روئے زمین سے ناپید کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار ایجاد کر رہے ہیں ۔ بعد میں جب کولمبس نے اس امریکہ کو دریافت کیا تو اسے خبر بھی نہیں تھی کہ امریکہ کی دریافت سے نیگروغلاموں کے کاروبار کی بنیاد پڑ جائےگی اور غلامی کے چلن کے نام ایک اور عمر کا پٹہ لکھا جائےگا جو یورپ میں تب سے بہت پہلے رخصت کی جا چکی تھی ۔ وہ لوگ جو سترھویں اٹھارویں صدی میں بھاپ کا انجن ایجاد کرنےکی دھن میں لگے ہوئے تھے ، وہ کہاں جانتے تھے کہ ایسا اوزار تیار کر رہے ہیں جو تمام دنیا میں سماجی رشتوں کو درہم برہم کرنے میں سارے اوزاروں سے بڑھ کر ثابت ہوگا ۔ خاص کر یورپ میں تاریخ نے اس جدید اوزار کو یہ مامور کیا کہ تھوڑی سی تعداد کے ہاتھ میں دولت سمیٹ کر ، بھاری اکثریت کو اس سے محروم کرکے اول تو بورژوازی کو سماجی اور سیاسی اقتدار بخش دے اور آگے چل کر اسی بورژوازی اور پرولتاریہ محنت کشوں کے درمیان طبقاتی

کش‌مکش بڑھائے جو صرف اسی انجام کو پہنچ سکتی ہے کہ بورژوازی کے اقتدار کا تختہ الٹ جائے اور ہر قسم کی طبقاتی تناتنی کا صفایا ہو جائے۔ لیکن عالم فطرت کی طرح اس میدان میں بھی اب طول طویل اور اکثر بےدرد تجربوں کے بعد، تاریخی مسالہ جمع کرنے اور اس کی چھان بین کرنے کے بعد ہم یہ سیکھنے لگے ہیں کہ پیداواری سرگرمی کے جو بالواسطہ اور دورازکار سماجی اثرات کبھی آئندہ پڑنےوالے ہیں ان کو پہلے سے نظر میں تول لیں اور اس طرح اب ہمیں یہ موقع میسر آنے لگا ہے کہ ان اثرات کو اپنے قابو میں بھی رکھیں اور انھیں ایک قاعدے سے چلائیں بھی۔

مگر اس قاعدے سے چلانے کے لئے صرف علم و آگاہی کافی نہیں، اس کے سوا کچھ اور بھی چاہئے۔ اب تک جو ہمارا طریق پیداوار چلتا رہا، اس میں اور اسی کے ساتھ تمام موجودہ سماجی نظام میں پوری طرح انقلاب لانے کی ضرورت ہے۔

اب تک جتنے پیداواری طریقے چلتے رہے ہیں ان کا منشا محض اسی قدر تھا کہ محنت سے جو فوراً اور براہ‌راست کارآمد حاصل ملتا ہے وہ لے لیا جائے۔ اس کے دوسرے نتیجے جو صرف بعد میں ظاہر ہوتے ہیں اور بتدریج باربار دھرانے اور جمع ہونے سے کارگر ہوتے ہیں ان پر کسی کی نظر نہ گئی۔ جب زمین کی ابتدائی مشترکہ ملکیت کا دور تھا تو ایک طرف اس کا جوڑ بیٹھتا تھا انسانوں کی نشوونما کی ایک ایسی سطح سے جس میں رہ کر ان کی نظر عموماً محدود تھی، اور وہ صرف وہیں تک دیکھ پاتے تھے جو سردست میسر ہو، اور دوسری طرف اسی میں دستیاب زمین کی کسی قدر افراط کا نکتہ بھی پوشیدہ تھا کہ معیشت کی اس پست سطح کے جو برے اثرات پڑتے، ان کی تھوڑی بہت تلافی اس دستیاب بافراط زمین سے ہو جایا کرتی تھی۔ جب یہ فالتو زمین فالتو نہ رہ گئی تو مشترکہ ملکیت پر بھی زوال آگیا۔ پیداوار کی جتنی ترقی‌یافتہ شکلیں آئیں وہ آبادی کو مختلف طبقوں میں بانٹتی چلی گئیں اور انھوں نے حاکم و محکوم طبقوں کے درمیان مستقل تضاد کی نوبت پہنچا دی۔ اس طرح سے حاکم طبقے کا اپنا مفاد ہی پیداوار کی ترقی کی اصلی کنجی رہ گئی اور پیداوار محکوموں کی گزر بسر کے انتہائی ضروری سامان تک محدود

نہیں رہی ۔ سرمایہ‌دارانہ طریق پیداوار پر جو آجکل کے مغربی یورپ میں جاری وساری ہے، اس طریقے نے پوری مہر ہی لگا دی ۔ مال کی پیداوار اور تبادلہ جن کے قبضہ قدرت میں ہے وہی فرداً فرداً سرمایہ‌دار اپنی کارروائی کے صرف اسی نتیجے سے سروکار رکھتے ہیں جو ہاتھ کے ہاتھ ان کی غرض پوری کرتا ہو ۔ اس میں شک نہیں کہ اگرچہ جو مال بھی تیار کیا جائے یا جس کا تبادلہ کیا جائے ، وہ بہرحال کسی نہ کسی ضرورت میں کام آتا ہے ، تاہم یہ مفید نتیجہ نظروں سے اوجھل ہوکر رہ جاتا ہے اور اصل تحریک صرف اس منافع سے ہی ملتی ہے جو مال کے فروخت کرنے سے ہاتھ آئے ۔

کلاسیکی سیاسی معاشیات ، جو بورژوازی کی سماجی سائنس ہے ، انسانی کارروائی کے صرف ان براہ راست مطلوبہ سماجی اثرات کی جانچ کرتی ہے جن کا تعلق پیداوار اور تبادلے سے ہے ۔ یہ بات سماج کی اس بناوٹ کے عین مطابق ہے جس سماج کا نظریاتی روپ خود سیاسی معاشیات میں موجود ہے ۔ فرداً فرداً سرمایہ‌دار پیداوار اور تبادلے میں اس غرض سے لگے رہتے ہیں کہ ہاتھ کے ہاتھ منافع ملے ۔ اس لئے وہ صرف اس پر نظر رکھتے ہیں کہ انسانی کارروائی سے فوراً کیا حاصل ہونےوالا ہے ۔ جب تک کوئی کارخانہ‌دار یا بیوپاری اپنا تیار کیا ہوا یا خریدا ہوا مال خاصے منافع پر اٹھا لیتا ہے وہ اس سے مطمئن رہتا ہے اور اس سے سروکار نہیں رکھتا کہ بعد میں مال پر اور اس کے خریدار پر کیا گزرتی ہے ۔ عین یہی بات اسی قسم کے عمل کے قدرتی اثرات پر صادق آتی ہے ۔ کیوبا میں اسپینی کھیت لگانےوالوں کو کیا پروا تھی کہ انھوں نے پہاڑی ڈھلانوں پر جنگل کے جنگل پھونک ڈالے اور ان کی راکھ سے اچھی خاصی کھاد لےلی جو کافی کے باغات کی بہت ہی منافع‌بخش صرف ایک فصل کے لئے کافی تھی ۔ انھوں نے ذرا بھی فکر نہ کی کہ گرم ملکوں کی دھواں‌دھار بارش بعد میں پہاڑی زمین کی اوپر کی اکھڑی ہوئی پپڑی بہا لے جائےگی اور صرف ننگی چٹانیں چھوڑ جائےگی ۔ فطرت سے واسطہ ہو یا سماج سے، دونوں حالتوں میں آجکل کے طریق پیداوار کو زیادہ تر

ان نتیجوں سے غرض رہتی ہے جو ہاتھ کے ہاتھ نکل آئیں اور جن سے وقتی طور پر خوب کام چل جائے۔ پھر اس پر تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اس نیت سے جو کارروائی کی گئی تھی اس کے بہت آگے جا کر دور از کار اثرات نہ صرف یہ کہ کچھ اور ہی بلکہ جو سوچا تھا اس کے بالکل الٹ نکلے ؛ اور یہ کہ سپلائی اور مانگ میں جو ہم‌آہنگی ہے وہ بعد میں بالکل برعکس سمتوں میں بدل جاتی ہے ، جیسا کہ ہر دس سال کی مدت میں صنعتی چکر سے ثابت ہوتا ہے اور تو اور ، خود جرمنی نے بھی پچھلے صنعتی سنکٹ (۳) میں اس کا مزا چکھ کر دیکھ لیا؛ اور یہ کہ نجی ملکیت جس کی بنیاد ذاتی محنت تھی وہ لازمی طور پر ارتقائی راستے سے گزر کر مزدوروں کی عدم ملکیت میں بدل جاتی ہے اور ساری دولت سمٹتے سمٹتے غیر محنت‌کش لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتی ہے ؛ اور یہ کہ ... *

۱۸۷۶ ء میں لکھا ہوا۔

«Die Neue Zeit», Bd. 2, № 44, 1895—1896 رسالے میں پہلی بار شائع ہوا۔

مسودے کے مطابق ترجمہ۔

* یہاں تک آکر مسودے کا سلسلہ ٹوٹ گیا ہے۔ (ایڈیٹر)

فریڈرک اینگلس
کارل مارکس

کارل مارکس ، وہ ہستی ، جس نے سوشلزم کو ، اور اس کی بدولت ہمارے زمانے کی پوری مزدور تحریک کو ایک سائنسی بنیاد عطا کی ، تریر کے مقام پر ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے بون اور برلن میں تعلیم پائی۔ شروع میں قانون کا مضمون لیا۔ لیکن فوراً ہی خود کو تاریخ اور فلسفے کے مطالعے میں لگا دیا اور ۱۸۴۲ء میں وہ فلسفے کی نائب پروفیسری سنبھالنے ہی‌والا تھا کہ اتنے میں اس سیاسی تحریک نے جو فریڈرک ولہلم سوم کی موت کے فوراً بعد اٹھی ، اس کی زندگی کا دھارا ہی بدل ڈالا۔ رائن صوبے کی آزاد خیال بورژوازی کے لیڈروں ، کیمپ‌ہاؤزن اور ہنزمان قسم کے لوگوں نے مارکس سے مل کر کولون میں ایک اخبار (۴) «Rheinische Zeitung» کی بنیاد ڈالی تھی۔ ۱۸۴۲ء کے موسم خزاں میں جب رائنی لاندتاگ (صوبائی اسمبلی) کی کارروائی پر مارکس کی تنقیدوں نے کھلبلی مچادی تو وہ اس اخبار کا سربراہ بنا دیا گیا۔ یہ اخبار ظاہر ہے کہ سنسر کی زد میں آگیا لیکن وہ سنسر کے قابو میں آنےوالا نہیں تھا * ۔ ہمیشہ کام کے مضامین اشاعت کے مرحلے

---

* اخبار «Rheinische Zeitung» کا پہلا سنسر پولیس کونسلر دولیشال مقرر ہوا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے ایک بار کولون کے اخبار (۵) «Kölnische Zeitung» سے اطالوی شاعر دانتے کی تصنیف

سے گزار لیتا تھا۔ ترکیب یہ تھی کہ شروع میں سنسر کو بیکار کی یا غیراہم تحریریں سپلائی کی جاتیں کہ ان پر اپنی قینچی چلا لے یہاں تک کہ وہ تھک ہار کر بیٹھ رہتا، یا اس دھمکی سے کام کے مضمون شائع کرنے کی سبیل نکال لی جاتی کہ اگر ان پر کاٹ چھانٹ کی تو دوسرے دن اخبار نہیں نکل سکے گا۔ «Rheinische Zeitung» کی سی ہمت کرکے اگر صرف دس اخبار اور نکل جاتے، ان کے پبلشر صرف چند سو تھالیر (پیسے) اور ضائع کرنے کو آمادہ ہو جاتے تو ۱۸۴۳ء میں ہی جرمنی میں سنسرشپ دم توڑ دیتا۔ لیکن جرمن مالکان اخبار چھوٹے دل و دماغ کے لوگ تھے، کان دبا کر اپنا کام نکالنے سے غرض رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ «Rheinische Zeitung» تن تنہا ہی ٹکر لیتا رہا۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی سنسروں کو تھکا مارا۔ آخر اس پر دوہرا سنسر بٹھا دیا گیا۔ جب ایک رکاوٹ پار کر چکتا تو Regierungspräsident (پروشیا کی مرکزی حکومت کا علاقائی نمائندہ) دوبارہ نظر ڈالتا اور اس کی منظوری حاصل کرنی پڑتی۔ مگر اس سے بھی کام نہیں چلا۔ آخر ۱۸۴۳ء کے شروع میں حکومت نے صاف کہہ دیا کہ اس اخبار پر روک ٹوک کا کچھ اثر نہیں ہوتا اس لئے بغیر کسی حیل حجت کے اسے بند کیا جاتا ہے۔

اس عرصے میں مارکس نے فون ویسٹفالین کی بہن سے شادی کر لی (جو بعد میں رجعت‌پرست وزیر ہو گیا تھا) اور شادی کے بعد وہ پیرس چلا آیا جہاں روگے سے مل کر (۶) «Deutsch-Französische Jahrbücher» نکالنے شروع کئے۔ اسی سالنامے میں ”ہیگل کے فلسفۂ حقوق کی تنقید“ لکھ کر مارکس نے اپنی اشتراکی تحریروں کا سلسلہ چھیڑا۔ آگے چل کر فریڈرک اینگلس کے ساتھ اس نے وہ تصنیف پیش کی جس کا عنوان تھا ”مقدس خاندان۔ برونو باؤیر اینڈ کو کے رد میں“۔ فلسفے کی یہ ایک تازہ‌ترین شکل (برونو باؤیروالے گروہ کے خیالات) ان دنوں جرمن فلسفیانہ آئڈیلزم نے اپنا رکھی تھی۔ مارکس نے اس کا خاکہ اڑایا۔

”طربیہ خداوندی“ کے ترجمے کا اشتہار کاٹ دیا تھا یہ کہہ کر کہ ”خداوندی معاملات میں کامیڈی کو دخل نہیں دینا چاہئے۔“

سیاسی معاشیات اور انقلاب فرانس کی تاریخ کے مطالعے سے مارکس نے اتنا وقت جیسے تیسے نکال لیا کہ گاہے ماہے پروشیائی حکومت پر بھی حملے کرتا رہتا تھا۔ اور حکومت نے اس کا انتقام یوں لیا کہ ۱۸۴۵ء کے موسم بہار میں فرانس میں گیزو کی وزارت سے کہہ سن کر مارکس کو فرانس سے نکلوانے کا حکم جاری کرا دیا (۷)۔ کہتے ہیں کہ یہ گفت و شنید ہر الیکساندر فون ہومبولٹ کے ذریعے ہوئی تھی۔ مارکس کو اپنی شہریت بروسلز منتقل کرنی پڑی اور وہیں سے اس نے فرانسیسی زبان میں ۱۸۴۷ء میں اپنی تصنیف ''فلسفے کا افلاس،، شائع کی جو پرودھوں کی تصنیف ''افلاس کا فلسفہ،، کے رد میں لکھی گئی تھی۔ ۱۸۴۸ء میں ''آزاد تجارت پر بحث،، ایک اور کتاب شائع کی۔ موقع محل سے فائدہ اٹھا کر اس نے بروسلز میں جرمن ورکرز سوسائٹی (۸) کی بنیاد رکھ دی اور یوں عملی ایجی‌ٹیشن شروع کر دیا۔ عملی ایجی‌ٹیشن کی اہمیت اس کے نزدیک اور بڑھ گئی جب ۱۸۴۷ء میں مارکس اور اس کے سیاسی رفیق‌کار کمیونسٹ لیگ میں شامل ہو گئے جو خفیہ طور پر برسوں سے قائم تھی۔ اب اس جماعت کا پورا ڈھانچہ سراسر بدل گیا۔ یہ لیگ جو پہلے کم وبیش ایک سازشی جماعت تھی، تبدیل کر کے کمیونسٹ پروپیگنڈے کی ایک سیدھی سی تنظیم بنا دی گئی جو محض حالات کی مجبوری سے خفیہ رہی، ورنہ جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی پہلی تنظیم یہی تھی۔ جہاں کہیں جرمن مزدوروں کی یونینیں وجود میں آتی تھیں وہیں کمیونسٹ لیگ بھی موجود ہوتی تھی۔ انگلینڈ، بلجیم، فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں اور جرمنی کی ایسی ہی بہت ساری یونینوں میں بھی جو نمایاں ممبر ہوتے، وہ کمیونسٹ لیگ کے آدمی ہوا کرتے تھے۔ اٹھتی ہوئی جرمن مزدور تحریک میں لیگ کا بڑا ہاتھ تھا۔ مزید یہ کہ ہماری یہی لیگ تھی جس نے تمام مزدور تحریک کے انٹرنیشنل کردار پر زور دیا اور اسے عملی جامہ پہنا کر کھا دیا۔ ورنہ ممبروں میں انگلینڈوالے، بلجیم‌والے، ہنگری اور پولینڈوالے ہوا کرتے تھے اور وہی انٹرنیشنل لیبر جلسے بلا لیا کرتے تھے جو خاص کر لندن میں طلب کئے جاتے تھے۔

کمیونسٹ لیگ کی تنظیم نو ۱۸۴۷ء میں منعقد ہونےوالی دو

کانگرسوں میں ہوئی۔ دوسری کانگرس نے طے کیا کہ پارٹی کے بنیادی اصول وضاحت سے مرتب کرکے ایک مینی‌فسٹو کی صورت میں شائع کر دئے جائیں جسے مارکس اور اینگلس تیار کریں۔ اس طرح سے ''کمیونسٹ پارٹی کا مینی‌فسٹو،، * فروری کے انقلاب سے زرا پہلے ۱۸۴۸ء میں منظر عام پر آیا اور تب سے آج تک یورپ کی تقریباً تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

بروسلز سے شائع ہونےوالے (۹) «Deutsche-Brüsseler-Zeitung» میں مارکس بھی شریک کار تھا اور اس اخبار نے جرمن وطن کی پولیس عملداری کی مہربانیوں کی ایسی بےتحاشا پول کھولی کہ پروشیائی حکومت نے پھر کوشش کی کہ مارکس کو بلجیم سے نکلوا دے لیکن اس بار کامیاب نہ ہوسکی۔ البتہ جب فروری کے انقلاب کے اثر سے بروسلز میں عام ہلچل پھیلنے لگی اور ملک میں گہری تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے تو بلجیم کی سرکار نے مارکس کو کچھ کہہ سنے بغیر گرفتار کرکے ملک سے نکال دیا۔ اسی عرصے میں فرانس کی عارضی حکومت نے فلوکن کے ذریعے مارکس کو پیرس کی واپسی کا دعوت‌نامہ بھیجا اور اس نے یہ دعوت قبول کرلی۔

پیرس میں مارکس نے خاص کر اس دغابازی کی مخالفت کی جو وہاں کے جرمنوں میں پھیلی ہوئی تھی اور جس کا کہنا تھا کہ فرانس میں رہنےوالے جرمن مزدوروں کے ہتھیاربند دستے تیار کئے جائیں جو جرمنی میں انقلاب اور ریپبلک لے کر پہنچیں۔ اول تو جرمنی کو اپنا انقلاب خود کرنا چاہئے تھا، دوسری طرف سے یہ ہوا کہ فرانس میں دوسرے ملکوں کے جتنے انقلابی دستے بنے تھے، فرانس کی عارضی حکومت کے لامارتین حضرات نے خود ہی ان کا بھانڈا پھوڑ دیا اور جس حکومت کا تختہ الٹا جانا تھا مثلاً بلجیم اور باڈین، اسی کو پہلے سے خبر بھیج دی۔

مارچ ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے بعد مارکس نے پیرس سے کولون کا رخ

---

* ملاحظہ ہو اسی سلسلے کا حصۂ اول، صفحات ۹۵ — ۴۳۔ (ایڈیٹر)

کیا اور وہاں سے (۱۰) «Neue Rheinische Zeitung» اخبار شائع کر دیا جو پہلی جون ۱۸۴۸ء سے ۱۹ مئی ۱۸۴۹ء تک نکلتا رہا۔ یہی ایک پرچہ تھا جو اپنے وقت کی جمہوری تحریک کے اندر پرولتاریہ طبقے کے خیالات کی نمائندگی کرتا تھا اور یہ بات اس سے ظاہر ہے کہ ۱۸۴۸ء کے جون (۱۱) میں اس نے پیرس کے باغیوں (insurgents) کی کھل کر بے محابا تائید کی جس کا خمیازہ یوں بھگتنا پڑا کہ پرچے کے قریب قریب سبھی حصہ‌دار اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ «Kreuz-Zeitung» (۱۲) اخبار نے بہت زور لگایا اور ”بے‌شرمی کی وہ چوٹی“ بھی دکھائی جس پر سے مارکس کا رسالہ (۱۳) «Neue Rheinische Zeitung» ہر ایک مقدس چیز کو حملے کا نشانہ بنا رہا تھا، بادشاہ سلامت اور وائسرائے سے لے کر سیاسی پولیس تک کو نہیں چھوڑتا تھا، وہ بھی اس پروشیائی چوکی میں بیٹھ کر جہاں فی‌الوقت آٹھ ہزار فوج کی چھاونی موجود تھی۔ رائن علاقے کے آزاد خیال پیٹ بھرے (philistines) بھی طیش میں آئے جو ایک دم رجعت‌پرست ہو گئے تھے، کولون میں مارشل لا کے حکم سے ۱۸۴۸ء کے موسم خزاں میں کافی دنوں کے لئے پرچے کی اشاعت روک دی گئی، فرینکفرٹ میں اسپریل وزارت انصاف نے کولون کے وکیل سرکار کو ایک کے بعد ایک مضمون کے قابل گرفت پہلو جتائے تاکہ پرچے کے خلاف عدالتی کارروائی کی جائے — ان سب کوششوں پر پانی پھر گیا اور اخبار پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر خاموشی سے نکلتا رہا۔ سرکار اور سرمایہ‌داروں پر اس کے حملے جتنے سخت ہوتے گئے، اس کی اشاعت اور شہرت اتنی ہی بڑھتی گئی۔ جب پروشیا میں نومبر ۱۸۴۸ء میں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش (۱۴) ہوئی تو مارکس کے اس اخبار نے ہر ایک شمارے کی پیشانی پر لوگوں کے نام یہ پیغام چھاپا کہ وہ ٹیکس کی ادائگی سے انکار کر دیں اور تشدد کا جواب تشدد سے دیں۔ ۱۸۴۹ء کے موسم بہار میں کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ ایک مضمون کے باعث اسے پوری ایک عدالتی جیوری کا سامنا کرنا پڑا لیکن دونوں موقعوں پر الزامات سے بری ہو گیا۔ آخر جب ڈریسڈن میں اور رائن صوبے میں مئی ۱۸۴۹ء کی شورشیں (۱۵) دبا دی گئیں اور پروشیا نے فوج کی کافی بڑی تعداد اکٹھی کر کے، اسے حرکت میں لا کر باڈین

پفالتس کی بغاوت پر چڑھائی کرنے کی ٹھان لی تو حکومت نے اپنا بس چلتا دیکھا کہ «Neue Rheinische Zeitung» کو زبردستی کچل ڈالے۔ چناں چہ اس اخبار کا آخری شمارہ لال روشنائی سے ۱۹ مئی ۱۸۴۹ء کو نکل کر رہ گیا۔

مارکس پھر پیرس چلا آیا لیکن وہاں ۱۳ جون ۱۸۴۹ء کے مظاہرے (۱۶) کو ابھی چند ہفتے گزرے تھے کہ حکومت فرانس نے اس کے سامنے صرف دو راستے رہنے دیے: یا تو پیرس چھوڑ کر بریتان میں جا کر رہے یا فرانس سے نکل جائے۔ اس نے دوسری راہ اختیار کی اور لندن کو روانہ ہو گیا جہاں زندگی کے باقی تمام سال گزار دئے۔

ایک کوشش اور کی تھی کہ «Neue Rheinische Zeitung» کو تبصرہ‌نامہ کی صورت میں شائع کیا جائے (ہمبرگ سے ۱۸۵۰ء میں) لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس سے ہاتھ اٹھانا پڑا کیوں کہ رجعت‌پرستوں کی طرف سے سختیاں برابر بڑھتی جا رہی تھیں۔ فرانس میں جیسے ہی دسمبر ۱۸۵۱ء میں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش چل گئی، مارکس نے فوراً اس پر اپنا مقالہ ''لوئی بوناپارٹ کی اٹھارویں برومئیر،، * شائع کیا (یہ مقالہ نیو یارک سے ۱۸۵۲ء میں اور دوسرا ایڈیشن ہمبرگ سے ۱۸۶۹ء میں جنگ سے ذرا پہلے شائع ہوا)۔ ۱۸۵۳ء میں اس نے ''کولون میں کمیونسٹوں پر مقدمہ بے‌نقاب،، ایک مقالہ لکھا جو پہلے بازل سے شائع ہوا، بعد میں بوسٹن سے، اور اب پھر لیپزگ سے نکلا ہے۔

جب کولون میں کمیونسٹ لیگ کے ممبروں کو سزائیں (۱۷) ہوچکیں تو مارکس نے سیاسی ایجی‌ٹیشن سے کنارہ کر لیا اور دس سال تک خود کو ایک طرف تو اس کام کے لئے وقف کیا کہ برٹش میوزیم کی لائبریری میں سیاسی معاشیات کے مضمون پر جو بیش‌بہا خزانہ سہیا ہے اس کا مطالعہ کیا جائے، دوسری طرف اخبار (۱۸) «New-York DailyTribune» کے لئے لکھتا رہا۔ امریکی خانہ جنگی (۱۹) کے شروع ہونے تک اس اخبار میں نہ صرف یہ کہ برابر اس کے دستخطی مضامین شائع ہوتے رہے بلکہ یورپ اور ایشیا کے حالات پر شائع ہونے والے کئی خاص خاص

---

* ملاحظہ ہو اسی سلسلے کا حصہ اول، صفحات ۲۷۵ — ۱۵۳۔ (ایڈیٹر)

مضمون بھی اسی کے قلم کا نتیجہ تھے ۔ لارڈ پالمرسٹن پر جو مارکس کے قلم سے سخت حملے ہوئے اور جو برطانیہ کی سرکاری دستاویزوں کے جامع مطالع پر مبنی تھے ، وہ لندن سے پمفلت کی صورت میں بھی چھپ چکے ہیں ۔

مارکس نے جو سالہا سال معاشیات کا مطالعہ کیا اس کا پہلا ثمرہ ۱۸۵۹ء میں یہ آیا کہ '' سیاسی معاشیات کی تنقید پر '' حصۂ اول لکھا گیا (برلن سے ڈونکر کی اشاعت) ۔ یہ وہ تصنیف ہے جس میں ویلیو کے متعلق مارکسی نظریہ پہلی بار ایک ربط و تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور اسی میں زر (money) کی مارکسی تحقیق بھی شامل ہے ۔ جب اٹلی کی جنگ (۲۰) چھڑی تو مارکس نے لندن سے شائع ہونےوالے جرمن اخبار (۲۱) «Das Volk» میں بوناپارٹزم پر حملہ کیا ۔ لوئی بوناپارٹ کا ازم اس زمانے میں آزاد خیال بنا پھرتا تھا اور دبی ہوئی قومیتوں کے مکتی دانی کا روپ بھرے ہوئے تھا ۔ اس زمانے کے پروشیا کی پالیسی بھی مارکس کے قلمی حملے کی زد میں آئی جس نے یوں تو غیرجانبداری کا بھرم رکھا تھا، لیکن گڑبڑ سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں لگی ہوئی تھی ۔ اسی سلسلے میں یہ ضروری تھا کہ ہر کارل فوگٹ کو بھی نشانہ بنایا جائے جو اس وقت پرنس نپولین (عرف پلون پلون) کا فرماں بردار تھا اور لوئی نپولین سے رقم پایا کرتا تھا ، اس نے غیر جانبداری کے حق میں حتی کہ جرمنی کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ایجی‌ٹیشن پھیلایا ۔ جب یہ کارل فوگٹ نہایت نفرت‌انگیز اور عمداً جھوٹی حلف بیانیوں کا انبار مارکس کے سر پر لگا چکا تو مارکس نے '' ہر فوگٹ '' نامی ایک تحریر میں (لندن ، ۱۸۶۰ء) اس کی خبر لی ۔ اس عنوان کے تحت فوگٹ اور بوناپارٹ کی ٹولی کے ان حضرات کا بخیہ ادھیڑا گیا تھا جو تھے تو ساہراجی لیکن دکھاوے کو جمہوری بنے بھرتے تھے ۔ اندرونی اور بیرونی شہادتوں کی بنا پر فوگٹ کو دسمبری سلطنت کی طرف سے رشوتیں وصول کرنے کا مجرم قرار دیا گیا تھا ۔ اس کی تصدیق ہوئی دس سال بعد : بوناپارٹ کے حوالی موالی کی جو فہرست ۱۸۷۰ء میں تویلری کے محل (۲۲) سے برآمد ہوئی اور ستمبروالی حکومت (۲۳) نے جسے شائع کر دیا ، اس میں ف کے حرف کے ذیل میں یہ عبارت درج تھی : '' فوگٹ ، اگست ۱۸۵۹ء میں اس کے نام ۴۰ ہزار فرانک کی رقم جمع کی گئی '' ۔

آخر ۱۸۶۷ء میں ہمبرگ سے وہ تصنیف شائع ہوئی : کتاب ''سرمایہ، سیاسی معاشیات کا ایک تنقیدی تجزیہ ، جلد اول ،، ۔ یہ مارکس کا اصل کام تھا جو اس کے معاشی اور اشتراکی خیالات کی بنیادوں کو ، موجودہ سماج ، سرمایہ‌دارانہ طریق پیداوار اور اس کے نتائج پر اس کی نکتہ‌چینی کے خاص خاص پہلوؤں کو بہت وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے ۔ اس عہد آفریں تصنیف کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۷۲ء میں نکلا ۔ مصنف آجکل دوسری جلد کے شرح و بسط میں مصروف ہے ۔

اس عرصے میں یورپ کے مختلف ملکوں کی مزدور تحریک پھر سے اتنی قوت پکڑ گئی کہ مارکس کو اپنی ایک زمانے کی آرزوؤں کی تعمیل ہوتی نظر آنے لگی ، مطلب یہ کہ مزدوروں کی ایسی انجمن کی بنیاد ڈالی جائے جو یورپ اور امریکہ کے سب سے ترقی‌یافتہ ملکوں کا احاطہ کرلے اور یوں کہنا چاہئے کہ اشتراکی تحریک کا انٹرنیشنل کردار جسمانی طور پر خود مزدوروں کو بھی دکھا دے اور بورژوازی اور حکومتوں کو بھی جتادے ، جس سے ادھر تو محنت‌کش طبقے (پرولتاریہ) کی ہمت اور قوت بڑھے اور ادھر اس کے دشمنوں کے دلوں میں ڈر بیٹھ جائے ۔ ۲۸ ستمبر ۱۸۶۴ء کو لندن کے سینٹ مارٹن ہال میں ایک جلسہ عام پولینڈ کی حمایت میں کیا گیا جسے انھی دنوں روس نے پھر سے کچل دیا تھا اور اس جلسہ‌عام نے وہ موقع فراہم کر دیا جہاں مزدوروں کی انٹرنیشنل انجمن کا مسئلہ اٹھانا تھا اور بڑے جوش خروش سے اٹھایا گیا ۔ انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی‌ایشن کی بنیاد پڑ گئی ۔ جلسے میں ہی ایک عارضی جنرل کونسل کا انتخاب ہوا جس کا مقام لندن طے پایا ۔ اس جنرل کونسل میں اور اس کے بعد بھی ہیگ کانگرس (۲۴) تک کی تمام جنرل کونسلوں میں کارل مارکس ہی روح رواں تھا ۔ انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کی قریب قریب ہر دستاویز کا مسودہ مارکس نے ہی تیار کیا ، ۱۸۶۴ء کے تاسیسی مینی‌فسٹو سے لے کر ۱۸۷۱ء والے فرانس میں خانہ جنگی کے خطبے* تک سب میں اسی کا قلم ہے ۔ انٹرنیشنل میں مارکس کی سرگرمی بیان

---

* ملاحظہ ہو اس سلسلے کا حصۂ دوم ، صفحات ۲۲۵ — ۱۶۰ ۔ (ایڈیٹر)

کرنی ہو تو اس انجمن کی پوری تاریخ لکھنی ہوگی جو بہر حال آج بھی یورپی مزدوروں کی یادوں میں محفوظ چلی آتی ہے۔

پیرس کمیون (۲۵) کے زوال نے انٹرنیشنل کو ایک عجب گو مگو کی حالت میں پہنچا دیا۔ وہ ایسے وقت میں یورپی تاریخ کے منظر پر نمایاں ہوئی تھی جب ہر جگہ سے اس کو کامیاب عملی کارروائی کے امکان سے خارج کر دیا گیا۔ جن واقعات نے اسے ساتویں عظیم طاقت کے مقام تک اٹھایا تھا وہی اس کی راہ میں حائل ہو گئے تھے کہ وہ اپنی جنگی قوتوں کو حرکت میں لا کر انھیں عمل کے میدان میں نہ اتارے، ورنہ شکست بھی لازمی ہے اور سالہا سال کے لئے مزدور تحریک کی پسپائی کا بھی سامنا ہے۔ ایک اور مشکل یہ آ پڑی کہ مختلف سمتوں سے ایسے عناصر اپنے آپ کو آگے بڑھانے لگے جو انٹرنیشنل ایسوسی‌ایشن کی یکا یک چمکی ہوئی شہرت سے خود فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھے، ذاتی حیثیت بنانے اور اپنی غرض پوری کرنے کی خاطر آگے آئے تھے۔ انھیں نہ تو انٹرنیشنل کی پوزیشن کی صحیح معلومات تھی نہ اس کا کچھ لحاظ تھا۔ ایسے وقت کوئی معرکے کا فیصلہ کرنا ضروری تھا۔ اس بار بھی مارکس نے ہی یہ فیصلہ کیا اور ہیگ کانگرس میں اسے منظور بھی کرا لیا۔ انٹرنیشنل نے ایک باوقار ریزولیوشن پاس کرکے باکونین کے حامیوں کی تمام حرکتوں کی ذمہ‌داری سے اپنا دامن پاک کر لیا۔ انھی لوگوں نے سارے نامعقول اور بےلگام عناصر کے گڑھ بنا رکھے تھے۔ اس خیال سے کہ عام رجعت‌پرستی کے پیش نظر انٹرنیشنل سے جو بڑھتے ہوئے تقاضے کئے جا رہے تھے، ان تقاضوں کا پورا کرنا محال ہو گیا تھا، اور لگاتار قربانیوں میں مزدوروں کی شہ‌رگ کا لہو بہائے بغیر اپنے عملی وجود کو بچا کر رکھنے کے خیال سے، انٹرنیشنل نے جنرل کونسل کو یورپ چھوڑ کر امریکہ منتقل کر دینے میں وقتی طور پر خود کو منظر عام سے ہٹا لینے کا فیصلہ کر دیا۔ نتیجوں سے ثابت ہو گیا کہ یہ فیصلہ کس قدر صحیح تھا جس پر ان دنوں اور بعد میں بھی بڑی لے دے ہوتی رہی۔ ایک تو یہ کہ اس فیصلے نے تب اور اس کے بعد ان تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا جو انٹرنیشنل کے نام پر ماردھاڑ کے ہنگامے (putsches) برپا کرنے کی خاطر کی جارہی تھیں۔ دوسرے یہ بھی کہ مختلف ملکوں

کی اشتراکی مزدور پارٹیوں کے مسلسل میل ملاپ اور ربط ضبط نے ثابت کر دیا تھا کہ تمام ملکوں کے پرولتاریوں کے مفاد میں یگانگی اور یک‌جہتی کا شعور جو انٹرنیشنل نے جگا دیا ہے، وہ بہرحال اپنی تاثیر دکھاتا رہے گا، چاہے انٹرنیشنل کا وہ رسمی سمبندھ برقرار نہ رہے جو بحالات موجودہ ایک بندھن بن کر رہ گیا تھا۔

ہیگ کانگرس سے نمٹنے کے بعد آخر مارکس کو امن و راحت کا وہ زمانہ پھر میسر آیا ہے جس میں نظریاتی کام کا سلسلہ آگے بڑھا سکے اور امید رکھنی چاہئے کہ بہت عرصہ گزرنے سے پہلے ہی وہ کتاب ''سرمایہ،، کی دوسری جلد اشاعت کے لئے تیار کر دے گا۔

ایسی بہت سی دریافتیں ہیں جن کی بدولت مارکس نے علم کی لوح پر اپنا نام نقش کر دیا ہے۔ ہم ان میں سے یہاں صرف دو کا ذکر کریں گے۔

اول تو وہ انقلاب جو مارکس نے عالمی تاریخ کے پورے نظریے میں برپا کر دیا۔ اس سے پہلے تاریخ کو دیکھنے کی تہہ میں یہ تصور کارفرما تھا کہ جتنی کچھ تاریخی تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کے اسباب تلاش کرنے کے لئے لوگوں کے بدلتے ہوئے خیالات پر نظر ڈالنی چاہئے اور یہ کہ جتنی بھی تاریخی تبدیلیاں ہوئی ہیں ان میں سیاسی تبدیلیاں سب سے اہم ہیں اور وہی بالآخر پوری تاریخ پر حاوی رہتی ہیں۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا تھا کہ ایسے خیالات آدمی کے ذہن میں کہاں سے آجاتے ہیں اور سیاسی تبدیلیوں کے اصل محرک اسباب کیا ہوتے ہیں۔ ادھر کچھ عرصے سے فرانسیسی اور بعض انگریزی مؤرخین میں یہ ایک تازہ رو چلی اور وہ اس یقین کے آگے جھک گئے کہ کم‌از کم قرون وسطی سے اب تک پوری تاریخ کی تہہ میں یہ قوت کارفرما رہی ہے کہ اٹھتی ہوئی بورژوازی نے جاگیردار اشرافیہ سے سماجی اور سیاسی اقتدار چھیننے کے لئے ٹکر لی۔ مارکس نے اب یہ ثابت کر دیا کہ پہلے کی تمام تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے اور یہ کہ اب تک جتنی بھی تہہ در تہہ اور پیچ در پیچ سیاسی کشمکشیں چلتی رہی ہیں، ان کی جڑبنیاد میں ایک ہی مسئلہ تھا کہ سماجی طبقے اپنے معاشرتی اور سیاسی اقتدار کی خاطر مقابلہ کرتے تھے؛ پرانے طبقے اس پر بضد رہتے کہ اپنا غلبہ ہاتھ سے نہ

جانے دیں اور نئے ابھرتے ہوئے طبقے اس پر کمربستہ ہوتے کہ ان سے اقتدار چھین لیں۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ ان طبقوں کی اصل کیا ہے؟ ان کے مسلسل وجود کا راز کیا ہے؟ وہ خاص مادی حالات، جسمانی طور پر محسوس حالات جن میں کوئی بھی سماج تاریخ کے ایک مخصوص دور میں اپنی گزر بسر کا سامان تیار کرتا ہے اور اس کا لین دین کرتا ہے۔ قرون وسطی میں جاگیرداری اقتدار کا پایہ اس پر جما ہوا تھا کہ چھوٹی چھوٹی کاشتکار برادریوں کی اپنی کام چلاؤ معیشت تھی جس میں یہ لوگ اپنی ضرورت کا تقریباً تمام سامان آپ ہی پیدا کر لیا کرتے تھے اور لین دین برائے نام ہوتا تھا، ہتھیاربند امیروں کی طرف سے ان کو باہر کے حملے سے امان ملتی تھی، قومی یا کم از کم سیاسی کڑیاں جڑی رہتی تھیں۔ جب دیہات سے قصبے اور شہر ابھرے، انھی کے ساتھ دستکاری اور کاروباری گرم بازاری آئی، شروع میں اندرونی حدوں میں، اور آگے چل کر سرحد پار لین دین بڑھا، تو شہری بورژوازی نے ہاتھ پاؤں نکالے اور وسطی صدیوں میں ہی اشرافیہ یا امیرزادوں سے لڑبھڑ کر اپنی یہ مراد پا لی کہ اسے بھی جاگیرداری نظام میں خاص جاگیری رتبہ نصیب ہوا کرے۔ بعد میں جب یورپ سے باہر کی دنیا کا پتہ چلا تو پندرھویں صدی کے وسط سے جتنا وقت گزرتا گیا بورژوازی کو دور دور تک کاروبار کے پھیلاؤ کا میدان ملتا گیا اور اس کی صنعت کو اور سہمیز لگی؛ جو زیادہ اہم شاخیں تھیں، ان میں دستکاری کی جگہ کارخانہ‌داری آتی گئی، اور فیکٹری کے پیمانے پر کام ہونے لگا جو اور آگے بڑھا تو بڑے پیمانے کی صنعت میں تبدیل ہو گیا؛ کیوں کہ پچھلی صدی کی ایجادوں، خاص کر بھاپ کے انجن نے بڑے پیمانے کی صنعت کی راہ کھول دی تھی۔ بڑے پیمانے کی صنعت کی باری آئی تو اس نے ٹریڈ پر یوں اثر ڈالا کہ پچھڑے ہوئے ملکوں میں جسمانی محنت مشقت کو بےدخل کر دیا اور زیادہ ترقی‌یافتہ ملکوں میں آجکل کے رسل و رسائل کے نئے ذریعے پیدا کر دئے، جیسے بھاپ کے انجن، ریلوے، تار برقی۔ چناں‌چہ بورژوازی اپنی مٹھی میں زیادہ سے زیادہ سماجی دولت بھی دباتی گئی اور سماجی طاقت بھی، لیکن ایک عرصہ گزر گیا اور سیاسی اختیارات اس کے ہاتھ نہ آئے، وہ ابھی تک امیرزادے شرفا کے قبضے میں اور اس بادشاہی کے ہاتھ

میں تھے جس کی پشت پر یہ سردار کھڑے تھے۔ آخر ایک مرحلے پر پہنچ کر، جو فرانس میں انقلاب عظیم کے بعد آیا، بورژوازی نے سیاسی اقتدار پر بھی ہاتھ ڈال دیا اور اب وہ پرولتاریہ (صنعتی مزدوروں) اور چھوٹی حیثیت کے کسانوں پر ایک حاکم طبقہ بن گئی۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو تاریخ انسانی کے تمام مظاہر انتہائی سادہ طریقے سے سمجھے اور سمجھائے جاسکتے ھیں بشرطے کہ سوسائٹی کی خاص معاشی اقتصادی حالت کا اچھا خاصا علم ھو، جو سچ پوچھیے تو ھمارے پیشہور مؤرخین میں سرے سے ناپید ھے۔ اور اسی طرح ھر ایک تاریخی دور کے تصورات اور خیالات کو لیا جائے تو نہایت آسانی سے زندگی کے معاشی حالات میں اور اس زمانے کے سماجی اور سیاسی رشتوں میں اندرونی ربط دکھایا جاسکتا ھے کہ یہ رشتے بھی ان معاشی حالات سے ھی فیصل ھوتے ھیں۔ تاریخ کو پہلی بار اس کی اصل بنیاد پر کھڑا کیا گیا؛ یہ سامنے کی بات تھی، اگرچہ پہلے کبھی اس پر نظر نہیں گئی کہ آدمی پہلے کھائے گا، پیے گا، سر چھپانے اور تن ڈھکنے کا ٹھکانا کرے گا، اس کے لئے کام کرنا ھوگا، تب کہیں جاکر غلبے یا اقتدار کے لئے لڑنے کی سوجھے گی، سیاست، مذھب اور فلسفے وغیرہ میں سر کھپائے گا — یہ سامنے کی بات آخر اپنے تاریخی قدوقامت کے ساتھ نمودار ھو گئی۔

تاریخ کا یہ نیا تصور اشتراکی نظریات کے لئے اولین اھمیت کا مالک تھا۔ اس نے یہ دکھا دیا کہ آج تک کی جتنی تاریخ ھے وہ طبقوں کی تناتنی اور طبقاتی کشمکش میں چلتی رھی ھے، ھمیشہ حاکم اور محکوم کا وجود رھا، لوٹنے اور لوٹے جانےوالے طبقے باقی رھے اور بنی نوع انسان کی بھاری اکثریت جان لیوا محنت مشقت اور تھوڑی سی راحت کی زندگی پر سدا سے مجبور رکھی گئی۔ ایسا کیوں ھے؟ وجہ سیدھی سی یہ ھے کہ بنی نوع انسان کی ترقی کے جتنے مرحلے اب تک گزرے ھیں ان میں پیداوار کو اتنی کم ترقی ھوئی کہ تاریخی اٹھان صرف اسی تناتنی کی صورت میں ھوسکتی تھی، جب تاریخی ترقی مجموعی طور پر ایک چھوٹی سی صاحب حیثیت اقلیت کی سرگرمی کے ذمے تھی، حالاں کہ عام لوگ اس محنت مشقت میں لگے رھے جس سے وہ تنگی ترشی کے ساتھ اپنی گزر اوقات کا سامان اور صاحب حیثیت کا بڑھتا ھوا سامان راحت تیار کر

سکیں ۔ تاریخ کی یہی چھان‌بین جو اس رخ سے اب تک کے طبقاتی اقتدار کی ایک قدرتی اور معقول تشریح پیش کرتی ہے ورنہ صرف آدمی کی شیطنت ہی سے تشریح ممکن رہ جاتی ، یہی چھان‌بین اتنا اور سجھا دیتی ہے کہ آج کے زمانے میں جب پیداواری طاقتیں بڑھتے بڑھتے اس انتہا کو پہنچ چکی ہیں ، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو حاکم و محکوم میں ، لوٹنے اور لوٹے جانےوالے میں تقسیم کرنے کا آخری حیلہ بہانہ بھی باقی نہیں رہا — جو ملک نہایت ترقی‌یافتہ ہیں ، ان میں تو کم از کم اس بہانے کی کوئی گنجائش نہیں رہی؛ اور یہ بھی کہ حاکمانہ اختیار رکھنےوالی بورژوازی اپنا تاریخی مشن پورا کر چکی ہے، اب وہ سماج کی رہنمائی کرنے کے قابل نہیں رہی بلکہ پیداوار کی ترقی میں اور الٹا حائل ہونے لگی ہے ، جیسا کہ بار بار کے کاروباری بحرانوں سے ، خاص کر پچھلی زبردست صنعتی تباہی (collapse) سے اور تمام ملکوں میں صنعت کی گری ہوئی حالت سے ثابت ہو چکا ہے؛ اور یہ بھی کہ تاریخی رہنمائی کی باگ اب پرولتاریہ کے ہاتھ میں ، اس طبقے کے ہاتھ میں آ گئی ہے جو سماج میں اپنی پوزیشن کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ ہر طرح کی طبقاتی حکمرانی کو ، فرماں برداری کو اور لوٹ کھسوٹ کو مٹا کر ہی اپنے آپ کو اس عذاب سے نجات دلاسکے ؛ اور یہ بھی کہ سماجی پیداواری طاقتیں جو بورژوازی کے قابو سے باہر جا چکی ہیں اس انتظار میں ہیں کہ متحدہ پرولتاریہ ان کی باگ‌ڈور سنبھالے تاکہ وہ ایسی صورت حال قائم کر دے جس میں سماج کا ہر ایک فرد بشر نہ صرف یہ کہ پیداوار کے عمل میں شرکت کے قابل ہو جائے بلکہ سماجی دولت کی تقسیم اور اس کے انتظام میں بھی برابر شریک ہو ۔ اس سے ، پوری پیداوار کی منصوبہ‌بند کارروائی کی بدولت، سماجی پیداواری طاقتیں اتنی بڑھ جائیں‌گی ، ان کا حاصل اتنا کچھ ہو جائےگا کہ ہر شخص کو اس کی تمام معقول و مناسب ضروریات کی تسکین کا سامان میسر آنا بھی یقینی ہو اور اس کا پیمانہ بھی برابر بڑھتا جائے ۔

مارکس کی دوسری اہم دریافت یہ ہے کہ سرمائے اور محنت کے رشتے کی ایک ایک کڑی کھول کر رکھ دی ، دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ مارکس نے ثابت کرکے دکھا دیا کہ موجودہ سوسائٹی کے

چوکھٹے میں، سرمایہ‌دارانہ طریق پیداوار کے سائے میں سرمایہ‌دار کے ہاتھوں مزدور کا استحصال کیا جاتا ہے۔ جس دن سے سیاسی معاشیات نے یہ کلیہ پیش کیا تھا کہ محنت ہی تمام دولت اور تمام ویلیو کا سرچشمہ ہے، تبھی سے یہ سوال اٹھنا لازمی تھا کہ: پھر اس حقیقت کو کیسے گلے اتارا جائے کہ مزدوری پر کام کرنےوالے کو اپنی محنت سے پیدا کی ہوئی پوری ویلیو وصول نہیں ہوتی بلکہ اس ویلیو کا ایک حصہ سرمایہ‌دار کے حوالے کرنا پڑتا ہے؟ بورژوا ماہرین معاشیات اور اشتراکی دونوں نے اپنا اپنا زور لگایا کہ اس سوال کا علمی لحاظ سے تسلی‌بخش جواب نکال کر لائیں، لیکن کچھ بات نہ بنی، یہاں تک کہ مارکس اس کا حل لے کر سامنے آیا۔ اور حال یوں ہے کہ: عہد حاضر کے سرمایہ‌دارانہ طریق پیداوار میں ہی دو سماجی طبقوں کا وجود پہلے سے طے ہے — ایک طرف تو سرمایہ‌داروں کا طبقہ جن کے قبضے میں ذرائع پیداوار بھی ہیں اور گزر بسر کے ذریعے بھی، دوسری طرف پرولتاریوں کا طبقہ جو اس قبضۂ مالکانہ سے محروم، مگر صرف ایک مال یعنی اپنی قوت محنت کا مالک ہے فروخت کرنے کے لئے۔ چناں‌چہ ان پرولتاریوں کو اپنی قوت محنت بیچنی پڑتی ہے تاکہ گزر اوقات کا سامان حاصل کر سکیں۔ کسی بھی مال کی ویلیو چوں‌کہ محنت کی اس مقدار سے طے پاتی ہے جو سماجی طور پر اس مال کی تیاری میں لگنی ضروری ہو، بلکہ اس مال کے پھر سے تیار ہونے میں بھی کھپتی ہو، لہذا اوسط درجے کے ایک آدمی کی ایک دن، ایک مہینے یا ایک سال کی قوت محنت کی ویلیو بھی محنت کی اس مقدار سے طے پائےگی جو اس قوت محنت کو ایک دن، ایک مہینے یا ایک سال کے دوران باقی رکھنےوالے گزر اوقات کے ضروری سامان کی تیاری میں کھپ جاتی ہو۔ یہاں ہم فرض کرتے ہیں کہ کسی مزدور کی ایک دن کی گزر بسر کے لئے جو سامان درکار ہوتا ہے اس کی تیاری میں چھ گھنٹے کی محنت لگتی ہے، یا اسی کو یوں کہہ لیں کہ اس سامان میں جس قدر محنت کھپی ہے وہ چھ گھنٹے کی محنت کی مقدار کے برابر ہے۔ تو ایک دن کی قوت محنت کی ویلیو اتنی رقم میں ظاہر ہوگی جو رقم اپنے اندر چھ گھنٹے کی محنت رکھتی ہے۔ آگے ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ سرمایہ‌دار جس نے اس مزدور کو

کام پر لگایا تھا ، اتنی رقم اسے معاوضے میں ادا کر دیتا ھے ، یعنی اس کی قوت محنت کی پوری ویلیو دے دیتا ھے ۔ اب اگر مزدور نے دن کے چھہ گھنٹے سرمایہ‌دار کے لئے کام کیا تو اس نے سرمایہ‌دار کے پورے دام چکا دئے کیوں کہ چھہ گھنٹے کی محنت کے بدلے چھہ گھنٹے دے دئے، اس طرح سرمایہ‌دار کو کچھ بھی وصول نہ ھوا ۔ اور اب وہ اس معاملے کو بالکل دوسری طرح سے دیکھے گا ۔ سرمایہ‌دار کہتا ھے : میں نے اس مزدور کی قوت محنت چھہ گھنٹے کے لئے نہیں بلکہ پورے دن کے لئے خریدی ھے ۔ پس وہ ، جیسا بھی موقع ھو ، اس سے آٹھ ، دس ، بارہ ، چودہ یا اور زیادہ گھنٹے کام لیتا ھے تاکہ چھہ سے اوپر ساتویں ، آٹھویں یا بعد کے گھنٹوں کا حاصل بےمعاوضہ محنت سے وصول ھو اور وہ سیدھا سرمایہ‌دار کی ھی جیب میں جائے ۔ اس طرح سے وہ مزدور جو سرمایہ‌دار کی خدمت کرتا ھے ، نہ صرف یہ کہ اپنی قوت محنت کی ویلیو نکال کر دے دیتا ھے جس کا معاوضہ اسے مل گیا ، بلکہ اوپر سے ایک فالتو ویلیو (قدر زائد) بھی پیدا کر دیتا ھے جسے شروع میں تو سرمایہ‌دار ھتھیاتا ھے لیکن آگے چل کر مقررہ معاشی قاعدوں کے مطابق وہ پورے سرمایہ‌دار طبقے میں بٹ جاتی ھے اور یہی اصل جمع پونجی ھوتی ھے جس میں سے زمین کا کرایہ ، منافع اور بچا کر رکھا ھوا سرمایہ نکلتا ھے ، مطلب یہ کہ وہ تمام دولت اسی میں سے آتی ھے جسے محنت نہ کرنےوالے طبقے یا تو صرف کرتے ھیں یا ذخیرہ کر لیتے ھیں ۔ اس سے ثابت ھوا کہ آجکل کے سرمایہ‌داروں کے ھاتھوں دولت بنانے میں دوسروں کی بےمعاوضہ محنت ھتھیا لینے کا عمل عین اسی طرح موجود ھے جیسے غلاموں کے آقا یا جاگیردار اپنے غلاموں کی محنت ھتھیایا کرتے تھے، اور یہ کہ لوٹ کھسوٹ کی یہ جتنی بھی شکلیں ھیں ان میں اگر فرق کیا جا سکتا ھے تو صرف ان طور طریقوں اور چالوں سے جو بے معاوضہ محنت ھتھیانے میں کام آتی ھیں ۔ مارکس کی اس تشریح نے مالک طبقوں کے ان ریاکارانہ بیانوں میں سچائی کی کوئی رمق نہیں چھوڑی جو اس بات کے مدعی تھے کہ عہد حاضر کے سماجی نظام میں حق و انصاف ، فرائض اور حقوق کی مساوات اور مفادوں کی عام ھم‌آھنگی کا بول بالا ھے ۔ آج کی سرمایہ‌دارانہ سوسائٹی کے چہرے سے نقاب اتار کر دکھا دیا کہ یہ

بھی ایک چھوٹی سی اور سکڑتی ہوئی اقلیت کے ہاتھوں آبادی کی بہت بڑی اکثریت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا ایک زبردست ڈھانچہ ہونے میں اپنے پیشروؤں سے کچھ کم نہیں ہے۔

آج کا سائنسی سوشلزم انھی دو اہم نکتوں پر مبنی ہے۔ کتاب ''سرمایہ،، کی دوسری جلد میں یہ دونوں نکتے اور ایسے ہی کئی اور انکشاف، جن کا تعلق سماج کے سرمایہ‌دارانہ نظام سے ہے، آگے بڑھائے جائیں گے، انھی کے ساتھ سیاسی معاشیات کے وہ پہلو بھی، جن کا ذکر پہلی جلد میں نہیں آسکا، بڑی چھان پھٹک سے گزر کر سامنے آئیں‌گے۔ مارکس کو صحت و سلامتی نصیب ہو تو یقین ہے کہ وہ عنقریب دوسری جلد پریس کے لئے تیار کر دے‌گا۔

اینگلس نے جون ۱۸۷۷ء میں لکھا تھا۔ ۱۸۷۸ء میں شائع ہونے‌والے جرمن سالنامے «Volks-Kalender» میں پہلی بار برونشویگ سے شائع ہوا۔

اصل کے مطابق ترجمہ۔

فریڈرک اینگلس

یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم

۱۸۹۲ء کے انگریزی ایڈیشن کے لئے مخصوص مقدمہ

یہ چھوٹی سی کتاب (۲۶) دراصل ایک بڑی کتاب کا حصہ ہے۔ ۱۸۷۵ء کے لگ بھگ ڈاکٹر ڈیورنگ نے، جو برلن یونیورسٹی کا لکچرر ہے، اچانک خاصے زورشور کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ وہ سوشلزم کا پیرو ہو گیا ہے اور اس نے جرمن پبلک کو نہ صرف ایک تفصیلی سوشلسٹ نظریہ دیا بلکہ سماج کی تنظیم نو کے لئے ایک عملی منصوبہ بھی پیش کیا۔ قدرتی طور پر اس کی اپنے پیش روؤں سے ٹکر ہوگئی۔ اور اس نے سب سے بڑھ کر مارکس کو اپنے تمام تر غیض و غضب کا شکار بنا کر ان کی عزت افزائی کی۔

یہ واقعہ ٹھیک اس وقت پیش آیا جب جرمنی میں سوشلسٹ پارٹی کے دو حصے — آئزی‌ناخ والے اور لاسال‌والے (۲۷) — متحد ہوئے ہی تھے اور اس طرح نہ صرف پارٹی کی طاقت میں بےاندازہ اضافہ ہوا تھا، بلکہ اس سے بڑھکر یہ کہ اس میں اپنی تمام‌تر طاقت کو مشترک دشمن کے خلاف استعمال کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوئی تھی۔ جرمنی میں سوشلسٹ پارٹی بہت تیزی سے ایک ذی اثر جماعت بن رہی تھی لیکن اس کو ایک طاقت بنانے کے لئے اولین شرط یہ تھی کہ اس نئے حاصل کئے ہوئے اتحاد پر کوئی آنچ نہ آئے۔ اور ڈاکٹر ڈیورنگ نے کھلم

کھلا اپنے چاروں طرف ایک گٹ بنانا شروع کیا جو مستقبل کی ایک علیحدہ پارٹی کا مرکزی نقطہ بن سکے۔ لہذا ہمارے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ خواہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں لیکن یہ چیلنج منظور کر لیں اور میدان کارزار میں اتر پڑیں۔

لیکن یہ سارا معاملہ بہت زیادہ مشکل نہ سہی، پھر بھی طول طویل اور پیچیدہ تو ضرور تھا۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں ہم جرمن لوگ ایک نہایت ہی وزنی Gründlichkeit کے مالک ہیں، اسے چاہے گمبھیر گہرائی کہئے یا گہری گمبھیرتا سمجھئے۔ جب کبھی ہم میں سے کوئی شخص اپنے خیال میں کوئی نیا نظریہ پیش کرتا ہے تو پہلے وہ اسے ایک تفصیلی اور ہمہ گیر نظام کی شکل ضرور دیتا ہے۔ وہ یہ ضرور ثابت کرتا ہے کہ منطق کے اولین اصول اور کائنات کے بنیادی قوانین دونوں چیزیں ازل سے محض اسی مقصد کی خاطر موجود تھیں کہ آخرکار اس سب سے بہتر اور نئے دریافتشدہ نظرئے کی سمت لے جائیں۔ اور اس لحاظ سے ڈاکٹر ڈیورنگ قومی معیار پر بالکل پورا اترا۔ ایک مکمل ''نظام فلسفہ،، — ذہنی، اخلاقی، فطری اور تاریخی، ایک مکمل ''سیاسی معاشیات اور سوشلزم کا نظام،، اور اس کے علاوہ ''سیاسی معاشیات کی تنقیدی تاریخ،، — یہ بڑے سائز کی تین موٹی موٹی جلدیں ہیں، خارجی اور اندرونی دونوں لحاظ سے وزنی اور دلائل کے لامتناہی سلسلے پر مشتمل، جو عام طور پر تمام پہلے فلسفیوں اور ماہرین معاشیات کے خلاف اور خصوصاً مارکس کے خلاف جمع کئے گئے ہیں — یعنی دراصل مکمل طور پر ''سائنس میں انقلاب،، لانے کی کوشش — یہ تھیں وہ چیزیں جن سے مجھے عہدہ برآ ہونا تھا۔ مجھے تصور زمان ومکان سے لے کر دو دھاتی اصول (Bimetallism) (۲۸) تک، مادے اور حرکت کی ابدیت سے لے کر اخلاقی تصورات کی فانی فطرت تک، ڈارون کے فطری انتخاب سے لے کر مستقبل کے سماج میں نوجوانوں کی تعلیم تک، ہر ممکن موضوع پر بحث کرنی تھی۔ بہرحال میرے مدمقابل کی باقاعدہ اور منظم ہمہ گیری نے مجھے اس کا موقع دیا کہ میں اس کے خلاف اپنی بحث میں ان تمام مختلف موضوعات پر اپنے اور مارکس کے نقطۂ نظر کی پہلے سے زیادہ مربوط طریقے سے مزید تشکیل و تکمیل کروں۔ اور یہی وہ سب

سے بڑا اور اہم سبب تھا جس کی بنا پر مجھے یہ کام اپنے ذمے لینے پر آمادہ ہونا پڑا ، حالانکہ اور لحاظ سے یہ ایک ناپسندیدہ کام تھا ۔

میرا جواب سب سے پہلے تو سوشلسٹ پارٹی کے سب سے بڑے آرگن ، لائپزگ شہر کے ''فورواڑٹس،، (۲۹) میں کئی سلسلہ‌وار مضامین کی شکل میں شائع ہوا اور بعد میں کتابی شکل میں «Herrn Eugen Dührings Umwälzung der Wissenschaft» (''مسٹر ڈیورنگ کا سائنس میں انقلاب،،) کے نام سے ۔ اور اسی کا دوسرا ایڈیشن زورخ میں ۱۸۸۶ ء میں شائع ہوا۔

اپنے دوست پول لافارگ کے کہنے سے، جو اب فرانسیسی ایوان نمائندگان میں لیل کے نمائندے ہیں ، میں نے اس کتاب کے تین ابواب کتابچے کی شکل میں ترتیب دئے اور اس کتابچے کا ترجمہ کرکے انہوں نے اسے ۱۸۸۰ ء میں «Socialisme utopique et socialisme scientifique» (یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم) کے عنوان سے شائع کیا ۔ اس فرانسیسی ٹکسٹ سے ایک پولستانی اور ایک ہسپانوی ایڈیشن تیار کیا گیا ۔ ۱۸۸۳ ء میں ہمارے جرمن دوستوں نے اس کتابچے کو اس کی اصلی زبان میں شائع کیا ۔ اس کے بعد جرمن اصل کے مطابق اطالوی، روسی ، ڈینش ، ولندیزی اور رومانیائی ترجمے بھی چھپ چکے ہیں ، اور اب یہ چھوٹی سی کتاب ، اس موجودہ انگریزی ایڈیشن سمیت ، دس زبانوں میں پڑھی جا رہی ہے ۔ جہاں تک مجھے علم ہے اور کوئی سوشلسٹ تصنیف یہاں تک کہ ہمارے ۱۸۴۸ ء میں لکھے ہوئے ''کمیونسٹ مینی‌فسٹو،، یا مارکس کی کتاب ''سرمایہ،، کا بھی اتنی متعدد بار ترجمہ نہیں ہوا ہے ۔ جرمنی میں اس کے چار ایڈیشن چھپ چکے ہیں جو کل ملا کر بیس ہزار نسخوں پر مشتمل ہیں ۔

اس کا ضمیمہ ''مارک،، (۳۰) اس غرض سے لکھا گیا تھا کہ جرمن سوشلسٹ پارٹی کی صفوں میں ، جرمنی میں زمین کی ملکیت کے ارتقا کی تاریخ کے متعلق ابتدائی معلومات پھیلائی جا سکیں ۔ یہ کام اس وقت اور بھی زیادہ ضروری معلوم ہوتا تھا جبکہ اس پارٹی نے شہر کے محنت کشوں کو اپنے اندر جذب کرنے کا کام تقریباً ختم کر لیا تھا اور جبکہ اسے کھیت مزدوروں اور کسانوں کی ذمہ‌داری لینی تھی ۔ یہ ضمیمہ

ترجمے کی عبارت میں شامل کر لیا گیا ہے کیونکہ زمین کے حق ملکیت کی ان اولین شکلوں سے ، جو جرمن قبیلوں میں مشترک تھیں ، اور ان کے زوال کی تاریخ سے انگلستان میں تو لوگ جرمنی سے بھی کم واقف ہیں ۔ میں نے ٹکسٹ کو اس کی اصلی شکل کے مطابق ہی رہنے دیا اور اس مفروضے کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے جو حال ہی میں میکسم کووالیفسکی نے پیش کیا ہے، جس کے مطابق قابل کاشت زمینیں اور چراگاہیں مارک کے اراکین میں تقسیم ہونے سے پہلے یہ صورت حال تھی کہ ایک وسیع سرقبیلی خاندانی برادری ، جس میں کئی پشتیں شامل ہوتی تھیں (جس کی مثال آج بھی جنوبی سلافی زادروگا سے ملتی ہے) ، ساجھے کے کھاتے پر ان زمینوں کی کاشت کرتی تھی ، اور بعد میں صرف اسی وقت تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا جبکہ برادری بہت پھیل گئی اور ساجھے کے کھاتے کے انتظام کے لئے ضرورت سے زیادہ بڑی اور قابو سے باہر ہو گئی (۳۱) ۔ کووالیفسکی غالباً بالکل ٹھیک کہتا ہے لیکن یہ معاملہ ابھی زیرغور (sub judice) ہے ۔

اس تصنیف میں جتنی نئی معاشی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں وہ سب مارکس کی تصنیف ''سرمایہ،، کے انگریزی ایڈیشن میں استعمال شدہ اصطلاحات کے مطابق ہیں ۔ ہم ''جنس تبادلہ کی پیداوار،، اس معاشی دور کو کہتے ہیں جس میں اشیا محض پیدا کرنے والے کے استعمال کے لئے ہی نہیں بلکہ تبادلے کی غرض سے بھی پیدا کی جاتی ہیں — یعنی جنس تبادلہ کی حیثیت سے ، استعمالی اقدار کی حیثیت سے نہیں ۔ یہ دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب تبادلے کے لئے پیداوار کا آغاز ہوا تھا اور ہمارے زمانے تک قائم ہے ۔ یہ صرف سرمایہ‌دار طریق پیداوار کے تحت ہی پوری نشو و نما پاتا ہے ، یعنی صرف انہیں حالات کے تحت جب سرمایہ‌دار — ذرائع پیداوار کا مالک — اجرت پر مزدوروں کو نوکر رکھتا ہے ، جو اپنی قوت محنت کے سوا اور تمام ذرائع پیداوار سے محروم ہوتے ہیں ، اور اپنی لاگت اور اشیائے پیداوار کی قیمت فروخت کے فرق سے جو منافع حاصل ہوتا ہے اسے اپنی جیب میں ڈالتا ہے ۔ ہم قرون وسطی سے اب تک صنعتی پیداوار کی تاریخ کو تین دوروں میں تقسیم کرتے ہیں : (۱) دستکاری ، چھوٹے چھوٹے استاد

کاریگر اور چند اجرت یافتہ کاریگر اور شاگرد مل کر کام کرتے ہیں ، اس میں ہر مزدور مکمل چیز تیار کرتا ہے ۔ (۲) کارخانہ‌داری ، جہاں کاریگروں کی بڑی تعداد جو ایک بڑے کارخانے میں جمع ہوتی ہے ، تقسیم محنت کے اصول پر مکمل شے تیار کرتی ہے ، ہر مزدور پورے کام کا صرف ایک حصہ کرتا ہے اور اس طرح تیارشدہ پیداوار باری باری سب لوگوں کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے ۔ (۳) جدید صنعت ، جس میں تیارشدہ شے قوت سے چلنے والی مشینوں کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے اور جہاں مزدور کا کام میکانکی عامل (مشین) کے کاموں کی نگرانی اور اصلاح تک محدود ہے ۔

مجھے بخوبی احساس ہے کہ اس تصنیف کے نفس مضمون پر برطانوی پبلک کے ایک خاصے بڑے حصے کو اعتراض ہوگا ۔ لیکن اگر ہم یورپی لوگ برطانوی ”سفیدپوشوں“ کے تعصبات کی طرف ذرہ برابر دھیان بھی دیتے تو ہماری جو حالت اس وقت ہے اس سے بھی بدتر ہوتی ۔ یہ کتاب اس چیز کی حمایت کرتی ہے جسے ہم ”تاریخی مادیت“ کہتے ہیں اور لفظ ”مادیت“ برطانوی قاریوں کی بہت بڑی اکثریت کے لئے بڑا سامعہ خراش ہے ۔ فلسفۂ لاادریت (یا تشکیک) (۳۲) کو برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن فلسفۂ مادیت سراسر ناقابل قبول ہے ۔

لیکن اس کے باوجود سترھویں صدی سے لے کر اب تک تمام جدید فلسفۂ مادیت کا اصلی وطن انگلستان ہی رہا ہے ۔

”فلسفۂ مادیت برطانیہ عظمی کا فطری بیٹا ہے ۔ برطانوی ماہر علم کلام (۳۳) ڈنس اسکاٹس نے سوال کیا تھا کہ ’ مادے کے لئے سوچنا ممکن ہے یا نہیں ؟ ،

”اس معجزے کو بہ‌روئے کار لانے کے لئے اس نے خدا کو قادر مطلق مان کر اس کے سائے میں پناہ لی ، یعنی دینیات (۳۴) سے مادیت کا پرچار کرادیا ۔ اس کے علاوہ وہ اسمیت پسند تھا ۔ فلسفۂ اسمیت (۳۵) جو فلسفۂ مادیت کی سب سے پہلی شکل ہے ، زیادہ‌تر انگریز مادیت پرستوں کے درمیان پایا جاتا ہے ۔

”انگریزی مادیت کا حقیقی مورث اعلی بیکن ہے ۔ اس کے نزدیک طبیعی سائنس ہی واحد سچی سائنس ہے اور حواس کے تجربے پر مبنی علم

طبیعیات طبیعی سائنس کا اہم‌ترین حصہ ہے ۔ وہ اکثر انکساگورس اور اس کے homoiomeriae (۳۶) اور دیموکریتس اور اس کے سالمات (ایٹم) کو سند کے طور پر پیش کرتا ہے ۔ اس کے نزدیک حواس غلطی نہیں کر سکتے اور وہی تمام‌تر علم کا سرچشمہ ہیں ۔ تمام سائنس کی بنیاد تجربے پر ہے اور وہ حواس کے فراہم کئے ہوئے مواد کی ایک عقلی طریقۂ تحقیق سے چھان بین کرتی ہے ۔ استقرأ (جزئی مثالوں سے کل نتیجہ اخذ کرنا) ، تجزیہ ، موازنہ ، مشاہدہ اور تجربہ اس عقلی طریقے کی خاص شکلیں ہیں ۔ مادے کی بنیادی خصوصیات میں اولین اور اہم‌ترین خصوصیت حرکت ہے — حرکت صرف اپنی ریاضیاتی اور میکانکی شکل میں ہی نہیں بلکہ خاص طور پر مادے کی تحریک و تہیج کی ، حیاتی ترنگ کی اور تناؤ کی شکل میں — یا یا کب بیمے کی اصطلاح میں — مادے کے کوال (qual) * کی شکل میں ۔

” اپنے پہلے خالق بیکن ہی کی تصانیف میں فلسفۂ مادیت اپنے اندر گوناگوں اور ہمہ‌پہلو ارتقا کے بیج لئے ہوئے ہے ۔ ایک طرف تو مادہ محسوس ، شاعرانہ کشش میں لپٹا ہوا اپنی من‌موہنی مسکراہٹوں کے ذریعے انسان کے تمام‌تر وجود کو اپنی طرف کھینچتا ہوا معلوم ہوتا ہے ، اور دوسری طرف یہ بلاغت کے ساتھ تشکیل دیا ہوا نظریہ ان ناہمواریوں سے بھرپور ہے جو دینیات سے لی گئی ہیں ۔

” اپنے مزید ارتقا کے دوران میں فلسفۂ مادیت یک‌رخا ہوجاتا ہے ۔ ہوبس وہ شخص ہے جس نے بیکن کے فلسفۂ مادیت کو نظم و ترتیب

---

* کوال (qual) ایک فلسفیانہ رعایت لفظی ہے ۔ ” کوال “ کے لفظی معنی ہیں کرب ، یا ایک ایسا درد جو کسی نہ کسی قسم کے عمل پر ابھارتا ہو ۔ اسی کے ساتھ ساتھ صوفی بیمے اس جرمن لفظ میں لاطینی لفظ ” کوالیتاس “ (qualitas) کے معنی کی آمیزش بھی کر دیتا ہے ۔ اس کا ” کوال “ ایک عمل پر ابھارنےوالا اصول تھا جو باہر سے عائد ہونے والے درد کے برخلاف اپنے اثر میں آنےوالی شے ، تعلق یا شخص کے بےساختہ ، فطری ارتقا سے پیدا ہوتا تھا اور پھر خود اس ارتقا کو آگے بڑھاتا تھا ۔ (انگریزی ایڈیشن میں اینگلس کا نوٹ)

بخشی۔ حواس پر مبنی علم اب اپنی شاعرانہ شگفتگی اور دل کشی کھوبیٹھتا ہے اور ریاضی داں کے مجرد تجربے کے دائرے میں داخل ہوجاتا ہے۔ علم ہندسہ یا جیومٹری کے ملکۂ علوم ہونے کا اعلان کر دیاجاتا ہے۔ مادیت مردم بیزاری اختیار کر لیتی ہے۔ اگر مادیت کو اپنی حریف، مردم‌بیزار اور بےرنگ و نور روحانیت سے خود اسی کے میدان میں ٹکر لے کر اس پر غالب آنا ہے، تو اس کےلئے نفس کش اور رہبانیت پسند بننا لازمی ہوجاتا ہے۔ اس طرح مادیت ایک حواسی شے کے بجائے عقلی شے بن‌جاتی ہے۔ لیکن اسی وجہ سے اس میں وہ نتائج سے بےنیاز استقامت اور استواری پیدا ہو جاتی ہے جو عقل کی خصوصیت ہے۔

"ہوبس، بیکن کے جانشین کی حیثیت سے اس طرح استدلال کرتا ہے: اگر تمام تر انسانی علم کا سرچشمہ حواس ہی ہیں تو ہمارے تصورات اور خیالات عالم حقیقی کی ان پرچھائیوں کے سوا اور کچھ نہیں، جنھیں ان کی حواسی شکلوں سے محروم کردیا گیا ہو۔ سائنس بس اتنا ہی کر سکتا ہے کہ ان پرچھائیوں کو نام دے دے۔ ان میں سے کئی پر ایک ہی نام کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ ناموں کے بھی نام ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم ایک طرف تو یہ کہیں کہ تمام خیالات کی بنیاد حواس کی دنیا پر ہے اور دوسری طرف یہ کہیں کہ لفظ محض لفظ ہی نہیں بلکہ کچھ اس سے بڑھ کر ہے، اور یہ بھی کہیں کہ ان وجودوں کے علاوہ جن کو ہم اپنے حواس کی مدد سے جانتے ہیں اور جو سب کے سب انفرادی وجود ہیں، کچھ ایسے وجود بھی ہیں جو انفرادی کے بجائے عمومی کردار کے حامل ہیں، تو یہ چیز ایک تضاد کی طرف اشارہ کرےگی۔ غیرجسمانی ہیولا یا مادہ — بھی اتنی ہی مہمل چیز ہے جتنی غیرجسمانی جسم۔ جسم، ہیولا، مادہ، وجود ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں۔ خیال و فکر کو سوچنے والے مادے سے علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ دنیا کے اندر ہونے والی تمام تبدیلیوں کی تہہ میں یہی مادہ کارفرما ہے۔ لفظ "غیرمحدود" بےمعنی لفظ ہے، سوائے اس کے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ ہمارا ذہن اضافہ کرتے رہنے کے لامتناہی عمل کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چونکہ ہم صرف مادی اشیا کا ادراک اور شعور کر سکتے ہیں اس لئے ہم خدا کے وجود کے متعلق کچھ نہیں

جان سکتے ۔ صرف میرا اپنا وجود یقینی ہے ۔ ہر انسانی جذبہ ایک میکانکی حرکت ہے جس کی ایک ابتدا اور ایک انتہا ہوتی ہے ۔ اور جس چیز کو ہم خیر کہتے ہیں وہ دراصل تہیج یا جذبے کا مقصود ہے ۔ انسان بھی انہیں قوانین کا تابع ہے جن کی تابع فطرت ہے ۔ قوت اور آزادی بالکل یکساں چیزیں ہیں ۔

'' ہوبس نے بیکن کے فلسفے کو منظم تو کر دیا لیکن اس نے بیکن کے بنیادی اصول ، یعنی تمام تر انسانی علم کی بنیاد حواس کی دنیا پر ہونے کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا ۔ یہ ثبوت لاک نے اپنے '' انسانی فہم و ادراک پر ایک مضمون ،، میں پیش کیا (۳۷) ۔

'' ہوبس نے بیکن کی مادیت کے خداپرستانہ (theistic) (۳۸) تعصبات کی دھجیاں اڑا دیں ۔ کولنس ، ڈوڈویل ، کاورڈ ، ہارٹلی اور پریسٹلی نے اسی طرح ان تمام آخری دینیاتی سلاخوں کو توڑڈالا جو ابھی تک لاک کے فلسفۂ محسوسیت (۳۹) کو مقید کئے ہوئے تھیں ۔ بہر صورت عملی مادیت پسندوں کےلئے فلسفۂ الوھیت (۴۰) (Deism) مذھب سے چھٹکارا پانے کا ایک آسان طریقہ ہے ۔ ،، *

کارل مارکس نے جدید مادیت کی برطانوی اصل اور بنیاد کے متعلق اس طرح لکھا تھا ۔ اگر مارکس کی زبانی اپنے آبا و اجداد کی یہ ستائش آج انگریزوں کو پسند نہیں تو بڑے افسوس کی بات ہے ۔ بہرحال یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بیکن ، ہوبس اور لاک فرانسیسی مادیت پسندوں کے اس درخشاں مکتب فکر کے مورث اعلی ہیں جس نے ، ان تمام بحری اور بری جنگوں کے باوجود جن میں جرمن اور انگریز فرانسیسیوں کے مقابلے میں فتح یاب ہوئے تھے ، اٹھارھویں صدی کو سب سے بڑھ کر

---

* مارکس اور اینگلس «Die heilige Familie» فرینک‌فورٹ ، ۱۸۴۵ء، صفحات ۲۰۴ — ۲۰۱ ۔

مارکس اور اینگلس کی اس کتاب کا پورا نام ہے «Die Heilige Familie oder Kritik der kritischen Kritik. Gegen Bruno Bauer und Konsorten» (مقدس خاندان یا تنقیدی تنقید کی تنقید — برونو باؤیر اور کمپنی کے خلاف ۔) (ایڈیٹر)

فرانسیسی صدی بنا دیا تھا — اور یہ اس سرفرازوکامراں انقلاب فرانس سے پہلے ھی ھو گیا تھا جس کے نتائج ، ھم باھر کے لوگ ، انگلستان اور جرمنی والے ، ابھی تک قبول کرنے کی کوشش کر رھے ھیں ۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ لگ بھگ اس صدی کے وسط میں انگلستان میں بس جانےوالے ھر مہذب بدیسی کو انگلستان کے ''سفید پوش ،، متوسط طبقے کی مذھبی عصبیت اور حماقت — یا وہ چیز جسے وہ اس وقت ایسا سمجھنے پر مجبور تھا — بہت نمایاں طور پر محسوس ھوتی تھی ۔ اس وقت ھم سب مادیت‌پسند تھے یا کم از کم بہت ترقی‌یافتہ معقولی تو تھے ھی اور ھمیں یہ چیز ناقابل یقین معلوم ھوتی تھی کہ انگلستان میں تقریباً تمام تعلیم‌یافتہ لوگ ھر قسم کے ناممکن معجزات پر اعتقاد رکھیں اور صرف یہی نہیں بلکہ بک‌لینڈ اور مانٹیل جیسے ماھرین علم الارض بھی اپنے مخصوص علم کے حقائق کو اس طرح توڑیں مروڑیں کہ ان کا کتاب تخلیق * کے فرضی قصوں سے بہت زیادہ تصادم نہ ھونے پائے ۔ اور دوسری طرف ایسے لوگوں کو تلاش کرنے کے لئے جو مذھبی معاملات میں خود اپنی عقلی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی ھمت رکھتے تھے ، آدمی کو غیرتعلیم‌یافتہ لوگوں کے یا ان لوگوں کے درمیان جو اس زمانے میں ''میلی کچیلی جنتا ،، (the great unwashed) کہلاتے تھے ، محنت کشوں کے اور خصوصاً اووین کے پیرو سوشلسٹوں کے درمیان جانا پڑتا تھا ۔

لیکن اس کے بعد انگلستان ''تہذیب یافتہ ،، ھو گیا ھے ۔ ۱۸۵۱ء کی نمائش نے (۴۱) انگریزوں کی تنگ نظر خلوت پسندی کو پیام اجل سنا دیا ۔ انگلستان رفتہ رفتہ کھانے پینے ، طرز معاشرت اور خیالات ھر چیز میں بین الاقوامی بن گیا ۔ اور اس حد تک بنا کہ مجھے یہ خواھش ھونے لگی کہ کاش بعض انگریزی آداب و اطوار نے بھی یورپ میں اسی قدر کامیابی حاصل کی ھوتی جتنی بعض یورپی عادات نے یہاں کی ھے ۔ بہر حال زیتون کے تیل کی ترویج اور توسیع کے ساتھ ساتھ (جس سے ۱۸۵۱ء سے پہلے محض رئیس‌زادے آشنا تھے) مذھبی معاملات میں

---

* کتاب تخلیق — توریت کا پہلا باب ۔ (مترجم)

یورپی تشکیک‌پرستی کی مہلک ترویج و توسیع بھی آئی ۔ اور اب یہ حال ہو گیا ہے کہ فلسفۂ لاادریت اگرچہ ابھی تک کلیسائے انگلستان جتنی ''خاصے کی چیز،، تو نہیں سمجھا جاتا لیکن پھر بھی جہاں تک اس کے باعزت ہونے کا تعلق ہے وہ بپٹزم کی برابری تو ضرور ہی کرنے لگا ہے اور ''نجات فوج،، (۴۲) (Salvation Army) سے تو یقیناً اس کا مرتبہ اونچا ہو چکا ہے ۔ اور میں یہ خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان حالات کے تحت بہت سے ایسے لوگوں کو جو خلوص سے بےدینی کی اس ترقی پر افسوس اور اس کی مذمت کرتے ہیں یہ معلوم کرکے کچھ تسلی ہوگی کہ یہ ''نت‌نئے نظرئے،، اصلاً بدیسی نہیں ہیں اور نہ روزانہ استعمال کی اکثر اشیا کی طرح ''جرمنی کے بنے ہوئے،، ہیں ، بلکہ بلا شبہ خاص الخاص قدیم انگریزی ہیں ، اور یہ معلوم کرکے بھی انہیں کچھ تسلی ہوگی کہ دو سو سال پہلے ان نظریوں کے برطانوی بانی اس حد سے کہیں آگے نکل گئے تھے جہاں تک پہنچنے کی آج ان کی اولاد ہمت کر سکتی ہے ۔

واقعی فلسفۂ لاادریت لنکاشائر کی ایک بلیغ اصطلاح میں ''معذرت خواہ،، مادیت کے سوا اور ہے کیا ؟ فلسفۂ لاادریت کے پیرو کا تصور فطرت شروع سے آخر تک مادی ہے ۔ پوری فطری دنیا قانون کے تابع ہے اور اس میں باہر کے کسی عمل کی دخل‌اندازی کی مطلق گنجائش نہیں ۔ لیکن فلسفۂ لاادریت کا پیرو یہ اور کہتا ہے کہ ہمارے پاس جانی بوجھی کائنات کے ماورا کسی ہستیٔ اعلی کے وجود کو ثابت یا باطل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے ۔ مگر یہ چیز اس زمانے کےلئے تو ٹھیک ہو سکتی تھی جب عظیم ہیئت‌داں لپلاس نے نپولین کے اس سوال کے جواب میں کہ اس کی کتاب * «Mécanique céleste» میں خالق کائنات کا کوئی ذکر کیوں نہیں ہے، فخر سے یہ کہہ دیا تھا : «Je n'avais pas besoin de cette hypothèse»**. لیکن آج ہمارے ارتقائی تصور کائنات

---

* لپلاس ۔ «Traite de mécanique céleste» (فلکی میکانیات یا علم سکون‌وحرکت کے متعلق ایک مقالہ) جلد ۵ — ۱ ۔ پیرس، ۱۷۹۹ء — ۱۸۲۵ء ۔ (ایڈیٹر)

** ''مجھے اس مفروضے کی کوئی ضرورت نہیں تھی ۔،، (ایڈیٹر)

میں کسی خالق یا فرماں روا کی قطعی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ایک ایسی ہستیٔ اعلیٰ کا ذکر جو تمام موجود دنیا سے الگ تھلگ ہو ایک قسم کا تناقض لفظی ہے اور مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز مذہبی لوگوں کے جذبات کی خواہ‌مخواہ توہین بھی ہے۔

اس کے علاوہ ہمارا تشکیک پرست یہ مانتا ہے کہ ہمارے پورے علم کی بنیاد ہمارے حواس کی دی ہوئی معلومات پر ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ ہم کیا جانیں کہ ہمارے حواس ہمارے‌لئے ان اشیا کی صحیح تصویریں فراہم کرتے ہیں یا نہیں جنہیں ہم ان کے توسط سے محسوس کرتے ہیں؟ اور پھر وہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ جب کبھی وہ اشیا یا ان کے خواص کے بارے میں بات کرتا ہے تو درحقیقت اس کی مراد ان اشیا اور ان کے خواص سے نہیں ہوتی کیونکہ ان کے متعلق تو وہ یقین سے کوئی بات جان ہی نہیں سکتا، بلکہ اس کا مطلب تو محض ان تاثرات سے ہوتا ہے جو ان اشیا اور ان کے خواص سے حواس پر پڑتے ہیں۔ یہ اس قسم کا طریقۂ استدلال ہے جسے محض مناظرے کی مدد سے شکست نہیں دی جا سکتی۔ لیکن عمل مناظرے سے پہلے سے موجود ہے۔ * «Im Anfang war die Tat» ۔ اور انسان کے عمل نے انسان کی جدت طرازی کی ایجاد کردہ دقت کو بہت پہلے ہی حل کر لیا تھا۔ مٹھائی کی عمدگی کی دلیل اس کے کھانے میں ہے۔ جوں ہی ہم اشیا کی خاصیتوں کے مطابق، جو ہمیں ان میں محسوس ہوتی ہیں، انہیں اپنے استعمال میں لانا شروع کرتے ہیں اسی لمحے سے ہم اپنے محسوسات کی صحت یا غلطی کی حکمی اور یقینی آزمائش کرنے لگتے ہیں۔ اگر یہ محسوسات غلط تھے تو ان اشیا کے مناسب استعمال کے بارے میں ہمارا اندازہ بھی یقیناً غلط ہوگا اور ہماری کوششیں رائگاں جائیں‌گی۔ لیکن اگر ہم اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ شے اس تصور سے مطابقت رکھتی ہے جو ہمارا اس کے بارے میں ہے اور جس مقصد کے لئے ہم

---

* ''ابتدا میں عمل ہی تھا،،۔ یہ فقرہ گوئٹے کے ''فاؤسٹ،، سے لیا گیا ہے۔ (ایڈیٹر)

اسے استعمال کرنا چاہتے تھے اس کے لئے وہ موزوں ہے تو یہ اس امر کا قطعی اور صریحی ثبوت ہے کہ ان حدود کے اندر اس شے کے اور اس کی خاصیتوں کے متعلق ہمارے جو محسوسات تھے وہ ابھی تک خارجی حقیقت سے ہم آہنگ ہیں۔ اور جب ہم ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں تو عموماً ہمیں اس سبب کو تلاش کرنے میں دیر نہیں لگتی جس نے ہمیں ناکامی کا منہ دکھایا، ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ جن محسوسات کی بنا پر ہم نے عمل کیا تھا وہ یا تو نامکمل تھے یا سطحی ، یا پھر انہیں بعض دوسرے محسوسات کے نتیجوں کے ساتھ کسی ایسے طریقے سے ملایا گیا تھا جو ناموزوں تھا — یعنی جس چیز کو ہم ناقص استدلال کہتے ہیں۔ جب تک ہم اپنے حواس کی صحیح اور معقول تربیت اور ان کے صحیح استعمال کی طرف توجہ دیتے ہیں اور اپنے عمل کو ان حدود کے اندر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جو صحیح اور مناسب طور پر حاصل اور استعمال کردہ محسوسات پر مبنی ہیں — اس وقت تک ہمارے عمل کے نتیجے سے ثابت ہوتا ہے کہ محسوس کردہ اشیا کی خارجی فطرت اور ہمارے محسوسات میں مطابقت اور ہم آہنگی ہے۔ آج تک تو کبھی ایک بار بھی ہمیں اس نتیجے پر پہنچنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ ہمارے سائنس کے ذریعے ثابت ہونے والے محسوسات ہمارے ذہنوں میں خارجی دنیا کے متعلق ایسے تصورات پیدا کرتے ہیں جو فطرتاً حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتے یا یہ کہ خارجی دنیا اور اس کے متعلق ہمارے محسوسات کے درمیان ایک خلقی بےآہنگی ہے۔

لیکن اس وقت نوکانٹی تشکیک‌پرست آتا ہے اور کہتا ہے : ہم کسی شے کی خصوصیات کو تو صحیح طور پر محسوس کر بھی سکتے ہیں لیکن اپنے کسی بھی حسی یا ذہنی عمل کے ذریعے ہم شۓ بالذات کا ادراک نہیں کر سکتے۔ یہ ''شۓ بالذات،، ہماری حد ادراک سے باہر ہے۔ مدت ہوئی اس کا ہیگل جواب دے چکا ہے : اگر تم کسی شے کی تمام خاصیتوں کو جانتے ہو تو تم خود اس شے کو بھی جانتے ہو۔ اب اس حقیقت کو سمجھنا اور باقی رہ جاتا ہے کہ شۓ مذکورہ کا وجود ہم سے الگ اور باہر ہے ، اور جب تمہارے حواس تمہیں یہ حقیقت بھی سمجھا دیں تو اس وقت تم شۓ بالذات کی آخری باقیات کا —

کانٹ کے مشہور و معروف Ding an sich حقیقی وجود یا شئ بالذات کا — ادراک بھی کر لیتے ہو ۔ اس میں اتنی بات کا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ کانٹ کے وقت میں فطری اشیا کے متعلق ہمارا مبلغ علم واقعی اس قدر غیرمکمل اور بکھرا ہوا تھا کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے متعلق ہمیں جو تھوڑی بہت واقفیت تھی اس کے پیچھے کانٹ ایک پراسرار ''شئ بالذات،، موجود سمجھتا تھا ۔ لیکن ایک کے بعد ایک ان ناقابل ادراک اشیا کا ادراک کیا جا چکا ہے ، تجزیہ کیا جا چکا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ سائنس کی عظیم الشان ترقی نے ان اشیا کو نئے سرے سے پیدا بھی کر دیا ہے ۔ اور جس چیز کو ہم پیدا کر سکتے ہیں، ظاہر ہے ، اسے ناقابل ادراک نہیں سمجھ سکتے ۔ اس صدی کے نصف اول میں علم کیمیا کے لئے نامیاتی مادے اسی قسم کی پراسرار چیزیں تھیں ۔ اب ہم نامیاتی عمل کے توسط کے بغیر ہی ان کو یکے بعد دیگرے ان کے کیمیاوی عناصر سے بنانے کا گر سیکھ رہے ہیں ۔ جدید ماہرین علم کیمیا کا دعوی ہے کہ جب بلا استثنا کسی بھی جسم کی کیمیاوی ساخت معلوم ہو جاتی ہے تو اسے اس کے کیمیاوی عناصر سے بنایا جا سکتا ہے ۔ ہم ابھی تک اعلیٰ‌ترین نامیاتی مادوں یعنی بیضین‌دار (albuminous) اجسام کی کیمیاوی ساخت کے علم سے بہت دور ہیں ، لیکن کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم کبھی نہ کبھی ، خواہ صدیوں بعد ہی سہی ، یہ علم حاصل نہ کر لیں اور اس علم سے مسلح ہو کر مصنوعی بیضین پیدا نہ کر سکیں ۔ لیکن جب ہم اس منزل پر پہنچیں گے تو ساتھ ہی ساتھ ہم نامیاتی زندگی کی تخلیق بھی کر دیں گے کیونکہ زندگی اپنی پست‌ترین شکل سے لے کر اپنی بلندترین شکل تک بیضین‌دار اجسام کے وجود کا نارمل طریقہ ہے ۔

بہر حال ہمارا تشکیک‌پرست جب رسمی طور پر اپنے لئے ان شرائط اور حدود کا تعین کر لیتا ہے تو پھر ایک پکے مادیت‌پسند کی طرح گفتگو اور عمل کرتا ہے — اور وہ دراصل ہئی مادیت‌پسند ۔ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ جہاں تک ہمیں علم ہے مادہ اور حرکت یا قوت کی — جیسا کہ اب حرکت کو کہا جاتا ہے — نہ تو تخلیق کی جا سکتی ہے

اور نہ ہی یہ دونوں چیزیں برباد کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ چیزیں کبھی بھی تخلیق نہیں کی گئی تھیں۔ لیکن اگر آپ کسی مخصوص صورت میں اس اعتراف کو تشکیک‌پرست کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کریں گے تو وہ تیزی سے آپ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دے گا۔ وہ in abstracto (عام طور پر) روحانیت (۴۳) کے امکان کو بھلے ہی تسلیم کرے لیکن in concreto (حقیقت میں) وہ اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ آپ کو بتائے گا کہ جہاں تک ہم جانتے ہیں اور جان سکتے ہیں کسی خالق کائنات یا فرماں روائے کائنات کا کوئی وجود نہیں ہے، جہاں تک ہم سمجھتے ہیں مادہ اور قوت نہ پیدا کئے جا سکتے ہیں، نہ معدوم کئے جا سکتے ہیں، ہمارے نزدیک ذہن قوت کی ایک شکل اور دماغ کا ایک کام ہے، ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ مادی دنیا پر اٹل قوانین کی حکمرانی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ سو جس حد تک یہ تشکیک پرست ایک سائنٹفک آدمی ہے اور جس حد تک وہ کچھ جانتا ہے اس حد تک وہ مادیت‌پسند ہے۔ اور اپنے علم کی حدود سے باہر، ان میدانوں میں جن سے وہ قطعی واقف نہیں ہے، وہ اپنی لاعلمی کا یونانی زبان میں ترجمہ کرکے اسے لاادریت یا فلسفۂ تشکیک کے نام سے پکارتا ہے۔

بہر صورت ایک بات تو کم از کم صاف معلوم ہوتی ہے: یہ ظاہر ہے کہ اگر میں تشکیک‌پرست ہوتا تب بھی میں اس کتابچے میں پیش کئے ہوئے تصور تاریخ کو ”تاریخی لاادریت“ کا نام نہیں دے سکتا تھا۔ اگر میں ایسا کروں تو مذہبی لوگ میرا مضحکہ اڑائیں گے اور تشکیک‌پرست ناراض ہو کر مجھ سے پوچھیں گے کہ کیا میں ان کا مذاق اڑانا چاہتا ہوں؟ لہٰذا مجھے امید ہے کہ خود برطانوی ”سفید پوشوں“ کو بھی ضرورت سے زیادہ دھکا نہیں پہنچے گا اگر میں اور بہت سی زبانوں کے علاوہ انگریزی میں بھی تاریخ کی رفتار کے اس نظرئیے کو ”تاریخی مادیت“ کی اصطلاح سے موسوم کروں جو تمام اہم تاریخی واقعات کے سبب اول اور عظیم قوت محرکہ کو تلاش کرتا ہے سماج کے معاشی ارتقا میں، طریق پیداوار اور طریق تبادلہ کے اندر ہونے والی تبدیلیوں میں، ان تبدیلیوں کے نتیجے کے طور پر الگ الگ

طبقات میں سماج کے تقسیم ہونے میں اور ان طبقات کی باہمی کشمکش میں۔

اور اگر میں یہ ثابت کر دوں کہ تاریخی مادیت شاید خود برطانوی سفید پوشوں کے فائدے کی چیز بھی ہو سکتی ہے تو غالباً مجھے اور زیادہ آسانی سے معاف کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اس حقیقت کا تذکرہ کیا ہے کہ تقریباً چالیس یا پچاس سال قبل انگلستان میں بسنے والے ہر مہذب بدیسی کو انگلستان کے سفید پوش، متوسط طبقے کی مذہبی عصبیت اور حماقت — یا وہ چیز جسے وہ اس وقت ایسا سمجھنے پر مجبور تھا — بہت نمایاں طور پر محسوس ہوتی تھی۔ اب میں اس امر کی وضاحت کروں گا کہ اس زمانے کا انگریز سفیدپوش، متوسط طبقہ اتنا بیوقوف ہرگز نہیں تھا جتنا کہ وہ ایک ذہین بدیسی کو معلوم ہوتا تھا۔ اس کے مذہبی رجحانات کی توجیہہ کی جا سکتی ہے۔

جس وقت یورپ قرون وسطی سے نکلا اس وقت شہروں کا ابھرتا ہوا متوسط طبقہ اس کا انقلابی عنصر تھا۔ اس طبقے نے قرون وسطی کی جاگیرداری تنظیم کے درمیان ایک مانا ہوا مقام حاصل کر لیا تھا، لیکن یہ مقام بھی اس کی توسیع پذیر طاقت کے لئے بہت تنگ ومحدود ہو چکا تھا۔ متوسط طبقے یا بورژوا طبقے کا ارتقا اور جاگیرداری نظام کا قیام اب ایک دوسرے کے لئے قطعی بے میل اور بے آہنگ ہو چکے تھے۔ لہذا جاگیرداری نظام کا زوال ہونا ہی تھا۔

لیکن جاگیرداری نظام کا عظیم بین‌الاقوامی مرکز رومن کیتھولک کلیسا تھا۔ اس نے ساری اندرونی جنگوں کے باوجود جاگیرداری نظام رکھنےوالے تمام مغربی یورپ کو ایک واحد عظیم الشان سیاسی نظام میں متحد کر رکھا تھا جو یونانیوں کی فرقہ‌بندی (۴۴) کے بھی اسی قدر خلاف تھا جتنا اسلامی ملکوں کے۔ اس کلیسا نے جاگیرداری اداروں کے ارد گرد الوہی تقدیس کا ایک ہالۂ نور سا بنا رکھا تھا۔ اس نے خود اپنے نظام مراتب کی تنظیم جاگیرداری نمونے پر کی تھی۔ مزیدبرآں وہ خود سب سے کہیں زیادہ طاقتور جاگیردار تھا کیونکہ وہ تمام کیتھولک دنیا کی پوری ایک تہائی زمینوں پر قابض تھا۔ اس سے پیشتر کہ ایک ایک ملک میں دنیوی نظام جاگیرداری پر کامیابی سے حملہ کیا جا سکے اس

کلیسا کو جو اس کا مقدس مرکزی ادارہ تھا نیست و نابود کرنا ضروری تھا۔

علاوہ بریں متوسط طبقے کے عروج کے پہلو بہ پہلو سائنس کی شاندار حیات ثانیہ بھی تھی۔ علم ہیئت، علم سکون و حرکت (میکانیات)، علم طبیعیات (فزکس)، علم تشریح بدن (اناٹومی)، علم الاعضا (فیزیالوجی) کی ایک دفعہ پھر توسیع و تزئین ہونے لگی۔ اور بورژوا طبقے کو اپنی صنعتی پیداوار کی ترقی کے لئے ایک ایسی سائنس کی ضرورت تھی جو اشیائے فطرت کی طبعی خاصیتوں اور فطرت کی قوتوں کے طریقۂ عمل کو ٹھیک طور پر سمجھ سکے۔ اس وقت تک سائنس محض کلیسا کی ایک ناچیز لونڈی تھی اور ایمان و عقیدے کی عائد کی ہوئی حدود سے آگے جانے کی مجاز نہیں تھی اور اسی وجہ سے وہ دراصل سائنس کہلائی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ سائنس نے کلیسا کے خلاف بغاوت کی اور بورژوا طبقہ چونکہ سائنس کے بغیر کام نہیں چلا سکتا تھا لہذا اسے بھی اس بغاوت میں شریک ہونا پڑا۔

مندرجۂ بالا مثالوں سے گو صرف ایسے دو ہی نقطوں پر روشنی پڑتی ہے جہاں ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کی رائج الوقت مذہب سے ٹکر ہونی ناگزیر تھی، لیکن اتنی ہی بات یہ دکھانے کے لئے کافی ہے کہ اول تو جس طبقے کو رومن کلیسا کے دعووں کے خلاف جدوجہد میں سب سے زیادہ براہ‌راست دلچسپی تھی وہ بورژوا طبقہ ہی تھا، اور دوسرے یہ کہ اس زمانے میں جاگیرداری کے خلاف ہر جد و جہد کے لئے مذہبی جامہ پہننا اور سب سے پہلے کلیسا کے خلاف جنگ‌آزما ہونا ضروری تھا۔ لیکن جب شہروں کے تاجر اور یونی‌ورسٹیاں نعرۂ‌جنگ لگاتے تھے تو دیہاتی جنتا کے، کسانوں کے دلوں سے بھی اس نعرے کی پرزور گونج نکلتی تھی کیونکہ انھیں ہر جگہ اپنے تن و جان کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے اپنے روحانی اور دنیوی جاگیردار آقاؤں کے مقابلے پر نکلنا پڑتا تھا۔

جاگیرداری کے خلاف یورپی بورژوا طبقے کی طویل جنگ تین عظیم اور فیصلہ کن مجادلوں میں اپنے عروج کو پہنچی۔

پہلا مجادلہ وہ تھا جو جرمنی میں ”پروٹسٹنٹ اصلاح دین“ کے نام

سے موسوم ہے ۔ لوتھر نے کلیسا کے خلاف جو نعرۂ جنگ بلند کیا تھا اس کو دو سیاسی کردار رکھنےوالی بغاوتوں نے لبیک کہا : پہلے ۱۵۲۳ء میں فرانز فون زی کنگین کی قیادت میں طبقۂ اشرافیہ کے نچلے حصے کی بغاوت ہوئی اور پھر ۱۵۲۵ء میں کسانوں کی عظیم جنگ ۔ دونوں ہی کو شکست ہوئی اور اس شکست کا سب سے اہم سبب اس جنگ میں سب سے زیادہ دلچسپی رکھنےوالے فریقوں، یعنی شہری تاجروں یا بورژواؤں (burghers) کا تذبذب اور تلون تھا — اس تذبذب و تلون کے اسباب سے ہم یہاں بحث نہیں کر سکتے ۔ اس لمحے سے یہ جدوجہد اپنے مقام سے گرکر مقامی شہزادوں اور مرکزی طاقت کے درمیان جنگ میں تبدیل ہو گئی اور آنےوالے دو سو برسوں کے لئے یورپ کی سیاسی اعتبار سے زندہ و باعمل قوموں کی صف سے جرمنی کا نام مٹا کر ہی ختم ہوئی ۔ سچ تو یہ ہے کہ لوتھر کی اصلاح دین نے جرمنی میں ایک نئے عقیدے کو، ایک ایسے مذہب کو جنم دیا جو مطلق العنان شہنشاہیت کے لئے موزوں اور مناسب تھا ۔ جیسے ہی شمال مشرقی جرمنی کے کسانوں نے لوتھری عقیدہ قبول کیا اسی وقت سے وہ آزاد انسانوں کے مقام سے گرکر زرعی غلام بن گئے ۔

لیکن جہاں لوتھر ناکام رہا وہاں کالوین نے میدان جیت لیا ۔ کالوین کا عقیدہ اس دور کے بےباک‌ترین بورژوا طبقے کے لئے بھی موزوں تھا ۔ اس کا عقیدۂ قضا و قدر اس حقیقت کا ایک مذہبی اظہار تھا کہ مقابلے کی تجارتی دنیا میں کامیابی یا ناکامی کا انحصار انسان کے جوش و سرگرمی یا ہوشیاری پر نہیں ہوتا بلکہ اس کا دار و مدار ایسے حالات پر ہوتا ہے جو انسان کے قبضۂ قدرت سے باہر ہیں ۔ کامیابی یا ناکامی کسی فرد کی دوڑبھاگ یا ارادہ اور خواہش کے قابو میں نہیں بلکہ نامعلوم اور برتر معاشی طاقتوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے ۔ اور یہ چیز معاشی انقلاب کے اس دور پر اور بھی زیادہ صادق آتی تھی جب سارے پرانے تجارتی راستوں اور مرکزوں کی جگہ نئے راستوں اور مرکزوں نے لے لی تھی، جب امریکہ اور ہندستان کے دروازے دنیا کے لئے کھل گئے تھے اور جب معاشیات کا مقدس ترین رکن ایمان — سونے اور چاندی کی قدر وقیمت — بھی متزلزل ہو چلا تھا ۔ کالوین کا کلیسائی نظام پوری طرح

جمہوری اور ریپبلکن تھا ، اور جب اقلیم خداوندی جمہوری رنگ میں رنگ گئی تو پھر بھلا اس دنیا کی اقلیمیں شہنشاھوں ، اسقفوں اور جاگیرداروں کی حلقۂبگوش کیسے رہ سکتی تھیں ؟ اس وقت میں جبکہ جرمن لوتھری عقیدہ خوشی خوشی شہزادوں کا آلۂ کار بن گیا تھا ، کالوینی عقیدے نے ھالینڈ میں ایک جمہوریہ کی اور انگلستان اور سب سے بڑھ کر اسکاٹلینڈ میں باعمل اور سرگرم ریپبلکن پارٹیوں کی بنیاد ڈالی ۔

کالوینی عقیدے میں بورژوا طبقے کے دوسرے انقلاب عظیم کو اپنا بنا بنایا ، تیارشدہ نظریہ مل گیا ۔ یہ انقلاب عظیم انگلستان میں واقع ھوا — شہر کا متوسط طبقہ اسے برروئے کار لایا اور دیہاتی اضلاع کے زراعتپیشہ متوسط طبقے نے اسے پروان چڑھایا ۔ یہ دلچسپ بات ھے کہ تینوں عظیم بورژوا بغاوتوں میں کسان ھی وہ فوج مہیا کرتے ھیں جسے لڑنے کا کام کرنا پڑتا ھے اور کسانوں کا طبقہ ھی وہ طبقہ ھے جسے فتح کے بعد اس فتح کے معاشی نتائج پوری طرح تباہ و برباد کر دیتے ھیں ۔ کرومویل کے سو سال بعد انگلستان کا زراعت پیشہ متوسط طبقہ تقریباً غائب ھو چکا تھا ۔ بہر حال اگر اسی زراعت پیشہ متوسط طبقے اور شہروں کے عامی عناصر کا دم قدم نہ ھوتا تو بورژوا طبقہ تنہا ھرگز اس معاملے کو انتہا تک نہ پہنچاتا اور کبھی بھی چارلس اول کو موت کے منہ تک نہ لے جاتا ۔ بورژوا طبقے کی جو فتوحات اس وقت بالکل مکمل ھو چکی تھیں ان کو استوار کرنے کے لئے بھی اس انقلاب کو اور کافی آگے لے جانے کی ضرورت تھی ، ٹھیک اسی طرح جیسے ۱۷۹۳ء میں فرانس میں اور ۱۸۴۸ء میں جرمنی میں ایسا کرنا ضروری تھا ۔ دراصل ایسا معلوم ھوتا ھے کہ یہ چیز بورژوا سماج کے ارتقا کے قوانین میں شامل ھے۔

پھر انقلابی جوش و سرگرمی کی یہ افراط لازمی طور پر ایک ناگزیر رجعتپسندی کو اپنے جلو میں لائی اور پھر یہ رجعتپسندی بھی اس نقطۂ اعتدال سے آگے نکل گئی جہاں وہ خود کو قائم رکھ سکتی تھی ۔ چند در چند جنبشوں اور پینگوں کے بعد آخرکار نیا مرکزثقل دستیاب ھو ھی گیا ، اور پھر وہ ایک نیا نقطۂ آغاز بن گیا ۔ انگریزی

تاریخ کے اس شاندار دور کا ، جسے سفید پوش لوگ ”بغاوت عظیم“ کے نام سے یاد کرتے ہیں ، اور اس کے بعد کی جدوجہد کا خاتمہ ایک نسبتاً حقیر و غیراہم واقعہ پر ہوا جسے لبرل مورخوں نے ”شاندار انقلاب“ (۴۵) کا نام دے رکھا ہے۔

نیا نقطۂ آغاز ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے اور سابق جاگیردار زمیں داروں کے درمیان ایک سمجھوتہ تھا۔ آخر الذکر گو اب کی طرح اس وقت بھی طبقۂ اشرافیہ کہلاتے تھے لیکن دراصل بہت مدت سے وہ اس راستے پر پڑ چکے تھے جو ان کو ”سلطنت کے اولین بورژوا“ بننے کی طرف لے جاتا تھا — جیسا کہ ایک بہت بعد کے دور میں فرانس میں لوئی فلپ بن گیا تھا۔ انگلستان کی خوش قسمتی تھی کہ پرانے جاگیرداری نوابوں نے گلاب والی جنگوں (۴۶) کے دوران میں ایک دوسرے کو قتل کر دیا تھا۔ ان کے ورثا زیادہ تر قدیم خاندانوں کے چشم و چراغ ہونے کے باوجود ، سیدھے سلسلۂ نسب سے اس قدر دور جا چڑے تھے کہ اب وہ ایک بالکل ہی نیا گروہ بن گئے تھے جو عادات اور میلانات کے لحاظ سے جاگیردار سے زیادہ بورژوا تھا۔ وہ پیسے کی اہمیت کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے اور انھوں نے فوراً ہزاروں چھوٹے کاشتکاروں کو بےدخل کرکے ان کی جگہ بھیڑوں کو زمینوں پر چھوڑ دیا اور اس طرح اپنا لگان بڑھانے لگے۔ ہنری ہشتم نے کلیسائی زمینوں کو اونے پونے بیچنے اور اڑانے کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر نئے بورژوا زمیں داروں کی تخلیق بھی کی۔ جائدادوں کی بے شمار ضبطیاں اور ان جائدادوں کا بالکل یا کم و بیش نودولتیوں کو عطا کئے جانے کا سلسلہ پوری سترھویں صدی میں چلتا رہا ، اور اس کا بھی نتیجہ یہی ہوا۔ لہذا ہنری ہفتم کے وقت ہی سے انگریز ”اشرافیہ“ صنعتی پیداوار کا توڑ کرنا تو الگ رہا اور الٹا اس سے بالواسطہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اور ویسے تو ہمیشہ سے بڑے زمیں داروں کا ایک حصہ موجود رہا تھا جو معاشی یا سیاسی اسباب کی بنا پر ، صنعتی بورژوا اور بینکر طبقے کے ممتاز افراد کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار رہتا تھا۔ اسی لئے ۱۶۸۹ء کا سمجھوتہ خاصی آسانی سے ہو گیا۔ ”عہدہ و زر“ کی سیاسی لوٹ بڑے زمیں دار خاندانوں کے لئے چھوڑ دی گئی تھی — بشرطیکہ بینکر ، صنعتی اور

تجارتی متوسط طبقے کے معاشی مفادوں کا پہلے ھی خوب اچھی طرح خیال کرلیا گیا ھو ۔ اور یہ معاشی مفاد اس وقت اتنے طاقتور تھے کہ قوم کی عام پالیسی انھیں کے اشاروں پر چلتی تھی ۔ تفصیلات کے سلسلے میں تو کچھ لڑائی جھگڑا ھونا ممکن بھی تھا لیکن مجموعی طور پر اشرافیہ کا حکمراں گروہ اچھی طرح جانتا تھا کہ خود اس کی معاشی خوش‌حالی صنعتی اور تجارتی متوسط طبقے کی معاشی خوش‌حالی کےساتھ اٹوٹ بندھنوں میں بندھی ھوئی ھے ۔

اس وقت سے بورژوا طبقہ انگلستان کے حکمراں طبقوں کا ایک خاکسار لیکن مسلمہ جزو ترکیبی بن گیا ۔ قوم کی لاتعداد محنت‌کش جنتا کو حلقہ بگوش رکھنے میں اس کا اور باقی حکمراں طبقوں کا مفاد مشترک تھا ۔ خود تاجر یا کارخانہ‌دار اپنے کلارکوں اور مزدوروں اور گھریلو ملازموں کے مالک — یا جیسا کہ ابھی کچھ دن پہلے تک کہا جاتا تھا ان کے ” فطری بزرگوار “ کا مرتبہ رکھتا تھا ۔ اس کا فائدہ اسی میں تھا کہ ان لوگوں سے حتی‌الامکان زیادہ سے زیادہ اور اچھے سے اچھا کام لے ، اور اس مقصد کےلئے ان کو ایک مناسب اطاعت کیشی کی تربیت دینی ضروری تھی ۔ یہ تاجر یا کارخانہ‌دار خود مذھبی تھا ، اس کے مذھب نے اسے وہ پرچم عطا کیا تھا جس کے نیچے اس نے بادشاہ اور امرا پر فتح پائی ۔ اور اب اسے یہ معلوم کرتے دیر نہیں لگی کہ اسی مذھب نے اسے اس بات کے سنہرے موقعے بھی عطا کئے ھیں کہ وہ فطری طور پر اپنے سے گھٹیا لوگوں کے ذھنوں پر اثرانداز ھو اور انھیں بےچون‌وچرا اپنے ان آقاؤں کے فرمان بجالانے پر مجبور کرے جنھیں مشیت الٰہی نے ان کے سروں پر متمکن کیا ھے ۔ قصہ مختصر یہ کہ انگریزی بورژوا طبقے کو اب ” نیچ ذاتوں “ کو — قوم کے دولت پیدا کرنےوالے بےشمار عوام کو — محکوم‌ومجبور رکھنے کے کام میں حصہ لینا تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے جو وسیلے استعمال کئے گئے ان میں مذھب کا بڑا ھاتھ تھا ۔

اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی تھی جس نے بورژوا طبقے کے مذھبی میلانات کو تقویت بخشنے میں مدد دی ۔ اور وہ چیز تھی انگلستان میں مادیت کا فروغ ۔ اس نئے نظرئے نے نہ صرف متوسط طبقے کے دین دارانہ

جذبات کو ٹھیس پہنچائی ، بلکہ اس نے تو یہ اعلان بھی کر دیا کہ وہ محض باذوق ، تعلیم یافتہ آدمیوں اور عالموں کے لئے موزوں فلسفہ ہے ۔ اس کے برخلاف مذہب غیر تعلیم یافتہ عوام کے لئے ہے ، جن میں بورژوا بھی شامل ہیں ۔ ہوبس کے یہاں یہ نظریہ شہنشاہیت کے بےروک اختیار اور قدرت مطلق کے حامی کی حیثیت سے منظر عام پر آیا ، اس نے مطلق العنان شہنشاہیت کو ہدایت کی کہ اس ہٹے کٹے مگر بدباطن لڑکے (puer robustus sed malitiosus) یعنی جنتا کو محکوم و مجبور رکھے ۔ اسی طرح ہوبس کے جانشینوں ، بولنگ‌بروک اور شافٹسبری کے یہاں بھی مادیت کی نئی الوہیت پسندانہ شکل منتخب لوگوں اور امرا تک محدود نظریہ ہی رہی جو اپنے کفر و الحاد اور اپنے بورژوا دشمن سیاسی تعلقات دونوں ہی چیزوں کے سبب متوسط طبقے کے لئے نفرت‌انگیز تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ جن پروٹسٹنٹ فرقوں نے اسٹوارٹ خاندان شاہی کے خلاف جنگ کا پرچم بلند کیا تھا اور لڑنے والے سپاہی فراہم کئے تھے وہی بعد میں اشرافیہ کے فلسفۂ مادیت اور عقیدۂ الوہیت کے مقابلے میں بھی ترقی‌پسند متوسط طبقے کی طاقت و قوت کا سب سے اہم حصہ فراہم کرتے رہے ، اور آج بھی وہ ''عظیم لبرل پارٹی،، کی پشت‌پناہ بنے ہوئے ہیں ۔

اسی اثنا میں فلسفۂ مادیت انگلستان سے فرانس کی طرف منتقل ہو گیا ، وہاں وہ فلسفیوں کے ایک اور مادیت پسند مکتب فکر سے ، جو کارٹیزینزم (۱۷ ۴) کی ایک شاخ تھا ، دوچار ہو کر اس کے ساتھ مربوط و متحد ہو گیا ۔ شروع شروع میں فرانس میں بھی یہ نظریہ صرف خواص ہی تک محدود نظریہ رہا ۔ لیکن جلد ہی اس کے انقلابی کردار نے اپنے آپ کو منوا لیا ۔ فرانسیسی مادیت پسندوں نے اپنی تنقید کو مذہبی عقائد ہی تک محدود نہیں رکھا ، انھوں نے اسے توسیع دے کر ہر اس سائنسی روایت یا سیاسی ادارے پر ، جس سے ان کا واسطہ پڑتا تھا ، چسپاں کر دیا اور اپنے نظرئے کے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کہ وہ ہر جگہ صادق آتا ہے ، انھوں نے سب سے چھوٹا راستہ اختیار کیا اور بڑی بےباکی سے اپنی عظیم و ضخیم تصنیف انسائکلوپیڈیا (Encyclopédie) میں — جس کے نام پر ان کا نام انسائکلوپیڈیائی پڑ گیا ہے — اس نظرئے

کا اطلاق علم کے تمام شعبوں پر کر دیا ۔ اور اس طرح اپنی دو شکلوں — کھلی مادیت یا عقیدۂ الوھیت — میں سے کسی ایک نہ ایک شکل میں یہ نظریہ فرانس کے تمام تہذیب‌یافتہ نوجوانوں کا عقیدہ بن گیا ، یہاں تک کہ جب انقلاب عظیم کے سوتے پھوٹے تو انگریز شاہ‌پرستوں کے تیار کئے ہوئے نظرئے نے فرانسیسی ریپبلکنوں اور دھشت پسندوں کو ایک نظریاتی پرچم دیا اور اسی نے ''حقوق انسانی کے اعلان نامے،، (۴۸) کے لئے مضمون مہیا کیا ۔

عظیم انقلاب فرانس بورژوا طبقے کی تیسری بغاوت تھی ، لیکن یہ وہ پہلی بغاوت تھی جس نے مذھبی جامہ پوری طرح اتار پھینکا تھا اور جو کھلم کھلا سیاسی اصول پر لڑی گئی تھی ۔ اسی طرح یہ وہ پہلی بغاوت تھی جو اس وقت تک جاری رھی جب تک کہ فریقین میں سے ایک یعنی اشرافیہ بالکل تباہ و برباد اور دوسرا یعنی بورژوا طبقہ مکمل طور پر فتح یاب اور کامراں نہ ہو گیا ۔ انگلستان میں انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد کے اداروں کے تعلق و تسلسل اور زمیں‌داروں اور سرمایہ‌داروں کی باھمی مفاھمت کا اظہار قانونی نظیروں کے اسی طور پر باقی رھنے اور قانون کی جاگیردارانہ شکلوں کو گویا مذھبی فریضہ سمجھ کر قائم رکھنے میں ھوا ۔ فرانس میں انقلاب نے ماضی کی روایات سے مکمل طور پر ناتہ توڑ لیا ، اس نے جاگیرداری نظام کی بچی کھچی باقیات کو بھی نکال پھینکا اور مدنی مجموعۂ قوانین (۴۹) (Code Civil) بنا کر پرانے رومی قانون کو جدید سرمایہ‌داری حالات کے مطابق اس قدر استادی سے ڈھالا کہ آج بھی فرانس کا یہ انقلابی مجموعۂ قوانین سارے ملکوں کے لئے — اور انگلستان بھی اس سے مستثنی نہیں ھے — قوانین ملکیت کی اصلاحات کے سلسلے میں نمونہ کا کام دیتا ھے ۔ اور یہ رومی قانون وہ تھا جو اس معاشی دور سے ، جسے مارکس نے جنس تبادلہ (مال) کی پیداوار کا دور کہا ھے ، میل اور مطابقت رکھنے والے قانونی تعلقات کا تقریباً کامل اظہار ھے ۔ لیکن ھمیں یہ نہیں بھولنا چاھئے کہ گو انگریزی قانون ابھی تک سرمایہ‌داری سماج کے معاشی تعلقات کا اظہار اس بربری جاگیرداری زبان میں کرتا ھے جو شئ مذکورہ سے اسی قدر مطابقت رکھتی ھے جس قدر انگریزی ھجے انگریزی تلفظ

سے — ”آپ لندن لکھتے ہیں اور اسے قسطنطنیہ پڑھتے ہیں“، ایک بار ایک فرانسیسی نے کہا تھا — لیکن یہی انگریزی قانون وہ واحد قانون ہے جس نے ان قدیم جرمن آزادیوں کے بہترین حصے — شخصی آزادی، مقامی حکومت خوداختیاری اور قانونی عدالتوں کے علاوہ اور ہر قسم کی مداخلت سے آزادی کو صدیوں سے اپنے اندر محفوظ اور زندہ رکھا اور امریکہ اور نوآبادیات کی طرف منتقل کیا ہے۔ یورپ میں یہ آزادیاں مطلق العنان شہنشاہیت کے دور میں بالکل ہی کھوئی گئی تھیں اور اب تک کسی جگہ مکمل طور پر دستیاب نہیں ہو سکی ہیں۔

ہم اب اپنے برطانوی بورژوا طبقے کی طرف لوٹتے ہیں۔ انقلاب‌فرانس نے اسے یہ سنہرا موقع دیا کہ یورپ کی شہنشاہیتوں کی مدد سے فرانسیسی بحری تجارت کو تباہ و برباد کردے، فرانسیسی نوآبادیات پر قبضہ کرلے اور فرانس کی طرف سے بحری رقابت کے آخری دعووں کو کچل ڈالے۔ ایک تو یہ وجہ تھی جس کی بنا پر برطانوی بورژوا طبقے نے انقلاب فرانس کی مخالفت کی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس انقلاب کے طریقے اس کے مزاج‌وطبیعت کے خلاف تھے — صرف انقلاب کی ”قابل نفرت“ دہشت‌پسندی ہی نہیں بلکہ بورژوا حکمرانی کو آخری حد تک لے‌جانے کی کوشش بھی اس کے‌خلاف طبیعت تھی۔ برطانوی بورژوا اپنے طبقۂ اشرافیہ کے بغیر بھلا کیسے گذارہ کرتا — اس اشرافیہ کے بغیر جس نے اسے آداب‌واطوار سکھائے، خواہ وہ جیسے کچھ بھی ہوں، جس نے اس کےلئے فیشن ایجاد کئے، جو ملک کے اندر نظم قائم رکھنےوالی بری فوج کےلئے اور ملک سے باہر نوآبادیاتی مقبوضات اور نئی منڈیاں فتح کرنےوالی بحری فوج کےلئے افسر مہیا کرتا تھا؟ یہ ٹھیک ہے کہ بورژوا طبقے کی ایک ترقی پسند اقلیت بھی تھی، اور یہ بورژوا طبقے کا وہ حصہ تھا جس کے مفاد کا اس سمجھوتے میں اچھی طرح خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ اس حصے کو، جو زیادہ تر متوسط طبقے کے کم دولت‌مند لوگوں پر مشتمل تھا، انقلاب‌فرانس سے واقعی ہمدردی تھی لیکن وہ پارلیمنٹ میں بےبس تھا۔

لہذا چونکہ فلسفۂ مادیت انقلاب‌فرانس کا عقیدہ بن گیا تھا اس‌لئے خوف خدا رکھنےوالے برطانوی بورژوا نے اپنے مذہب کا دامن اور بھی

مضبوطی سے پکڑلیا۔ کیا پیرس میں دہشت گردی (۵۰) نے ثابت نہیں کر دیا تھا کہ جتنا کی مذہبی جبلتیں ڈوب جائیں تو کیا انجام ہوتا ہے؟ جتنا زیادہ فلسفۂ مادیت فرانس سے نکل کر آس‌پاس کے ملکوں میں پھیلتا گیا اور دوسری اپنے سے ملتی جلتی ذہنی تحریکوں سے، خاص طور پر جرمنی فلسفے سے، کسب فیض کرکے مضبوط ہوتا گیا، اور فلسفۂ مادیت اور عام طور پر معقول پسندی یورپ میں ہر تہذیب‌یافتہ اور باذوق آدمی کا طرۂ امتیاز بنتے گئے اسی قدر ہٹ‌دھرمی سے برطانوی متوسط طبقہ اپنے بےشمار مذہبی عقائد سے لپٹتا چلا گیا۔ یہ عقائد ایک دوسرے سے مختلف بھلے ہی ہوں لیکن وہ سب کے سب تھے نمایاں طور پر مذہبی، عیسائی عقائد۔

فرانس میں انقلاب نے بورژوا طبقے کی سیاسی فتح کی ضمانت کی اور انگلستان میں واٹ، آرک‌رائٹ، کارٹ‌رائٹ اور دوسرے لوگوں نے ایک صنعتی انقلاب شروع کیا جس نے معاشی طاقت کے مرکزثقل کو بالکل ہی بدل ڈالا۔ بورژوا طبقے کی دولت زمیں‌دار اشرافیہ کی دولت سے بہت زیادہ تیزی سے بڑھنے لگی۔ خود بورژوا طبقے میں پونجی‌والے اشرافیہ اور بینکروں وغیرہ کو کارخانہ‌دار زیادہ سے زیادہ پس‌منظر میں دھکیلنے لگے۔ گو ۱۶۸۹ء کے سمجھوتے میں بتدریج اس قسم کی تبدیلیاں ہوئی تھیں جو بورژوا طبقے کے حق میں تھیں، تاہم اس سمجھوتے کے سلسلے میں مختلف فریقوں کو جو نسبتی مقام حاصل تھا اب یہ سمجھوتہ اس سے ہم‌آہنگ نہیں رہا تھا۔ ان فریقوں کا کردار بھی بدل گیا تھا — ۱۸۳۰ء کا بورژوا طبقہ پچھلی صدی کے بورژوا طبقے سے بہت مختلف تھا۔ وہ سیاسی طاقت جو اب تک طبقۂ اشرافیہ کے پاس باقی رہ گئی تھی اور جسے وہ نئے صنعتی بورژوا طبقے کے دعووں کے توڑ کےلئے استعمال کرتا تھا، نئے معاشی مفاد سے ہم‌آہنگ نہیں رہی تھی۔ اشرافیہ کے خلاف ایک نئی جدوجہد ضروری ہو گئی تھی اور اس کا انجام نئی معاشی قوت کی فتح کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اول تو ہر قسم کی مخالفت کے باوجود، ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی انقلاب کے زیراثر، قانون اصلاحات (۵۱) (Reform Act) منظور کرایا گیا۔ اس نے بورژوا طبقے کے لئے پارلیمنٹ میں ایک مضبوط اور مسلم مقام مہیا کر دیا۔ اس کے بعد

'' اناج کے قوانین ،، * کی تنسیخ ہوئی جس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زمیں دار اشرافیہ پر بورژوا طبقے کی ، اور خاص طور پر اس کے سب سے زیادہ سرگرم و باعمل حصے ، یعنی کارخانہ‌داروں کی فوقیت مسلم کر دی — یہ بورژوا طبقے کی سب سے بڑی فتح تھی۔ لیکن ساتھ ہی یہ آخری فتح تھی جو اس نے بلاشرکت غیرے محض اپنے مفاد کے لئے حاصل کی تھی۔ بعد میں اسے جو کچھ فتوحات حاصل ہوئیں ان سب کو اسے ایک نئی سماجی طاقت کے ساتھ بانٹنا پڑا ، جو شروع میں اس کی حلیف تھی لیکن جلد ہی حریف بن گئی۔

صنعتی انقلاب نے بڑے بڑے کارخانہ‌دار سرمایہ‌داروں کے طبقے کو جنم دیا لیکن ساتھ ہی اس نے ایک اور طبقے — کارخانے میں کام کرنےوالے محنت کشوں کے طبقے — کو بھی جنم دیا جو تعداد میں اول‌الذکر سے کہیں زیادہ تھا۔ جس تناسب سے صنعتی انقلاب یکےبعد دیگرے صنعت کی تمام شاخوں پر چھاپہ مارتا گیا اسی تناسب سے یہ طبقہ رفتہ رفتہ تعداد اور طاقت کے اعتبار سے بڑھتا گیا۔ ۱۸۲۴ء ہی میں اس طبقے نے اپنی اس طاقت کا ثبوت دےدیا جب کہ اس نے پارلیمنٹ کو مجبور کرکے اس سے بادل ناخواستہ ان قوانین کو منسوخ کروا لیا جن کی رو سے مزدوروں کا سنگھٹن بنانا منع تھا (۵۲)۔ ریفارم ایجی‌ٹیشن کے دوران میں محنت کش ریفارم پارٹی کا تیزخیال (ریڈیکل) بازو تھے۔ ۱۸۳۲ء کے قانون نے انھیں حق‌رائے دھندگی سے محروم کر دیا تھا ، سو انھوں

---

* '' اناج کے قوانین ،، — ۱۸۱۵ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے زمیں داروں کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اناج کی درآمد پر بھاری محصول لگانے کے سلسلے میں جو قوانین پاس کئے ان کو '' اناج کے قوانین ،، (Corn Laws) کہتے ہیں۔ '' اناج کے قوانین ،، آبادی کے زیادہ مفلس حصوں کے شانوں پر ایک بھاری بوجھ تھے اور ساتھ ہی وہ صنعتی بورژوا طبقے کے لئے بھی منافع بخش نہیں تھے کیونکہ انھوں نے محنت کی قیمت بڑھا دی تھی ، گھریلو منڈی کی گنجائش کو گھٹا دیا تھا اور بدیسی تجارت کی راہ میں حائل تھے۔ یہ قوانین ۱۸۴۶ء میں منسوخ کئے گئے۔ (ایڈیٹر)

نے اپنی مانگوں کو حقوق نامۂ عوام (People's Charter) (٥٣) میں مرتب کیا ، اور اناج کے قوانین کی مخالف عظیم بورژوا لیگ کے مقابلے میں اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھنےوالی پارٹی — چارٹسٹ پارٹی (٥٤) — بنائی جو جدید زمانے میں محنت کشوں کی پہلی جماعت تھی -

اس کے بعد فروری اور مارچ ١٨٤٨ ء کے یورپی انقلابات آئے جن میں محنت کشوں نے بہت نمایاں حصہ لیا اور کم از کم پیرس میں تو انھوں نے ایسی مانگیں رکھیں جو سرمایہ‌داری سماج کے نقطۂ‌نظر سے قطعی ناقابل قبول تھیں - پھر عام رجعت‌پسندی کا دور آیا - پہلے تو ١٠ اپریل ١٨٤٨ ء کو چارٹسٹ لوگوں کو شکست ہوئی (٥٥) ، پھر اسی سال کے ماہ جون میں پیرس کے محنت کشوں کی بغاوت کو کچل دیا گیا ، اس کے بعد ١٨٤٩ ء میں اٹلی ، ہنگری اور جنوبی جرمنی میں بغاوتوں کی ناکامیاں واقع ہوئیں اور آخرکار ٢ دسمبر ١٨٥١ ء کو لوئی بوناپارٹ نے پیرس پر فتح پائی (٥٦) - کم از کم کچھ عرصے کےلئے تو مزدور طبقے کے مطالبات کا ہوا کچل ہی دیا گیا تھا — لیکن یہ چیز کس قدر مہنگی پڑی تھی ! جبکہ برطانوی بورژوا پہلے ہی عوام پر مذہبیت کا رنگ چڑھائے رکھنے کی ضرورت کا قائل تھا تو ان تمام تجربوں کے بعد تو وہ اس ضرورت کو جتنی شدت سے محسوس کرتا کم تھا ! اپنے یورپی ہم چشموں کے طنزواستہزا کی پروا کئے بغیر وہ مسلسل لاکھوں روپے جنتا کے درمیان مسیحی عقیدے کی تبلیغ و اشاعت پر خرچ کرتا رہا - اپنے دیسی مذہبی نظام پر قناعت نہ کرکے اس نے ” برادر جوناتھن ،، کی طرف رجوع کیا جس کا مذہب کو تجارتی حیثیت سے منظم کرنے میں کوئی ثانی نہیں تھا - برطانوی بورژوا نے امریکہ سے موڈی اور سانکی کے احیائے مذہب (Revivalism) (٥٧) کی درآمد کی اور آخرکار نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے ” نجات فوج ،، کی خطرناک مدد بھی قبول کرلی ، جو ابتدائی مسیحیت کی تعلیمات کا احیا کرتی ہے ، غریبوں کو خدا کے برگزیدہ‌بندوں کی حیثیت سے مخاطب کرتی ہے ، مذہبی طریقے سے سرمایہ‌داری کےخلاف لڑتی ہے ، اور اس طرح ایک حد تک مسیحیت کے ابتدائی دور کی طبقاتی آویزش کے بعض پہلوؤں کو پروان

چڑھاتی ہے جو ایک روز انھیں خوشحال لوگوں کےلئے درد سر بن‌سکتے ہیں جو آج ان کے واسطے بےدریغ روپیہ صرف کر رہے ہیں۔

یہ تاریخی ارتقا کا قانون معلوم ہوتا ہے کہ کسی یورپی ملک میں بھی بورژوا طبقہ اس طور پر بلا شرکت غیرے سیاسی اقتدار پر قابض نہیں ہوسکتا جس طرح جاگیرداری اشرافیہ قرون وسطی میں اس پر قابض رہا تھا — کم از کم زیادہ مدت کے لئے تو بورژوا طبقہ ایسا کر نہیں سکتا۔ فرانس تک میں، جہاں جاگیرداری کا بالکل ہی قلع قمع ہو چکا تھا، مجموعی طور پر بورژوا طبقہ ہر دفعہ صرف بہت ہی قلیل مدت کے لئے حکومت پر پوری طرح قابض رہ سکا ہے۔ لوئی فلپ کے دور حکومت میں — ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۸ء تک — بورژوا طبقے کا ایک بہت ہی چھوٹا حصہ سلطنت کرتا تھا اور اس کی بہت بڑی اکثریت حق رائے دہندگی پر بہت اونچی شرائط ہونے کے باعث اس سے محروم تھی۔ دوسری ریپبلک کے زمانے میں — ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۱ء تک — پورے بورژوا طبقے کی حکومت تھی لیکن صرف تین سال کے لئے۔ ان کی نااہلی کے سبب دوسری سلطنت معرض وجود میں آگئی۔ اور یہ صرف اب، تیسری ریپبلک کے وقت میں ہی ہو سکا ہے کہ بیس سال سے زائد سے عنان حکومت پورے بورژوا طبقے کے ہاتھ میں ہے، مگر اس میں ابھی سے انحطاط کے بھرپور آثار نظر آنے لگے ہیں۔ بورژوا طبقے کی پائدار حکومت تو صرف امریکہ ہی جیسے ملکوں میں ممکن ہو سکی ہے جہاں جاگیرداری ہمیشہ سے ناپید تھی اور سماج کا قیام شروع ہی سے بورژوا بنیادوں پر ہوا تھا۔ اور فرانس اور امریکہ تک میں بورژوا طبقے کے جانشین، محنت کش عوام، ابھی سے دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔

انگلستان میں بورژوا طبقے کو کبھی بھی مکمل اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ ۱۸۳۲ء کی فتح کے بعد بھی سارے سرکاری ادارے تقریباً مکمل طور پر جاگیرداری اشرافیہ کے قبضے میں رہے۔ دولت‌مند متوسط طبقے نے جس مسکینی کے ساتھ اس صورت‌حال کے سامنے سر جھکا دیا تھا وہ میرے لئے اس وقت تک بالکل ناقابل تصور تھی، جب تک کہ ایک بڑے لبرل کارخانہ‌دار مسٹر ولیم فارسٹر نے اپنی ایک پبلک تقریر میں یہ کہہ کر بریڈفورڈ کے نوجوانوں کو فرانسیسی زبان سیکھنے کی پراصرار ہدایت

نہیں کی کہ وہ ان کی دنیوی ترقی کا ایک وسیلہ ہے اور اس نے اس سلسلے میں اپنا تجربہ پیش کیا کہ جب اسے وزیر کابینہ کی حیثیت سے ان سماجی حلقوں سے رسم و راہ رکھنی پڑتی تھی جن کے یہاں فرانسیسی زبان کم‌از کم انگریزی جتنی ضروری چیز تھی ، تو وہ کس قدر کھسیایا ہوا دکھائی دیتا تھا ! واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے کا انگریز متوسط طبقہ عام طور پر بالکل جاہل نودولتیوں پر مشتمل تھا اور اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ ان بہتر اور اونچی قسم کے حکومتی عہدوں کو اشرافیہ کے لئے چھوڑ دے جن کے واسطے محض کنویں کے مینڈک کی سی تنگ‌نظری اور خودپسندی جس میں کاروباری *

---

* اور کاروباری معاملات میں بھی قومی عصبیت (Chauvinism) بہت ہی فضول صلاح‌کار ثابت ہوتی ہے ۔ ابھی کچھ عرصے پہلے تک ایک اوسط انگریز کارخانہ‌دار اس چیز کو بہت کسرشان سمجھتا تھا کہ کوئی انگریز اپنی زبان کے علاوہ اور کوئی زبان بولے اور وہ اس چیز پر نازاں بھی تھا کہ ”بچارے،، بدیسی انگلستان میں آکر بس گئے تھے اور انھوں نے اسے اپنی پیداوار کو باہر کی منڈیوں میں کھپانے کی مصیبت سے نجات دلا دی تھی ۔ اس نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا کہ اس طرح ان بدیسیوں نے ، جن میں زیادہ تر جرمن تھے ، برطانیہ کی بیرونی تجارت کے درآمد اور برآمد کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تھا اور انگریزوں کی تجارت تقریباً تمام‌تر نوآبادیوں اور چین ، ریاست‌ہائے متحدہ اور جنوبی امریکہ تک محدود ہو گئی تھی ۔ اسی طرح اس نے اس امر پر بھی کوئی توجہ نہیں کی کہ یہ جرمن باہر کے جرمنوں کے ساتھ تجارت کرتے تھے جنھوں نے دھیرے دھیرے تمام دنیا میں تجارتی نوآبادیات کا ایک جال سا بچھا دیا تھا ۔ لیکن جب تقریباً چالیس سال ادھر جرمنی نے سنجیدگی سے برآمد کے لئے مصنوعات تیار کرنی شروع کیں تو اسے اتنے مختصر سے عرصے میں اناج کی برآمد کرنے والے ملک سے اول درجے کے صنعتی ملک بننے میں نوآبادیوں کے اس جال سے بہت زیادہ مدد ملی ۔ تب ، تقریباً دس سال ادھر ، برطانوی کارخانہ‌دار گھبرانے لگا اور اس نے اپنے سفیروں اور قونصلوں سے پوچھنا

تیزفہمی کی تھوڑی سی چاشنی بھی ہو ، کافی نہیں ہے ، بلکہ اور دوسری اہلیتوں کی ضرورت ہے ۔ اب بھی متوسط طبقے کی تعلیم کے متعلق اخباروں میں جو لامتناہی بحث مباحثے ہوتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریز متوسط طبقہ اب تک خود کو بہترین تعلیم کے قابل نہیں سمجھتا اور کسی اس سے کم درجہ چیز کی تلاش کرتا ہے ۔ چنانچہ اناج کے قوانین کی تنسیخ کے بعد بھی اس چیز کو بالکل ٹھیک اور مناسب سمجھا گیا کہ وہ لوگ جنھوں نے یہ معرکہ سر کیا تھا — یعنی کوبڈن ، برائٹ اور فارسٹر وغیرہ — ملک کی سرکاری حکومت میں حصہ لینے سے محروم رہیں — تاوقتیکہ بیس سال بعد ایک نیا قانون اصلاحات (۵۸) ان کے لئے کابینہ کے دروازے وا نہ کر دے ۔ انگریز بورژوا طبقے کو آج تک اپنی سماجی کم‌مائگی کا اس قدر شدید احساس ہے کہ اس نے اپنے اور قوم کے خرچ پر محض آرائشی احدیوں کی ایک پوری فوج رکھ چھوڑی ہے جو تمام ریاستی تقریبوں میں قوم کے شایان شان نمائندگی کرتی ہے ، اور بورژوا طبقے کے لوگوں میں سے اگر کوئی اس منتخب اور برگزیدہ جماعت میں شامل ہونے کا اہل سمجھا جاتا ہے ، جس کی خود انھوں نے ہی تخلیق کی ہے، تو پورا طبقہ اس کو اپنی بڑی عزت افزائی سمجھتا ہے ۔

تو گویا صنعتی اور تجارتی متوسط طبقے نے زمین‌دار اشرافیہ کو سیاسی اقتدار سے پوری طرح نکالا بھی نہیں تھا کہ ایک اور مدمقابل ، مزدور طبقہ ، منظر پر نمودار ہو گیا ۔ چارٹسٹ تحریک اور یورپی انقلابوں کے بعد کی رجعت پسندی نے اور اس کے علاوہ ۱۸۴۸ ء سے ۱۸۶۶ ء تک انگریزی تجارت کی غیرمعمولی توسیع نے (جسے عامیانہ طریقے

شروع کیا کہ آخر اس کے خریدار اب اس کے ہاتھ سے کیوں نکلے جا رہے ہیں ؟ سب یکزبان ہو کر جواب دیتے تھے : (۱) تم خود اپنے خریدار کی زبان نہیں سیکھتے ہو بلکہ اس سے توقع کرتے ہو کہ وہ تمھاری زبان سیکھے ، (۲) اور یہی نہیں بلکہ تم تو اپنے خریدار کی ضروریات ، عادتوں اور مذاق سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے ، بلکہ اس سے توقع کرتے ہو کہ وہ تمھاری انگریزی عادات ، ضروریات اور مذاق کو اپنائے ۔ (اینگلس کا نوٹ)

سے صرف آزاد تجارت کا مرہون منت سمجھا جاتا ہے لیکن جو دراصل اس سے کہیں زیادہ ریلوں، بحری جہازوں اور عموماً سبھی ذرائع آمد و رفت کی شاندار توسیع و ترقی کی شرمندۂ احسان ہے) ایک دفعہ پھر مزدور طبقے کو لبرل پارٹی کا محتاج بنا دیا تھا جس کا وہ چارٹسٹ زمانے سے پہلے کی طرح اب بھی ریڈیکل بازو تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ مزدوروں کی حق رائے دہندگی کی مانگ کو ٹالنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اور جبکہ لبرل پارٹی کے ''وھگ،، (۵۹) لیڈروں نے ''بزدلی،، دکھائی تو ڈزرائیلی نے ''ٹوریوں،، (۶۰) کو ٹھوکے دے دے کر ان سے صحیح اور مناسب موقع پر نشستوں کی نئی تقسیم کے ساتھ بلدیوں (boroughs) میں رہائشی مکان رکھنےوالے خاندان کے حق رائے دہندگی کی بنا بھی ڈلوا دی اور اس طرح وھگ لیڈروں پر اپنی فوقیت ثابت کر دی۔ اس کے بعد پوشیدہ رائے دہندگی شروع ہوئی۔ پھر ۱۸۸۴ء میں خاندان کے حق رائے دہندگی کو بڑھا کر اس کا اطلاق اضلاع بلدہ (کاؤنٹی) پر بھی ہونے لگا اور نشستوں کی ایک اور تقسیم نو عمل میں لائی گئی جس کی وجہ سے انتخابی اضلاع میں کسی حد تک مساوات قائم ہو گئی۔ ان سب تدابیر نے خاصی بڑی حد تک مزدور طبقے کی انتخابی طاقت کو بڑھایا، یہاں تک کہ آج کم از کم ڈیڑھ، دو سو انتخابی حلقوں میں رائے دہندوں کی اکثریت مزدور طبقے پر مشتمل ہے۔ لیکن پارلیمانی طرز حکومت روایات کا احترام سکھانے کے لئے بہترین تعلیم گاہ ہے۔ جب متوسط طبقہ اس طبقے کو جسے لارڈ جان سینرس مذاق میں ''ہمارا پرانا اشرافیہ،، کہتا تھا، رعب و احترام کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتا تھا، اس وقت محنت کش عوام اس طبقے کو جسے ''ان سے بالاتر،، کہا جاتا تھا — یعنی متوسط طبقے کو — اسی طرح عزت و تعظیم کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ پندرہ سال ادھر تک برطانوی مزدور مثالی مزدور تھا جس کا حفظ مراتب کا خیال، اپنے آقا کے مرتبے کا احترام اور اپنے حقوق منوانے کے سلسلے میں جس کا ضبط و اعتدال — یہ چیزیں ہمارے ''کتھیڈر سوشلسٹ،، (Katheder-Socialist) (۶۱) مدرسۂ خیال کے پیرو، جرمن ماہرین معاشیات کے آنسو پونچھ دیتی تھیں جو خود اپنے ہم‌قوم مزدوروں کے ناقابل علاج کمیونسٹ اور انقلابی رجحانات سے نالاں تھے۔

لیکن انگریز متوسط طبقے کے لوگ — جو بڑے اچھے کاروباری ہوتے ہیں — جرمن پروفیسروں سے زیادہ دوربین تھے ، انھوں نے محض بدرجۂ مجبوری مزدور طبقے کو اپنے اقتدار میں شریک کیا تھا — انھوں نے چارٹسٹ زمانے میں دیکھ لیا تھا کہ یہ '' ہٹا کٹا لیکن بدباطن لڑکا ،، — یعنی عوام — کیا کچھ کر سکتا ہے اور اس کے بعد سے وہ حقوق‌نامۂ عوام کے زیادہ‌تر حصے کو سلطنت متحدہ برطانیہ کے تحریری قوانین میں شامل کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اب تو ہمیشہ سے بھی زیادہ اس بات کی ضرورت تھی کہ عوام کو اخلاقی ذرائع سے قابو میں رکھا جائے اور ان تمام اخلاقی ذرائع میں جن کی مدد سے عوام پر اثر ڈالا جاتا ہے مذہب ہمیشہ سے اولین اور سب سے زیادہ موثر حربہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہی سبب تھا اسکول بورڈوں میں پادریوں کی اکثریت کا ، اور یہی سبب تھا کہ رسوم‌پرستی (۶۲) سے لے کر ''نجات‌فوج،، تک ہر قسم کی احیائے مذہب کی تحریکوں کو مدد پہنچانے کے لئے بورژوا طبقے نے روزافزوں طور پر اپنے اوپر ٹیکس لگایا۔

اور اب یورپی بورژوا کی معقول‌پسندی اور مذہب کی طرف سے بے پروائی پر برطانوی سفیدپوشوں کی فتح کا وقت آیا۔ فرانس اور جرمنی کے مزدور باغی ہو گئے تھے۔ وہ سوشلزم کی بیماری کا بری طرح شکار ہو چکے تھے اور — خاصی معقول وجوہ کی بنا پر — انھیں اس چیز کی قطعی فکر نہیں تھی کہ اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے وہ جو ذرائع اختیار کریں وہ قانونی ہی ہوں۔ اس موقع پر وہ ''ہٹا کٹا لڑکا،، روز بروز زیادہ بدباطن ہوتا گیا۔ فرانسیسی اور جرمن بورژوا طبقے کے لئے بس ایک یہی آخری چارۂ کار رہ گیا تھا کہ وہ خاموشی سے اپنی معقول‌پسندی کو خیرباد کہہ دے ، جس طرح ایک نوعمر لڑکا ، جو بڑی شان سے اکڑتا ہوا اپنا جلتا ہوا سگار لے کر جہاز پر آتا ہے ، متلی اور دوران سر شروع ہوتے ہی خاموشی سے سگار گرا دیتا ہے۔ مذہب کی تضحیک کرنے‌والوں نے ایک ایک کر کے مذہبی جامہ پہن‌لیا اور چرچ کا اور اس کے عقیدوں اور رسوم کا احترام سے ذکر کرنے لگے۔ اور تو اور وہ اس حد تک ان رسوم کی پابندی بھی کرنے لگے جس کے بغیر گزارہ نہیں تھا۔ فرانسیسی بورژوا جمعے کے دن گوشت کھانے سے پرہیز کرنے لگا اور جرمن بورژوا

اتوار کے روز اپنی گرجا کی نشست پر بیٹھ کر لمبے لمبے پروٹسٹنٹ وعظ سننے لگا۔ فلسفۂ مادیت کے ہاتھوں انھوں نے زک اٹھائی تھی۔ «Die Religion muss dem Volk erhalten werden» — مذہب کو عوام کے لئے زندہ رکھنا چاہئے — یہ سماج کو مکمل تباہی سے بچانے کا واحد اور آخری ذریعہ تھا۔ بدقسمتی سے ان لوگوں کو یہ نکتہ اس وقت تک نہیں سوجھ سکا جب تک کہ وہ مذہب کو کمزور کرنے کے لئے اپنی تمام‌تر بہترین کوششیں صرف نہیں کر چکے۔ اور اب برطانوی بورژوا کے پھبتی کسنے کرنے کی اور یہ کہنے کی باری آئی ”احمقو، میں تو تمھیں دو سو سال پہلے ہی یہ کر سکھا سکتا تھا!“

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نہ تو برطانوی بورژوا کا مذہبی اڑیل پن اور نہ ہی یورپی بورژوا کی بعد ازوقت (post festum) تبدیلیٔ عقائد پرولتاری دھارے کو روکنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ پرانی لکیر پیٹنا تاخیر اور سست‌رفتاری پیدا کرنےوالی ایک اہم قوت ہے، وہ تاریخ کی جامدوساکن طاقت (vis inertiae) ہے، لیکن چونکہ وہ محض ایک مفعولی قوت ہے اس‌لئے کبھی نہ کبھی ضرور توڑ دی جائےگی، اور اس طرح مذہب سرمایہ‌داری سماج کا لازوال پشت‌پناہ نہیں رہ سکتا۔ اگر کسی سماج میں ہمارے قانونی، فلسفیانہ اور مذہبی خیالات‌ونظریات اس سماج میں رائج‌وموجود معاشی تعلقات کا کم‌وبیش دور یا نزدیک کا نتیجہ ہیں تو ان تعلقات میں ایک مکمل تبدیلی واقع ہونے کی صورت میں وہ آخرکار اس تبدیلی کے اثرات اور نتائج سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اگر ہم مافوق‌الفطری الہام و وحی پر اعتقاد رکھتے ہوں تو الگ بات ہے ورنہ ہمیں تسلیم کرنا ہی پڑےگا کہ کوئی مذہبی اصول و عقائد ایک گرتے ہوئے سماج کی عمارت کو تھامنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔

واقعہ یہ ہے کہ انگلستان میں بھی ایک دفعہ پھر محنت کشوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ طرح طرح کی روایات میں جکڑے ہوئے ہیں — ایک طرف بورژوا روایات ہیں، مثلاً یہ عام عقیدہ کہ دو پارٹیوں — قدامت‌پرست (Conservative) اور آزادخیال (Liberal) پارٹیوں — کے علاوہ اور کوئی تیسری جماعت ہو ہی نہیں سکتی اور مزدور طبقے کو عظیم لبرل پارٹی کے وسیلے اور

توسط سے ھی اپنی مکتی تلاش کرنی ھوگی ۔ اور دوسری طرف محنت کشوں کی روایات ھیں جو ان کی پہلی آزادانہ اور بطور خود میدان عمل میں کودنے کی آزمائشی کوششوں کا ورثہ ھیں ، مثلاً بہت سی پرانی مزدور سبھاؤں (ٹریڈ یونینوں) میں ان تمام امیدواروں کا داخلہ بند ھونے کا مطلب جو باقاعدہ شاگردی کے دور سے نہیں گزرے ھیں ھر ایسی مزدور سبھا میں اس کے اپنے غدار ھڑتال توڑ مزدوروں کا پیدا ھونا اور پروان چڑھنا تھا ۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود انگریز مزدور طبقہ برابر آگے بڑھ رھا ھے جیسا کہ خود پروفیسر برنتانو کو رنج و افسوس کے ساتھ اپنے روحانی بھائیوں ''کتھیڈر سوشلسٹوں،، کو بتانا پڑا تھا ۔ انگریز مزدور طبقہ ، انگلستان کی اور تمام چیزوں کی طرح دھیرے دھیرے اور نپے تلے قدموں سے آگے بڑھ رھا ھے ، اس کے یہاں کہیں جھجک اور تامل ھے تو کسی جگہ کچھ آزمائشی قسم کی ، کم‌وبیش بےثمر اور بےنتیجہ کوششیں ھیں ۔ یہ کبھی کبھی سوشلزم کے نام سے انتہائی محتاط قسم کی بداعتقادی دکھاتا ھوا آگے بڑھتا ھے مگر ساتھ ھی ساتھ سوشلزم کے جوھر کو جذب بھی کرتا جاتا ھے ۔ یہ تحریک بڑھ رھی ھے اور یکے بعد دیگرے مزدوروں کے مختلف حصوں کو اپنی گرفت میں لا رھی ھے ۔ اب اس نے لندن کے ''مشرقی محلے،، (East End) (۶۳) کے اونگھتے ھوئے غیرھنرمند مزدوروں کو بھی جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا ھے اور ھم سب جانتے ھیں کہ ان نئی قوتوں نے اس کے عوض اس تحریک کو کیسی تڑپ اور توانائی عطا کی ھے ۔ اگر اس تحریک کی رفتار بعض بےصبر لوگوں کے نزدیک کافی تیز نہیں ھے تب بھی انھیں یہ نہیں بھولنا چاھئے کہ مزدور طبقے ھی نے انگریزی کردار کی بہترین خصوصیات کو زندہ رکھا ھے ، اور انھیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاھئے کہ انگلستان میں جب ایک بار ترقی کی راہ میں کوئی قدم اٹھا لیا جاتا ھے تو پھر وہ عام طور پر پیچھے نہیں ھٹتا ۔ اگر چارٹزم کے پرانے علم برداروں کے بیٹے — ان وجوہ کی بنا پر جن کی اوپر تشریح کر دی گئی ھے — ان کے معیار پر پورے نہیں بھی اترے تو ان کے پوتوں کی ھونہاری تو صاف بتا رھی ھے کہ وہ اپنے اجداد کے سپوت ثابت ھوں گے ۔

لیکن یورپ کے مزدور طبقے کی فتح کا انحصار صرف انگلستان ھی پر

نہیں ہے ۔ اس کے حصول کے لئے کم از کم انگلستان ، فرانس اور جرمنی کا تعاون لازمی شرط ہے (۶۴) ۔ فرانس اور جرمنی دونوں ملکوں میں مزدور طبقے کی تحریک انگلستان سے کہیں آگے ہے ۔ اور جرمنی میں تو تحریک کامیابی سے کچھ ایسی بہت دور نہیں رہ گئی ہے ۔ اس نے پچھلے پچیس سال میں وہاں جو ترقی کی ہے اس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی ۔ یہ تحریک روزافزوں تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے ۔ اگر جرمن متوسط طبقے نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ افسوسناک حد تک سیاسی صلاحیت، ڈسپلن، ہمت، زور و توانائی اور مستقل مزاجی سے محروم ہے تو دوسری طرف جرمن مزدور طبقے نے ان ساری صفات کا حامل ہونے کے فراواں ثبوت دے دئے ہیں ۔ چار سو سال پہلے جرمنی یورپ کے متوسط طبقے کے پہلے انقلاب کا نقطۂ آغاز تھا، اور اب جو حالات ہیں ان کے پیش نظر کیا یہ چیز بالکل خارج از ممکنات ہے کہ جرمنی یورپ کے پرولتاری طبقے کی پہلی عظیم فتح کا گہوارہ بھی ہو ؟

۲۰ اپریل ۱۸۹۲ ء

فریڈرک اینگلس

یہ مقدمہ سب سے پہلے اینگلس کی تصنیف «Socialism Utopian and Scientific» کے ساتھ شائع ہوا جو لندن میں ۱۸۹۲ء میں چھپی تھی ۔ بیک وقت رسالہ «Die Neue Zeit» کے ۱۸۹۳ء — ۱۸۹۲ء کے شماروں میں جرمن زبان میں شائع ہوا ۔

ترجمہ ۱۸۹۲ ء کی انگریزی اصل کے مطابق کیا گیا ۔

یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم

۱

عہد جدید کا سوشلزم بنیادی طور پر ایک طرف تو ان طبقاتی مخالفتوں کے شعور کی دین ہے جو موجودہ سماج میں ملکیت‌داروں اور محروم ملکیت افراد کے درمیان، سرمایہ‌داروں اور اجرتی مزدوروں کے درمیان پائی جاتی ہیں اور دوسری طرف وہ دین ہے پیداوار میں نراج کی۔ لیکن اپنی نظریاتی شکل میں جدید سوشلزم سب سے پہلے ظاہر بظاہر ان اصولوں کی ایک زیادہ منطقی توسیع کی طرح نمودار ہوتا ہے جن کی بنیاد اٹھارھویں صدی کے عظیم فرانسیسی فلسفیوں نے رکھی تھی۔ ہر نئے نظرئے کی طرح جدید سوشلزم کو بھی شروع میں اپنا تعلق اس عقلی سرمائے سے قائم کرنا پڑا جو اس وقت تیار موجود تھا، باوجودیکہ اس کی جڑیں مادی معاشی حالات میں بہت گہرائی تک اتری ہوئی تھیں۔

وہ عظیم انسان جنھوں نے فرانس میں لوگوں کے ذھنوں کو آنے والے انقلاب کے لئے تیار کیا تھا خود شدت پسند انقلاب‌پرست تھے۔ وہ کسی بھی قسم کے خارجی اقتدار کو نہیں مانتے تھے۔ مذھب، علوم طبیعی، سماج، سیاسی ادارے — ہر چیز کو تیز اور کڑی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا: ہر چیز کے لئے ضروری تھا کہ وہ عقل کی کرسیٔ عدالت کے حضور میں اپنے وجود کا جواز پیش کرے ورنہ اپنے وجود ھی سے دست بردار ھو جائے۔ عقل ہر چیز کا واحد پیمانہ بن گئی تھی۔ یہ وہ

زمانہ تھا جب ہیگل کے الفاظ میں دنیا سر کے بل کھڑی تھی * ۔ اول تو اس معنی میں کہ انسانی سر (ذہن) اور اس کے فکر سے پیدا ہونےوالے اصول تمام انسانی افعال اور تعلقات کی بنیاد ہونے کا دعوی کرتے تھے ، لیکن رفتہ رفتہ اس دوسرے وسیع تر معنی میں بھی کہ حقیقت کو ، جو ان اصولوں کے برعکس تھی ، واقعی الٹ دیا گیا تھا ۔ سماج اور حکومت کی ہر اس شکل کو جو اس وقت تک موجود تھی اور تمام پرانے روایتی خیالات کو خلاف عقل کہہ کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا تھا ، اس وقت تک دنیا نے خود کو صرف تعصبات کی قیادت میں دے رکھا تھا ، ماضی کی تمام چیزیں صرف قابل رحم اور قابل تحقیر تھیں ۔

---

* یہ ٹکڑا انقلاب فرانس کے متعلق ہے : '' قانون کے تصور اور فہم نے یکبارگی اپنے وجود کو محسوس کرایا اور ان کے مقابلے میں باطل کا پرانا ڈھانچہ کھڑا نہیں رہ سکا ۔ لہذا اس تصور قانون کی روشنی میں اب ایک آئین بن گیا ہے اور اب سے ہر چیز کی بنیاد اسی پر ہونی چاہئے ۔ جب سے سورج فضائے سماوی میں موجود ہے اور سیارے اس کے گرد گھومتے ہیں ، یہ نظارہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ انسان سر کے بل — یعنی خیال پر — کھڑا ہو اور اس خیال کے مطابق حقیقت کی تشکیل کرے ۔ پہلے انکساگورس نے کہا تھا کہ Nous یا عقل دنیا پر حکومت کرتی ہے ، لیکن اب پہلی دفعہ انسان نے یہ بات مانی کہ خیال کو ذہنی حقیقت پر حکومت کرنی چاہئے ۔ اور یہ ایک شاندار طلوع آفتاب تھا ۔ تمام سوچنے والی ہستیوں نے اس مبارک اور مقدس دن پر خوشیاں منانے میں حصہ لیا ۔ اس وقت انسان پر ایک لطیف و پاکیزہ جذبہ طاری و ساری ہو گیا تھا ۔ دنیا پر ایک جوش خرد چھایا ہوا تھا گویا اس وقت '' قانون الہی '' میں اور دنیا میں صلح ہو گئی تھی ۔ '' (ہیگل : '' فلسفۂ تاریخ '' ، ۱۸۴۰ ء ، صفحہ ۵۳۵ ۔) کیا اب وقت نہیں آگیا ہے کہ مرحوم پروفیسر ہیگل کی ان مخرب و باغیانہ اور اجتماعی خطرے کی حامل تعلیمات کے خلاف سوشلسٹ دشمن ہنگامی قانون (۶۵) لاگو کر دیا جائے ؟ (اینگلس کا نوٹ)

اب پہلی دفعہ دن کی روشنی ، عقل کی سلطنت ، نمودار ہوئی تھی ۔ اب سے توہمات ، ناانصافی ، مخصوص مراعات اور ظلم و جبر کی جگہ ابدی صداقت ، ابدی حق ، فطرت پر مبنی مساوات اور اٹل انسانی حقوق کی حکمرانی ہوگی ۔

آج ہم جانتے ہیں کہ یہ عقل کی سلطنت بورژوا طبقے کی نام‌نہاد مثالی سلطنت سے زیادہ اور کچھ نہیں تھی ، ہم جانتے ہیں کہ اس ابدی حق کی تعبیر تھی بورژوا عدل ، اور یہ مساوات قانون کے سامنے بورژوا مساوات سے زیادہ اور کسی معنی کی حامل نہیں تھی ، ہم جانتے ہیں کہ بورژوا ملکیت کے لئے یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ وہ انسان کے بنیادی حقوق میں سے ایک ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عقل کی حکومت ، روسو کا معاہدۂ عمرانی (٦٦) صرف ایک جمہوری بورژوا ریپبلک کی شکل میں وجود میں آیا اور صرف اسی ایک شکل میں وجود میں آسکتا تھا ۔ اپنے پیش‌رووں کی طرح اٹھارھویں صدی کے عظیم مفکر بھی ان حدود سے آگے نہیں جا سکتے تھے جو ان کے دور نے ان پر عائد رکھی تھیں ۔

لیکن دولت‌مند شہریوں (burghers) کی ، جو باقی تمام سماج کی نمائندگی کے دعوےدار تھے ، اور جاگیردار اشرافیہ کی باہمی مخالفت کے پہلو بہ پہلو استحصالی طبقوں اور مظلوم طبقوں ، دولت مند عیش کوشوں اور غریب محنت کشوں کی عام باہمی آویزش بھی تھی ۔ اور ٹھیک یہی چیز تھی جس نے بورژوا طبقے کے نمائندوں کے لئے یہ امکان پیدا کر دیا کہ وہ خود کو صرف ایک مخصوص طبقے کے نہیں بلکہ تمام مصیبت‌زدہ انسانیت کے نمائندوں کی حیثیت سے پیش کریں ۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اپنے معرض وجود میں آنے کے وقت سے ہی بورژوا طبقے کی ضد اس کے شانوں پر سوار تھی : اجرتی مزدوروں کے بغیر سرمایہ‌داروں کا وجود ممکن نہیں ہے اور جس تناسب سے عہد وسطی کے گلڈ (Guild) * کے استاد کاریگر عہد جدید کے بورژوا طبقے میں تبدیل ہوئے اسی تناسب سے گلڈ کے اجرت‌یافتہ کاریگر اور گلڈ سے باہر کے روزانہ کام

---

* قرون وسطی میں یورپ میں ہم پیشہ دستکاروں کی انجمن ۔ (ایڈیٹر)

کرنےوالے مزدور پرولتاری طبقے میں تبدیل ہوتے گئے۔ اور گو بورژوا طبقہ، مجموعی طور پر، اشرافیہ کےخلاف اپنی کشمکش کے دوران میں اس زمانے کے مختلف محنت کش طبقوں کے مفاد کی نمائندگی کا بھی دعوی کرسکتا تھا، لیکن ہر عظیم بورژوا تحریک میں اس طبقے کی، جو عہدجدید کے پرولتاریہ کا کم‌وبیش ترقی‌یافتہ پیش‌رو تھا، اپنی الگ اور آزادانہ تحریکیں ضرور پیدا ہوجاتی تھیں۔ مثلاً جرمن اصلاح دین اور کسانوں کی جنگ کے زمانے میں اناباپٹسٹ (٦٧) اور تھومس میونتسر، عظیم انقلاب انگلستان کے دوران میں لیویلر (٦٨) اور عظیم انقلاب‌فرانس میں بابیف۔

اس طبقے کی، جو اب تک پوری طرح ترقی‌یافتہ نہیں تھا، انقلابی بغاوتوں سے مطابقت رکھتے ہوئے نظری دعوے بھی موجود تھے۔ مثلاً سولھویں اور سترھویں صدیوں میں مثالی سماجی حالات کی یوٹوپیائی تصویریں (٦٩) اور اٹھارھویں صدی میں خود کمیونسٹ نظریے (موریلی اور مابلی)۔ اب مساوات کا مطالبہ صرف سیاسی حقوق تک محدود نہیں رہا تھا، اس نے پھیل کر افراد کے سماجی حالات کو بھی احاطہ کر لیا تھا۔ صرف طبقاتی مراعات ہی کا نہیں بلکہ خود طبقاتی امتیازات کا انسداد ہونا تھا۔ ایک رہبانیت‌پسند اور اسپارٹائی قسم کا کمیونزم جو زندگی کے تمام عیش و تفریح کے خلاف تھا نئی تعلیمات کی اولین شکل تھا۔ اس کے بعد تین عظیم یوٹوپیائی آئے: سین سائمون، جس کے لئے پرولتاری تحریک کے ساتھ ساتھ متوسط طبقے کی تحریک اب تک ایک خاص اہمیت رکھتی تھی، فورئے اور اووین، جس نے اس ملک میں، جہاں سرمایہ‌دارانہ پیداوار سب سے زیادہ ترقی‌یافتہ تھی، اور اس صورت حال سے پیدا ہونے والے تضادوں کے زیراثر، باضابطہ طور پر طبقاتی امتیاز کو ختم کرنے کے سلسلے میں اپنی وہ تجاویز مرتب کیں جن کا فرانسیسی مادیت سے براہ‌راست تعلق تھا۔

ایک چیز ان تینوں میں مشترک ہے — ان میں سے ایک بھی اس پرولتاریہ کے مفاد کے نمائندے کی حیثیت سے سامنے نہیں آتا جسے اس دوران میں تاریخی ارتقا نے جنم دے دیا تھا۔ فرانسیسی فلسفیوں کی طرح وہ بھی یہ دعوی نہیں کرتے کہ شروع میں وہ ایک خاص طبقے کو

آزادی دلائیں گے بلکہ ایک دم پوری انسانیت کو آزاد کرانے کا دعوی کرتے ہیں۔ انہیں کی طرح وہ بھی عقل کی سلطنت اور ابدی عدل کو بروئے کار لانے کے خواہش‌مند ہیں لیکن اس سلطنت کا جو تصور ان کے سامنے ہے اس میں اور فرانسیسی فلسفیوں کے تصور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کیونکہ ہمارے ان تین سماجی مصلحوں کی نظر میں ان فلسفیوں کے اصولوں پر مبنی بورژوا دنیا اسی قدر خلاف عقل اور خلاف انصاف ہے جتنا کہ جاگیرداری اور اس سے پہلے کے اور تمام سماجی دور ہیں، لہذا اسی قدر آسانی سے وہ بھی کوڑے کے ڈھیر پر جگہ پا جاتی ہے۔ اگر دنیا پر اب تک عدل اور عقل محض کی حکمرانی نہیں ہوئی ہے تو اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ لوگوں نے ان دونوں چیزوں کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا تھا۔ بس ایک صاحب فکر و نظر کی ضرورت تھی جو اب نمودار ہو گیا ہے اور جو صداقت کو سمجھتا ہے۔ یہ چیز کہ اب ایک ایسا فرد نمودار ہو گیا ہے، اور یہ کہ اب صداقت کو اچھی طرح سمجھ لیا گیا ہے، ایک ناگزیر واقعہ نہیں ہے جو تاریخی ارتقا کی زنجیر کی ایک لازمی کڑی ہو، بلکہ محض حسن اتفاق ہے۔ وہ آسانی سے پانچ سو سال قبل بھی پیدا ہو سکتا تھا اور اس طرح وہ انسانیت کو ان پانچ سو سالوں کی غلطیوں، کشمکشوں اور مصائب کا شکار ہونے سے بچا سکتا تھا۔

ہم نے دیکھا کہ اٹھارھویں صدی کے فرانسیسی فلسفی، انقلاب کے پیش‌رو، کس طرح عقل کو ہر موجود شے کا واحد حکم مان کر اس کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ایک عقل پر مبنی حکومت اور عقل پر مبنی سماج کی نیو رکھی جانی تھی، ہر اس چیز کا جو ابدی عقل کے خلاف تھی بےرحمی سے قلع قمع کیا جانا تھا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ یہ ابدی عقل اٹھارھویں صدی کے بورژوا بنتے ہوئے شہری کی مثالی عقل و فہم کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ انقلاب فرانس نے اس عقلیت پسند سماج اور حکومت کو عملی جامہ پہنا دیا تھا۔

لیکن نیا نظام جو پہلے حالات کے مقابلے میں نسبتاً معقول تھا مطلق طور پر مبنی بہ عقل ثابت نہیں ہوا۔ عقل کی بنیاد پر قائم‌شدہ ریاست کی عمارت بالکل ہی ڈھے گئی۔ روسو کے معاہدۂ عمرانی کو دہشت

گردی میں عملی شکل ملی ۔ اس دہشت گردی سے بورژوا طبقے نے ، جو خود اپنی سیاسی اہلیت پر یقین کھو بیٹھا تھا ، پہلے تو مجلس نظما (Directorate) (۷۰) کی رشوت‌خوری اور بے ایمانی میں اور آخرکار نپولینی مطلق العنانی کے زیرسایہ پناہ لی ۔ موعودہ ابدی امن مسلسل غاصبانہ جنگ میں تبدیل ہوگیا ۔ عقل کی بنیاد پر قائم‌شدہ سماج کا حشر بھی اس سے کچھ بہتر نہیں ہوا ۔ غریب اور امیر کے درمیان جو مخالفت تھی اور جسے گلڈ اور دوسری مخصوص مراعات نے کسی حد تک کم کر رکھا تھا وہ ان کے ختم ہونے اور چرچ کے خیرانی اداروں کے بند ہو جانے سے عام خوش‌حالی میں تبدیل ہونے کے بجائے اور بھی شدید ہو گئی تھی ۔ جاگیرداری زنجیروں کو توڑ کر ”ملکیت کی آزادی“ جو اب پوری طرح قائم ہو چکی تھی ، چھوٹے سرمایہ‌داروں اور چھوٹے کسان ملکیت‌داروں کے لئے صرف اس بات کی آزادی ثابت ہوئی کہ بڑے سرمایہ‌داروں اور بڑے زمیں‌داروں کے زبردست مقابلے سے دب کر اپنی چھوٹی ملکیت کو ان بڑے ملکیت‌داروں کے ہاتھ بیچ ڈالیں ۔ اور اس طرح جہاں تک چھوٹے سرمایہ‌داروں اور کسان ملکیت‌داروں کا تعلق ہے یہ آزادی ”ملکیت سے آزادی“ بن گئی ۔ سرمایہ‌داری بنیاد پر صنعت کے ارتقا نے محنت کشوں کے افلاس اور بدحالی کو سماج کے وجود کی شرط بنا دیا ۔ کارلائل کے الفاظ میں نقد ادائگی انسانوں کے مابین روز بروز واحد رابطہ بنتی چلی گئی ۔ جرائم کی تعداد ہر سال بڑھتی ہی چلی گئی ۔ پہلے جاگیرداری عیب کھلم کھلا ، دن دھاڑے ہوا کرتے تھے ، اب بھی گو وہ پوری طرح مٹے تو نہیں تھے لیکن کم از کم پس‌منظر میں ضرور دھکیل دئے گئے تھے ۔ اور ان کی جگہ بورژوا عیب ، جو اب تک چوری چھپے ہوا کرتے تھے ، بڑے دھڑلے سے منظر عام پر آنے لگے ۔ تجارت روزافزوں طور پر دھوکہ‌بازی بنتی چلی گئی ۔ انقلابی نعرے (۷۱) کی ”اخوت“ کی تعبیر ہوئی مقابلے کی جنگ کی حیلہ‌سازیوں اور رقابتوں میں ۔ تشدد کے ذریعہ ظلم و ستم کی جگہ رشوت‌ستانی وغیرہ نے لے لی ، فرد کو سماج میں اونچا اٹھانے کے لئے تلوار کی جگہ سونا اہم‌ترین چیز بن گیا ۔ پہلی رات کا حق جاگیرداری مالکوں سے بورژوا کارخانہ‌داروں کی طرف منتقل ہوگیا ۔ عصمت‌فروشی کی وہ گرم بازاری ہوئی جو کبھی اس سے پہلے دیکھنے سننے

میں نہیں آئی تھی ۔ شادی اب بھی پہلے ھی کی طرح عصمت‌فروشی کی قانونی شکل اور سرکاری پردہ بنی رھی ، مزیدبرآں زناکاری کی وافر اور بھرپور فصلیں اس کے ساتھ ساتھ پھلتی پھولتی رھیں ۔

مختصر یہ کہ فلسفیوں کے دلکش اور شان‌دار وعدوں کے مقابلے میں '' عقل کی فتح ،، کے جنم دئے ھوئے سماجی اور سیاسی ادارے بےحد مایوس کن آڑی ترچھی لکیر ثابت ھوئے ۔ بس اس مایوسی کو الفاظ کا جامہ پہنانے والے لوگوں کی کمی تھی ۔ اور وہ لوگ اگلی صدی کے آغاز میں نمودار ھو گئے ۔ ۱۸۰۲ء میں سین سائمون کے '' خطوط جنیوا ،، شائع ھوئے ۔ ۱۸۰۸ء میں فورئے کی پہلی تصنیف نمودار ھوئی ، گو اس کے نظرئے کی داغ بیل تو ۱۷۹۹ء ھی میں پڑ چکی تھی ۔ اور یکم جنوری ۱۸۰۰ء کو رابرٹ اووین نے نیولانارک (۷۲) کی قیادت کا بیڑا اٹھایا ۔

لیکن اس زمانے تک سرمایہ‌داری طریق پیداوار اور اس کے ساتھ ساتھ بورژوا اور پرولتاری طبقوں کی باھمی آویزش پورے طور پر پختہ نہیں ھوئی تھی ۔ جدید صنعت سے جو کچھ ھی دن پہلے انگلستان میں شروع ھوئی تھی اب تک فرانس میں کوئی واقف بھی نہیں تھا ۔ لیکن جدید صنعت ایک طرف تو ان کشمکشوں کو ھوا دیتی ھے اور تیزتر بناتی ھے ، جو طریق پیداوار میں انقلاب اور طریق پیداوار کے سرمایہ‌داری کردار کے خاتمے کو لازمی بنا دیتی ھیں — یہ کشمکشیں صرف ان طبقات کے مابین ھی نہیں ھوتیں جنھیں جدید صنعت نے جنم دیا ھے بلکہ یہ اس کی تخلیق کردہ تبادلے کی شکلوں اور خود پیداواری قوتوں کے درمیان بھی ھوتی ھیں ۔ دوسری طرف جدید صنعت ان بہت ھی عظیم الشان پیداواری قوتوں کے اندر ان کشمکشوں کو ختم کرنے کے ذرائع بھی پیدا کر دیتی ھے ۔ لہذا اگر ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ نئے سماجی نظام سے پیدا ھونے والی کشمکشوں کی تشکیل ابھی شروع ھی ھوئی تھی تو یہ بات ان کشمکشوں کو ختم کرنے کے ذرائع پر اور بھی اچھی طرح صادق آتی ھے ۔ پیرس کے '' نادار ،، عوام دھشت گردی کے دنوں میں لمحاتی طور پر اقتدار حاصل کر سکے ، اور اس طرح بورژوا طبقے کے خلاف مرضی انھوں نے بورژوا انقلاب کو فتح کی منزل تک پہنچایا ، لیکن ان کے ایسا کرنے

سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ اس زمانے کے حالات کے تحت ان کا اقتدار پائدار ہونا کس قدر ناممکن تھا۔ پرولتاریہ، جس نے اس وقت پہلی مرتبہ خود کو ان ''نادار،، عوام کی سطح سے اٹھا کر ایک نئے طبقے کے مرکز میں تبدیل کیا تھا، ابھی علیحدہ اور آزادانہ سیاسی عمل کے قطعی ناقابل تھا، وہ ایک مظلوم اور مصیبت‌زدہ جماعت کی حیثیت سے نمودار ہوا جو اپنی مدد آپ کرنے کے قابل نہیں تھی اور جسے اسی باعث حد سے حد، باہر سے یا اوپر سے مدد پہنچائی جا سکتی تھی۔

اس تاریخی صورت حال کا اثر سوشلزم کے بانیوں کے ذہنوں پر بھی تھا۔ سرمایہ‌داری طریق پیداوار کے خام اور بھونڈے حالات اور بھونڈے طبقاتی حالات سے مطابقت رکھتے ہوئے خام اور بھونڈے نظرئے بھی وجود میں آ گئے۔ یوٹوپیائی فلسفیوں نے سماجی مسائل کا حل، جو اس وقت تک ادھ کچرے معاشی حالات کے اندر چھپا ہوا تھا، انسانی دماغ کے ذریعے ڈھونڈھ نکالنے کی کوشش کی۔ سماج میں ناانصافیوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تو ان ناانصافیوں کو دور کرنا عقل کا فرض ٹھیرا۔ سو یہ ضروری تھا کہ ایک نیا اور زیادہ کامل سماجی نظام دریافت کیاجائے اور اس نظام کو باہر سے، پرچار کے ذریعے، اور جہاں کہیں ممکن ہو مثالی تجربوں کے ذریعے سماج کے سر تھوپا جائے۔ یوٹوپیائی ہونے کی وجہ سے ناکامی کا منہ دیکھنا تو ان نئے سماجی نظاموں کا مقدر ہی تھا۔ جتنی زیادہ تفصیل اور تکمیل کے ساتھ ان کی تشکیل اور ترتیب کی جاتی تھی اسی قدر زیادہ ناگزیر خطرہ اس بات کا تھا کہ وہ محض خیالی پلاؤ بن کر رہ جائیں‌گے۔

ایک بار یہ باتیں مان لی گئیں تو ہمیں مسئلے کے اس پہلو پر، جو اب مکمل طور پر قصۂ پارینہ بن چکا ہے، اور زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اسے چھوٹے موٹے ہیچ مقدار ادیبوں کے لئے چھوڑ سکتے ہیں تاکہ وہ بڑی گمبھیرتا کے ساتھ ان خیالی باتوں کی بال کی کھال نکالیں اور ان کے متعلق سخن سازیاں کریں جو آج صرف ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتی ہیں، اور اس قسم کی ''دیوانگی،، کے مقابلے میں اپنی بے کیف و کم توجیہہ اور استدلال کی فوقیت پر فخر سے اپنی

پیٹھ ٹھونکیں۔ رہے ہم سو ہم تو ان بےحد ارفع و اعلی، مکمل اور نامکمل خیالات سے بہت خوش ہوتے ہیں جو ہر طرف اپنے وہم و خیال کے پردوں کو چیر چیر کر نکلے آتے ہیں اور جن کی طرف سے یہ کم‌نظر مادہ‌پرست (Philistines) بالکل اندھے ہیں۔

سین‌سائمون عظیم انقلاب فرانس کا فرزند تھا، جس کے آغاز کے وقت وہ تیس برس کا بھی نہیں ہوا تھا۔ انقلاب ”تیسرے طبقے“ (۷۳) کی فتح تھی یعنی مخصوص مراعات رکھنےوالے بیکار طبقات، اشرافیہ اور پادریوں کے مقابلے میں عوام کی اکثریت کی فتح جو پیداوار یا تجارت میں کام کرتے تھے۔ لیکن تیسرے طبقے کی فتح نے جلد ہی اپنے آپ کو اس شکل میں دکھا دیا کہ وہ اس ”طبقے“ کے محض ایک بہت چھوٹے سے حصے کی فتح، یا دوسرے الفاظ میں اس کے مخصوص سماجی مراعات کے حامل حصے، یعنی ملکیت‌دار بورژوا طبقے، کے سیاسی اقتدار حاصل کر لینے کا نام ہے۔ اور بورژوا طبقے نے واقعی انقلاب کے دوران بہت تیزی سے ترقی کی تھی جو ایک حد تک تو اشرافیہ اور کلیسا کی ان زمینوں میں سٹہ‌بازی کے ذریعے حاصل ہوئی، جو ضبط کر لی گئی تھیں اور بعد میں بکاؤ ہو گئی تھیں، اور ایک حد تک یہ ترقی فوجی ٹھیکوں کے ذریعے قوم کو دھوکا دے دے کر حاصل کی گئی تھی۔ یہ انھیں جعل‌سازوں کا اقتدار تھا جو مجلس نظما کے تحت فرانس کو تباہی اور بربادی کے گڑھے تک لے آیا تھا اور جس نے اس طرح نپولین کے اچانک انقلاب حکومت کے لئے ایک عذر مہیا کر دیا تھا۔

لہذا سین سائمون کے نزدیک تیسرے طبقے اور مراعات رکھنےوالے طبقات کی باہمی مخالفت نے ”محنت کشوں“ اور ”بیکاروں“ کے مابین مخالفت کی شکل اختیار کر لی۔ بیکاروں کی فہرست میں صرف مخصوص مراعات رکھنےوالے طبقات ہی نہیں تھے بلکہ وہ سب لوگ بھی شامل تھے جو پیداوار یا تجارت میں کوئی حصہ لئے بغیر محض اپنی آمدنیوں پر رہتے تھے۔ اور محنت کش محض اجرتی مزدور ہی نہیں تھے بلکہ کارخانہ‌دار، تاجر اور بینکر بھی اسی صف میں آتے تھے۔ یہ بات کہ بیکار لوگ ذہنی قیادت اور سیاسی اقتدار اعلی کی ساری صلاحیت کھو بیٹھے تھے، پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی تھی، اور انقلاب نے قطعی طور پر

اس چیز پر مہر لگا دی تھی۔ اور یہ بات کہ محروم ملکیت طبقات اس اہلیت سے عاری تھے، سین سائمون کے خیال میں دہشت گردی کے تجربات نے ثابت کر دی تھی۔ تو پھر رہبری اور قیادت کون کرے گا؟ سین سائمون کے قول کے مطابق یہ قیادت سائنس اور صنعت کریں گی جنھیں ایک نئے مذہبی بندھن نے آپس میں باندھ رکھا تھا۔ یہ بندھن ایک لازمی طور پر صوفیانہ، بے لوچ اور کٹر کلیسائی نظام مدارج رکھنے والی ''نئی عیسائیت،، کا ہم معنی تھا اور یہی نئی عیسائیت مذہبی عقائد کے اس اتحاد کو بحال کر سکتی تھی جو اصلاح دین کے زمانے سے اب تک ناپید تھا۔ لیکن سائنس مرادف تھی عالموں کے، اور صنعت سب سے بڑھ کر کام کرنے والے بورژوا لوگوں، کارخانہ داروں، تاجروں اور بینکروں کے مرادف تھی۔ بلاشبہ سین سائمون کا خیال تھا کہ یہ بورژوا لوگ اپنے آپ کو ایک قسم کے پبلک اہل کاروں اور سماجی متولیوں میں تبدیل کر لیں، لیکن جہاں تک ان کا اور محنت کشوں کا باہمی تعلق ہے انھیں اپنا حاکمانہ اور معاشی اعتبار سے مخصوص مراعات والا مرتبہ برقرار رکھنا تھا۔ خصوصاً بینکروں کو قرض کے لین دین میں ضبط اور باقاعدگی پیدا کر کے سماجی پیداوار کی رہبری کا فرض ادا کرنا تھا۔ یہ تصور اس عہد سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھا جبکہ فرانس میں جدید صنعت نے اور اس کے ساتھ ساتھ بورژوا اور پرولتاری طبقات کے درمیان اختلاف نے ابھی حال ہی میں جنم لیا تھا۔ لیکن سین سائمون خاص طور سے جس بات پر زور دیتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر جس چیز سے دلچسپی ہے وہ سب سے زیادہ غریب اور تعداد میں سب سے بڑے طبقے کی تقدیر ہے («la classe la plus nombreuse et la plus pauvre»).

اپنے ''خطوط جنیوا،، میں بھی سین سائمون یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ ''سب آدمیوں کو کام کرنا چاہئے،،۔ اپنی اسی تصنیف میں وہ یہ بھی اعتراف کرتا ہے کہ دہشت گردی محروم ملکیت عوام کا عہد حکومت تھا۔ ''دیکھا تم نے،، وہ ان سے کہتا ہے ''جب فرانس میں تمھارے ساتھیوں کا دور دورہ تھا تو وہاں کیا ہوا، وہ لوگ اپنے ساتھ قحط لائے۔،، لیکن یہ تسلیم کرنا کہ انقلاب فرانس ایک طبقاتی جنگ تھی اور

یہ جنگ صرف اشرافیہ اور بورژوا طبقے کے مابین ہی نہ تھی بلکہ اشرافیہ ، بورژوا طبقے اور محروم ملکیت لوگوں کے مابین تھی ، ۱۸۰۲ ء میں ایک بےحد معنی‌خیز اور غیرمعمولی انکشاف تھا - ۱۸۱۶ ء میں وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ سیاست علم پیداوار کا نام ہے اور پیش گوئی کرتا ہے کہ سیاست سو فی‌صدی معاشیات میں ضم ہوجائےگی - یہ ادراک کہ معاشی حالات سیاسی اداروں کی بنیاد ہیں یہاں صرف بالکل ابتدائی شکل میں ظاہر ہوتا ہے - لیکن جس چیز کا یہاں ابھی سے بہت صاف طور پر اظہار کیا گیا وہ یہ تصور ہے کہ انسانوں کے اوپر سیاسی حکومت مستقبل میں انتظام ، بندوبست اور پیداواری عمل کی دیکھ بھال میں تبدیل ہوجائےگی— دوسرے الفاظ میں '' ریاست کے خاتمے '' کا تصور تھا ، جس کے متعلق حال ہی میں اس قدر شوروغوغا مچا تھا -

سین سائمون ۱۸۱۴ ء میں ، اتحادیوں کے پیرس میں داخل ہونے کے فوراً ہی بعد ، اور پھر ۱۸۱۵ ء میں '' سو دن کی جنگ '' (۷۴) کے دوران میں جب یہ اعلان کرتا ہے کہ فرانس اور انگلستان کا اتحاد اور پھر ان دونوں ملکوں کا جرمنی سے اتحاد یورپ کے امن اور خوش‌حالی اور ارتقا کا واحد ضامن ہے تو وہ اپنے ہم عصروں پر اپنی اسی فوقیت کا ثبوت دیتا ہے - ۱۸۱۵ ء میں فرانسیسیوں کے سامنے واٹرلو (۷۵) کے فاتحوں کےساتھ اتحاد کی تبلیغ کرنے کےلئے تاریخی بصیرت اور ہمت دونوں ہی کی ضرورت تھی -

سین سائمون میں ہمیں ایک ایسی ہمہ گیر وسعت نظر ملتی ہے جس کی وجہ سے بعد کے سوشلسٹوں کے تقریباً وہ تمام نظرئے جو سو فی‌صدی معاشی نہیں ہیں ، سین سائمون کے یہاں دھندلے خاکوں کی شکل میں مل جاتے ہیں - اور دوسری طرف ہمیں فورئے کی تعلیمات میں سماج کے موجودہ حالات کی تنقید ملتی ہے ، جو خالص فرانسیسی ڈھنگ کی اور بڑی ظریفانہ ہے ، لیکن اس کے باوجود اسی قدر بھرپور اور نکتہ رس ہے - فورئے بورژوا طبقے اور اس کے انقلاب سے پہلے کے فیضان‌یافتہ پیغمبروں اور انقلاب کے بعد کے غرض‌مند قصیدہ گویوں کو خود ان ہی کے الفاظ سے شکست دیتا ہے - وہ بڑی بےرحمی سے بورژوا دنیا کی مادی اور اخلاقی پستی کا پردہ فاش کرتا ہے - وہ اس پستی کا مقابلہ کرتا ہے پچھلے

فلسفیوں کے تابناک وعدوں سے جن میں ایک ایسے سماج کا ذکر ہے جہاں محض عقل کی حکمرانی ہوگی، ایک ایسی تہذیب کا تذکرہ ہے جہاں گھر گھر خوشی کے چراغ جلیں گے اور جن میں انسان بے پناہ کمال کو پہنچتا جائے گا۔ اسی طرح وہ اس پستی اور انحطاط کا مقابلہ اپنے دور کے بورژوا نظریہ سازوں کے سندر اور سنہرے الفاظ سے کرتا ہے۔ فورئے دکھاتا ہے کہ کس طرح ہر جگہ انتہائی لن‌ترانیوں اور کھوکھلی لفاظیوں اور انتہائی پست اور دردناک حقیقت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور وہ ان اونچے، شاندار فقروں کی ٹائیں ٹائیں فش کو اپنے تیزابی، کٹیلے طنز کا نشانہ بناتا ہے۔

فورئے صرف نکتہ‌چین نہیں ہے۔ اس کی پرسکون اور پراطمینان فطرت نے اسے طنز نگار — بلاشبہ دنیا کے عظیم‌ترین طنزنگاروں میں سے ایک — بنا دیا ہے۔ انقلاب فرانس کے زوال کے بعد ابھرنے اور پھلنے پھولنے والی جعل سازی اور سٹہ‌بازی اور اس دوکان دارانہ ذہنیت کا جو اس زمانے کی فرانسیسی تجارت میں جاری و ساری اور اس کی نمایاں خصوصیت تھی، فورئے بیک‌وقت بہت استادی اور خوبصورتی سے نقشہ کھینچتا ہے۔ بورژوا سماج میں عورت کی حیثیت اور دونوں جنسوں کے باہمی تعلقات کی بورژوا شکل کی جو تنقید اس نے کی ہے اس میں اور بھی زیادہ استادانہ شان ہے۔ وہ پہلا آدمی تھا جس نے یہ اعلان کیا کہ کسی بھی سماج میں عورت کی آزادی مجموعی آزادی کی صحیح اور فطری کسوٹی ہے۔

لیکن فورئے کی پوری عظمت اس کے سماج کی تاریخ کے تصور میں ابھرتی ہے۔ وہ تاریخ کے اس وقت تک کے ارتقا کو چار منزلوں میں تقسیم کرتا ہے — عہد وحشت، عہد بربریت، سرقبیلی یا پدری نظام اور عہد تہذیب۔ یہ آخری منزل آج کل کے نام‌نہاد مدنی یا بورژوا سماج کے — یعنی سولھویں صدی میں وجود میں آنے‌والے سماجی نظام کے — مرادف ہے۔ فورئے ثابت کرتا ہے کہ ”عہدتہذیب ہر اس عیب کو، جو عہد بربریت میں سادہ طور پر کیا جاتا تھا، ایک پیچیدہ، مبہم، منافقانہ اور پرفریب رنگ میں رنگ دیتا ہے“۔ اور وہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ تہذیب ایک ”دائرۂ نامعقول“ میں، ایک بھنور کی صورت میں گھومتی رہتی ہے، ان تضادوں کے درمیان گھومتی رہتی ہے جن کو

حل کرنے کی وہ نااہل ہے اور جنھیں وہ ہمیشہ نئے سرے سے جنم دیتی رہتی ہے ، اور یہی وجہ ہے کہ وہ جس چیز کے حصول کی خواہش‌مند ہے ، یا یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کے حصول کی خواہش‌مند ہے ، ہمیشہ اس کے متضاد چیز تک پہنچ جاتی ہے ۔ اور اس طرح مثلاً ”عہد تہذیب میں افلاس خود افراط کے بطن سے پیدا ہوتا ہے“ ۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ فورئے جدلیاتی طریقے کا استعمال اسی قدر استادانہ انداز سے کرتا ہے جیسے اس کا ہم‌عصر ہیگل کرتا ہے ۔ انھیں جدلیات کا استعمال کرتے ہوئے وہ لامحدود انسانی تکمیل‌پذیری کے ذکر کے خلاف دلائل پیش کرتا ہے اور بحث کرتا ہے کہ ہر تاریخی منزل تغیر کا ایک چڑھاؤ کا دور ضرور ہوتا ہے اور اسی طرح ایک اتار کا دور بھی ۔ اور فورئے کل نسل انسانی کے مستقبل پر اس قول کا اطلاق کرتا ہے ۔ جس طرح کانٹ نے علم طبیعی میں زمین کی لازمی اور قطعی تباہی کا تصور شامل کیا ہے اسی طرح فورئے نے علم تاریخ کو نسل انسانی کے لازمی اور قطعی خاتمے کا نظریہ دیا ہے ۔

جس وقت فرانس میں انقلاب کا طوفان پورے ملک پر آیا ہوا تھا ، انگلستان میں مسلسل ایک زیادہ پرسکون لیکن اس کے باوجود اسی قدر اہم اور بڑا انقلاب ہو رہا تھا ۔ بھاپ اور نئی اوزارساز مشینیں کارخانہ‌داری کو جدید صنعت میں تبدیل کر رہی تھیں اور اس طرح بورژوا سماج کی پوری بنیاد میں ایک انقلاب لا رہی تھیں ۔ کارخانہ‌داری دور کا سست رو عمل ارتقا پیداوار کا ایک ابلتا مچلتا دھارا بن گیا تھا ۔ سماج روزافزوں تیزی کے ساتھ بڑے سرمایہ‌داروں اور نادار پرولتاریوں میں تقسیم ہو رہا تھا ۔ ان دونوں کے درمیان پہلے کے مستحکم متوسط طبقے کے بجائے غیرمستحکم کاریگروں اور چھوٹے دوکان‌داروں کی ایک بڑی تعداد ، جو آبادی کا سب سے زیادہ تغیرپذیر حصہ تھی، اب ایک غیرمستقل اور ڈانواں ڈول سی زندگی گذارنے لگی تھی ۔

نیا طریقۂ پیداوار ابھی اپنے چڑھاؤ کے زمانے کی چوکھٹ ہی پر تھا ، وہ اب تک پیداوار کا نارمل اور باقاعدہ طریقہ تھا — اس وقت کے موجود حالات کے تحت واحد ممکن طریقہ ۔ لیکن اس وقت بھی وہ کھلی

ہوئی سماجی لعنتوں کو جنم دے رہا تھا — مثلاً بے گھر ، بےدر انسانوں کی ایک بڑی تعداد کا بڑے بڑے شہروں کے بدترین علاقوں میں ٹھونسا جانا ، تمام روایتی اخلاقی بندھنوں اور خاندانی تعلقات کا ڈھیلا ہو جانا ، کام کا بے اندازہ بوجھ ، خصوصاً بچوں اور عورتوں پر ، اور محنت کش طبقے کی پست ہمتی ، جو یکبارگی قطعی نئے حالات میں پھینک دیا گیا تھا — یعنی دیہات سے شہر میں ، زراعت سے جدید صنعت میں ، جانے بوجھے ، مستحکم حالات زندگی سے دن بہ دن بدلنے والے ناقابل اعتبار حالات زندگی میں ۔

اس موقع پر ایک ۲۹ سالہ کارخانہدار مصلح کی حیثیت سے سامنے آیا — ایک بچوں جیسا خوش اطوار ، معصوم اور سادہ کردار کا آدمی جو اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کے چند پیدائشی رہنماؤں میں سے ایک تھا ۔ رابرٹ اووین نے مادیتپسند فلسفیوں کی تعلیمات قبول کر لی تھیں کہ انسان کا کردار ایک طرف تو وراثت کی دین ہے اور دوسری طرف خود انسان کے دوران حیات میں ، اور خصوصاً اس کی نشو و نما کے زمانے میں جو اس کا ماحول ہوتا ہے اس کی دین ہے ۔ اس کے طبقے کے زیادہتر لوگوں کو صنعتی انقلاب میں محض افراتفری اور پراگندگی ہی نظر آئی اور اس کے علاوہ اگر انھوں نے اس میں کچھ دیکھا تو ”کسی کا گھر جلے کوئی آگ تاپے“ کے مصداق اس زمانے کی مشکلات سے فائدہ اٹھانے اور تیزی سے خوب خوب روپیہ بنانے کا موقع ۔ رابرٹ اووین نے صنعتی انقلاب میں اپنے محبوب نظرئے کو عملی جامہ پہنانے کا اور اس طرح اس افراتفری سے نظم پیدا کرنے کا موقع دیکھا ۔ وہ پہلے ہی مانچسٹر کے ایک کارخانے میں پانچ سو سے زائد آدمیوں کے منتظم کی حیثیت سے کامیابی کے ساتھ اس نظرئے کو آزما چکا تھا ۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۹ء تک اس نے ایک منتظم ساجھےدار کی حیثیت سے ، اسی نظرئے کی بنیاد پر لیکن زیادہ آزادیٔ عمل کے ساتھ اسکاٹلینڈ کے شہر نیولانارک کے بہت بڑے سوت بنانے کے کارخانے کا اتنی زیادہ کامیابی سے انتظام کیا کہ تمام یورپ میں اس کی شہرت ہوگئی ۔ ایک ایسی انسانی آبادی کو جو شروع میں انتہائی بھانت بھانت کے اور زیادہتر بہت بدحال اور پست ہمت

عناصر پر مشتمل تھی — ایسی آبادی کو جس کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھ کر ۲۵۰۰ ہوگئی تھی — اس نے ایک مثالی نوآبادی میں تبدیل کر دیا — ایسی نوآبادی میں جہاں شراب خوری، پولیس، مجسٹریٹ، مقدمات، غربا کی امداد کے قوانین اور خیرات کا کوئی نام تک نہیں جانتا تھا اور یہ سب کچھ ممکن ہوا محض لوگوں کے لئے ایسے حالات مہیا کرنے سے جو انسانوں کے شایان شان ہیں، اور خصوصاً نوخیز نسل کی تربیت میں احتیاط سے کام لینے سے۔ اووین بالک گھروں کا بانی تھا اور اس نے سب سے پہلے نیولانارک میں بالک گھر شروع کئے۔ دو سال کی عمر سے بچے وہاں جانے لگتے تھے اور وہاں وہ اتنے خوش رہتے تھے، اس قدر تفریح کرتے تھے کہ انھیں گھر واپس لے جانا مشکل ہو جاتا تھا۔ جبکہ اس کے حریف و ہم‌چشم اپنے مزدوروں سے دن میں تیرہ تیرہ، چودہ چودہ گھنٹے کام لیتے تھے، نیولانارک میں دن میں صرف ساڑھے دس گھنٹے کام ہوتا تھا۔ ایک دفعہ سوتی کپڑے کی صنعت میں بحران آنے کی وجہ سے چار مہینے تک کام رکا رہا تو اس کے مزدور اس تمام عرصے میں پوری اجرت پاتے رہے۔ اور ان سب باتوں کے باوجود کاروبار کی قیمت دو گنی سے زیادہ ہو گئی اور آخر تک اس کے مالکوں کو اس سے بہت اونچا منافع ہوتا رہا۔

ان سب باتوں کے باوجود اووین آسودہ خاطر نہیں تھا۔ وہ زندگی بھی جو وہ اپنے مزدوروں کے لئے بنا سکا تھا اس کے نزدیک ابھی انسانوں کے شایان‌شان زندگی نہیں تھی۔ ”لوگ میرے رحم و کرم پر تھے“، اس نے کہا۔ وہ نسبتاً بہتر حالات جو اس نے ان لوگوں کے لئے مہیا کئے تھے اب تک کردار اور ذہن کے ایک متوازن اور معقول ارتقا کے ضامن نہیں ہو سکتے تھے، اور کردار اور ذہن کی تمام صلاحیتوں کے آزادانہ استعمال کے تو اس سے بھی کم ضامن ہو سکتے تھے۔ ”لیکن اس کے باوجود اس ۲۵۰۰ انسانوں کی آبادی کا کام کرنےوالا حصہ ہر روز سماج کے لئے اتنی حقیقی دولت پیدا کر رہا تھا جتنی دولت پیدا کرنے کے لئے آدھی صدی قبل ۶ لاکھ انسانوں کی آبادی کے کام کرنےوالے حصے کی ضرورت پڑتی۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ جو دولت ۲۵۰۰ آدمی صرف کر

رہے ہیں اس کے اور اس دولت کے درمیان جو ۶۰۰۰۰۰ آدمی صرف کرتے ، جو فرق تھا اس کا کیا ہوا ؟ ،، *

جواب صاف تھا ۔ وہ زائد دولت اس کاروبار کے مالکوں کو ان کے لگائے ہوئے سرمائے پر ۵ فی‌صدی سود دینے کے لئے، جو ۳۰۰۰۰۰ پاؤنڈ سے زائد کھلے منافع کے علاوہ تھا ، استعمال ہوتی تھی ، اور جو چیز نیولاناورک پر صادق آتی تھی اس کا اطلاق اس سے بھی زیادہ انگلستان کے تمام کارخانوں پر ہوتا تھا ۔ ’’ اگر مشینوں نے — گو ان کا استعمال بہت نامکمل طریقے سے ہو رہا تھا — اس نئی دولت کی تخلیق نہ کی ہوتی تو نپولین کی مخالفت اور سماج کے اشرافی اصولوں کی حمایت میں ہونےوالی یورپی جنگوں کے اخراجات پورے نہیں کئے جا سکتے تھے ۔ لیکن اصل میں تو یہ نئی قوت مزدور طبقے کی تخلیق کردہ تھی،، ** ۔ لہذا اس نئی قوت کے ثمروں کا مالک بھی وہی تھا ۔ نئی تخلیق‌شدہ عظیم الشان پیداواری قوتیں جو اب تک افراد کو دولت‌مند اور عوام کو غلام بنانے کے لئے استعمال کی جاتی تھیں ، اووین کو ان میں سماج کی تعمیر نو کی بنیادیں مل گئیں ۔ سب کی مشترکہ ملکیت بن کر انھیں سب کی مشترکہ فلاح و بہبودی کے لئے استعمال ہونا تھا ۔

اووین کا کمیونزم اس خالص کاروباری بنیاد پر قائم تھا ، گویا وہ ایک طرح تجارتی حساب کتاب اور تخمینے کا نتیجہ تھا ۔ اس کے کمیونزم نے آخر تک اپنا یہ عملی کردار باقی رکھا ۔ مثلاً ۱۸۲۳ ء میں اووین نے آئرلینڈ کی معاشی بدحالی دور کرنے کے لئے کمیونسٹ نوآبادیوں کی تجویز پیش کی اور ان کے قائم کرنے کا صرفہ ، ان کے سالانہ اخراجات اور ان سے ہونے والی امکانی آمدنی کے مکمل تخمینے تیار کئے ۔ اووین کے مستقبل کے

---

* ’’ ذہن اور عمل میں انقلاب ،، نامی اپیل سے لی ہوئی عبارت ، صفحہ ۲۱ ۔ اس میں ’’ یورپ کے تمام سرخ ریپبلکنوں ، کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں ،، سے خطاب کیا گیا ہے ، اور ۱۸۴۸ ء میں اسے فرانس کی عارضی حکومت اور اس کےعلاوہ ’’ ملکہ وکٹوریہ اور اس کے ذمہ‌دار مشیروں کے پاس ،، بھی بھیجا گیا تھا ۔ (اینگلس کا نوٹ)

** نوٹ ایضاً ، صفحہ ۲۲ ۔ (اینگلس کا نوٹ)

صاف اور واضح منصوبے میں ساری جزویات اور ٹکنیکی تفصیلات اس قدر عملی لیاقت اور بصیرت کے ساتھ مرتب کی گئی ھیں — ان میں بنیادی نقشہ ، سامنے کا منظر ، پہلو کا منظر اور اوپر سے دکھائی دینے والا منظر سبھی کچھ شامل ھے — کہ ایک دفعہ اووین کا سماجی اصلاح کا طریقہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر عملی نقطۂ نظر سے تفصیلات کی ترتیب و تنظیم کے خلاف مشکل ھی سے کچھ کہا جا سکتا ھے ۔

اووین کا کمیونزم کی سمت بڑھنا اس کی زندگی کا نقطۂ انقلاب تھا ۔ جب تک وہ محض ایک انسان دوست رھا اس پر دولت ، تعریف و تحسین اور عزت و شہرت کی بارش ھوتی رھی ۔ وہ یورپ میں سب سے زیادہ مقبول شخص تھا ۔ صرف اس کے اپنے طبقے کے لوگ ھی نہیں بلکہ سیاستداں اور شہزادے بھی پسندیدگی سے اس کی باتیں سنتے تھے ۔ لیکن جب وہ اپنے کمیونسٹ نظریوں کو منظر عام پر لایا تو معاملہ ھی کچھ اور ھوگیا ۔ اووین کا خیال تھا کہ سماجی اصلاح کی راہ میں تین رکاوٹیں خاص طور پر حائل ھیں : شخصی ملکیت ، مذھب اور شادی کی موجودہ شکل ۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ان پر حملہ کرےگا تو اسے کن چیزوں کا سامنا کرنا پڑےگا — قانون کی محافظت کھوبیٹھنا ، اعلی سماجی حلقوں سے برادری باھر کیا جانا اور ساتھ ھی اپنے پورے سماجی مرتبے سے محروم ھونے پر مجبور ھو جانا ۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی اسے ، نتائج کے خوف سے بےنیاز ھوکر ، ان سب پر حملہ کرنے سے باز نہیں رکھ سکی ۔ اور وھی ھوا جس کا اسے اندیشہ تھا ۔ وہ اعلی سوسائٹی سے ذات باھر کردیا گیا ، اخباروں نے اس کےخلاف خاموشی کی سازش کرلی اور اس کے امریکہ میں کئے ھوئے کمیونسٹ تجربات نے اسے مالی لحاظ سے تباہ کردیا ۔ اس حالت میں اس نے براہراست مزدور طبقے کی طرف رجوع کیا اور تیس سال تک ان کے درمیان رہ کر کام کرتا رھا ۔ انگلستان میں مزدوروں کے بھلے کےلئے ھر ایک سماجی تحریک اور ھر ایک معقول اقدام کا رابرٹ اووین کے نام سے گہرا تعلق ھے ۔ اس نے پانچ سال کی جدوجہد کے بعد ۱۸۱۹ ء میں ایسا پہلا قانون منظور کرایا جس کی رو سے کارخانوں میں کام کرنےوالی عورتوں اور بچوں کے کام کے اوقات کی ایک حد مقرر ھوئی ۔ وہ اس پہلی کانگرس کا صدر تھا جس میں انگلستان

کی ساری ٹریڈیونینیں ایک واحد عظیم ٹریڈ ایسوسی‌ایشن میں متحد ہوگئیں (۷۶)۔ اس نے ایک طرف سماج کی مکمل کمیونسٹ تنظیم کی طرف لےجانےوالی عبوری تدابیر کے طور پر پیداوار اور خردہ فروشی کےلئے امداد باھمی کی انجمنوں کی بنا ڈالی — اور اس وقت سے ان انجمنوں نے کم‌از کم اس چیز کا عملی ثبوت تو دے ھی دیا ھے کہ تاجر اور کارخانےدار سماجی لحاظ سے قطعی غیرضروری ھیں ، اور دوسری طرف اس نے محنت منڈیوں کی بنیاد رکھی جہاں محنت پرچیوں کے ذریعے ، جن کی اکائی صرف ایک گھنٹے کی محنت ھوا کرتی تھی ، محنت کی پیداوار کا تبادلہ ھوتا تھا (۷۷)۔ یہ ادارے ناکامیابی کو اپنے جلو میں لے کر آئے تھے ، لیکن وہ بہت بعد کے ، پرودھوں کے تجویز کردہ ، تبادلے کے بینک (۷۸) کے پیش‌رو تھے ، اور ساتھ ھی اس بینک سے اس لحاظ سے قطعی طور پر مختلف بھی تھے کہ وہ تمام سماجی برائیوں کےلئے اکسیر اعظم ھونے کا دعوی نہیں کرتے تھے ، بلکہ ان کو سماج کے ایک بہت بنیادی انقلاب کی جانب صرف ایک پہلے قدم کی حیثیت سے تجویز کیا گیا تھا۔

یوٹوپیائی طریقۂ فکر عرصۂ دراز تک انیسویں صدی کے سوشلسٹ خیالات پر حاوی رھا اور اب تک ان میں سے بعض اس کے زیراثر ھیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک تمام انگریز اور فرانسیسی سوشلسٹ اسے خراج عقیدت پیش کرتے تھے۔ اس سے پہلے کا جرمن کمیونزم ، جس میں وائٹلنگ کا کمیونزم بھی شامل ھے ، اسی مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ ان سب کے نزدیک سوشلزم مطلق صداقت ، عقل اور عدل کا مظہر ھے ، اور بس ایک دفعہ سوشلزم کے دریافت ھونے کی دیر ھے ، پھر وہ خود اپنی طاقت کے کس بل پر تمام دنیا کو مسخر کر لےگا۔ اور چونکہ صداقت مطلق انسان کے تاریخی ارتقا اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ھے ، اس لئے یہ چیز کہ وہ کہاں اور کب دریافت ھو محض ایک حادثاتی امر ھے۔ اس کے باوجود مطلق صداقت ، عقل اور عدل مختلف مدرسہ‌ھائے فکر کے بانیوں کے یہاں مختلف ھیں۔ اور چونکہ ان میں سے ھر ایک کی مخصوص قسم کی مطلق صداقت ، عدل اور عقل اس کے اپنے داخلی فہم و ادراک، حالات زندگی، علم اور ذھنی تربیت کی

حدود — ان سب چیزوں سے اثرپذیر ہوتی ہے اس لئے مطلق صداقتوں کی اس کشمکش کا اور کوئی انجام ممکن نہیں ہے — سوائے اس کے کہ ان سب صداقتوں میں ایک دوسرے کے لئے مطلق کوئی جگہ نہ ہو ۔ لہذا اس سے ایک اوسط درجے کے ، انتخابیت‌پسند (eclectic) سوشلزم کے علاوہ اور کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی اور واقعہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے تک انگلستان اور فرانس کے زیادہ‌تر سوشلسٹ مزدوروں کے ذہنوں پر ایک ایسے ہی سوشلزم کی حکمرانی رہی ہے ۔ لہذا اس کا نتیجہ ہے ایک ایسی معجون مرکب جس میں مختلف قسم کی ، بھانت بھانت کی رائیں ، ایسے تنقیدی بیانات ، اقتصادی نظرئے اور مختلف فرقوں کے بانیوں کی پیش کردہ مستقبل کے سماج کی ایسی تصویریں شامل ہیں جو کم سے کم اختلافات کا باعث ہوتی ہیں ، یہ ایک ایسی معجون مرکب ہے جس کے مختلف اجزائے ترکیبی کا تیکھاپن مناظرے کی بھٹی میں پڑ کر جس قدر ہلکا پڑ جاتا ہے اسی قدر اس کی تیاری آسان ہو جاتی ہے ۔

سوشلزم کو علمی شکل دینے کے لئے پہلے اسے ایک حقیقی بنیاد پر کھڑا کرنے کی ضرورت تھی ۔

۲

اسی اثنا میں اٹھارھویں صدی کے فرانسیسی فسلفے کے ساتھ ساتھ ، اور اس کے بعد ، نیا جرمن فلسفہ بھی ابھر چکا تھا جس کا نقطۂ عروج ہیگل تھا ۔ اس کی سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ اس نے ایک دفعہ پھر جدلیات کو استدلال کی اعلیٰ‌ترین شکل کی حیثیت سے اختیار کر لیا تھا ۔ سارے قدیم یونانی فلسفی پیدائشی اور فطری ماہر جدلیات تھے اور ارسطو ، جو ان میں سب سے زیادہ ہمہ‌داں ذہن کا مالک تھا ، پہلے ہی جدلیاتی فکر کی سب سے زیادہ بنیادی شکلوں کا تجزیہ کر چکا تھا ۔ نیا فلسفہ — اگرچہ اس میں بھی جدلیات کے ممتاز علم‌بردار (مثلاً دیکارت اور اسپینوزا) موجود تھے — خاص طور پر انگریزی اثر کے تحت ، روزافزوں اور بالکل بےلوچ طریقے پر نام‌نہاد مابعد الطبیعیاتی طریقۂ استدلال کو اپناتا گیا اور یہی طریقۂ استدلال اٹھارھویں صدی کے

فرانسیسیوں کے ذہنوں پر بھی تقریباً مکمل طور پر چھایا ہوا تھا — کم از کم ان کی خاص فلسفیانہ تخلیقات میں تو ایسا ضرور تھا۔ ایک محدود معنی میں فلسفے کے باہر فرانسیسیوں نے بہر حال جدلیات کے شہ پاروں کی تخلیق کی تھی۔ ہمارے لئے محض دیدرو کے «Le Neveu de Rameau» (''رامو کا بھتیجا،،) اور روسو کے «Discours sur l'origine et les fondements de l'inégalité parmi les hommes» (''انسانوں کے درمیان عدم مساوات کی ابتدا اور بنیاد،،) کو یاد کرنا کافی ہے۔ ہم یہاں مختصر طور پر انسانی فکر کے ان دونوں طریقوں کا بنیادی کردار پیش کرتے ہیں۔

جب ہم پوری فطرت یا انسانیت کی تاریخ یا خود اپنے عمل ذہنی پر غور و فکر کرتے ہیں تو شروع میں ہمیں ایک ایسی تصویر نظر آتی ہے جس میں تعلقات اور ردعمل، ترتیب اور اتصال کی ایک ایسی اتھاہ بھول بھلیاں ہے جہاں کوئی چیز بھی، جہاں اور جیسی تھی، وہاں اور ویسی نہیں رہتی، بلکہ ہر چیز حرکت کرتی ہے، بدلتی ہے، وجود میں آتی ہے اور فنا ہو جاتی ہے۔ لہذا ہم شروع میں تصویر کو مجموعی طور پر دیکھتے ہیں اور اس کے الگ الگ حصے اس وقت کم و بیش پس منظر میں رہتے ہیں۔ ہم ان چیزوں کا مشاہدہ کرنے کے بجائے جو حرکت، اتصال اور ارتباط کے عمل سے گذرتی ہیں، حرکتوں، تبدیلیوں اور روابط کا مشاہدہ کرنے لگتے ہیں۔ یہ بھونڈا اور ان گھڑ، سادہ اور معصوم لیکن بنیادی طور پر صحیح تصور کائنات قدیم یونانی فلسفے کا تصور ہے اور سب سے پہلے اسے ہیراقلیتس نے ایک صاف اور واضح شکل میں پیش کیا تھا: ہر شے ہے بھی اور نہیں بھی ہے کیونکہ ہر شے رواں دواں ہے، مسلسل تغیرپذیر ہے اور مسلسل وجود میں آتی اور فنا ہوتی رہتی ہے۔

لیکن یہ تصور گو مظاہر قدرت کی تصویر کے عمومی کردار کو مجموعی طور پر صحیح طریقے سے پیش کرتا ہے تاہم یہ ان تفصیلات کی تشریح کرنے کے لئے ناکافی ہے جن پر یہ تصویر مشتمل ہے۔ اور جب تک ہم ان تفصیلات کو نہیں سمجھتے اس وقت تک ہم پوری تصویر کے متعلق کوئی صاف اور صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان

تفصیلات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم انہیں ان کے فطری یا تاریخی روابط سے علیحدہ کریں اور ان میں سے ہر ایک کا، اس کی ماہیت اور خواص، مخصوص اسباب اور نتائج وغیرہ کا، الگ الگ معائنہ کریں۔ یہ بنیادی طور پر علم‌طبیعی اور تاریخی تحقیق کا کام ہے، اور یہ سائنس کی وہ شاخیں ہیں جنہیں کلاسیکی دور کے یونانیوں نے، بہت معقول وجوہ کی بنا پر، ایک ثانوی مرتبہ دے رکھا تھا، کیونکہ انہیں سب سے پہلے وہ مواد جمع کرنا تھا جس کی بنا پر یہ علوم کام کر سکیں۔ کسی طرح کا تنقیدی تجزیہ، مقابلہ اور جنس، صنف اور نوع کے اعتبار سے ترتیب کرنے کےلئے ضروری ہے کہ پہلے کسی قدر طبیعی اور تاریخی مواد اکٹھا کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قطعی علوم طبیعی کی بنیادیں سب سے پہلے عہد سکندری (۷۹) کے یونانیوں نے استوار کی تھیں اور بعد میں قرون وسطی کے عربوں نے۔ اصلی علم طبیعی پندرھویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہوا اور اس کے بعد سے وہ روزافزوں تیزی کے ساتھ ترقی کرتا رہا۔ فطرت کا تجزیہ کرکے اسے الگ الگ حصوں میں بانٹنا، فطرت کے مختلف اعمال اور اشیا کی معین اور واضح اجناس میں درجہ‌بندی کرنا، نامیاتی اجسام کی تمام مختلف النوع شکلوں کی اندرونی ہیئت تشریحی کا مطالعہ کرنا — یہ تھیں وہ بنیادی شرائط جن کی بنا پر پچھلے چار سو سال کے عرصے میں ہمارے فطرت کے علم نے اس قدر زبردست ترقی کی ہے۔ لیکن اس طریقۂ کار نے ہمارے لئے ایک اور ورثہ بھی چھوڑا ہے — یعنی طبیعی اشیا اور اعمال کا علیحدہ علیحدہ اور مجموعی کلیت سے ان کے تعلق کو نظرانداز کرکے مشاہدہ کرنے کی عادت، اور ان اشیا اور اعمال کا حرکت کے بجائے سکون کی کیفیت میں، انہیں لازمی طور پر تغیرپذیر نہیں بلکہ مستقل سمجھ کر، اور ان کی حالت زندگی میں نہیں بلکہ حالت‌موت میں ان کا مشاہدہ کرنے کی عادت۔ جب بیکن اور لاک نے اشیا کو دیکھنے کے اس انداز کو علوم طبیعی سے فلسفے کی طرف منتقل کر دیا تو اس نے اس تنگ و محدود، مابعد الطبیعیاتی طریقۂ فکر کو جنم دیا جو پچھلی صدی کی خصوصیت تھا۔

ماہر مابعدالطبیعیات کے نزدیک اشیا اور ان کے ذہنی پرتو — خیالات — بالکل الگ تھلگ اور ایسی چیزیں ہیں جن کا ایک دوسرے

سے علیحدہ کرکے اور ایک دوسرے کے بعد مطالعہ کرنا چاہئے ، ان کے خیال میں وہ تحقیق اور مطالعے کے غیر تغیرپذیر ، بےلوچ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہی حالت میں رہنےوالے موضوعات ہیں ۔ ماہر مابعد الطبیعیات ایک دوسرے سے کبھی ہم‌آہنگ نہ ہو سکنےوالے تضادوں کی اصطلاحات میں سوچتا ہے ۔ اس کی گفتگو '' ہاں‌ہاں ، نہیں نہیں ،، کی شکل میں ہوتی ہے ، کیونکہ '' ان دو کے علاوہ اور جو کچھ ہے وہ سب عمل شیطانی ہے ،، ۔ اس کے نزدیک کوئی شے یا موجود ہے یا غیرموجود ، کوئی شے بیک وقت خود اور غیرخود نہیں ہو سکتی ۔ مثبت اور منفی میں ایک دوسرے کے لئے قطعی کوئی جگہ نہیں ، سبب اور نتیجہ مکمل طور پر ، بالکل بےلوچ طریقے سے ، ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔

پہلی نظر میں تو ہمیں یہ طریقۂ فکر بہت بصیرت افروز معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ نام نہاد صحیح اور محکم عقل سلیم کا طریقۂ فکر ہے ۔ لیکن مشکل صرف اتنی ہے کہ یہ صحیح اور محکم عقل سلیم صاحبہ ، جو اپنی چاردیواری کی گھریلو فضا میں اپنی عزت‌آبرو لئے بیٹھی رہتی ہیں ، تحقیق و تدقیق کی وسیع دنیا میں قدم رکھتے ہی بڑے بڑے زوردار ہنگاموں سے دوچار ہوتی ہیں ۔ اور مابعدالطبیعیاتی طریقۂ فکر گو بہت سے میدانوں میں جائز اور ضروری ہے ، جن میں سے ہر ایک کی حدود اپنے اپنے موضوعات تحقیق کی ماہیت کے مطابق ہوتی ہیں ، لیکن دیر یا سویر یہ طریقۂ فکر ایک ایسی حد تک پہنچ جاتا ہے جس کے اس پار جانے پر وہ یک‌رخا ، محدود اور مجرد ہو جاتا ہے اور ناقابل حل تضادوں میں کھو کر رہ جاتا ہے ۔ فرداً فرداً اشیا کے مطالعے میں وہ ان کے باہمی ربط و تعلق کو نظرانداز کر بیٹھتا ہے ، ان کے وجود پر غور و فکر کرتے ہوئے وہ اس وجود کی ابتدا اور انتہا کو بھول جاتا ہے ، ان کے سکون اور ٹھیراؤ پر غور و خوض کرنے میں وہ ان کی حرکت کو فراموش کر دیتا ہے ، اور اس کی حالت بقول شاعر ایسی ہوتی ہے کہ '' قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل ! ،،

روزمرہ کے معمولی واقعات کی حد تک تو ہم جانتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ مثلاً کوئی جانور زندہ ہے یا نہیں ۔ لیکن زیادہ غور اور

توجہ سے دیکھنے پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی صورتوں میں یہ ایک نہایت پیچیدہ سوال ہے ، جیسا کہ قانون‌داں بہت اچھی طرح جانتے ہیں ۔ انھوں نے بہت بہت عقل لڑائی کہ کسی طرح وہ معقول حد دریافت کر سکیں جس کے اس پار ماں کے رحم میں بچے کو مارنا قتل کے مرادف ہو جاتا ہے ، لیکن سب بےسود ۔ موت کے لمحے کا قطعی تعین کرنا بھی اسی قدر ناممکن ہے کیونکہ علم الاعضا ثابت کرتا ہے کہ موت کوئی فوری اور آنی مظہر نہیں ہے بلکہ بہت طول طویل مدت تک چلنےوالا عمل ہے ۔

اسی طرح ہر نامیاتی وجود ہر لمحے وہ چیز بھی ہے جس کا اس پر اطلاق ہوتا ہے اور اس سے مختلف بھی ہے ۔ ہر لمحے وہ باہر سے مہیا کئے جانے والا مادہ جذب کرتا رہتا ہے اور کچھ اور مادہ خارج کرتا رہتا ہے ، ہر لمحے اس کے جسم کے کچھ خلیے مرتے رہتے ہیں اور کچھ نئے خلیے پیدا ہوتے رہتے ہیں ۔ کچھ کم یا کچھ زیادہ مدت میں اس کے جسم کے مادے کی مکمل تجدید ہو جاتی ہے ، اور مادے کے دوسرے سالمے اس کی جگہ لے لیتے ہیں ۔ سو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر نامیاتی وجود ہمیشہ خود بھی ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس میں غیرخود کا کچھ عنصر بھی موجود ہوتا ہے ۔

علاوہ بریں زیادہ بغور مطالعے پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک تضاد کے دو سرے ، مثلاً مثبت اور منفی ، جس قدر ایک دوسرے کے متضاد ہیں اسی قدر ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بھی ہیں ، اور مزید ، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اپنے تمام‌تر تضاد کے باوجود وہ ایک دوسرے میں جاری و ساری بھی ہوتے ہیں ۔ اور اسی طرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سبب اور نتیجہ ایسے تصورات ہیں جن کا اطلاق محض انفرادی واقعات پر ہوتا ہے ، لیکن جوں ہی ہم انفرادی واقعات کو ان کے اور کل کائنات کے عمومی ربط و تعلق کے پیش نظر دیکھنے لگتے ہیں تب یہ تصورات ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ ہو جاتے ہیں ، اور اسی طرح وہ اس وقت بھی آپس میں خلط‌ملط ہو جاتے ہیں جب ہم اس عالمگیر عمل اور ردعمل پر غور کرتے ہیں جس میں اسباب اور نتائج ازلی اور ابدی طور پر آپس میں اس طرح جگہ بدلتے رہتے ہیں کہ جو اس وقت

اور اس جگہ نتیجہ ہے وہ دوسرے وقت اور دوسری جگہ سبب ہوگا اور اس کے برعکس سبب نتیجہ ہوگا۔

ان میں سے کسی عمل اور طریقۂ فکر کی مابعدالطبیعیاتی استدلال کے چوکھٹے میں سمائی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف جدلیات اشیا اور ان کے پرتو اور مظاہر — خیالات — کا ادراک ان کے بنیادی ربط و تعلق، سلسلہ‌بندی، حرکت، اصل، آغاز اور انتہا کو نظر میں رکھتے ہوئے کرتی ہے۔ لہذا مذکورۂ‌بالا طریقہ‌ہائے عمل خود جدلیات کے طریقۂ کار ہی کی مزید تصدیق و تائید ہیں۔

خود فطرت جدلیات کی کسوٹی ہے اور جدید سائنس کے حق میں اتنا تو کہنا ہی پڑےگا کہ اس نے اس ثبوت کو روزافزوں، بھرپور اور فراواں مواد عطا کیا ہے اور اس طرح اس نے دکھا دیا ہے کہ فطرت کا طریقۂ عمل بنیادی طور پر مابعدالطبیعیاتی نہیں ہے بلکہ جدلیاتی ہے، اور یہ بھی دکھا دیا ہے کہ فطرت ایک ازلی اور ابدی طور پر یکساں اور لامتناہی دائرۂ تواتر میں نہیں گھومتی رہتی بلکہ وہ ایک واقعی تاریخی ارتقا سے گزرتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ڈارون کا نام آنا چاہئے۔ اس نے یہ چیز ثابت کرکے کہ تمام نامیاتی وجود — نباتات، حیوانات اور خود انسان — ایک ارتقائی عمل کی پیداوار ہیں جس کا سلسلہ کروڑوں برس سے چل رہا ہے، مابعدالطبیعیاتی تصور فطرت پر کاری ضرب لگائی ہے۔ لیکن ایسے ماہرین علم فطرت جنھوں نے جدلیاتی ڈھنگ سے غور و فکر کرنا سیکھ لیا ہے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اور اس کشمکش کو دیکھ کر، جو نئی دریافتوں کے نتائج اور مدتوں سے مانے ہوئے طریقہ‌ہائے فکر کے درمیان پائی جاتی ہے، اس افراتفری کا راز سمجھ میں آجاتا ہے جس کا موجودہ زمانے میں نظریاتی علوم طبیعی میں دوردورہ ہے اور جو استاد اور شاگرد، مصنف اور قاری سبھی کے لئے یکساں درد سر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کائنات اور اس کے ارتقا، انسانیت کی ترقی اور نشو و نما، اور ذہن انسانی میں اس ارتقا کے عکس کی صحیح صحیح تصویر صرف جدلیات ہی کے طریقوں سے حاصل کی جا سکتی ہے کیونکہ جدلیات زندگی اور موت کے اور ترقی‌پذیر یا تنزل‌پذیر تبدیلیوں کے بےشمار

عمل اور ردعمل کی طرف ہمیشہ خاص دھیان دیتی ہے۔ نئے جرمن فلسفے نے اسی اسپرٹ میں کام کیا ہے۔ نیوٹن کے مستحکم نظام شمسی اور اس نظام شمسی کے مشہور و معروف اولین تحریک پانے کے بعد ابد تک قائم رہنے کے نظرئے کو کانٹ نے ایک تاریخی عمل کے نتیجے — یعنی مادے کے گردش کرتے ہوئے بےشکل، دھندلے ڈھیر سے سورج اور دوسرے تمام سیاروں کی تشکیل — کی حیثیت سے پیش کرکے اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا۔ اس سے بہ‌یک‌وقت اس نے یہ نتیجہ بھی نکالا کہ اگر نظام شمسی کا آغاز یہ ہو تو مستقبل میں اس کی موت لابدی ہے۔ نصف صدی بعد لپلاس نے اس کے نظرئے کو ریاضی کے ذریعے ثابت کر دیا اور اس کے نصف صدی بعد طیف‌پیما (Spectroscope) نے اس کا مزید ثبوت دیا کہ فضائے‌بسیط میں گیس کے اس قسم کے روشن اور گرم ہیولے موجود ہیں جو انجماد کی مختلف منزلوں میں ہیں۔

اس نئے جرمن فلسفے کی معراج ہیگل کا نظام تھا۔ اس نظام میں پہلی دفعہ تمام دنیا — طبیعی، تاریخی اور عقلی دنیا — ایک حالت‌عمل کی شکل میں پیش کی گئی ہے، یعنی مسلسل حرکت، تبدیلیٔ شکل، تغیر اور ارتقا کی حالت میں۔ اور اس اندرونی ربط کا پتہ چلانے کی کوشش کی گئی ہے جو اس تمام حرکت اور ارتقا کو ایک مسلسل کل بناتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے انسانیت کی تاریخ اب پہلے کی طرح تشدد کی داستان اور بےمعنی افعال کا ایک بےقابو بھنور نہیں معلوم ہوتی، جو سب پختہ‌کار فلسفیانہ تعقل کی کرسیٔ عدالت کے نزدیک یکساں طور پر قابل ملامت ہیں، اور جن کو جلد از جلد بھول جانا ہی بہتر ہے۔ اس کے بجائے اب انسانیت کی تاریخ خود انسان کے ارتقائی عمل کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اب یہ عقل کا کام تھا کہ اس بتدریج عمل کو اس کی تمام پیچ درپیچ راہوں سے گذرکر آگے بڑھتے ہوئے دیکھے اور سمجھے اور اس کے تمام بظاہر حادثاتی مظاہر میں جاری و ساری اندرونی قانون کا پتہ چلائے۔

یہ بات کہ ہیگلی نظام نے جس مسئلے کو پیش کیا تھا اسے حل نہیں کیا یہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس نظام کی عہدآفریں خدمت یہ تھی کہ اس نے مسئلے کو پیش کیا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ

ہے جسے کوئی بھی فرد کبھی تنہا حل نہیں کر سکتا ۔ اگرچہ ہیگل — سین سائموں کی طرح — اپنے دور کے سب سے زیادہ ہمہ‌داں ذہن کا مالک تھا لیکن وہ بھی ایک حد سے آگے نہیں جا سکتا تھا — اول تو اپنے لازمی طور پر محدود علم کے باعث اور دوسرے اپنے عہد کے علم اور تصورات کے محدود ہونے کے سبب سے ۔ اور ان میں ایک تیسری بندش کا اضافہ بھی کرنا چاہئے ۔ ہیگل عینیت‌پرست تھا ۔ اس کے نزدیک اس کے ذہن میں جو خیالات تھے وہ حقیقی اشیا اور اعمال کے کم‌وبیش مجرد پرتو نہیں تھے بلکہ اس کے برخلاف اشیا اور ان کا ارتقا صرف اس ''عین'' (خیال) کی تشکیل و تکمیل ہے جو دنیا کے وجود سے پہلے ہی ازل سے اسی طرح کہیں موجود ہے ۔ اس طریقۂ فکر نے ہر چیز کو الٹ‌پلٹ کر رکھ دیا اور دنیا میں اشیا کا جو واقعی رابطہ اور رشتہ ہے اسے بالکل سر کے بل کھڑا کر دیا ۔ گو ہیگل نے کئی مجموعہ‌ٔ حقائق کو فرداً فرداً بہت طباعی سے اور صحیح طور پر سمجھ لیا تھا لیکن انھیں وجوہ کی بنا پر جو ابھی بیان کئے گئے ہیں ، اس کے یہاں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن میں تصنع اور آورد پائی جاتی ہے اور جو پیوند کے مانند معلوم ہوتی ہیں ۔ مختصراً یہ کہ وہ غلط ہیں ۔ ہیگلی نظام بجائے خود ایک بہت بڑی ناکامی تھا ۔ لیکن ساتھ ہی وہ اپنی قسم کی آخری چیز بھی تھا ۔ دراصل وہ ایک اندرونی اور ناقابل علاج تضاد کا شکار تھا ۔ ایک طرف تو اس کا بنیادی دعوی یہ تصور تھا کہ انسانی تاریخ ایک مسلسل عمل ارتقا ہے ، جس کی فطرت ہی ایسی ہے کہ اس کو کسی قسم کی نام‌نہاد صداقت مطلق کی دریافت میں اپنی آخری عقلی تکمیل نہیں مل سکتی ۔ لیکن دوسری طرف اس نظام نے اسی صداقت مطلق کے جوہر خاص ہونے کا دعوی بھی کیا ۔ فطری اور تاریخی علم کا ایک ایسا نظام جو تمام چیزوں اور تمام زمانوں پر حاوی اور ہمہ‌گیر ہو جدلیاتی استدلال کے بنیادی قانون کے منافی ہے ۔ اور یہ قانون اس خیال سے قطعی منکر نہیں ہے کہ خارجی کائنات کا ایک منظم اور مرتب علم ، ہر پہلے دور کے مقابلے میں اس سے اگلے دور میں ، زبردست ترقی کر سکتا ہے ۔ اس کے برخلاف جدلیاتی استدلال کے بنیادی قانون نے اس خیال کو اپنے یہاں شامل کیا ہے ۔

جرمن عینیت‌پرستی میں بنیادی تضاد کی موجودگی کا شعورواحساس لازمی طور پر مادیت کی طرف واپس لے گیا ، لیکن خیال رہے کہ اٹھارھویں صدی کی محض مابعدالطبیعی اور مکمل طور پر میکانکی مادیت کی طرف نہیں لے گیا ۔ پرانی مادیت تمام پرانی تاریخ کو نامعقولیت اور تشدد کا ایک بےشکل تودہ سمجھتی تھی ، اور جدید مادیت تاریخ کو انسانیت کے ارتقا کا عمل مسلسل سمجھتی ہے اور اس کے قوانین دریافت کرنے کی کوشش کرتی ہے ۔ اٹھارھویں صدی کی فرانسیسی مادیت کے یہاں ، اور صرف اسی کے نہیں بلکہ ہیگل کے یہاں بھی ، مجموعی طور پر فطرت کا جو تصور ملتا ہے وہ یہ ہے کہ فطرت تنگ‌دائروں میں حرکت کرتی‌رہتی ہے اور دائمی طور پر غیرمتغیر ہے ، اور اس کے یہاں نیوٹن کی تعلیمات کے مطابق ابدی اجرام فلکی ، اور لینئی کی تعلیمات کےمطابق ناقابل تبدیلی نامیاتی انواع ہیں ۔ جدید مادیت علم طبیعی کی جدید دریافتوں کو بھی اپنی آغوش میں سمیٹ لیتی ہے ۔ ان دریافتوں کے مطابق فطرت کی بھی وقت کی حدود میں ایک تاریخ ہے ، اور اجرام فلکی ، ان نامیاتی اجسام کی طرح جو مناسب حالات ہونے پر ان میں آباد ہوتے ہیں ، خود بھی موجود اور معدوم ہوتے رہتے ہیں ۔ اگر فطرت کےلئے مجموعی طور پر اب بھی یہ کہا جائے کہ وہ سلسلۂ تواتر (یا باربار واقع ہونےوالے چکروں) میں گھومتی رہتی ہے تب بھی یہ مکرر چکر یا سلسلے بےحد بڑی اور وسیع و عریض شکل تو ضرور ہی اختیار کر لیتے ہیں ۔ دونوں لحاظ سے جدید مادیت بنیادی طور پر جدلیاتی ہے ، اور اسے اب اس قسم کے فلسفے کی مدد کی احتیاج نہیں ہے جو پہلے ایک راجہ کی سی تمکنت کےساتھ یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ سائنس کی باقی تمام پرجا پر راج کرتا ہے ۔ جوں ہی اشیا کی اور اشیا کےمتعلق ہمارے علم کی عظیم جامعیت میں ہر مخصوص علم لازماً اپنے مقام کی وضاحت اور تعین کردےگا ، ویسے ہی وہ خاص علم جس کا موضوع یہ جامعیت ہو بےکار اور غیرضروری ہوجائےگا ۔ پورے پچھلے فلسفے میں سے لے دے کر اگر کچھ باقی رہ گیا ہے تو فکر و خیال کا علم اور اس کے قوانین — اصول منطق (formal logic) اور جدلیات ۔ اور باقی سب کچھ تاریخ اور فطرت کے علم‌ثبوتی میں ضم ہو کر رہ گیا ۔

لیکن ، اگرچہ تصور فطرت میں انقلاب اسی تناسب سے ہو سکتا تھا جس تناسب سے تحقیق نے اس سلسلے کا مثبت مواد مہیا کیا تھا ، مگر بہت عرصہ پہلے ہی بعض ایسے تاریخی وقائع رونما ہوئے تھے جنھوں نے تصور تاریخ میں فیصلہ کن تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ ۱۸۳۱ء میں لیون میں مزدور طبقے کی پہلی بغاوت نے جنم لیا۔ ۱۸۳۸ء اور ۱۸۴۲ء کے دوران مزدور طبقے کی پہلی قومی تحریک — انگریزی چارٹسٹ تحریک — اپنے نقطۂ عروج تک پہنچی۔ یورپ کے سب سے زیادہ ترقی‌یافتہ ملکوں کی تاریخ میں بورژوا طبقے اور پرولتاریوں کی باہمی طبقاتی کشمکش اسی تناسب سے سامنے آئی جس تناسب سے ایک طرف تو جدید صنعت کا ارتقا ہوا اور دوسری طرف بورژوا طبقے کا نیا نیا حاصل کیا ہوا سیاسی اقتدار بڑھا۔ حقائق روز بروز زیادہ زورشور سے بورژوا ماہرین معاشیات کی ان تعلیمات کی تردید کرنے لگے کہ سرمایہ و محنت کا مفاد ایک ہے اور بےلگام مقابلے کے نتیجے کے طور پر ہمہ‌گیر ہم‌آہنگی اور ہمہ‌گیر خوشحالی کا دوردورہ ہوگا۔ اب زیادہ دن تک ان سب چیزوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور اسی طرح فرانسیسی اور انگریزی سوشلزم کو بھی ، جو ان کا نظری ، گو بہت ناقص ، اظہار تھا ، نظرانداز کرنا مشکل تھا۔ لیکن پرانا عینیت‌پرست تصور تاریخ جو ابھی تک پوری طرح تخت سے نہیں اترا تھا ، معاشی مفاد پر مبنی طبقاتی کشمکش سے ناواقف محض تھا ، وہ معاشی مفاد سے بھی بالکل ناواقف تھا۔ اس تصور تاریخ میں پیداوار اور تمام معاشی تعلقات ”تہذیب کی تاریخ“ میں محض حادثاتی اور کم‌تر درجے کے عناصر کی حیثیت سے نظر آتے تھے۔

نئے حقائق نے اس چیز کو نہایت اہم اور ضروری بنا دیا کہ تمام گذشتہ تاریخ کا نئے سرے سے مطالعہ اور معائنہ کیا جائے۔ اور تب معلوم ہوا کہ بالکل ابتدائی عہد کے علاوہ تمام گذشتہ تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے ، اور سماج کے یہ مصروف پیکار طبقے ہمیشہ پیداوار اور تبادلے کے طریقوں کے — یا مختصر یہ کہ اپنے زمانے کے معاشی حالات کے — پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی دیکھا گیا کہ ہمیشہ سماج کا معاشی ڈھانچہ اصلی بنیاد مہیا کرتا ہے اور صرف اسی بنیاد سے شروع کرکے ہم کسی ایک تاریخی دور کے تمام قانونی اور

سیاسی اداروں کی اور اسی طرح اس کے مذھبی ، فلسفیانہ اور دوسرے خیالات کی تمام عمارت کی آخری توجیہہ اور تشریح کر سکتے ھیں ۔ ھیگل نے تاریخ کو مابعدالطبیعیات سے نجات دلائی تھی ۔ اس نے تاریخ کو جدلیاتی بنا دیا تھا لیکن اس کا تصورتاریخ بنیادی طور پر عینی تصور تھا ۔ اور اب عینیت‌پرستی کو اس کی آخری جائے پناہ — فلسفۂ تاریخ — سے بھی نکالا مل گیا تھا ۔ اب تاریخ کا مطالعہ کرنے کا ایک مادیت‌پسندانہ طریقۂ‌کار پیش کیا گیا ، اور آدمی کے '' وجود ،، کی توجیہہ اس کے '' شعور ،، کے ذریعے کرنے کے بجائے، جیسا کہ اب تک ھوتا چلا آیا تھا ، اس کے '' شعور ،، کی توجیہہ اس کے '' وجود ،، کے ذریعے کرنے کا طریقہ دریافت کر لیا گیا ۔

اس وقت سے سوشلزم کسی ایک یا دوسرے تیز اور طباع دماغ کی اتفاقی اور حادثاتی دریافت نہیں رھا ، اب تو وہ دو تاریخی طور پر ارتقایافتہ طبقوں — پرولتاریہ اور بورژوا — کی باھمی کشمکش کا لازمی ماحصل بن گیا تھا ۔ اب اس کا کام یہ نہیں تھا کہ کسی طرح ایک زیادہ سے زیادہ مکمل اور بےعیب نظام معاشرہ کی تخلیق کرے ، اب اس کا کام ھوگیا تھا ان تاریخی اور معاشی سلسلۂواقعات کا مطالعہ اور معائنہ کرنا جنھوں نے لازمی طور پر ان طبقات اور ان کی تناتنی کو جنم دیا تھا ، اور اس طرح پیداشدہ معاشی حالات میں اس آویزش کو دور کرنے کے ذرائع ڈھونڈھ نکالنا ۔ لیکن پرانے زمانے کا سوشلزم اس مادیت پسندانہ تصور سے اسی قدر مختلف اور بے آھنگ تھا جتنا فرانسیسی مادیت‌پسندوں کا تصور فطرت جدلیات اور جدید علوم طبیعی سے ۔ یہ صحیح ھے کہ پرانے زمانے کا سوشلزم مروجہ سرمایہ‌داری طریق پیداوار اور اس کے نتائج کی تنقید کرتا تھا لیکن یہ سوشلزم ان چیزوں کی توجیہہ نہیں کر سکتا تھا ، اور اسی لئے ان پر غلبہ بھی نہیں پا سکتا تھا ۔ وہ تو صرف ان کو برا کہہ کر مسترد ھی کر سکتا تھا ۔ یہ پرانا سوشلزم جتنے زورشور اور شدومد سے مزدور طبقے کے استحصال کی ، جو سرمایہ‌داری کے تحت ایک ناگزیر چیز ھے ، مذمت کرتا تھا ، اتنا ھی وہ صاف طور پر یہ نہیں دکھا سکتا تھا کہ یہ استحصال کن باتوں پر مشتمل ھے اور کس طرح اس کا آغاز ھوا ۔ لیکن اس کے لئے ضروری

تھا کہ (۱) سرمایہ‌داری طریقۂ پیداوار کو اس کے تاریخی ربط و تعلق کے ساتھ اور ایک خاص تاریخی دور میں اس کے ناگزیر ہونے کی حیثیت سے پیش کیا جائے، اور اسی لئے اس کے ناگزیر زوال کو بھی واضح کیا جائے اور (۲) اس کے بنیادی کردار کو، جو اب تک پردۂ راز تھا، فاش کیا جائے۔ یہ کام قدرزائد کی دریافت کے ذریعے ہوا۔ یہ دکھایا گیا کہ اس محنت کو، جس کی اجرت ادا نہیں کی گئی ہے، اپنے تصرف میں لانا سرمایہ‌داری طریق پیداوار اور مزدور کے اس طریق پیداوار کے تحت ہونے والے استحصال کی بنیاد ہے۔ یہ بھی دکھایا گیا کہ اگر سرمایہ‌دار اپنے مزدور کی قوت محنت کو منڈی میں تجارتی مال کی طرح اس کی پوری قدر پر خریدے، تب بھی اسے اس سے زیادہ قدر حاصل ہوتی ہے جتنی کہ اس نے پیسے ادا کئے ہیں، اور آخری تجزیے میں اسی قدر زائد سے قدر کی وہ رقمیں بنتی ہیں جن سے صاحب‌جائداد طبقوں کے پاس سرمائے کے روزافزوں انبار لگتے رہتے ہیں۔ اس طرح سرمایہ‌داری پیداوار کی ابتدا اور سرمائے کی پیداوار دونوں کی تشریح و توضیح ہو گئی۔

تاریخ کا مادیت‌پسندانہ تصور اور سرمایہ‌داری طریق پیداوار کے راز کا قدر زائد کے ذریعے فاش ہونا — ان دو عظیم دریافتوں کےلئے ہم مارکس کے مرہون منت ہیں۔ ان دریافتوں کے بعد سوشلزم ایک علم بن گیا۔ اب سوشلزم کی تمام تفصیلات اور تعلقات کی ترتیب و تشکیل اگلا قدم تھا۔

۳

تاریخ کا مادیت پسندانہ تصور اس نظریہ کو لے کر آگے بڑھتا ہے کہ انسانی زندگی کو قائم رکھنے کے ذرائع کی پیداوار اور پیدا کی ہوئی اشیا کا تبادلہ، ہر سماجی ڈھانچے کی بنیاد ہے، اور ہر اس سماج میں جو تاریخ میں نمودار ہو چکا ہے دولت کی تقسیم اور سماج کے طبقوں یا مدارج میں بٹنے کے انداز اور ڈھنگ کا دار و مدار اس چیز پر ہے کہ اس میں کیا چیزیں پیدا کی جاتی ہیں، کس طرح پیدا کی

سیاسی اداروں کی اور اسی طرح اس کے مذھبی، فلسفیانہ اور دوسرے خیالات کی تمام عمارت کی آخری توجیہہ اور تشریح کر سکتے ھیں۔ ھیگل نے تاریخ کو مابعدالطبیعیات سے نجات دلائی تھی۔ اس نے تاریخ کو جدلیاتی بنا دیا تھا لیکن اس کا تصورتاریخ بنیادی طور پر عینی تصور تھا۔ اور اب عینیت‌پرستی کو اس کی آخری جائے پناہ — فلسفۂ تاریخ — سے بھی نکالا مل گیا تھا۔ اب تاریخ کا مطالعہ کرنے کا ایک مادیت‌پسندانہ طریقۂ‌کار پیش کیا گیا، اور آدمی کے ''وجود،، کی توجیہہ اس کے ''شعور،، کے ذریعے کرنے کے بجائے، جیسا کہ اب تک ھوتا چلا آیا تھا، اس کے ''شعور،، کی توجیہہ اس کے ''وجود،، کے ذریعے کرنے کا طریقہ دریافت کر لیا گیا۔

اس وقت سے سوشلزم کسی ایک یا دوسرے تیز اور طباع دماغ کی اتفاقی اور حادثاتی دریافت نہیں رھا، اب تو وہ دو تاریخی طور پر ارتقایافتہ طبقوں — پرولتاریہ اور بورژوا — کی باھمی کشمکش کا لازمی ماحصل بن گیا تھا۔ اب اس کا کام یہ نہیں تھا کہ کسی طرح ایک زیادہ سے زیادہ مکمل اور بےعیب نظام معاشرہ کی تخلیق کرے، اب اس کا کام ھوگیا تھا ان تاریخی اور معاشی سلسلۂواقعات کا مطالعہ اور معائنہ کرنا جنھوں نے لازمی طور پر ان طبقات اور ان کی تناتنی کو جنم دیا تھا، اور اس طرح پیداشدہ معاشی حالات میں اس آویزش کو دور کرنے کے ذرائع ڈھونڈھ نکالنا۔ لیکن پرانے زمانے کا سوشلزم اس مادیت پسندانہ تصور سے اسی قدر مختلف اور بے آھنگ تھا جتنا فرانسیسی مادیت‌پسندوں کا تصور فطرت جدلیات اور جدید علوم طبیعی سے۔ یہ صحیح ھے کہ پرانے زمانے کا سوشلزم مروجہ سرمایہ‌داری طریق پیداوار اور اس کے نتائج کی تنقید کرتا تھا لیکن یہ سوشلزم ان چیزوں کی توجیہہ نہیں کر سکتا تھا، اور اسی لئے ان پر غلبہ بھی نہیں پا سکتا تھا۔ وہ تو صرف ان کو برا کہہ کر مسترد ھی کر سکتا تھا۔ یہ پرانا سوشلزم جتنے زورشور اور شدومد سے مزدور طبقے کے استحصال کی، جو سرمایہ‌داری کے تحت ایک ناگزیر چیز ھے، مذمت کرتا تھا، اتنا ھی وہ صاف طور پر یہ نہیں دکھا سکتا تھا کہ یہ استحصال کن باتوں پر مشتمل ھے اور کس طرح اس کا آغاز ھوا۔ لیکن اس کے لئے ضروری

تھا کہ (۱) سرمایہ‌داری طریقۂ پیداوار کو اس کے تاریخی ربط و تعلق کے ساتھ اور ایک خاص تاریخی دور میں اس کے ناگزیر ہونے کی حیثیت سے پیش کیا جائے، اور اسی لئے اس کے ناگزیر زوال کو بھی واضح کیا جائے اور (۲) اس کے بنیادی کردار کو، جو اب تک پردۂ راز تھا، فاش کیا جائے۔ یہ کام قدرزائد کی دریافت کے ذریعے ہوا۔ یہ دکھایا گیا کہ اس محنت کو، جس کی اجرت ادا نہیں کی گئی ہے، اپنے تصرف میں لانا سرمایہ‌داری طریق پیداوار اور مزدور کے اس طریق پیداوار کے تحت ہونے والے استحصال کی بنیاد ہے۔ یہ بھی دکھایا گیا کہ اگر سرمایہ‌دار اپنے مزدور کی قوت محنت کو منڈی میں تجارتی مال کی طرح اس کی پوری قدر پر خریدے، تب بھی اسے اس سے زیادہ قدر حاصل ہوتی ہے جتنی کہ اس نے پیسے ادا کئے ہیں، اور آخری تجزیے میں اسی قدر زائد سے قدر کی وہ رقمیں بنتی ہیں جن سے صاحب‌جائداد طبقوں کے پاس سرمائے کے روزافزوں انبار لگتے رہتے ہیں۔ اس طرح سرمایہ‌داری پیداوار کی ابتدا اور سرمائے کی پیداوار دونوں کی تشریح و توضیح ہو گئی۔

تاریخ کا مادیت‌پسندانہ تصور اور سرمایہ‌داری طریق پیداوار کے راز کا قدر زائد کے ذریعے فاش ہونا — ان دو عظیم دریافتوں کےلئے ہم مارکس کے مرہون منت ہیں۔ ان دریافتوں کے بعد سوشلزم ایک علم بن گیا۔ اب سوشلزم کی تمام تفصیلات اور تعلقات کی ترتیب و تشکیل اگلا قدم تھا۔

۳

تاریخ کا مادیت پسندانہ تصور اس نظریہ کو لے کر آگے بڑھتا ہے کہ انسانی زندگی کو قائم رکھنے کے ذرائع کی پیداوار اور پیدا کی ہوئی اشیا کا تبادلہ، ہر سماجی ڈھانچے کی بنیاد ہے، اور ہر اس سماج میں جو تاریخ میں نمودار ہو چکا ہے دولت کی تقسیم اور سماج کے طبقوں یا مدارج میں بٹنے کے انداز اور ڈھنگ کا دار و مدار اس چیز پر ہے کہ اس میں کیا چیزیں پیدا کی جاتی ہیں، کس طرح پیدا کی

جاتی ہیں اور پیداوار کے تبادلے کا کیا طریقہ ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق تمام سماجی تبدیلیوں اور سیاسی انقلابات کے اصلی سبب و علت کو انسانوں کے دماغوں میں، اور ابدی صداقت اور عدل کے بارے میں انسان کی بڑھتی ہوئی بصیرت میں نہیں تلاش کرنا چاہئے، بلکہ طریق پیداوار اور طریق تبادلہ میں ہونے والی تبدیلیوں میں ان اسباب کو ڈھونڈنا چاہئے۔ ان کو ہر دور کے فلسفے میں نہیں بلکہ اس کی معاشیات میں تلاش کرنا چاہئے۔ اس چیز کا بڑھتا ہوا شعور و ادراک کہ موجودہ سماجی ادارے غیرعقلی اور غیرمنصفانہ ہیں، اور ”معقولیت نامعقولیت اور حق باطل بن چکا ہے،، * بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ طریق پیداوار اور طریق تبادلہ میں چپکے ہی چپکے ایسی تبدیلیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کے ساتھ سماجی نظام، جو اب سے پہلے کے معاشی حالات کے لئے موزوں تھا، اب ہم‌آہنگ نہیں رہا ہے۔ اور اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جن بےآہنگیوں اور ناموزونیوں کو بےنقاب کیا گیا ہے ان سے نجات پانے کے ذرائع بھی ضرور کم وبیش ارتقایافتہ شکل میں خود بدلے ہوئے طریق پیداوار ہی میں مضمر ہوں گے۔ بنیادی اصولوں سے استخراج کے ذریعے یہ ذرائع ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ان کو پیداوار کے موجودہ نظام کے سخت و سرکش حقائق میں دریافت کرنا ہوگا۔

آئیے دیکھیں اس سلسلے میں جدید سوشلزم کی کیا حیثیت ہے؟

اب یہ چیز عام طور پر مان لی گئی ہے کہ سماج کا موجودہ ڈھانچہ آج کے حکمراں طبقے، یعنی بورژوا طبقے کا پیدا کیا ہوا ہے۔ بورژوا طبقے کا مخصوص طریق پیداوار، جو مارکس کے وقت سے سرمایہ‌داری طریق پیداوار کہلانے لگا ہے، نظام جاگیرداری کے ساتھ ہم‌آہنگ نہیں تھا۔ اس نظام نے افراد کو، پورے پورے سماجی مدارج کو اور مقامی کارپوریشنوں کو مخصوص مراعات دے رکھی تھیں اور اسی کے ساتھ اس کی سماجی تنظیم کا پورا ڈھانچہ خدمت اور تابعداری کے موروثی بندھنوں پر مشتمل تھا۔ بورژوا طبقے نے جاگیرداری نظام کو توڑ ڈالا

* گوئٹے کے ”فاؤسٹ،، میں میفسٹوفیلیس کے الفاظ۔ (ایڈیٹر)

اور اس کے کھنڈروں پر سماج کے سرمایہ‌داری نظام کی — مقابلہ آزاد ، شخصی آزادی ، قانون کی نظروں میں جنس تبادلہ کے سارے مالکوں کی مساوات ، اور باقی تمام سرمایہ‌داری برکتوں کی — سلطنت تعمیر کی۔ اس وقت سے سرمایہ‌داری طریق پیداوار آزادی سے ترقی کر سکا۔ جب سے بھاپ ، مشینری اور مشینری سے مشین بنانے کے طریقے نے پرانے کارخانہ‌داری نظام کو جدید صنعت میں تبدیل کر دیا ، بورژوا طبقے کی رہبری میں ابھرنے اور پنپنے‌والی پیداواری قوتوں نے اس قدر تیزی سے اور اس حد تک ترقی کی ہے جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے سننے میں نہیں آئی تھی۔ لیکن جس طرح اپنے وقت میں پرانے کارخانہ‌داری نظام اور دستکاری کی ، جو اس کے اثر سے زیادہ ترقی‌یافتہ ہو گئی تھی ، ”گلڈ“ کی جاگیرداری بندشوں اور زنجیروں سے ٹکر ہوئی تھی بالکل اسی طرح اپنے زیادہ مکمل ارتقا کے دوران میں جدید صنعت کا ان قیود اور پابندیوں سے تصادم ہو رہا ہے جن میں سرمایہ‌داری طریق پیداوار نے اسے جکڑ رکھا ہے۔ نئی پیداواری قوتیں ابھی سے ان قوتوں کو استعمال کرنے کے سرمایہ‌داری طریقے سے آگے نکل گئی ہیں۔ اور پیداواری قوتوں اور طریق پیداوار کی یہ باہمی کشمکش و آویزش آدم کے ”گناہ اولین“ اور ”عدل خداوندی“ کی باہمی آویزش کی طرح انسانی دماغ کی پیداوار نہیں ہے۔ دراصل یہ تو واقعی اور خارجی طور پر ، ہمارے باہر ، ان انسانوں کے ارادے اور اعمال سے بھی آزاد اور خودمختار جو اس کو بروئے‌کار لائے ہیں ، موجود ہے۔ جدید سوشلزم دراصل صرف حقیقت میں موجود اس کشمکش و آویزش کا خیالی مظہر اور پرچھائیں ہے ، سب سے بڑھ کر یہ کشمکش کا براہ‌راست شکار ہونے والے طبقے ، یعنی مزدور طبقے کے ذہنوں میں اس حقیقت کا خیالی پرتو ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ کشمکش اور آویزش کن چیزوں پر مشتمل ہے ؟

سرمایہ‌داری پیداوار سے پہلے ، یعنی قرون وسطی میں ، عام طور پر چھوٹی صنعت کا نظام رائج تھا جس کی بنیاد اس چیز پر تھی کہ مزدوروں کے ذرائع پیداوار ان کی ذاتی ملکیت ہوں۔ دیہات میں چھوٹے کسان ، آزاد مزارع یا زرعی غلام کی کاشت‌کاری اور شہروں میں گلڈ

کے ذریعے منظم کی ہوئی دستکاری کا رواج تھا۔ آلات محنت — زمین، زرعی اوزار، ورک شاپ اور آلات وغیرہ فرد واحد کی محنت کے آلات تھے اور ایک ہی مزدور کی محنت کےلئے موزوں اور مناسب تھے اور اسی لئے لازمی طور پر چھوٹے، ہلکے پھلکے، کم‌حیثیت اور محدود تھے۔ لیکن ٹھیک اسی وجہ سے وہ عموماً خود پیدا کرنے والے کی ملکیت ہوتے تھے۔ ان بکھرے ہوئے اور محدود ذرائع پیداوار کو مرکوز و متحد کرنا، انھیں توسیع دینا اور انھیں موجودہ زمانے کی پیداوار کی توسیع کے طاقت‌ور وسیلے کی شکل دینا — ٹھیک یہ تاریخی رول تھا سرمایہ‌داری طریق پیداوار اور اس کے علم‌بردار، یعنی بورژوا طبقے کا۔ مارکس نے ''سرمایہ،، کے چوتھے حصے میں تفصیل سے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ پندرھویں صدی سے لے کر اب تک کس طرح یہ کام تاریخی طور پر تین مختلف منازل — سادہ امداد باہمی، کارخانہ‌داری اور جدید صنعت سے گزر کر انجام دیا گیا ہے۔ لیکن بورژوا طبقہ، جیسا کہ ''سرمایہ،، میں دکھایا گیا ہے، اس وقت تک ان چھوٹے اور ادنی ذرائع پیداوار کو عظیم پیداواری قوتوں میں تبدیل نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ وہ ساتھ ہی ساتھ انھیں فرد کے ذرائع پیداوار سے سماجی ذرائع پیداوار میں تبدیل نہ کر دے جن کو صرف بہت سے انسان مل کر ہی استعمال کر سکتے تھے۔ کرگھے اور چرخے اور لوہار کی ہتوڑی کی جگہ سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی مشین اور بھاپ کی طاقت سے چلنے والے ہتوڑے نے لے لی، انفرادی ورک شاپ کی جگہ فیکٹری نے لے لی جس میں سینکڑوں اور ہزاروں مزدوروں کا کام کرنا ضروری تھا۔ اسی طرح خود عمل پیداوار نے بھی انفرادی سلسلۂ اعمال کے بجائے سماجی سلسلۂ اعمال کی شکل اختیار کر لی اور مصنوعات انفرادی کے بجائے سماجی ہو گئیں۔ اب دھاگا، کپڑا اور دھات کی بنی ہوئی اشیا جو فیکٹری سے نکل کر آتی تھیں بہت سے مزدوروں کی مشترکہ محنت کی پیداوار بن گئیں جن کے ہاتھوں سے انھیں یکے بعد دیگرے تیار ہونے سے پہلے گذرنا پڑتا تھا۔ اب کوئی ایک شخص ان کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا تھا ''اسے میں نے بنایا، یہ میری پیدا کی ہوئی چیز ہے،،۔

لیکن جس کسی سماج میں بھی پیداوار کی بنیادی شکل وہ بےساختہ

اور فطری قسم کی تقسیم محنت ہو جو کسی سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق نہیں ہوتی بلکہ رفتہ‌رفتہ دبے پاؤں گھس آتی ہے ، وہاں پیداشدہ اشیا جنس تبادلہ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جن کا باہمی تبادلہ اور خرید و فروخت اشیا پیدا کرنےوالے افراد کے لئے یہ امکان پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنی بہت سی مختلف ضروریات پوری کر سکیں ۔ اور قرون وسطی میں یہی صورت تھی ۔ مثلاً کسان دستکار کے ہاتھ اپنی زرعی پیداوار بیچ دیتا تھا اور اس سے دستکاری کی اشیا خرید لیتا تھا ۔ انفرادی طور پر مال پیدا کرنےوالے ، یعنی جنس تبادلہ پیدا کرنےوالے افراد کے اس سماج میں نیا طریق پیداوار درانہ گھس آیا ۔ اس پرانی تقسیم محنت کے درمیان ، جو فطری اور بےساختہ طور پر ، کسی واضح اور معین منصوبے کے بغیر پیدا ہو گئی تھی ، اور جو پورے کے پورے سماج پر حاوی تھی ، اب ایک اور تقسیم محنت پیدا ہو گئی جو ایک واضح اور معین منصوبے کے مطابق تھی — مثلاً فیکٹری کی تنظیم ۔ انفرادی پیداوار کے پہلو بہ پہلو سماجی پیداوار بھی نظر آنے لگی ۔ دونوں کی مصنوعات ایک ہی منڈی میں بکتی تھیں اور اسی لئے کم و بیش مساوی قیمتوں پر بکتی تھیں ۔ لیکن ایک واضح اور معین منصوبے پر مبنی تنظیم فطری اور بے ساختہ تقسیم محنت سے زیادہ طاقت‌ور تھی ۔ کارخانے جو بہت سے افراد کی مجتمع اور مشترکہ سماجی قوتوں کا استعمال کرتے تھے ، اپنی مصنوعات اس سے کہیں زیادہ سستے طریقے پر پیدا کر سکتے تھے جتنا کہ چھوٹے چھوٹے ، انفرادی طور پر اشیا پیدا کرنےوالوں کے لئے ممکن تھا ۔ انفرادی طریق پیداوار یکے بعد دیگرے مختلف شعبوں میں ہتھیار ڈالتا ہی چلا گیا ۔ پیداوار کے سماجی ڈھنگ نے پیداوار کے تمام پرانے طریقوں میں انقلاب پیدا کر دیا ۔ لیکن ساتھ ہی اس کے انقلابی کردار کو اتنا کم سمجھا اور مانا گیا کہ وہ بجائے انقلابی حیثیت سے پیش کئے جانے کے جنس تبادلہ کی پیداوار کو توسیع و ترقی دینے کے ذریعے کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ۔ جس وقت یہ سماجی ڈھنگ کی پیداوار ابھری تو اس نے جنس تبادلہ کی پیداوار اور تبادلے کے لئے چند بنی بنائی تیارشدہ چیزوں — مثلاً تاجروں کا سرمایہ ، دستکاری ، اجرتی محنت — کو موجود پایا اور اس نے ان سے خوب فائدہ بھی اٹھایا ۔

چونکہ سماجی ڈھنگ کی پیداوار نے اپنے آپ کو جنس تبادلہ کی پیداوار کی ایک نئی شکل کی حیثیت سے پیش کیا تھا اس لئے یہ بات قرین قیاس تھی کہ اس کے زیرسایہ تصرف اور ملکیت کی تمام پرانی شکلیں زورشور سے قائم رہیں اور ان کا اطلاق اس طریق پیداوار کے تحت بننے والی مصنوعات پر بھی ہوتا رہا۔

جنس تبادلہ کی پیداوار کے ارتقا کے اس دور میں جس کا تعلق قرون وسطی سے ہے، محنت کی پیداوار کے مالک کے متعلق کوئی سوال ہی نہیں اٹھ سکتا تھا۔ انفرادی طور پر اشیا پیدا کرنےوالا عموماً اس خام مواد سے جو اسی کی ملکیت ہوتا تھا اور عام طور پر اسی کا بنایا ہوا ہوتا تھا، اشیا کو خود اپنے اوزاروں سے اور اپنے یا اپنے خاندان کے دست و بازو کی محنت سے تیار کرتا تھا۔ اسے اس نئی پیداشدہ شے پر تصرف اور قبضہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو معمولاً اور بہر صورت بلا شرکت غیرے اس کی ملکیت ہوتی ہی تھی۔ لہذا خود اس کی اپنی محنت اس کے پیداوار کا مالک ہونے کی بنیاد تھی۔ اور جہاں کہیں خارجی مدد کا استعمال کیا بھی جاتا تھا تو عام طور پر اس کی اہمیت محض ضمنی اور جزوی ہوتی تھی اور عموماً اس کا بدلہ اجرت دینے کے بجائے اور کسی طرح کر دیا جاتا تھا — گلڈ کے اجرت‌یافتہ کاریگر اور شاگرد زیادہ‌تر مزدوری اور کھانے کی خاطر نہیں بلکہ تعلیم و تربیت پانے کی خاطر کام کرتے تھے، اور اس خیال سے کام کرتے تھے کہ وہ خود آئندہ استاد کاریگر کا رتبہ حاصل کر سکیں۔

اس کے بعد ذرائع پیداوار اور پیدا کرنےوالے دونوں کے بڑی بڑی ورک شاپوں اور کارخانوں میں مرکوز اور مجتمع ہونے کا، ان کے واقعی سماجی ذرائع پیداوار اور سماجی ڈھنگ کے پیدا کرنےوالوں میں تبدیل ہونے کا زمانہ آیا۔ لیکن سماجی ڈھنگ کے پیدا کرنےوالوں اور ذرائع پیداوار اور ان سے حاصل‌شدہ پیداوار کو اس تبدیلی کے بعد بھی، پہلے ہی کی طرح، افراد کے ذرائع پیداوار اور حاصل پیداوار سمجھا جاتا رہا۔ اب تک تو آلات محنت کا مالک خود ہی پیداوار پر قابض ہوتا تھا کیونکہ عام طور پر وہ اسی کی پیداوار ہوتی تھی اور دوسروں کی مدد ایک مستثنی چیز تھی۔ اب آلات محنت کا مالک پیداوار پر ہمیشہ

اپنا قبضہ جمانے لگا حالانکہ اب یہ اس کی پیداوار نہیں ہوتی تھی بلکہ مکمل طور پر دوسروں کی محنت کی پیداوار ہوتی تھی ۔ اس طرح اب جو پیداوار اجتماعی طور پر حاصل کی جاتی ہے اس پر ان لوگوں کا قبضہ نہیں ہوتا جو دراصل ذرائع پیداوار کو حرکت میں لاتے ہیں اور جنس تبادلہ پیدا کرتے ہیں بلکہ سرمایہ‌دار اس پر قابض ہوتے ہیں ۔ ذرائع پیداوار اور خود پیداوار دونوں بنیادی طور پر سماجی ڈھنگ کے ہو گئے تھے لیکن وہ تصرف اور ملکیت کی ایک ایسی شکل کے تابع تھے جس کے لئے الگ الگ افراد کی نجی پیداوار ایک لازمی چیز ہے ، اور جس کے تحت ہر شخص خود اپنی پیداشدہ اشیا کا مالک ہوتا ہے اور خود ہی اسے منڈی میں لاتا ہے ۔ طریق پیداوار ملکیت اور تصرف کی اس شکل کے تابع ہے باوجودیکہ وہ ان حالات کا خاتمہ کرتا ہے جن پر اس شکل کی بنیاد ہے * ۔

اس تضاد میں جو نئے طریق پیداوار کو اس کا سرمایہ‌دارانہ کردار بخشتا ہے ، آج کی تمام سماجی آویزشوں کے بیج موجود ہیں ۔ نئے طریق پیداوار نے پیداوار کے تمام اہم شعبوں اور تمام صنعتی ملکوں پر جتنا زیادہ قابو پایا ، اسی تناسب سے اس نے انفرادی پیداوار کو ایک معمولی تلچھٹ کی حیثیت دے دی ، اور اسی تناسب سے یہ بات کھلتی

---

* اس سلسلے میں یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ملکیت اور تصرف کی شکل وہی رہنے کے باوجود ملکیت اور تصرف کے کردار میں مندرجۂ بالا تبدیلیوں کے باعث اسی قدر انقلاب پیدا ہوا ہے جس قدر پیداوار میں ہوا ہے ۔ ظاہر ہے ان دونوں چیزوں میں بہت فرق ہے کہ میں اپنی پیداوار کو اپنے قبضے اور تصرف میں لاؤں یا کسی دوسرے کی پیداوار کو ۔ برسبیل تذکرہ اس چیز کا بھی ذکر کرتے چلیں کہ اجرت پر کام کرنے کا طریقہ جس کے اندر تمام سرمایہ‌داری طریق پیداوار کے بیج موجود ہیں بہت قدیم چیز ہے ۔ اتفاقی ، اکادکا اور منتشر شکل میں صدیوں سے غلامانہ محنت کے ساتھ ساتھ اس کا بھی وجود رہا ہے ۔ لیکن یہ بیج بڑھ کر سرمایہ‌داری طریق پیداوار اسی وقت بن سکا جب کہ اس کے لئے ضروری تاریخی حالات مہیا ہو گئے ۔ (اینگلس کا نوٹ)

گئی کہ سماجی ڈھنگ کی پیداوار کا سرمایہ‌داری ملکیت اور تصرف سے جوڑ نہیں بیٹھتا۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے ابتدائی سرمایہ‌داروں کو کام کے اور طریقوں کے ساتھ ساتھ اجرتی محنت کا طریقہ منڈی میں تیارشدہ شکل میں مل گیا تھا۔ لیکن اجرتی محنت مستثنی، اضافی، زائد، امدادی اور عارضی قسم کی تھی۔ کاشتکار اگرچہ کبھی کبھی دن دن بھر کی مزدوری کر لیتا تھا لیکن اس کے پاس اپنی ذاتی چند ایکڑ زمین ہوتی تھی جس پر وہ بہر صورت تنگ ترشی سے تو گزارہ کر ہی سکتا تھا۔ گلڈ کی تنظیم کچھ ایسی تھی کہ آج کا اجرت‌یافتہ کاریگر کل استاد کاریگر بن سکتا تھا۔ لیکن جوں ہی ذرائع پیداوار سماجی بنے اور سرمایہ‌داروں کے ہاتھ میں مرکوز ہوئے یہ سب کچھ بدل گیا۔ انفرادی طور پر پیدا کرنےوالے کے ذرائع پیداوار اور پیداوار دونوں چیزیں روزبروز بیکار اور بےمصرف ہوتی چلی گئیں۔ اب اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ سرمایہ‌دار کے لئے اجرت پر کام کرے۔ اجرتی محنت جو اب تک مستثنی اور ضمنی سی چیز تھی اب تمام پیداوار کی بنیاد اور عام اصول بن گئی۔ اب تک وہ ایک زائد اور امدادی سی چیز تھی لیکن اب مزدور کا واحد کام بن گئی۔ وہ جو وقتی اور عارضی طور پر اجرتی مزدور تھا اب تمام عمر کے لئے اجرتی مزدور بن گیا۔ اس کے علاوہ ان اجرتی مزدوروں کی تعداد میں جاگیرداری نظام کے زوال کی وجہ سے، جو اسی زمانے میں رونما ہوا، بہت غیرمعمولی اضافہ ہوا، کیونکہ اس زمانے میں جاگیرداری رؤسا کے وابستۂ دولت درباریوں اور مصاحبین کا شیرازہ بکھر گیا اور کسان کھیتوں سے بےدخل کر دئے گئے وغیرہ وغیرہ۔ اب ایک طرف تو سرمایہ‌داروں کے ہاتھوں میں مرکوز ذرائع پیداوار تھے، اور دوسری طرف اپنی قوت محنت کے علاوہ اور ہر شے سے محروم پیدا کرنےوالے، اب ان کی باہمی دوری اور علیحدگی کی تکمیل ہو گئی تھی۔ سماجی ڈھنگ کی پیداوار کا سرمایہ‌داری ملکیت اور تصرف سے باہمی تضاد کا اظہار پرولتاری اور بورژوا طبقوں کی آویزش کی شکل میں ہوا۔

ہم نے دیکھ لیا ہے کہ سرمایہ‌داری طریق پیداوار جنس تبادلہ (مال) پیدا کرنے والوں کے، یعنی انفرادی طور پر اشیا پیدا کرنے والوں کے سماج میں درانہ گھس آیا جن کا سماجی بندھن ان کی پیداوار کا تبادلہ تھا۔ لیکن جنس تبادلہ کی پیداوار پر مبنی ہر سماج میں یہ خصوصیت ہے کہ پیدا کرنے والوں کا اپنے باہمی سماجی تعلقات پر قابو باقی نہیں رہتا۔ ہر شخص کے پاس جو کچھ بھی ذرائع پیداوار موجود ہوتے ہیں انہیں سے اور جس قسم کے تبادلے کی اسے اپنی باقی ماندہ ضروریات کی آسودگی کے لئے حاجت ہوتی ہے اسی تبادلے کے لئے وہ اپنے واسطے اشیا پیدا کرتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کی جنس تبادلہ کی کتنی مقدار منڈی میں آنےوالی ہے اور نہ ہی یہ جانتا ہے کہ اس میں سے کتنی جنس کی ضرورت ہوگی۔ کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ اس کی اپنی پیداوار کی واقعی مانگ ہوگی یا نہیں، وہ اپنی پیداوار کا خرچہ نکال سکےگا یا نہیں، بلکہ اپنی جنس تبادلہ کو سرے سے بیچ بھی پائےگا یا نہیں۔ اس سماجی پیداوار میں افراتفری کا راج ہے۔

لیکن اور ہر قسم کی پیداوار کی طرح جنس تبادلہ کی پیداوار کے بھی اپنے مخصوص اور راسخ قانون ہوتے ہیں جنہیں اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اور یہ قوانین نراج کے باوجود اور نراج کے اندر ہی مصروف‌عمل ہوتے ہیں۔ وہ سماجی تعلقات‌باہمی کی واحد مستقل شکل میں اپنا اظہار کرتے ہیں، یعنی‌تبادلے کی شکل میں، اور یہاں وہ انفرادی پیدا کرنےوالوں پر مقابلے کے جبری قوانین کی حیثیت سے اثرانداز ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں تو خود انفرادی پیدا کرنےوالے بھی ان قوانین سے واقف نہیں ہوتے اور انہیں رفتہ رفتہ، تجربے کے نتیجے کے طور پر یہ قوانین دریافت کرنا ہوتے ہیں۔ اسی‌لئے یہ قوانین پیدا کرنےوالوں کی مرضی اور ارادے سے آزاد اور ان کے برخلاف اپنا کام کرتے ہیں، اور مخصوص طریق‌پیداوار کے اٹل فطری قوانین کی حیثیت سے مصروف‌کار ہوتے ہیں۔ پیداوار، پیدا کرنےوالوں پر راج کرنے لگتی ہے۔

قرون‌وسطی کے سماج میں، اور خاص طور پر اس کی ابتدائی صدیوں میں، پیداوار بنیادی طور پر فرد کی‌ضروریات پوری کرنے کےلئے ہوتی تھی۔ زیادہ‌تر وہ صرف پیدا کرنےوالے کی اور اس کے خاندان کی ضروریات پوری

کرتی تھی۔ جہاں شخصی تابعداری کے تعلقات رائج تھے، مثلاً دیہات میں، وہاں پیداوار جاگیردار رئیس کی ضروریات کی آسودگی میں بھی مدد کرتی تھی۔ ان سب چیزوں میں تبادلے کا کوئی سوال نہیں تھا لہذا پیداشدہ اشیا نے جنس تبادلہ کا کردار اختیار نہیں کیا۔ کسان کا خاندان اپنی ضرورت کی تقریباً ہر چیز — کھانا، کپڑا اور اسباب خانہداری — پیدا کر لیتا تھا۔ جب اس نے اپنی ضروریات کی آسودگی کے لئے اور جاگیردار کی ادائگی بالجنس کے لئے جتنا کچھ ضروری تھا اس سے زیادہ پیدا کرنا شروع کیا، صرف اسی وقت اس نے جنس تبادلہ بھی پیدا کی۔ یہ زائد مقدار سماجی تبادلے میں شامل ہوکر اور بکاؤ چیز کی حیثیت اختیار کرکے جنس تبادلہ بن گئی۔

یہ ٹھیک ہے کہ شہروں کے کاریگروں کو شروع ہی سے تبادلے کے لئے اشیا پیدا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن وہ بھی زیادہتر اپنی ذاتی ضروریات خود ہی پوری کرتے تھے۔ ان کے پاس باغ اور زمین کے قطعے ہوتے تھے۔ وہ اپنے مویشیوں کو پنچائتی جنگل میں چرنے کے لئے چھوڑ دیتے تھے اور اسی جنگل سے انھیں عمارتی لکڑی اور ایندھن بھی مل جاتا تھا۔ عورتیں کتائی کرتی اور اون وغیرہ بنتی تھیں۔ تبادلے کی خاطر پیداوار، یعنی جنس تبادلہ کی پیداوار عالم طفلی میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تبادلہ محدود، منڈی چھوٹی اور پیداوار کے طریقے پائدار تھے۔ بیرونی دنیا کی طرف مقامی خلوت پسندی کا رویہ تھا اور اندر مقامی اتحاد، دیہات میں مارک* تھا اور قصبے میں گلڈ۔

لیکن جنس تبادلہ کی پیداوار کی توسیع اور خاص طور پر سرمایہداری طریق پیداوار کی ترویج کے ساتھ، جنس تبادلہ کی پیداوار کے قوانین جو ابھی تک خوابیدہ و پنہاں تھے، زیادہ کھلے طور پر اور زیادہ زور شور کے ساتھ مصروف عمل ہونے لگے۔ پرانے بندھن ڈھیلے ہو گئے، پرانی مخصوص حدبندیاں ٹوٹ گئیں اور پیدا کرنےوالے روزافزوں طور پر خودمختار اور علیحدہ علیحدہ جنس تبادلہ پیدا کرنےوالوں میں تبدیل

---

* یہاں اینگلس نے اپنی تصنیف ''مارک،، کا حوالہ دیا ہے۔ دیکھئے تشریحی نوٹ نمبر ۳۰۔ (ایڈیٹر)

ہونے لگے۔ صاف ظاہر ہو گیا کہ مجموعی طور پر سماج کی پیداوار میں منصوبے کی غیرموجودگی، اتفاقات اور نراج کا دور دورہ ہے، اور یہ افراتفری زیادہ سے زیادہ بڑھتی ہی جارہی ہے۔ لیکن وہ خاص ذریعہ، جس کی مدد سے سرمایہ‌داری طریق پیداوار نے سماجی پیداوار کے اس نراج کو زیادہ شدید اور تیز بنایا، دراصل نراج کی عین ضد تھا — اور وہ ذریعہ تھا ہر ایک پیداواری کارخانے میں روزافزوں طور پر پیداوار کا سماجی بنیاد پر منظم کیا جانا۔ اس چیز نے پرانے، پرسکون اور پائدار حالات کا خاتمہ کردیا۔ جہاں کہیں بھی صنعت کے کسی شعبے میں پیداوار کی اس تنظیم کو رواج دیا گیا اس نے اپنے پہلو بہ پہلو پیداوار کے اور کسی طریقے کو برداشت نہیں کیا۔ محنت کا میدان میدان جنگ بن گیا۔ عظیم جغرافیائی دریافتوں (۸۰) اور ان کے بعد نوآبادیات نے منڈیوں کی تعداد بڑھا دی اور دستکاری کے کارخانہ‌داری میں تبدیل ہونے کے عمل کو تیزتر کردیا۔ اور محض مختلف بستیوں کے انفرادی پیدا کرنےوالوں ہی کے درمیان جنگ نہیں چھڑی — مقامی جنگوں نے قومی آویزشوں کو، سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی تجارتی جنگوں کو جنم دیا (۸۱)۔

علاوہ بریں جدید صنعت اور عالمی منڈی نے اس کشمکش کو عالمگیر بنادیا اور ساتھ ہی ساتھ اسے ایک غیرمعمولی توانائی بھی عطا کردی۔ اب پیداوار کے فطری اور مصنوعی حالات کی فوقیت اور برتری انفرادی سرمایہ‌داروں اور اسی کے ساتھ تمام کی تمام صنعتوں اور ملکوں کے عدم اور وجود کا فیصلہ کرتی ہے۔ جو گرتا ہے اسے بےرحمی سے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ یہ ڈارون کے نظرئے کے مطابق وہی فرد کی زندہ رہنے کی کوشش ہے جو زیادہ شدت کے ساتھ فطرت سے سماج کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ حیوان کےلئے جو حالات‌زندگی فطری ہیں وہ ارتقائے انسانی کےلئے حرف‌آخر کی حیثیت سے سامنے آنے لگے ہیں۔ سماجی پیداوار اور سرمایہ‌داری تصرف اور ملکیت کا تضاد اب الگ الگ کارخانوں میں پیداوار کی تنظیم اور عام طور پر سماج میں پیداوار کے نراج کے درمیان آویزش کی شکل میں اپنا اظہار کرتا ہے۔

سرمایہ‌داری طریق‌پیداوار آویزش اور تناقض کی انھیں دو شکلوں میں

حرکت کرتا رہتا ہے جو پیدائش کے وقت سے ہی اس کے اندر موجود ہیں - وہ کبھی بھی اس ''دائرۂ نامعقول،، سے باہر نہیں نکل سکتا جو فورئے نے پہلے ہی دریافت کرلیا تھا - اصل میں فورئے اپنے زمانے میں جو چیز نہیں دیکھ سکا وہ یہ تھی کہ یہ دائرہ رفتہ رفتہ تنگ ہوتا جا رہا ہے ، حرکت روز بروز ایک مخروطی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے ، اور اسے بھی سیاروں کی حرکت کی طرح مرکز سے تصادم ہونے پر کبھی نہ کبھی ضرور ختم ہونا ہے - پورے سماج کی پیداوار میں جو نراج ہے اس کی دباؤ ڈالنےوالی قوت انسانوں کی اکثریت کو زیادہ سے زیادہ پرولتاریوں میں تبدیل کرتی جا رہی ہے ، اور دوسری طرف یہی پرولتاری ہیں جو آخرکار پیداوار کے اس نراج کا خاتمہ کریں‌گے - سماجی پیداوار میں جو افراتفری ہے اس کی دباؤ ڈالنےوالی قوت ہی ، جدید صنعت کے تحت مشینوں کی بےپناہ تکمیل پذیری کو ایک جبری قانون میں تبدیل کرتی ہے جس کی رو سے ہر سرمایہدار کے لئے اپنی مشینوں کو روزافزوں طور پر بہتر سے بہتر بنانا ضروری ہوتا ہے ، ورنہ تباہی اور بربادی اس کا مقدر ہوجاتی ہے -

لیکن مشینوں کی تکمیل انسانی محنت کو ایک مدزائد بنا رہی ہے- اگر مشینوں کی ترویج اور توسیع کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مشین پر کام کرنےوالے چند مزدور ہاتھ سے کام کرنےوالے لاکھوں محنت کشوں کی جگہ لےلیں ، تو مشینوں میں اور زیادہ ترقی ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ خود مشین پر کام کرنےوالے مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ نکالا جائے - علاوہبریں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اجرتی مزدوروں کی ایک تعداد سرمائے کی اوسط ضروریات سے زیادہ ہوجاتی ہے ، اور اس کا مطلب ہے صنعتی مزدوروں کی ایک ریزرو فوج کی تشکیل (۱۸۴۵ء میں میں نے اسے یہ نام دیا تھا *) جو صنعت کے نہایت سرگرمی اور تیزی سے کام کرنے کے زمانے میں استعمال ہوتی ہے ، اور جسے ناگزیر کاروباری تباہی کے رونما ہوتے ہی اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا جاتا ہے - یہ محفوظ فوج مزدور

---

* ''انگلینڈ میں مزدور طبقے کی حالت،، (''سوشن شائن اینڈ کو،، کا ایڈیشن) ، صفحہ ۸۴ - (اینگلس کا نوٹ)

طبقے کی سرمائے کے خلاف جہدبقا میں اس کے اوپر ایک بھاری بوجھ کی طرح موجود رہتی ہے اور سرمائے کے مفاد کے مطابق اجرت کو نیچی سطح پر قائم رکھنے کا ایک آلہ ہے۔ سو اس طور پر، مارکس کے الفاظ میں، مشینیں مزدور طبقے کےخلاف سرمائے کی جنگ میں انتہائی طاقتور ہتھیار بن‌جاتی ہیں، آلات محنت مسلسل مزدور کے ہاتھ سے اس کی روزی کے وسیلے چھینتے رہتے ہیں، اور خود مزدور کی تیار کی ہوئی چیز اس کو ماتحتی میں رکھنے کا آلہ بن‌جاتی ہے۔ سو اس طور پر آلات محنت کی کفایت، شروع ہی سے، بیک‌وقت قوت محنت کی انتہائی لاابالی فضول خرچی بھی بن‌جاتی ہے، اور ان نارمل حالات پر مبنی ڈاکہ بھی جن کے تحت محنت مصروف‌کار ہوتی ہے۔ مشین یعنی ''محنت کے وقت میں کمی کرنے کا سب سے زیادہ طاقتور ہتھیار، اس چیز کا انتہائی کارگر ذریعہ بن جاتی ہے کہ مزدور اور اس کے خاندان کے وقت کا ایک ایک لمحہ سرمایہ‌دار کے اختیار میں ہو، تاکہ وہ اپنے سرمائے کی قدر میں اضافہ کر سکے''۔ (''سرمایہ''۔ انگریزی ایڈیشن، جلد اول، صفحہ ۴۰۶۔) سو اس طرح کچھ لوگوں کا حد سے زیادہ کام کرنا دوسرے لوگوں کے بیکار محض رہنے کی لازمی شرط بن‌جاتا ہے، اور جدید صنعت، جو دنیا بھر میں نئے خرچ کرنےوالوں کی تاک میں رہتی ہے، اپنے ملک کی جنتا کے صرف کو فاقہ کشی کی سطح تک پہنچا دیتی ہے، اور ایسا کرنے میں خود اپنی گھریلو منڈی کو تباہ کر دیتی ہے۔ ''وہ قانون جو نسبتاً زائد آبادی — یا صنعتی ریزرو فوج کے — اور سرمایہ جمع ہونے کی مقدار اور طاقت کے درمیان ہمیشہ توازن قائم رکھتا ہے، وہی قانون مزدور کو سرمائے کی زنجیروں میں اس قدر مضبوطی سے باندھ دیتا ہے کہ اتنی مضبوطی سے ولکان نے پرومیتھیس کو بھی چٹان سے نہ باندھا ہوگا۔ یہ قانون سرمایہ کے اجتماع کے تناسب سے مصائب کے اجتماع کو بھی جنم دیتا ہے۔ لہذا ایک سرے پر دولت کا اجتماع ہوتا ہے اور اس کے متضاد سرے پر بیک وقت مصائب، محنت کے کرب، غلامی، جہالت، درندگی اور ذہنی پستی کا — اور یہ سب اس طبقے کے حصے میں آتا ہے جو اپنی محنت کا حاصل سرمائے کی شکل میں پیدا کرتا ہے۔''

(مارکس، ''سرمایہ''، (''سونن شائن اینڈ کو'' کا ایڈیشن) صفحہ

۶۷۱ -) اور سرمایہ‌داری طریق پیداوار سے پیداشدہ اشیا کی کسی اور تقسیم کی توقع کرنا ایسا ھی ھے جیسے ایک بیٹری کے برقیروں (electrodes) سے یہ توقع کی جائے کہ وہ بیٹری سے منسلک ھونے کی صورت میں تیزاب‌دار پانی کو تحلیل نہ کریں اور آکسیجن کو اپنے مثبت قطب پر اور ھائیڈروجن کو منفی قطب پر پانی سے خارج نہ کریں۔

ھم نے دیکھا کہ جدید مشینوں کی روزافزوں تکمیل‌پذیری، سماجی پیداوار کے نراج کے ذریعے، ایک جبری قانون میں تبدیل ھو جاتی ھے جو ھر صنعتی سرمایہ‌دار کو ھمہ‌وقت اپنی مشینوں کو ترقی دینے اور ان کی پیداواری قوت بڑھاتے رھنے پر مجبور کرتا ھے۔ محض پیداوار کا میدان وسیع کرنے کا امکان بھی اس کے لئے ایک ایسے ھی جبری قانون کی شکل اختیار کر لیتا ھے۔ جدید صنعت کی بےحد بڑی توسیع پذیر قوت، جس کے مقابلے میں گیسوں کے پھیلنے کی قوت بچوں کا کھیل معلوم ھوتی ھے، اب ھمیں مقدار اور ماھیت دونوں کی توسیع کی ناگزیر ضرورت معلوم ھوتی ھے جو کسی قسم کی مزاحمت کو خاطر میں نہیں لاتی۔ یہ مزاحمت صرف، فروخت اور جدید صنعت کی پیداوار کی منڈیوں کی طرف سے ھوتی ھے۔ لیکن منڈیوں کی فراخ اور عمیق، دونوں قسم کی توسیع کی صلاحیت کا انحصار بنیادی طور پر قطعی مختلف قوانین پر ھے جو اس سے کہیں کم توانائی کے ساتھ مصروف عمل ھوتے ھیں۔ منڈیوں کی توسیع پیداوار کی توسیع کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ تصادم ناگزیر ھو جاتا ھے، اور چونکہ جب تک یہ تصادم سرمایہ‌داری طریق‌پیداوار کا پوری طرح تختہ نہ الٹے اس وقت تک وہ کوئی معقول حل پیش نہیں کر سکتا، لہذا یہ تصادم باربار ھونے لگتا ھے۔ سرمایہ‌داری پیداوار نے ایک اور ”دائرۂنامعقول“ کو جنم دے دیا۔

واقعہ یہ ھے کہ ۱۸۲۵ء سے لے کر، جب کہ پہلا عام بحران نمودار ھوا تھا، اب تک تمام صنعتی اور تجارتی دنیا میں، تمام مہذب قوموں اور ان کے کم و بیش نامہذب طفیلیوں کے درمیان، تقریباً ھر دس سال بعد ساری پیداوار اور تبادلہ کی چولیں ڈھیلی پڑ جاتی ھیں۔ تجارت کا بازار مندا پڑ جاتا ھے، منڈیاں ٹھساٹھس بھر جاتی ھیں، اشیائے تبادلہ جتنی ناقابل فروخت ھوتی ھیں اسی قدر ان گنت اور بےشمار

بھی ہوتی ہیں ، زرنقد غائب ہو جاتا ہے ، کوئی قرض دینے پر تیار نہیں ہوتا ، کارخانے بند ہونےلگتے ہیں ، مزدوروں کی بڑی تعداد کے پاس ذرائع زندگی نہیں ہوتے کیونکہ انھوں نے بہت زیادہ ذرائع زندگی پیدا کر دئے ہیں ۔ دیوالوں پر دیوالے نکلنے لگتے ہیں اور قرقی کا سلسلہ بندھ جاتا ہے ۔ یہ جمود کئی سال تک باقی رہتا ہے ۔ پیداوار اور پیداواری قوتیں بہت بڑی تعداد میں ضائع اور برباد ہوتی ہیں ، یہاں تک کہ جمع‌شدہ مالوں کی قیمت کم و بیش گھٹنے کے بعد آخرکار رفتہ رفتہ ان کی نکاسی ہونے لگتی ہے اور عمل پیداوار اور تبادلہ دونوں رفتہ‌رفتہ ایک دفعہ پھر حرکت میں‌آتے ہیں ۔ آہستہ آہستہ چال تیز ہوتی ہے ۔ وہ دلکی چال بن جاتی ہے ، صنعتی دلکی چال بڑھ کر پویہ بن جاتی ہے اور پویہ تیز ہو کر صنعت ، تجارتی قرض اور سٹہ‌بازی کی بہترین سرپٹ گھوڑدوڑ میں تبدیل ہو جاتی ہے جو بالآخر انتہائی تیز چھلانگوں کے بعد اسی جگہ ختم ہوتی ہے جہاں سے شروع ہوئی تھی ۔ یعنی بحران کی خندق میں ۔ اور باربار یہی ہوتا رہتا ہے ۔ ۱۸۲۵ ء سے لے کر اب تک ہم پانچ مرتبہ اس چکر سے گذر چکے ہیں ، اور اس وقت (۱۸۷۷ ء میں) چھٹی بار اس سے گذر رہے ہیں ۔ اور ان بحرانوں کا کردار اس قدر صاف اور واضح ہے کہ فوریئے نے پہلے بحران کو ’’ افراط کا بحران ،، کہہ کر ان سب کی صحیح تعریف کر دی۔

سماجی پیداوار اور سرمایہ‌داری ملکیت اور تصرف کے درمیان جو تضاد ہے وہ ان بحرانوں میں ایک بڑے تند و تیز دھماکے پر ختم ہوتا ہے ۔ وقتی طور پر اجناس تبادلہ کی گردش ختم ہو جاتی ہے۔ زر جو اشیا کی گردش کا ذریعہ ہے گردش کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے ۔ جنس تبادلہ کی پیداوار اور گردش کے تمام قانون الٹ‌پلٹ ہو جاتے ہیں ۔ معاشی تصادم اپنے منتہی تک پہنچ جاتا ہے : طریق پیداوار طریق تبادلہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتا ہے ۔

یہ حقیقت کہ کارخانے کے اندر پیداوار کی سماجی تنظیم نے اس حد تک ترقی کر لی ہے کہ وہ سماج میں پیداوار کے اس نراج سے بالکل میل نہیں کھاتی جو اس تنظیم کے پہلو بہ پہلو موجود ہے اور اس پر چھائی رہتی ہے — اس حقیقت کا احساس خود سرمایہ‌داروں کو بحرانوں کے

وقت بہت سے بڑے ، اور اس سے بھی زیادہ تعداد میں چھوٹے سرمایہ‌داروں کی بربادی کے باعث ہونےوالی سرمائے کی شدید مرکزیت کے ذریعے ہوتا ہے ۔ سرمایہ‌داری طریق پیداوار کا تمام نظام پیداواری قوتوں کے دباؤ سے ، جو خود اس طریق‌پیداوار کی تخلیق ہیں ، ٹوٹ جاتا ہے ۔ اب وہ ذرائع پیداوار کے اس تمام انبار کو سرمائے کی شکل دینے سے قاصر ہو گیا ہے ۔ اور یہ ذرائع‌پیداوار بےاستعمال پڑے رہتے ہیں اور اسی‌لئے صنعتی فوج محفوظ بھی لازماً بےاستعمال پڑی رہتی ہے ۔ ذرائع پیداوار ، ذرائع زندگی ، موجودودستیاب مزدور ، پیداوار اور عام دولت کے تمام عناصر بہ افراط موجود ہیں ۔ لیکن یہ ” افراط پریشانی ، افلاس اور احتیاج کا سرچشمہ بن‌جاتی ہے “ (فورئے) کیونکہ ٹھیک یہ افراط ہی وہ چیز ہے جو ذرائع‌پیداوار اور ذرائع‌زندگی کے سرمائے کی شکل اختیار کرنے میں مانع ہیں ہے ۔ چونکہ سرمایہ‌داری سماج میں ذرائع‌پیداوار صرف اسی وقت اپنا کام انجام دے سکتے ہیں جب کہ وہ ابتدائی طور پر سرمائے ، یعنی انسانی قوت‌محنت کے استحصال کے ذریعے میں ، تبدیل ہو چکے ہوں ۔ ذرائع پیداوار اور ذرائع زندگی کے سرمائے میں تبدیل ہونے کی ناگزیر ضرورت ان ذرائع کے اور مزدوروں کے درمیان ایک دیوار بنی کھڑی ہے ۔ صرف یہی چیز ہے جو پیداوار کے مادی اور انسانی محرکوں کے یکجا ہونے میں مانع ہے اور صرف یہی چیز ذرائع‌پیداوار کو اپنا کام انجام دینے کی اور مزدوروں کو کام کرنے اور زندہ رہنے کی اجازت نہیں دیتی ۔ لہذا ایک طرف تو سرمایہ‌داری طریق پیداوار ان پیداواری قوتوں کی قیادت کرنے کی نااہلی کے جرم میں ماخوذ نظر آتا ہے ، اور دوسری طرف خود یہ پیداواری قوتیں روزافزوں زور اور قوت کے ساتھ دباؤ ڈالتی ہیں تاکہ اس تضاد کا خاتمہ ہو جائے ، ان پیداواری قوتوں کی سرمائےوالی حیثیت اور خصوصیت ختم ہوجائے ، اور ان کا یہ کردار عملی طور پر تسلیم کرلیاجائے کہ وہ سماجی پیداواری قوتیں ہیں ۔

پیداواری قوتوں کے روزافزوں طاقتور ہوتے جانے کے ساتھ ساتھ ، ان کی خود اپنی سرمائے والی حیثیت اور خصوصیت کے خلاف بغاوت ، اور یہ مسلسل بڑھتا ہوا مطالبہ کہ ان کا سماجی کردار تسلیم کیا جائے ، سرمایہ‌دار طبقے کو مجبور کرتا ہے کہ ، جہاں تک سرمایہ‌داری حالات

کے تحت ممکن ہے ، وہ ان سے روزبروز زیادہ سے زیادہ سماجی پیداواری قوتوں کا سا سلوک کرے ۔ ایک طرف تو صنعتی گرم‌بازاری کے دور میں جب قرضے کی لامحدود افراط ہوتی ہے اور دوسری طرف کاروبار کی مکمل تباہی میں بڑے بڑے سرمایہ‌داری اداروں کی بربادی کے باعث ، ذرائع پیداوار کی بڑی اکثریت کے وہ سماجی شکل اختیار کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے ، جو ہمیں مختلف قسم کی سرمایۂ مشترک (joint-stock) کی کمپنیوں میں ملتی ہے ۔ ان ذرائع پیداوار اور ذرائع نقل و حمل کی ایک بڑی تعداد شروع ہی سے اس قدر دیوپیکر ہوتی ہے کہ ، ریلوں کی طرح ، وہ سرمایہ‌داری استحصال کی اور کسی شکل کے لئے گنجائش ہی نہیں چھوڑتی ۔ ارتقا کی ایک اور اگلی منزل پر یہ شکل بھی ناکافی ہو جاتی ہے ۔ ایک ملک میں بڑے پیمانے کے ایک شعبۂ صنعت کے مالک مل کر ایک ”ٹرسٹ“ بنا لیتے ہیں — یہ اتحاد پیداوار میں باقاعدگی پیدا کرنے کےلئے ہوتا ہے ۔ یہ لوگ کل پیداوار کی مقدار کا تعین کرتے ہیں اور اس کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں ، اور اس طرح پہلے سے طےشدہ قیمت‌فروخت عائد کر دیتے ہیں ۔ لیکن جوں ہی کاروبار مندا پڑنے لگتا ہے اس قسم کی ٹرسٹ کا عام طور پر شیرازہ بکھرنے لگتا ہے ، اور ٹھیک اسی وجہ سے وہ مجبوراً اجتماع کی مزید مرکزیت کو برروئےکار لاتی ہے : وہ پوری کی پوری صنعت ایک بہت لمبی چوڑی سرمایۂ مشترک کی کمپنی میں تبدیل ہو جاتی ہے ، اندرونی مقابلے کی جگہ اب اس ایک کمپنی کا اندرونی اجارہ لے لیتا ہے ۔ ۱۸۹۰ء میں انگریزی القلی کی پیداوار کے ساتھ ایسا ہی ہوا ، اور ۴۸ بڑے بڑے کارخانوں کے مل کر ایک ہو جانے کے بعد اب وہ ایک کمپنی کے ہاتھ میں ہے ، صرف ایک منصوبے کے مطابق منظم کی جاتی ہے اور اس کے پاس ساٹھ لاکھ پاؤنڈ کا سرمایہ ہے ۔

ٹرسٹ میں مقابلے کی آزادی اپنی ضد — یعنی اجارے کی آزادی —کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔ اور سرمایہ‌داری سماج کی پیداوار ، جو کسی مقررہ منصوبے پر مبنی نہیں ہوتی ، آنےوالے سوشلسٹ سماج کی ایک مقررہ منصوبے پر مبنی پیداوار کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے ۔ یہ سچ ہے کہ ابتدا میں یہ چیز سرمایہ‌داروں کے فائدے اور منافع ہی کی

ہے۔لیکن اجا رےداری کی اس صورت میں استحصال اس قدر صریحی اور نمایاں ہے کہ اس کا خاتمہ لازمی ہو جاتا ہے ۔ کوئی قوم ٹرسٹ کی منظم کردہ پیداوار کو برداشت نہیں کر سکتی ، جس میں منافع خوروں کی ایک چھوٹی سی ٹولی پورے سماج کا اس قدر ڈھٹائی سے استحصال کرتی ہے ۔

بہرصورت ٹرسٹ ہوں یا نہ ہوں ، سرمایہداری سماج کے سرکاری نمائندے — ریاست — کو کبھی نہ کبھی پیداوار کی نگرانی اور رہنمائی اپنے ذمے لینی ہی ہوگی * ۔ ریاستی ملکیت میں تبدیل ہونے کی یہ ضرورت

---

* میں کہتا ہوں ”لینی ہی ہوگی“ ، کیونکہ جب ذرائع پیداوار اور ذرائع رسل ورسائل واقعی سرمایۂ مشترک کی کمپنیوں کے انتظام کی حد سے کہیں آگے نکل جائیں گے اور جب اسی وجہ سے ریاست کا ان کو اپنے ہاتھ میں لینا معاشی طور پر ناگزیر ہو جائے گا — خواہ موجودہ ریاست ہی یہ کام انجام دے — صرف اسی صورت میں یہ معاشی ترقی ہوگی ، صرف اسی وقت یہ ایک اور ابتدائی قدم ہوگا جو خود سماج کے تمام پیداواری قوتوں کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے ضروری ہے ۔ جب سے بسمارک نے کچھ صنعتی اداروں کو ریاستی ملکیت بنایا اس وقت سے ایک قسم کا نقلی سوشلزم ابھر رہا ہے جو اکثر و بیشتر رو بہ تنزل ہو کر ایک طرح کا خوشامدی پن بن جاتا ہے اور جو نہایت اطمینان سے ہر قسم کی ریاستی ملکیت کو ، یہاں تک کہ بسمارک کی قسم کی ریاستی ملکیت کو بھی ، سوشلسٹ قرار دے دیتا ہے ۔ اور اگر ریاست کا تمباکو کی صنعت کو اپنے ہاتھ میں لینا سوشلسٹ قدم ہے تو یقیناً نپولین اور میٹرنک کا شمار سوشلزم کے بانیوں میں ہونا چاہئے ۔ اگر بلجیم کی ریاست نے بالکل معمولی سیاسی اور مالی وجوہ کی بنا پر خود اپنی سب سے اہم ریلوے لائنیں تعمیر کیں اور اگر بسمارک نے ریاست کے نام پر سب سے اہم پروشین ریلوے لائنیں اپنے ہاتھ میں لے لیں — کسی معاشی مجبوری کی بنا پر نہیں ، بلکہ محض اس لئے کہ جنگ کی صورت میں ریلیں زیادہ اچھی طرح اس کے قبضے میں ہوں ، ریلوے کے ملازمین کو گورنمنٹ کے لئے ووٹ دینے والے مویشیوں کی طرح تیار کیا جا سکے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود پارلیمنٹ کی اجازت کا

سب سے پہلے آمد و رفت، رسم و راہ اور رسل و رسائل کے عظیم اداروں — پوسٹ آفس، ٹیلیگراف اور ریلوں — میں محسوس کی جاتی ہے۔

اگر بحران بورژوا طبقے کی جدید پیداواری قوتوں کی نگرانی اور انتظام کرنے کی موجودہ نااہلی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو پیداوار اور رسل و رسائل کے بڑے بڑے اداروں کا سرمایۂ مشترک کی کمپنیوں، ٹرسٹ اور ریاستی ملکیت کی شکل اختیار کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ بورژوا طبقہ اس مقصد کے لئے کس درجہ غیرضروری ہے۔ سرمایہ‌داروں کے تمام سماجی کام اب تنخواہ‌دار ملازمین انجام دیتے ہیں۔ اب سرمایہ‌دار کا اس کے علاوہ اور کوئی سماجی کام باقی نہیں رہا کہ وہ منافع کی رقمیں اپنی جیب میں پہنچائے، کوپن پھاڑے اور اسٹاک اکسچینج میں جوا کھیلے جہاں مختلف سرمایہ‌دار ایک دوسرے کا سرمایہ لوٹتے رہتے ہیں۔ شروع میں سرمایہ‌داری طریق‌پیداوار مزدوروں کو نکال پھینکتا ہے اور اب سرمایہ‌داروں کو نکال پھینکتا ہے۔ اور جس طرح اس نے مزدوروں کو جبراً فاضل آبادی کی صف میں لا ڈالا تھا اسی طرح اب وہ سرمایہ‌داروں کے ساتھ کرتا ہے، اگرچہ آخرالذکر کو فوراً صنعتی محفوظ فوج کی صفوں میں نہیں ڈالتا۔

لیکن پیداواری قوتیں خواہ سرمایۂ مشترک کی کمپنیوں اور ٹرسٹ کی شکل اختیار کریں خواہ وہ ریاستی ملکیت میں تبدیل ہو جائیں، بہرصورت اس سے ان کا سرمایہ‌داری کردار ختم نہیں ہوتا۔ سرمایۂ مشترک کی کمپنیوں اور ٹرسٹ میں تو یہ بات بالکل صاف ہے۔ اور رہی

محتاج نہ رہ کر اپنے لئے ایک اور علیحدہ ذریعۂ آمدنی پیدا کر سکے — تو کسی لحاظ سے بھی، براہ‌راست یا بالواسطہ، شعوری یا غیرشعوری طور پر، غرض کسی طرح بھی یہ کوئی سوشلسٹ قدم نہیں تھا۔ ورنہ شاہی بحری تجارت (۸۲)، رائل چینی کے برتنوں کی صنعت، اور یہی نہیں بلکہ فوج کی رجمنٹ کا درزی خانہ بھی سوشلسٹ ادارے مانے جائیں‌گے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ریاست کا قحبہ‌خانوں کو اپنے ہاتھ میں لینا بھی — جیسا کہ فریڈرک ولیم سوم کے عہد حکومت میں ایک چھپے رستم نے سنجیدگی سے تجویز پیش کی تھی۔ (اینگلس کا نوٹ)

جدید ریاست ، سو وہ محض بورژوا سماج کی وہ تنظیم ہے جو یہ سماج سرمایہ‌داری طریق‌پیداوار کے خارجی حالات کو ایک طرف الگ الگ سرمایہ‌داروں کی اور دوسری طرف مزدوروں کی دست‌درازی سے محفوظ رکھنے کےلئے بناتا ہے ۔ جدید ریاست کی شکل خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ، بنیادی طور پر وہ ایک سرمایہ‌داری سیاسی نظام ، سرمایہ‌داروں کی ریاست ، کل قومی سرمائے کا معیاری اظہار ہے ۔ جتنا جتنا وہ پیداواری قوتوں کو اپنے ہاتھ میں لیتی جاتی ہے ، اتنا ہی زیادہ وہ دراصل قومی سرمایہ‌دار بنتی جاتی ہے اور اتنے ہی زیادہ شہریوں کا استحصال کرتی ہے ۔ مزدور ، اجرتی مزدور — پرولتاری ہی رہتے ہیں ۔ سرمایہ‌داری تعلق ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ تو کچھ اور بھی شدید ہو جاتا ، اور انتہا پر پہنچنے کے بعد دھڑام سے گرکر پاش پاش ہو جاتا ہے ۔ پیداواری قوتوں کا ریاستی ملکیت ہونا کشمکش اور آویزش کا حل نہیں ہے ، لیکن اس کے اندر وہ امکانی حالات مضمر ہیں جو اس حل کو ممکن بناتے ہیں ۔

اور یہ حل مشتمل ہو سکتا ہے صرف جدید پیداواری قوتوں کے سماجی کردار کے عملی اعتراف پر ، دوسرے الفاظ میں طریق‌پیداوار ، طریق تبادلہ اور طریق‌تصرف کو ذرائع پیداوار کے سماجی کردار سے ہم‌آہنگ کرنے پر ۔ اور یہ صرف اسی صورت میں بروئےکار آسکتا ہے کہ سماج کھلم کھلا اور براہ راست پیداواری قوتوں پر قابض ہو جائے ، جو اب اتنی ترقی یافتہ ہو چکی ہیں کہ پورے سماج کی نگرانی کے علاوہ ان پر اور کسی قسم کی نگرانی عائد نہیں کی جا سکتی ۔ موجودہ زمانے میں ذرائع‌پیداوار اور پیداوار کا سماجی کردار خود پیدا کرنے والوں کے خلاف عمل کرتا ہے ، وہ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد تمام پیداوار اور تبادلے کو درہم‌برہم کر دیتا ہے اور صرف کسی قانون‌فطرت کی طرح ، اندھادھند اور جبری اور تخریبی طور پر اپنا کام کرتا ہے ۔ لیکن سماج کے پیداواری قوتوں کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کے بعد پیدا کرنے والے ، ذرائع‌پیداوار اور پیداوار کے سماجی کردار کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے ، اس کو مفید مصرف میں لائیں‌گے ، اور یہ سماجی کردار ، تھوڑی تھوڑی مدت بعد واقع ہونے والی تباہیوں اور ابتری کا

سرچشمہ ہونے کے بجائے ، خود پیداوار کی توسیع و ترقی کا ایک زبردست آلہ بن جائے گا۔

سماجی قوتیں اس وقت تک بالکل فطری قوتوں کے مانند اندھادھند اور جبری اور تخریبی طور پر مصروف کار ہوتی ہیں جب تک کہ ہم انہیں سمجھتے اور اہمیت نہیں دیتے ۔ لیکن جب ہم ایک دفعہ ان کو سمجھ لیتے ہیں اور ہمیں ان کے عمل ، ان کے رخ اور ان کے اثرات کا شعور اور ادراک ہو جاتا ہے تو اس وقت ان کو روزافزوں طور پر اپنے ارادے کے تابع کرنا اور ان کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنا صرف ہمیں لوگوں پر منحصر ہوتا ہے ۔ اور موجودہ زمانے کی عظیم پیداواری قوتوں پر یہ بات اور بھی زیادہ صادق آتی ہے ۔ جب تک ہم ہٹ‌دھرمی سے ان سماجی ذرائع‌عمل کی فطرت اور کردار کو سمجھنے سے انکار کرتے رہیں‌گے — اور ان کو سمجھنا سرمایہ‌داری طریق پیداوار اور اس کے حامیوں کی سرشت کے خلاف ہے — اس وقت تک یہ پیداواری قوتیں ہم سے بےتعلق اور ہماری مخالفت میں مصروف عمل رہیں‌گی اور ہمارے اوپر حکومت کرتی رہیں‌گی جیسا کہ ہم نے ابھی تفصیل سے دکھایا ہے۔

لیکن ایک دفعہ ان کی فطرت کو سمجھ لیا جائے تو وہ ساتھ مل کر اشیا پیدا کرنے والوں کے لئے حکمران عفریتوں کے بجائے آمادۂ خدمت موکل بن جائیں‌گی ۔ یہ وہی فرق ہے جو طوفان برق و باراں میں کوندنےوالی بجلی اور انسانی نگرانی کے تحت تاربرقی اور آرک لیمپ میں مستعمل بجلی میں ہے ، جو آتش‌زدگی اور انسان کی خدمت کرنے والی آگ کے درمیان ہے ۔ جب آخرکار آج کی پیداواری قوتوں کی اصلی فطرت پہچان اور مان لی جاتی ہے ، تو پیداوار کی سماجی افراتفری پیداوار کے سماجی نظم اور باقاعدگی کے لئے جگہ خالی کر دیتی ہے ، جو تمام افراد اور سماج کی ضروریات کے مطابق اور ایک مقررہ منصوبے پر مبنی ہوتی ہے ۔ تب سرمایہ‌داری طریق تصرف کی جگہ ، جس میں پیداوار پہلے تو پیدا کرنے والے کو غلام بناتی ہے اور پھر تصرف کرنے والے کو ، پیداوار کا ایک ایسا طریق تصرف لے لیتا ہے جو جدید ذرائع‌پیداوار کے کردار پر مبنی ہوتا ہے — ایک طرف تو براہ‌راست سماجی تصرف جو پیداوار

کے قیام اور توسیع کا ذریعہ ہے ، اور دوسری طرف براہ‌راست انفرادی تصرف ، جو وسیلۂ حیات اور ذریعۂ مسرت ہے ۔

آبادی کی اکثریت کو روزافزوں طور پر مکمل پرولتاری بنانے کے ساتھ ساتھ سرمایہ‌داری طریق پیداوار اس قوت کی تخلیق بھی کرتا ہے جو اس انقلاب کو بروئے‌کار لانے پر مجبور ہے اور اگر ایسا نہ کرے تو خود اس کی تباہی آجائے‌گی ۔ سرمایہ‌داری طریق پیداوار ان وسیع ذرائع پیداوار کو ، جو پہلے ہی سماجی ڈھنگ کے ہو چکے ہیں ، ریاستی ملکیت کی شکل اختیار کرنے پر مجبور کرکے گویا خود ہی اس انقلاب کو بروئے‌کار لانے کا راستہ دکھاتا ہے ۔ پرولتاری طبقہ سیاسی اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور ذرائع پیداوار کو ریاست کی ملکیت بنا دیتا ہے ۔

لیکن ایسا کرنے کے دوران وہ خود کو پرولتاری طبقے کی حیثیت سے ختم کر دیتا ہے ، تمام طبقاتی امتیازات اور طبقاتی مخالفتوں کا قلع قمع کر دیتا ہے اور ریاست کو ریاست کی حیثیت سے ختم کر دیتا ہے ۔ اب تک سماج کو ، جس کی بنیاد طبقاتی مخالفتوں پر تھی ، ریاست کی ضرورت تھی ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اس خاص طبقے کی ایک تنظیم کی ضرورت تھی جو اپنے زمانے کا استحصالی طبقہ تھا ، ایک ایسی تنظیم کی ضرورت تھی جس کا مقصد مروجہ حالات‌پیداوار میں باہر سے ہر قسم کی مداخلت کی روک‌تھام کرنا تھا اور اسی لئے خاص طور پر مظلوم طبقوں کو جبر اور زبردستی سے ایک ایسی مظلوم ومجبور حالت میں رکھنا تھا جو اس زمانے کے طریق پیداوار سے ہم‌آہنگ ہو (غلامی ، زرعی غلامی ، اجرتی محنت) ۔ کہنے کو تو ریاست پورے سماج کی نمائندہ ، پورے سماج کے متحد ہوکر ایک مرئی اور محسوس شکل پانے کا نام تھی ۔ لیکن ریاست کی یہ حیثیت اسی حد تک تھی جس حد تک کہ یہ اس طبقے کی ریاست تھی جو وقتی طور پر پورے سماج کی نمائندگی کرتا تھا — قدیم زمانے میں یہ غلاموں کے مالکوں کی ریاست تھی ، قرون وسطی میں جاگیردار رؤسا کی اور خود ہمارے وقت میں بورژوا طبقے کی ۔ جب آخرکار ریاست واقعی پورے سماج کی نمائندہ ہو جاتی ہے تو خود اس کی کوئی ضرورت نہیں رہتی ۔ جس وقت کوئی ایسا سماجی طبقہ

باقی نہیں رہتا جسے حلقہ‌بگوش یا دبیل رکھنے کی ضرورت ہو ، جس وقت طبقاتی حکومت ، افراد کی جہد بقا جو ہماری پیداوار کے موجودہ نراج پر مبنی ہے ، اور اس سے پیدا ہونےوالے تصادم ، زیادتیاں اور بےاعتدالیاں ، یہ سب کچھ ختم ہوجاتا ہے ، اس وقت کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہتی جسے کچلا اور دبایا جائے اور ایک خاص جبری قوت یعنی ریاست کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی ۔ وہ پہلا قدم جس کے ذریعے ریاست خود کو واقعی پورے سماج کے نمائندے کی حیثیت بخشتی ہے — یعنی سماج کے نام پر ذرائع پیداوار کو اپنے ہاتھ میں لینے کا عمل — ریاست کی حیثیت سے اس کا آخری آزادانہ قدم بھی ہوتا ہے ۔ یکے بعد دیگرے تمام سماجی تعلقات میں ریاست کی دخل اندازی فضول اور غیرضروری ہوجاتی ہے اور پھر خود ہی ختم ہوجاتی ہے ۔ اشیا کا انتظام اور نگرانی اور عمل پیداوار کی دیکھ‌بھال انسانوں پر حکومت کی جگہ لےلیتی ہے ۔ ریاست کا '' انسداد ،، نہیں ہوتا ۔ اس کا پودا دھیرے دھیرے خود ہی سوکھ جاتا ہے ۔ اس سے '' آزاد ریاست ،، کے فقرے * کی ٹھیک ٹھیک قدروقیمت معلوم ہو سکتی ہے ، ایک طرف تو یہ کہ بعض اوقات سیاسی پرچارک اس کا جائز استعمال کرتے ہیں اور دوسری طرف یہ کہ دراصل سائنسی اعتبار سے یہ ایک ناکافی فقرہ ہے ، علاوہ بریں نام نہاد نراجیوں کے اس مطالبے کی صحیح قیمت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ یوں ہی بیٹھے بٹھائے ریاست کا صفایا کردیا جائے ۔

جب سے سرمایہ‌داری طریق‌پیداوار تاریخ کے میدان میں نمودار ہوا ہے اس وقت سے مختلف افراد اور فرقے کم و بیش دھندلے طریقے سے خواب دیکھتے آئے ہیں کہ مستقبل کا نصب‌العین یہ ہوگا کہ پورا سماج ذرائع پیداوار پر قابض ہوگا ۔ لیکن وہ ممکن العمل اور تاریخی ضرورت صرف اسی وقت بن‌سکا جبکہ اس کے شرمندۂ تعبیر ہونے کےلئے حقیقی حالات موجود ہوئے ۔ اور ہر سماجی ترقی کی طرح یہ نصب العین بھی انسانوں کے یہ بات سمجھ جانے سے کہ طبقوں کا وجود عدل اور مساوات

---

* ملاحظہ ہو اس سلسلے کا حصۂ دوم ، صفحات ۲۵۸ — ۲۵۷ ، ۲۷۲ — ۲۷۰ ۔ (ایڈیٹر)

وغیرہ کے منافی ہے ممکن‌العمل نہیں بنتا اور نہ ہی وہ انسانوں کی ان طبقات کو ختم کرنے کی آمادگی سے ممکن العمل بنتا ہے ۔ وہ ممکن العمل بنتا ہے بعض نئے معاشی حالات کی بدولت ۔ سماج کا استحصالی اور مظلوم ، حاکم اور محکوم طبقات میں بٹنا پرانے وقتوں کی پیداوار کے محدود اور ناقص ارتقا کا لازمی نتیجہ تھا ۔ جب تک کل سماجی محنت کی پیداوار اس سے کچھ ہی زیادہ رہےگی جتنی کہ سب کے محض زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے ، اور اسی وجہ سے جب تک سماج کے اراکین کی بہت بڑی اکثریت کا تمام یا تقریباً تمام وقت محنت میں صرف ہوتا رہےگا ، اس وقت تک لازمی طور پر سماج طبقات میں بٹا رہےگا ۔ اس بڑی اکثریت کے پہلو بہ پہلو جو پوری طرح محنت کی زرخرید لونڈی ہے ، ایک اور طبقہ ابھرتا ہے جو براہ‌راست پیدا کرنے والی محنت سے آزاد ہے اور سماج کے عام معاملات — یعنی محنت ، ریاستی معاملات ، قانون ، سائنس اور آرٹ وغیرہ — کی دیکھ بھال کرتا ہے ۔ سو تقسیم‌محنت کا قانون طبقاتی تقسیم کی بنیاد ہے ۔ لیکن یہ امر اس چیز میں مانع نہیں ہے کہ زور و زبردستی ، ڈاکہ اور چالبازی ، جعل‌سازی اور فریب کے ذریعے طبقات کی یہ تقسیم بروئےکار لائی جاتی ہے ، یہ امر اس چیز میں مانع نہیں ہے کہ حکمران طبقہ جب ایک بار برسر اقتدار اور غالب ہو جاتا ہے تو وہ مزدور طبقے کی ہڈیوں پر اپنے اقتدار کی عمارت استوار اور مستحکم کرتا ہے ، اور اپنی سماجی قیادت کو جنتا کے ایک بےتحاشا استحصال میں تبدیل کر دیتا ہے ۔

لیکن اگر اس طرح پیش کئے جانے میں طبقاتی تقسیم کا کچھ تاریخی جواز ہے بھی تو محض ایک خاص مدت کے لئے اور چند مخصوص سماجی حالات کے تحت ۔ اس کی بنیاد پیداوار کی قلت اور کمی پر تھی ۔ اور جدید پیداواری قوتوں کا مکمل ارتقا اس کا خاتمہ کر دےگا ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ سماج میں طبقات کے خاتمے کے لئے تاریخی ارتقا کا وہ درجہ موجود ہونا ایک لازمی شرط ہے جب کہ صرف کسی خاص حکمران طبقے کی موجودگی ہی نہیں بلکہ سرے سے حکمران طبقے کا وجود اور اسی لئے خود طبقاتی امتیازات کا وجود ہی فرسودہ اور متروک ہو گیا ہو ۔ سو طبقات کے ختم ہونے سے پہلے ضروری ہے کہ پیداوار کا

ارتقا ایک ایسے مقام تک پہنچ چکا ہو جہاں ذرائع پیداوار اور پیدا شدہ اشیا پر سماج کے صرف ایک خاص طبقے کا تسلط اور تصرف اور اسی کے ساتھ ساتھ صرف ایک ہی طبقے کا سیاسی غلبہ اور تہذیبی اور عقلی رہبری کی اجارہ‌داری نہ صرف فضول اور غیرضروری ہو بلکہ معاشی ، سیاسی اور عقلی ارتقا کی راہ میں رکاوٹ بن چکی ہو ۔ اب عین وہ وقت آن پہنچا ہے ۔ بورژوا طبقے کا سیاسی اور ذہنی دیوالیہ‌پن اب خود اس کے لئے بھی راز نہیں رہا ہے ۔ اس کا معاشی دیوالیہ‌پن دس دس سال کے وقفے سے باقاعدگی کے ساتھ واقع ہوتا ہے ۔ ہر بحران میں سماج کا خود اپنی پیداواری قوتوں اور پیدا شدہ اشیا کے بوجھ کے نیچے ، جنھیں وہ استعمال نہیں کر سکتا ، دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ اس احمقانہ تضاد کے روبرو بےبس و لاچار کھڑا رہ جاتا ہے کہ پیدا کرنےوالوں کے پاس صرف کرنے کو کچھ نہیں ہے کیونکہ صرف کرنےوالے کمیاب ہیں ۔ ذرائع پیداوار کی وسیع اور پھیلتی ہوئی قوت ان بندھنوں کو توڑ ڈالتی ہے جن میں سرمایہ‌داری طریق‌پیداوار نے ان کو جکڑ رکھا تھا ۔ ذرائع پیداوار کا ان بندھنوں سے آزاد ہونا پیداواری قوتوں کے مسلسل اور روزافزوں ارتقا کی اور اسی لئے خود پیداوار کی تقریباً لامتناہی افزائش کی اولین اور لازمی شرط ہے ۔ اور یہی نہیں ۔ ذرائع پیداوار کا سماجی ملکیت بن جانا صرف پیداوار کی موجودہ مصنوعی بندشوں کا خاتمہ ہی نہیں کرتا ، بلکہ پیداواری قوتوں اور پیداشدہ اشیا کی صریحی فضول‌خرچی اور بربادی اور تاراجی کا بھی خاتمہ کر دیتا ہے ، جو موجودہ زمانے میں پیداوار کا جزو لاینفک ہیں اور بحرانوں کے وقت اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہیں ۔ علاوہ‌بریں ذرائع پیداوار کا سماجی ملکیت بن جانا موجودہ حکمران طبقوں اور ان کے سیاسی نمائندوں کے فضول اور احمقانہ اسراف کو ختم کر کے بہت سے ذرائع پیداوار اور اشیائے‌پیداوار کو پورے سماج کے استعمال کے لئے بچا لیتا ہے ۔ سماجی پیداوار کے ذریعے سماج کے ہر فرد کے لئے نہ صرف ایک ایسی زندگی مہیا کرنے کا امکان پیدا ہوتا ہے جو مادی لحاظ سے مکمل طور پر موزوں اور بھرپور ہے اور روزبروز زیادہ بھرپور ہوتی جاتی ہے ، بلکہ ایک ایسی زندگی بھی ممکن ہوتی ہے جس میں ہر شخص کے لئے اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے آزادانہ ارتقا اور

استعمال کا پورا موقع ہو — یہ امکان اب پہلی دفعہ پیدا ہوا ہے ، لیکن اس وقت یہ واقعی موجود ہے ۔ *

جب سماج ذرائع پیداوار پر قبضہ کرلیتا ہے تو جنس تبادلہ کی پیداوار ختم ہوجاتی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اشیائے پیداوار کا پیدا کرنے والے پر غلبہ بھی ختم ہوجاتا ہے ۔ سماجی پیداوار میں ایک باقاعدہ، واضح اور معین تنظیم نراج اور بدنظمی کی جگہ لے لیتی ہے ۔ انفرادی زندگی کے لئے جدوجہد غائب ہوجاتی ہے ۔ تب انسان پہلی دفعہ ایک معنی میں ہمیشہ کے لئے باقی حیوانی دنیا سے بالکل الگ اور ممتاز ہوجاتا ہے اور محض حیوانی حالات زندگی سے نکل کر واقعی انسانی حالات زندگی میں قدم رکھتا ہے ۔ حالات زندگی کا پورا دائرہ جو انسان کے گردوپیش موجود ہوتا ہے اور جو اب تک انسان پر حکومت کرتا آیا تھا ، اب انسان کے — جو پہلی دفعہ فطرت کا اصلی اور باشعور فرماں روا بنتا ہے — قبضہ قدرت میں آجاتا ہے ، کیونکہ اب وہ اپنی سماجی تنظیم کا مالک ومختار

---

* یہ چند اعدادوشمار جدید ذرائع پیداوار کے سرمایہ داری دباؤ کے نیچے دبے ہونے کے باوجود ان کی انتہائی بڑی اور وسیع قوت کا کم و بیش صحیح اندازہ لگانے میں مدد دے سکتے ہیں ۔ مسٹر گفن کے نزدیک برطانیہ عظمی اور آئرلینڈ کی کل دولت تخمیناً اتنی تھی :

۱۸۱۴ ء میں دو ارب بیس کروڑ پاؤنڈ
۱۸۶۵ ء میں چھ ارب دس کروڑ پاؤنڈ
۱۸۷۵ ء میں آٹھ ارب پچاس کروڑ پاؤنڈ

اقتصادی بحران کے زمانے میں ذرائع پیداوار اور پیدا شدہ اشیا کے فضول خرچی اور بے دردی سے ضائع کرنے کی ایک مثال کے طور پر دوسری جرمن صنعتی کانگرس (برلن ، ۲۱ فروری ۱۸۷۸ ء) میں بتایا گیا تھا کہ ۱۸۷۳ ء سے ۱۸۷۸ ء تک کے اقتصادی بحران میں محض جرمنی کی لوہے کی صنعت میں ۲ کروڑ ۲۷ لاکھ ۵۰ ہزار پاؤنڈ کا نقصان ہوا ۔ (اینگلس کا نوٹ)

ہوجاتا ہے ۔ انسان کے خود اپنے سماجی عمل کے قوانین جو اب تک اس کے روبرو قوانین فطرت کی طرح استادہ تھے ، جو انسان کے لئے اجنبی ہوتے ہیں اور اس پر حکومت کرتے ہیں ، اب انہیں انسان پورے فہم وادراک کے ساتھ استعمال کرے گا اور اسی لئے ان پر غالب بھی آجائے گا ۔ انسان کی خود اپنی سماجی تنظیم جو اب تک اس کو ایک ناگزیر ضرورت معلوم ہوتی تھی جسے فطرت اور تاریخ نے اس کے اوپر ٹھونس دیا تھا اب خود انسان کے آزادانہ عمل کا نتیجہ بن جاتی ہے ۔ غیرمتعلق ، خارجی قوتیں جنھوں نے اب تک تاریخ پر حکومت کی ہے اب خود انسان کے قبضے اور اختیار میں آجاتی ہیں ۔ صرف اسی وقت سے خود انسان زیادہ سے زیادہ شعوری طور پر اپنی تاریخ خود بنائے گا ۔ صرف اسی وقت سے انسان کے حرکت میں لائے ہوئے سماجی اسباب سے زیادہ تر اور روزافزوں طور پر وہی نتائج حاصل ہوں گے جو انسان چاہتا ہے ۔ یوں گویا انسان حلقۂ جبر سے بلند ہو کر حلقۂ اختیار میں قدم رکھتا ہے ۔

آئیے ہم مختصراً اپنے تاریخی ارتقا کے خاکے کا خلاصہ بیان کریں :

۱ ۔ قرون وسطی کا سماج — چھوٹے پیمانے پر انفرادی پیداوار ۔ ذرائع پیداوار انفرادی صرف و استعمال کے لئے موزوں اور مناسب اور اسی لئے ابتدائی شکل کے ، بھدے ، بھونڈے اور ادنی درجے کے ہیں اور صرف محدود طور پر کام دے سکتے ہیں ۔ پیداوار فوری استعمال کے لئے ہے — یا تو خود پیدا کرنے والے کے یا اس کے جاگیردار آقا کے استعمال کے لئے ۔ جہاں کہیں پیداوار اس استعمال کی ضرورت سے زائد ہوجاتی ہے صرف وہیں یہ زائد پیداوار فروخت کے لئے پیش کی جاتی ہے اور تبادلے میں شامل ہو جاتی ہے ۔ لہذا جنس تبادلہ (مال) کی پیداوار ابھی عالم طفلی میں ہے ۔ لیکن وہ اپنے اندر ابھی سے پورے سماج کی پیداوار میں نراج کے بیج لئے ہوئے ہے ۔

۲ ۔ سرمایہ داری انقلاب — صنعت کی کایاپلٹ — شروع میں سادہ امدادباہمی اور کارخانہ داری کے ذریعے ۔ اب تک منتشر ذرائع پیداوار کا بڑے بڑے کارخانوں میں مرکوز ہونا ۔ اس کے نتیجے کے طور پر ان ذرائع پیداوار کا انفرادی سے سماجی ذرائع پیداوار میں تبدیل ہونا —

ایک ایسی تبدیلی جو مجموعی طور پر تبادلے کی شکل پر اثرانداز نہیں ہوتی۔ تصرف کی پرانی شکلیں برقرار رہتی ہیں۔ سرمایہ‌دار نمودار ہوتا ہے۔ ذرائع پیداوار کے مالک کی حیثیت سے وہ اشیائے پیداوار پر بھی قبضہ کرلیتا ہے اور انہیں جنس تبادلہ میں تبدیل کردیتا ہے۔ پیداوار اب ایک سماجی عمل ہو گئی ہے۔ تبادلہ اور تصرف اب تک انفرادی عمل — افراد کا عمل — ہی ہیں۔ سماجی اشیائے پیداوار پر انفرادی سرمایہ‌دار کا قبضہ اور تصرف ہوتا ہے۔ یہ بنیادی تضاد ہے جس سے وہ تمام تضاد نکلتے ہیں جن کے اندر ہمارا موجودہ سماج حرکت کرتا ہے اور جنہیں جدید صنعت بےنقاب کرتی ہے۔

الف۔ پیدا کرنےوالے کا ذرائع پیداوار سے بالکل قطع تعلق اور جدائی۔ مزدور کا زندگی بھر کےلئے اجرتی محنت کرنے پر مجبور ہوجانا۔ پرولتاری اور بورژوا طبقوں کے درمیان مخالفت اور کشمکش۔

ب۔ ان قوانین کا روزافزوں غلبہ‌واقتدار اور مسلسل بڑھتا ہوا اثر جو جنس تبادلہ کی پیداوار پر حاوی ہیں۔ بےلگام مقابلہ۔ فرداً فرداً ہر فیکٹری کی سماجی تنظیم اور مجموعی طور پر پیداوار کے سماجی نراج کے درمیان تضاد۔

ج۔ ایک طرف تو مشینوں کی ترقی اور تکمیل جسے مقابلے نے ہر کارخانہ‌دار کےلئے لازمی اور جبری بنا دیا ہے اور اس کے پہلو بہ پہلو مزدوروں کا کام سے اخراج اور صنعتی ریزرو فوج۔ اور دوسری طرف پیداوار کی بےکراں توسیع، اسے بھی مقابلے نے ہر کارخانہ‌دار کےلئے لازمی بنا دیا ہے۔ دونوں طرف پیداواری قوتوں کا غیرمعمولی ارتقا، رسد کا طلب سے زیادہ ہونا، ضرورت سے زیادہ پیداوار، منڈیوں کا مال سے ٹھساٹھس بھرجانا، ہر دس سال کے بعد معاشی بحران، اور ایک ''دائرۂ نامعقول،، : ادھر ذرائع پیداوار اور اشیائے پیداوار کی افراط — ادھر ایسے مزدوروں کی افراط جن کے پاس نہ روزگار ہے نہ ذرائع زندگی۔ لیکن پیداوار اور سماجی خوش‌حالی کو بڑھانے کے یہ دو وسیلے ایک ساتھ کام کرنے کے ناقابل ہیں کیونکہ پیداوار کی سرمایہ‌داری شکل پیداوری قوتوں کے کام کرنے میں اور اشیائے پیداوار کی گردش میں مانع ہوتی

ہے — سوائے اس صورت کے کہ وہ پہلے سرمائے کی شکل میں تبدیل ہو چکی ہوں۔ اور ان کی حد سے زیادہ افراط ان کے سرمائے میں تبدیل ہونے میں مانع ہے۔ تضاد بڑھ کر حماقت بن گیا ہے: طریق پیداوار تبادلے کی شکل کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ بورژوا طبقے کی اس سے آگے خود اپنی سماجی پیداواری قوتوں کا انتظام کرنے کی نااہلی ثابت ہو جاتی ہے۔

د۔ خود سرمایہ‌داروں کا ایک حد تک پیداواری قوتوں کے سماجی کردار کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جانا۔ پیداوار اور رسل و رسائل کے عظیم اداروں کا پہلے سرمایۂ مشترک کی کمپنیوں کے، پھر ٹرسٹ کے اور اس کے بعد ریاست کے ہاتھ میں آنا۔ بورژوا طبقے کا ایک فضول اور بےکار طبقہ ثابت ہونا۔ اب بورژوا طبقے کے تمام سماجی کام تنخواہ‌دار ملازمین انجام دیتے ہیں۔

۳۔ پرولتاری انقلاب — تضادوں کا حل ہو جانا: پرولتاری طبقہ پبلک اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے اور اس کے توسط سے سماجی ذرائع پیداوار کو، جو بورژوا طبقے کے ہاتھوں سے نکلے جا رہے ہیں، پبلک ملکیت بنا دیتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے پرولتاری طبقہ ذرائع پیداوار کو ان کے سرمائے والے کردار سے نجات دیتا ہے جو اب تک ان کے اوپر نازل تھا، اور ان کے سماجی کردار کو تشکیل و توسیع کی پوری پوری آزادی عطا کرتا ہے۔ اس وقت سے ایک طےشدہ اور معین منصوبے پر مبنی سماجی پیداوار ممکن ہو جاتی ہے۔ پیداوار کا ارتقا اس وقت سے سماج کے مختلف طبقوں کے وجود کو ایک شئ متروک بنا دیتا ہے۔ جس تناسب سے سماجی پیداوار کی افراتفری غائب ہوتی ہے اسی تناسب سے ریاست کا سیاسی اقتدار ختم ہوتا ہے۔ انسان، جو آخرکار خود اپنی سماجی تنظیم کا مالک و مختار ہو جاتا ہے، ساتھ ہی فطرت کا فرماں‌روا، خود اپنا مالک بنتا ہے — اور آزاد ہو جاتا ہے۔

یہ عالمگیر آزادی حاصل کرنے کا کام انجام دینا جدید پرولتاریہ کا تاریخی فریضہ ہے۔ اس کام کی تاریخی شرائط اور اس طرح اس کی پوری فطرت کو بخوبی سمجھ لینا اور پرولتاری طبقے کی طرف، جو اس وقت

مظلوم ومجبور ہے ، اس اہم اور عظیم کام کی شرائط اور معانی کا بھرپور علم منتقل کرنا جو اسے انجام دینا ہے — یہ پرولتاری تحریک کے نظریاتی مظہر ، سائنسی سوشلزم ، کا فرض ہے ۔

اینگلس نے جنوری اور وسط مارچ ۱۸۸۰ ء کے درمیان لکھا ۔

۱۸۸۰ ء میں اس کتاب کا فرانسیسی ترجمہ پیرس میں ایک علحدہ کتابچے کی شکل میں شائع ہوا ۔ ۱۸۸۳ ء میں جرمن ترجمہ زورخ میں اور ۱۸۹۱ ء میں برلن میں شائع ہوا اور انگریزی ترجمہ لندن میں ۱۸۹۲ ء میں شائع ہوا ۔

۱۸۹۲ ء کے مستند انگریزی ایڈیشن کی اصل سے ترجمہ کیا گیا ۔

کارل مارکس کو دفن کرتے وقت اینگلس کی تقریر

۱۴ مارچ کو سہ پہر کے پونے تین بجے موجودہ زمانے کی سوچنے والی سب سے بڑی ہستی نے سوچنا بند کر دیا۔ مشکل سے دو منٹ کو وہ تنہائی میں رہا ہوگا کہ ہم نے واپس آکر دیکھا تو اپنی آرام کرسی پر وہ آرام سے سو چکا تھا، ہمیشہ کے لئے۔

اس شخص کی موت سے دونوں کو بے انتہا نقصان پہنچا ہے: یورپ اور امریکہ کے جاں‌باز پرولتاریہ کو اور تاریخی سائنس کو۔ اس مہان آتما کے سدھار جانے سے جو کمی پڑ گئی ہے، اس کا احساس ہوتے دیر نہیں لگے گی۔

جس طرح ڈارون نے نامیاتی جسموں کے ارتقا کا اصول دریافت کیا تھا، اسی طرح کارل مارکس نے انسانی تاریخ کے ارتقا کا اصول معلوم کیا، سادہ سی اس حقیقت کا پتہ لگایا، جو نظریات کے پر و بال میں چھپ گئی تھی، کہ آدمی پہلے کھائے گا، پیے گا، سر چھپانے اور تن ڈھانکنے کا ٹھکانا کرے گا، تب کہیں سیاست، سائنس، آرٹ اور مذہب وغیرہ کے معاملات میں سر کھپائے گا؛ لہذا گزربسر کا جو فوری سامان ہوتا ہے، اس کی تیاری، اور یہ کہ کوئی قوم کسی خاص دور میں جس معاشی اقتصادی درجے تک پہنچی ہو، وہ درجہ بھی اصل بنیاد ہے جس پر اس قوم کے سرکاری ادارے، قانونی نظریات، آرٹ، بلکہ مذہب تک کے بارے میں خیالات بنتے اور ابھرتے ہیں اور اسی کی روشنی میں انھیں سمجھا سمجھایا جا سکتا ہے؛ حقیقت اس کے برعکس نہیں ہے جیسا کہ آج تک سمجھا گیا تھا۔

محض اتنا ہی نہیں۔ مارکس نے اس حرکت کی قانون کا بھی سراغ لگایا جو آجکل کے سرمایہ‌دارانہ طریق پیداوار پر اور خود اس سرمایہ‌دار

سماج پر حاوی ہے جسے اس طریق پیداوار نے جنم دیا ہے۔ قدر زائد (surplus value) کا پتہ لگنے سے اس مسئلے پر ایک دم روشنی پڑی جسے سلجھانے میں پہلے کی تمام تلاش، بورژوا ماہرین معاشیات اور اشتراکی نکتہ‌چین، دونوں کی جستجو اندھیرے میں بھٹکتی پھری تھی۔

ساری عمر میں ایسی دو دریافتیں بھی بڑی چیز ہیں۔ کسی کے سر ایسی ایک دریافت کا سہرا بھی بندھ جائے تو وہ خوش نصیب ہے۔ مارکس نے جس میدان میں بھی تلاش و تحقیق کا علم بلند کیا، اس نے بہت سے میدان چھانے ہیں اور کہیں سے بھی سرسری نہیں گزرا، ہر ایک میدان میں، یہاں تک کہ علم حساب میں بھی اس نے اپنے طور پر نئی باتیں نکالی ہیں۔

وہ سائنس کا آدمی تھا۔ مگر اتنا کہہ دینے میں اس کا آدھا وجود بھی نہیں سماتا۔ مارکس کی نظر میں سائنس تاریخی لحاظ سے ایک تب و تاب تھی، ایک انقلابی قوت تھی۔ کسی ایسے علمی شعبے میں نئی معلومات کا خیر مقدم کرتے وقت، جس کے عملی جامہ پہننے کا تب تک غالباً کوئی صحیح اندازہ نہ ہو سکے، کارل مارکس چاہے کتنی ہی خوشی مناتا ہو، لیکن وہ خوشی کچھ اور ہی قسم کی ہوتی تھی جب کسی ایسی دریافت کا پتہ چلتا جس سے انڈسٹری میں اور عموماً تاریخی ارتقا میں انقلابی تبدیلیاں ہونے‌والی ہوں۔ مثلاً بجلی کے سلسلے میں جو نئی نئی معلومات سامنے آتی گئیں اور مارسل دیپرے نے جو حال میں نئی دریافتیں کی ہیں، ان پر خاص طور سے مارکس کی نظر لگی ہوئی تھی۔

مارکس کی سب سے مقدم حیثیت یہ ہے کہ وہ انقلابی تھا۔ زندگی میں اس کا اصلی مشن یہ تھا کہ کسی‌نہ کسی صورت سے سرمایہ‌دارانہ سماج کو اور اسی کے لائے ہوئے سرکاری اداروں کو بےدخل کرنے میں ہاتھ بٹائے، اور عہد حاضر کے پرولتاریہ کو آزاد کرانے میں مدد دے، وہ پرولتاریہ جسے سب سے پہلے مارکس نے ہی اس کی پوزیشن اور ضروریات سے باخبر کیا اور جتایا کہ اس طبقے کو اپنے سر کا بوجھ اتارنے کے لئے کیا کچھ کرنا ہے۔ مارکس کے رگ و پے میں جنگی جذبہ بھرا تھا۔ وہ اس جوش سے اور اس کامیابی سے قدم جما کر لڑا کہ اس کی مثال کم ملے‌گی۔ اس نے پہلے «Rheinische Zeitung» اخبار (۱۸۴۲ء) میں،

پیرس کے (۸۳) «Vorwärts!» اخبار (۱۸۴۴ء) میں، «Deutsche-Brüsseler-Zeitung» (۱۸۴۷ء)، «Neue Rheinische Zeitung» (۱۸۴۹ء — ۱۸۴۸ء)، «New-York Daily Tribune» (۱۸۶۱ء — ۱۸۵۲ء) میں اپنے قلم سے کام لیا، ان کے علاوہ بہت سے زوردار اور گرم پمفلٹ لکھے، پیرس، بروسلز اور لندن کی پارٹی تنظیموں میں کام کیا، اور بالآخر سب سے بڑھ کر یہ کہ انٹرنیشنل ورکنگ‌مینز ایسوسی‌ایشن (۸۴) قائم کر دی — یہ بجائے خود اتنا زبردست کارنامہ ہے کہ اگر اس انٹرنیشنل کے بانی مبانی نے اور کچھ نہ بھی کیا ہوتا تو فخر کرنے کے لئے یہی کافی تھا۔

نتیجہ یہ کہ مارکس ہی اپنے زمانے میں سب سے زیادہ نفرتوں، الزاموں اور بدکلامیوں کا نشانہ بنا رہا۔ اسے شاہی حکومتوں نے بھی اپنے یہاں سے ملک بدر کیا اور ریپبلکن حکومتوں نے بھی۔ چاہے قدامت‌پرست بورژوا تھے یا جمہوریوں سے بڑھ کر جمہوری بورژوا، دونوں نے مارکس پر بہتان تراشنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کیا۔ اور وہ ان سارے بہتانوں کو مکڑی کے جالے کی طرح جھٹکتا رہا، نظرانداز کرتا رہا، جب تک کہ انتہائی مجبوری پیش نہ آئی اس نے کسی کا جواب نہیں دیا۔ وہ دنیا سے رخصت ہوا ہے تو آج اس کے لاکھوں انقلابی رفیق، سائبیریا سے لے کر کیلی‌فورنیا کی کانوں تک، یورپ اور امریکہ کے ایک ایک حصے میں محبت اور احترام کے ساتھ اس کا سوگ منا رہے ہیں۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ چاہے اس کے کتنے ہی مخالفین رہے ہوں لیکن مارکس کا ذاتی دشمن شاید ہی کوئی ملے۔

اس کا نام صدیوں برقرار رہے گا اور اس کا کام بھی!

اینگلس نے یہ تقریر ہائی گیٹ کے قبرستان (لندن) میں ۱۷ مارچ ۱۸۸۳ء کو بزبان انگریزی کی تھی۔ ۲۲ مارچ ۱۸۸۳ء کو جرمن اخبار «Der Sozialdemokrat» میں شائع ہوئی۔

اخبار میں شائع‌شدہ اصل کے مطابق ترجمہ۔

فریڈرک اینگلس

کمیونسٹ لیگ کی تاریخ پر[۸۵]

۱۸۵۲ء میں کولون کے کمیونسٹوں کو سزائیں سنا دی گئیں تو جرمن مزدوروں کی آزادانہ تحریک کا پہلا دور اس پر تمام ہوگیا۔ آج کسی کو وہ زمانہ یاد بھی نہیں رہا، جو ۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۲ء تک پھیلا ہوا تھا۔ دوسرے ملکوں میں جرمن مزدوروں کے پھیل جانے کے ساتھ ان کی مزدور تحریک تقریباً سبھی متمدن ملکوں میں پھیل چکی ہے۔ اتناھی نہیں۔ آجکل مزدوروں کی انٹرنیشنل تحریک اصل میں ایک براہ‌راست سلسلہ ہے اس زمانےوالی جرمن مزدور تحریک کا جو دنیا میں پہلی بار مزدوروں کی ایک انٹرنیشنل تحریک تھی اور جو ایسے بہت

سے لوگوں کو سامنے لائی جنھوں نے انٹرنیشنل ورکنگ‌مینز ایسوسی‌ایشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ''کمیونسٹ مینی‌فسٹو''* کے وہ نظریاتی اصول جو کمیونسٹ لیگ نے ۱۸۴۷ء میں اپنے پرچم پر چڑھائے تھے، آج یورپ اور امریکہ دونوں کی تمام پرولتاری تحریک کا سب سے مضبوط بین‌اقوامی رشتہ بن‌چکے ہیں۔

---

* ملاحظہ ہو اس سلسلے کا حصۂ اول، صفحات ۹۰ — ۴۳۔ (ایڈیٹر)

آج تک اس تحریک کی مربوط تاریخ کے لئے صرف ایک ہی خاص سرچشمہ موجود تھا ، یعنی وہ جسے کالی کتاب کہا جاتا ہے : ویرموتھ اور شٹیبر کی برلن سے ۱۸۵۳ ء اور ۱۸۵۴ ء میں دو حصوں میں شائع کی ہوئی کتاب '' ۱۹ ویں صدی کی کمیونسٹ سازشیں ،، ۔ پھوھڑپن کی یہی تالیف ، جس میں جان بوجھ کر جعل‌سازی بھری گئی ہے اور جسے ہماری صدی کے دو انتہائی نفرت‌انگیز پولیس‌والے پاجیوں نے اپنے دل سے جوڑ جوڑ کر تیار کیا ہے ، آج لے دے کے وہی ایک ذریعہ رہ گئی ہے جس سے غیر کمیونسٹ تحریریں اس گزرے ہوئے دور کا حال معلوم کر سکتی ہیں ۔

میں یہاں پر صرف ایک ہلکا سا نقشہ پیش کر سکتا ہوں اور وہ بھی اسی قدر جتنا کمیونسٹ لیگ سے براہ‌راست متعلق ہے ، اتنی ہی باتیں لکھوں گا جو '' بے‌نقاب ،، کو سمجھنے کے لئے انتہائی ضروری ہیں ۔ البتہ امید ہے کہ ایک نہ ایک دن مجھے یہ موقع ملے گا کہ مارکس نے اور میں نے مل کر مزدوروں کی انٹرنیشنل تحریک کے اس عنفوان شباب‌والے شاندار دور کی تاریخ پر جو کبھی بہت سا مسالہ جمع کیا تھا ، اسے محنت سے تیار کر سکوں گا ۔

* * *

پیرس میں جرمن پناہ گزینوں کی خفیہ جماعت — جمہوری ریپبلکن خلاف‌قانون لوگوں کی لیگ جو ۱۸۳۴ ء میں قائم ہوئی تھی ، اس کے انتہاپسند ، خاص کر پرولتاری عناصر نے ۱۸۳۶ ء میں اس جماعت سے رشتہ توڑ کر ایک نئی خفیہ انصاف لیگ (League of the Just) بنالی ۔ جس لیگ سے یہ لوگ الگ ہو کر نکلے تھے ، اس میں صرف اونگھتے ٹھیلنے آدمی ، یعنی یاکب وینیدئی جیسے لوگ رہ گئے ، اور وہ کچھ دنوں میں بالکل ہی سو رہے : چنانچہ جب ۱۸۴۰ ء میں پولیس نے جرمنی میں اس کے بعض حلقوں کو سونگھ سونگھ کر کھنگالا تو پہلے‌والی خفیہ جماعت کی پرچھائیں تک نہیں رہ گئی تھی ۔ اس کے برخلاف نئی لیگ جو بنی تھی وہ مقابلتاً تیزی سے بڑھتی چلی گئی ۔ شروع میں تو وہ فرانس کے اس مزدور کمیونزم کی جرمن حاشیہ‌نشین رہی، جو بابوازم (Babouvism) (۸۶)

کی یاد دلاتا تھا اور پیرس میں تقریباً انھی دنوں رنگ روپ بھی نکال رہا تھا۔ اس جماعت نے ”مساوات“ کا حاصل حصول اس مطالبے میں رکھا تھا کہ جتنا مال تیار ہو وہ سب کمیونٹی (سماج) کا ہو۔ اور اس کے سامنے مقصد وہی تھے جو اس زمانے میں پیرس کی خفیہ جماعتوں کے ہوا کرتے تھے۔ یہ نیم تبلیغی اور نیم سازشی جماعت تھی۔ پیرس ہمیشہ انقلابی کارروائی کا گڑھ سمجھا جاتا تھا اگرچہ اس میں یہ گنجائش موجود تھی کہ جرمنی میں کبھی اتفاقیہ بغاوتوں کی (putsches) تیاری بھی ممکن ہو۔ مگر چوں کہ پیرس ایک فیصلہ کن معرکے کا مقام تھا تو یہ نئی لیگ بھی تب تک فرانس کی خفیہ جماعتوں کی جرمن شاخ کے سوا کچھ نہیں تھی، خاص طور سے اس جماعت کی شاخ جس کا نام تھا Société des Saisons (موسمی سوسائٹی) اور جس کے رہنما تھے بلانکی اور باربے۔ اسی سے لیگ کا گہرا تعلق قائم تھا۔ فرانسیسیوں نے ۱۲ مئی ۱۸۳۹ء کو عملی قدم اٹھا دیا۔ لیگ والے کچھ حصے بھی ان کے شریک ہو گئے اور یوں انھیں بھی ساتھ ہی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ (۸۷)

گرفتارشدہ جرمنوں میں کارل شاپیر اور ہنریخ باؤیر بھی تھے۔ لوئی فلپ کی فرانسیسی حکومت نے انھیں کافی عرصے تک قید رکھنے کے بعد ملک بدر کر دینے کو کافی سمجھا۔ دونوں نکالے گئے تو لندن پہنچے۔ کارل شاپیر نساؤ علاقے کے ویلبرگ کا رہنے والا تھا۔ ابھی ۱۸۳۲ء میں گیسن کے مقام پر جنگلات کے کالج میں تعلیم پا رہا تھا کہ جارج بوخنر کی بنائی ہوئی خفیہ جماعت کا ممبر بن گیا۔ ۳ اپریل ۱۸۳۳ء کو جب فرینکفرٹ کے تھانے پر باغیانہ یلغار کی گئی (۸۸)، وہ اس میں شریک تھا۔ پھر سرحد پار نکل گیا اور فروری ۱۸۳۴ء میں مازینی نے جب سیوائے پر چڑھائی کی (۸۹) تو پھر شریک ہوگیا۔ خوب ڈیل ڈول کا آدمی، اٹل ارادے اور زبردست قوت کا مالک، ہمیشہ اپنی جان اور آسائش جوکھم میں ڈالنے کو تیار۔ وہ ان پیشہ‌ور انقلابیوں کا ایک عمدہ نمونہ تھا جنھوں نے ۱۸۳۰ء کے دہلے میں خاص رول انجام دیا ہے۔ خیالات میں کسی قدر جھول ہونے کے باوجود یہ شخص گہری نظریاتی سوجھ بوجھ سے کسی طرح عاری نہیں تھا، اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ ڈیما گوگوں (Demagogue) (۹۰) سے ہوتے ہوتے وہ کمیونسٹ بنا

اور جو عقیدہ ایک بار تمام لیا تھا بعد میں اسے اور بھی مضبوطی سے تھامے رہا۔ اس شدت کے باعث ایسا ضرور ہوا کہ انقلابی جذبہ سمجھ بوجھ پر غالب آگیا، تاہم اسے ہمیشہ بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا تھا اور وہ کھلے عام غلطی مان لیا کرتا تھا۔ وہ ایک بھرپور آدمی تھا اور جرمن مزدور تحریک کی بنیاد ڈالنے میں اس نے جتنا کچھ کیا ہے، وہ فراموش نہیں کیا جائے گا۔

ہنریخ باؤیر فرانکونیا کا ایک جفتساز (جوتے کا کاریگر) تھا۔ مزاج، چاق‌چوبند، چھیڑ چھاڑ کرنےوالا یہ شخص تھا تو چھوٹے جثے کا، لیکن اس میں بھی ہوشیاری اور عزم کی قوت بھری ہوئی تھی۔

کارل شاپیر کے بعد باؤیر بھی لندن پہنچا۔ شاپیر نے پیرس میں کمپوزیٹر کا کام کیا تھا اور لندن میں زبانوں کی تعلیم کو ذریعہ‌معاش بنایا۔ دونوں نے ٹوٹے ہوئے تار جوڑنے کی کوشش شروع کر دی اور لندن کو لیگ کا مرکز بنا دیا۔ اگر پیرس میں جوزف مول کا ساتھ نہیں رہ چکا تھا تو یہاں پہنچ کر وہ بھی ان کا شریک ہو گیا۔ یہ جوزف مول کولون شہر کا ایک گھڑی‌ساز تھا، میانہ قدوقامت کا نہایت مضبوط بدن۔ کتنی ہی بار وہ اور شاپیر مل کر ایک ہال کے دروازے پر سیکڑوں مخالفین کے ہجوم کو پسپا کر چکے تھے۔ یہ شخص جسمانی اور ارادی قوت میں تو اکیلا اپنے دونوں ساتھیوں کی جوڑ کا ہوگا، لیکن ذہنی صلاحیت میں ان دونوں سے بلند تھا۔ اس کا پیدائشی ڈپلومیٹ ہونا تو یوں ثابت ہوا کہ جتنے مشنوں پر گیا، کامیاب رہا۔ نظریاتی بصیرت میں بھی وہ کچھ کم نہیں تھا۔ میری ان تینوں سے ۱۸۴۳ء میں لندن کے دوران قیام میں ملاقات ہوئی۔ وہ پہلے انقلابی پرولتاری تھے جن سے میں ملا ہوں۔ اگرچہ تب ہمارے خیالات اپنی تفصیل میں ایک دوسرے سے بہت الگ جاتے تھے، کیوں کہ ان تینوں میں کٹر، تنگ‌نظر قسم کا مساویانہ کمیونزم * سمایا تھا تو مجھ میں اسی درجہ تنگ نظر فلسفیانہ

---

* میرا مطلب اس کمیونزم سے ہے جو صرف یا بیشتر اسی مطالبے سے سروکار رکھتا ہے کہ سب میں مساوات ہونی چاہئے۔

روکھے پن کی ہوا بھری ہوئی تھی ، تاہم میں بھول نہیں سکتا کہ ان تین کھرے آدمیوں نے مجھ پر کیسا گہرا نقش چھوڑا تھا — اور میں تو اس وقت تک آدمی بننے کی جستجو میں وقت گزار رہا تھا۔

لندن میں ، اور اس سے کچھ کم درجے پر سوئٹزرلینڈ میں ، ان لوگوں کو انجمن بنانے اور جلسے کرنے کی آزادی میسر آئی۔ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ۷ فروری ۱۸۴۰ء کو جرمن مزدوروں کی تعلیمی انجمن (سوسائٹی) (۹۱) نام کی ایک کھلی قانونی جماعت کی بنیاد ڈال دی گئی جو ابھی تک چل رہی ہے۔ یہ انجمن لیگ کے نئے ممبروں کے لئے بھرتی کا دفتر بن گئی اور جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے ، کمیونسٹ ہی اس انجمن کے سب سے تیز ذہین اور سرگرم کارکن تھے، لہذا رفتہ رفتہ تعلیمی انجمن کی لیڈری پوری طرح لیگ‌والوں کے ہاتھ میں آگئی۔ لیگ نے لندن میں فوراً ہی کئی ایک حلقے قائم کر دئے جنھیں اس زمانے میں ''لاج،، کہا جاتا تھا۔ سوئٹزرلینڈ اور دوسرے مقامات پر بھی کام کی یہی تدبیر اختیار کی گئی۔ جہاں کہیں مزدوروں کی انجمنیں بنائی جاسکتی تھیں ، ان سے بھی اسی انداز پر کام لیا جاتا تھا۔ اور جہاں قانون اس کی اجازت نہ دیتا وہاں گیت سنگیت سوسائٹیاں ، پہلوانی اکھاڑے وغیرہ بنا کر کام نکالا جاتا۔ لیگ کے ممبر برابر ادھر سے ادھر سفر کرتے بھرتے تھے اور ان کے ذریعے دوردراز تک رشتے رابطے قائم رکھے جاتے۔ جب ضرورت پڑتی تو انھی کے ذریعے نامہ و پیام بھی چلتے تھے۔ دونوں حالتوں میں ان حکومتوں کی دانائی لیگ کے مفید مطلب رہتی تھی جو کسی بھی قابل اعتراض کارکن کو اپنے ملک سے باہر نکال دیا کرتی تھیں۔ ایسے نکالے جانے‌والے دس میں سے نو آدمی لیگ کے ممبر ہوتے تھے اور وہ قابل اعتراض کارکن کے بجائے پیغامبر کا فرض انجام دیا کرتے تھے۔

پھر سے بحال کی ہوئی اس لیگ نے اپنا حلقہ اثر کافی بڑھا لیا۔ خاص طور سے سوئٹزرلینڈ میں وائیٹلنگ نے ، آگسٹ بیکر نے (جو زبردست صلاحیت کا آدمی تھا لیکن اکثر جرمنوں کی طرح وہ بھی کیرکٹر کے ڈانواڈول ہونے سے مصیبت میں پھنس گیا) اور کئی لوگوں نے ایک مضبوط تنظیم کھڑی کردی جو وائیٹلنگ کے کمیونسٹ نظام کو کم‌وبیش اپنا عقیدہ بنا چکی تھی۔ وئیٹلنگ کے کمیونزم پر تنقید کرنا یہاں بےمحل ہوگا۔

لیکن جرمن پرولتاریہ کی پہلی آزادانہ نظریاتی اٹھان کی حیثیت سے دیکھتا ہوں تو آج بھی مجھے مارکس کے ان الفاظ سے اتفاق ہوتا ہے جو ۱۸۴۴ء میں پیرس کے جرمن اخبار «Vorwärts» میں شائع ہوئے تھے کہ :
'' بھلا (جرمن) بورژوازی اپنے سارے فلسفیوں اور لائق اہل‌قلم سمیت کوئی ایسی تحریر پیش کر سکتی ہے جو خود بورژوازی کے ہی چھٹکارے سے ، اس کی سیاسی گلوخلاصی سے تعلق رکھتی ہو اور وائیٹلنگ کے مقالے '' ہم‌آہنگی اور آزادی کی ضمانتیں ،، کے مقابلے میں رکھی جاسکے ؟ اگر جرمن سیاسی ادب کی روکھی پھیکی تنگ‌دامنی کا جرمن مزدوروں کے اس بے‌پناہ ، جگمگاتے ہوئے کارنامے سے موازنہ کیا جائے ، اگر پرولتاریوں کے ان بچکانہ مگر بہت لمبے چوڑے جوتوں کا بورژوازی کے گھسے ہوئے بالشتیے سائزوالے سیاسی جوتوں سے مقابلہ کیا جائے تو ابھی سے یہ پیش گوئی کی جاسکتی ہے کہ اس کمسن سینڈریلا کا بدن سانچے میں ڈھل جائے گا ،، ۔ آج وہ سانچے میں ڈھلا ہوا بدن ہماری آنکھوں کے سامنے ہے ، اگرچہ ابھی تک اس کے بھر پور ہونے کی نوبت نہیں آئی ہے۔

جرمنی میں بھی بہت سے حلقے موجود تھے ۔ یوں دیکھا جائے تو وہ بنتے بکھرتے رہتے تھے ، لیکن جو حلقے وجود میں آیا کرتے ، وہ بکھر جانےوالوں کی کمی پوری کرنے سے کچھ زیادہ ہی نکلتے تھے ۔ کہیں سات سال بعد ۱۸۴۶ء کے آخر میں پولیس کو سن گن ملی کہ برلن (مینتیل) میں اور میگڈبورگ (بیک) میں لیگ کا وجود ہے ، مگر وہ ان لوگوں کا کچھ اور پتہ نہ نکال سکی۔

وائیٹلنگ ابھی ۱۸۴۰ء تک پیرس میں ہی تھا ، وہاں بھی اس نے بکھرے ہوئے لوگوں کو جوڑ لیا اور اس کے بعد سوئٹزرلینڈ روانہ ہوگیا۔

لیگ کی مرکزی طاقت درزیوں میں تھی ۔ جرمن درزی جگہ جگہ پھیلے ہوئے تھے : سوئٹزرلینڈ ، لندن اور پیرس میں موجود تھے ۔ درزی کے پیشے میں جرمن زبان اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ ۱۸۴۶ء میں مجھے ناروے کے ایک ٹیلر سے ملایا گیا جو درونھیئم سے فرانس تک سیدھا سمندری فاصلہ طے کرکے آیا تھا ۔ اٹھارہ مہینے کی مدت میں اس کو فرانسیسی زبان کی زرا شدبد بھی نہیں ہوئی تھی لیکن جرمن میں خود

قابلیت پیدا کر لی تھی۔ ۱۸۴۷ء میں پیرس کے دو خاص حلقے (کمیونٹی) زیادہ‌تر درزیوں کے تھے اور ایک حلقہ تھا جس میں بکس بنانے‌والے مستری تھے۔

جب لیگ کا مرکز ثقل پیرس سے لندن آگیا تو اس میں ایک نئی خصوصیت ابھری: اب تک تو یہ لیگ جرمنوں کی تھی، رفتہ رفتہ انٹرنیشنل بن گئی۔ مزدوروں کی تعلیمی انجمن میں بھی اب جرمنوں اور سوئٹزرلینڈوالوں کے علاوہ ان تمام قوموں کے لوگ نظر آنے لگے جن کے پاس جرمن زبان غیرملکیوں تک نامہ و پیام پہنچانے کا واحد ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ ان میں اسکنڈی‌نیویاوالے، ڈچ، ہنگری‌والے، چیک، جنوبی سلاف، بلکہ روسی اور الزاس کے لوگ تک شامل تھے۔ ۱۸۴۷ء میں جو صورتیں باقاعدگی سے نظر پڑتی تھیں ان میں ایک باوردی برطانوی بھی شامل تھا جو گارڈز کے خاص دستے کا گرینیڈیر تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں تعلیمی انجمن نے اپنا نام رکھا مزدوروں کی کمیونسٹ تعلیمی انجمن اور سمبری کے کارڈوں پر یہ لفظ ''سب لوگ بھائی بھائی ہیں'' کم‌ازکم بیس زبانوں میں درج کئے ہوں‌گے اور کہیں کہیں لکھنے میں غلطی بھی ہوگی۔ کھلی ہوئی انجمن کی طرح خفیہ لیگ نے بھی پہلے سے زیادہ انٹرنیشنل کردار اختیار کر لیا جو شروع میں ایک محدود معنی میں رہا: عملی صورت تو یہ تھی کہ لیگ کے ممبروں میں مختلف قوموں کے لوگ شامل تھے اور نظریاتی شکل یہ کہ اس نے کسی بھی انقلاب کی فتحمندی کے لئے پورے یورپ میں انقلاب برپا ہونا مان لیا۔ قدم آگے نہیں پڑا لیکن بنیاد پڑ گئی۔

جو فرانسیسی انقلابی ۱۲ مئی ۱۸۳۹ء کے معرکے کے بعد لندن بھاگ کر آگئے تھے ان کے ذریعے فرانس کے انقلابیوں سے لیگ کا نزدیکی رشتہ قائم رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح پولینڈوالوں میں جو زیادہ گرم تھے ان سے بھی۔ پولینڈ سے بھاگے ہوئے لوگوں میں جن کی سرکاری حیثیت تھی، وہ بھی مازینی کی طرح، حلیف ہونے کے بجائے مخالف صفوں میں آگئے۔ انگریز چارٹسٹوں کو، ان کی تحریک کے خاص انگریزی کردار کی بنا پر انقلاب سے باہر قرار دیا جاتا تھا۔ لندن میں لیگ کے لیڈر ان لوگوں سے بعد میں ملے، وہ بھی میرے ذریعے۔

دوسری نسبتوں سے بھی لیگ کا کردار واقعات کے ساتھ ساتھ بہت بدل چکا تھا۔ اگرچہ ابھی تک عام خیال یہی تھا اور اس زمانے میں برحق بھی تھا کہ شہر پیرس انقلاب کی ماں ہے لیکن اب یہ حالت ہو چلی تھی کہ پیرس کے سازشیوں پر تکیہ کئے رہنے سے کام نہیں چلتا۔ لیگ کا دائرہ اثر پھیلا تو اس کی خود آگاہی بھی بڑھی۔ محسوس کیا جانے لگا کہ تحریک کی جڑیں جرمن مزدور طبقے میں زیادہ گہری ہوتی جاتی ہیں اور ان جرمن مزدوروں کو تاریخ نے صدا دی ہے کہ آگے آئیں اور یورپ کے شمال اور مشرق کے مزدوروں کا جھنڈا اٹھائیں۔ وائیٹلنگ کی ہستی میں کمیونزم کا وہ نظریہ‌ساز موجود تھا جسے اس زمانے کے فرانسیسی ہمسروں کے برابر ہمت کے ساتھ رکھا جاسکتا تھا۔ آخر میں یہ کہ ۱۲مئی ۱۸۳۹ء کے تجربے نے ہماری آنکھیں کھول دی تھیں کہ فی‌الحال ماردھاڑ کی کارروائی (putsches) سے کچھ بھی حاصل ہونےوالا نہیں ہے۔ تب بھی اگر ایسے لوگ باقی تھے جو ہر ایک واقعے کو آنےوالے طوفان کی علامت قرار دیتے رہتے تھے، اگر انھی پرانے نیم سازشی اصولوں کو سینے سے لگائے رکھنےوالے موجود تھے تو وہ پرانی انقلابی سرکشی کا قصور تھا جس نے آگے بڑھتے ہوئے زیادہ سنجیدہ اور وزنی خیالات سے ٹکرانا شروع کر دیا تھا۔

کچھ بھی سہی، لیگ کے سماجی نظریے میں، جو ویسے ہی کچھ اکھڑا ہوا تھا، ایک بڑی خرابی پائی جاتی تھی۔ مگر اس خرابی کی جڑبنیاد خود اس زمانے کے سماجی تعلقات تھے۔ لیگ کے ممبروں میں جتنے بھی مزدور تھے، وہ قریب قریب کاریگر لوگ تھے۔ صدر مقامات پر بھی وہ شخص جو کاریگروں سے کام لیا کرتا، خود بھی چھوٹا موٹا استاد کاریگر ہوتا تھا۔ بڑے پیمانے پر کپڑوں کی سلائی سے فائدہ بٹورنا جسے آجکل ریڈی میڈ (تیار) کپڑوں کی کارخانہ‌داری کا نام دیا جاتا ہے اور جس میں درزی کاریگر کی جگہ اس گھریلو صنعت نے لے لی ہے جو کسی بڑے سرمایہ‌دار کے تحت کام کرتی ہو، تب تک لندن میں بھی صرف ہاتھ پاؤں نکال رہی تھی۔ اس صورت میں ایک طرف تو ان کاریگروں کا استحصال کرنےوالا کوئی چھوٹا موٹا استاد ہوتا، اور دوسری طرف کاریگروں میں سے ہر ایک کو اس بات کی لگن رہتی کہ میں بھی آگے

چل کر کچھ کاریگر لگا لوں گا۔ اس کے علاوہ جو کاریگروں کی برادری والا مزاج چلا آرہا تھا ، وہ بھی اس زمانے کے جرمن کاریگروں سے چپکا ہوا تھا۔ یہ لوگ پھر بھی بڑی عزت و احترام کے مستحق ہیں کہ خود ابھی تک پرولتاری نہ ہونے پائے تھے ، بلکہ چھوٹی بورژوازی کے اس حصے کے نمائندے تھے ، جو آجکل کے پرولتاریہ کی صفوں میں اترتے آرہے تھے مگر بورژوازی ، یعنی بڑے سرمائے کے مد مقابل ابھی کھڑے نہیں ہوئے تھے ، اس کے باوجود ان کاریگر پیشہ لوگوں نے پہلے سے ہی فطرتاً انداز لگا لیا کہ مستقبل کا رخ کیا ہوگا اور اگر یہ پورے شعور کے ساتھ نہ کیا ہو ، تب بھی اتنا تو کیا کہ خود کو پرولتاریوں کی پارٹی میں ڈھال لیا۔ مگر اس سے بھی کوئی مفر نہیں تھا کہ جب بھی موجودہ سماج کی تفصیلی نکتہ‌چینی کا موقع آتا ، جب بھی ٹھوس معاشی حقیقتوں کی چھان بین کی جاتی ، کاریگروں کے پرانے تعصبات ہر قدم پر سنگ راہ بننے اور حائل ہونے‌والے تھے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تب اس زمانے میں پوری لیگ کے اندر کوئی ایسا شخص موجود ہوگا جس نے سیاسی معاشیات کی کوئی کتاب اٹھا کر پڑھی ہو۔ مگر اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑا : فی الوقت تو ”مساوات“ ، ”اخوت“ اور ”انصاف“ کا عقیدہ ہر ایک نظریاتی رکاوٹ پار کر جانے میں ان کی پشت‌پناہی کر رہا تھا۔

اسی عرصے میں لیگ اور وائیٹلنگ کے کمیونزم سے ہٹ کر ایک اور ہی ، قطعی مختلف کمیونزم کا نظریہ پروان چڑھ رہا تھا۔ جن دنوں میں مانچسٹر میں تھا ، مجھ پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ معاشی اقتصادی اصلیتیں ، جن سے آج تک تاریخ نگاری میں یا تو سرے سے کوئی کام ہی نہیں لیا گیا ، یا اگر لیا گیا تو بہت حقیر سا کام ، وہی آجکل کی دنیا میں کم‌از‌کم ایک فیصلہ کن تاریخی قوت ضرور ہیں ؛ عہدحاضر کی جو طبقاتی تناتنی ہے ، اس کی جڑبنیاد بھی وہیں ہے ؛ یہی طبقاتی عناد اور تناتنی ان ملکوں میں ، جہاں بڑے پیمانے کی صنعت کی بدولت خاص کر انگلینڈ میں ، وہ خوب پروان چڑھ چکی ہے ایک بنیاد ہے جس پر سیاسی پارٹیاں بنتی ہیں ، پارٹیوں کی رسہ کشی ہوتی ہے اور یوں پوری سیاسی تاریخ کا پایہ اسی پر رکھا ہوا ہے۔ مارکس نہ صرف یہ کہ اسی نقطۂ نظر پر پہنچ چکا تھا ، بلکہ «Deutsch-Französische Jahrbücher» (۱۸۴۴ء)

میں اس نے یہ خیال کلیے کی صورت میں یہاں تک پیش کر دیا تھا کہ عام کرکے کہیے تو اسٹیٹ نہیں ہے جو شہری سماج پر اثرانداز ہوتی اور اسے ضابطے میں رکھتی ہے ، بلکہ شہری سماج ہے جو اسٹیٹ پر اثرانداز ہوتا اور اسے ضابطے میں رکھتا ہے ۔ نتیجہ یہ کہ کسی پالیسی اور اس کی تاریخ کو ہم معاشی تعلقات اور ان کے اتار چڑھاؤ سے سمجھ سکتے ہیں ، اس کے برعکس درست نہیں ہے ۔ جب میں پیرس میں ۱۸۴۴ء کی گرمیوں میں مارکس سے ملنے گیا تو ظاہر ہو گیا کہ تمام نظریاتی گوشوں میں ہم دونوں کے درمیان پورا اتفاق رائے ہے ۔ اور ہم نے اسی وقت سے مل کر کام کرنا شروع کر دیا ۔ اگلے سال کے موسم بہار میں جب بروسلز میں پھر ہماری ملاقات ہوئی تب تک مارکس نے مذکورہ‌بالا بنیاد پر تاریخ کے مادی نظریے کو خاص خاص پہلوؤں سے خوب تیار کر لیا تھا ۔ چنانچہ ہم دونوں نے اپنے نودریافت نقطۂ نظر کو ایک سے ایک مختلف سمتوں میں تفصیلات کے ساتھ پھیلانے میں لگا دیا ۔

یہ دریافت جس نے تاریخ کے علم میں انقلاب برپا کر دیا اور جیسا کہ ذکر کیا گیا ، بنیادی طور پر کارل مارکس کا ہی کارنامہ ہے ، میں تو اس کا بہت معمولی سا حصہ خود سے منسوب کر سکتا ہوں ، یہ دریافت مزدوروں کی موجودہ تحریک میں فوری اہمیت کی مالک تھی ۔ فرانسیسیوں اور جرمنوں میں کمیونزم اور انگریزوں میں چارٹزم (دیکھئے نوٹ نمبر ۳۵) اب اس دریافت کے بعد ایسی تحریکیں نہیں رہ گئیں جن کا ہونا نہونا محض اتفاقی امر تھا ۔ نظر آنے لگا کہ یہ تحریکیں آج کے دبے کچلے طبقے یعنی پرولتاریہ کی تحریک ہیں جو حاکم طبقے یعنی بورژوازی کے توڑ پر اس طبقے کی تاریخی تقاضے‌والی کشمکش کی تھوڑی بہت ترقی‌یافتہ شکلیں ہیں ؛ نظر آنے لگا کہ یہ تحریکیں طبقاتی کشمکش کی ہی صورتیں ہیں لیکن ایک بات میں پہلے کی تمام طبقاتی کشمکشوں سے الگ پہچانی جاتی ہیں ، وہ بات یہ کہ آج کا دبا کچلا طبقہ خود اپنے سر کا بوجھ اتارنے میں تب تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ پورے سماج کو طبقوں کی تقسیم سے ، اور اسی بنا پر طبقاتی کشمکش سے نجات نہ دلوا دے ۔ اب کمیونزم کا مطلب یہ نہیں رہ گیا کہ جہاں تک ممکن ہو وہ بےعیب اور مثالی سماج کی ، تخئیل کے زور سے ایک شیرازہ‌بندی ہے ،

بلکہ اب یہ نکلا کہ پرولتاریہ کی چھیڑی ہوئی کشمکش کی گہرائی میں اترنا ، اس کی حالتوں ، کیفیتوں میں اور انھی پر مبنی عام مقصدوں میں گہری نظر رکھنا کمیونزم ہے ۔

ہمارا منشا ہرگز یہ نہیں تھا کہ ان نئے سائنسی نتیجوں کو بڑی بڑی جلدوں میں بھر کر ''علم‌وفضل،، کی دنیا کے لئے خاص کر دیں ۔ اس کے برعکس ، ہم دونوں سیاسی تحریک میں اندر تک اترے ہوئے تھے ، پڑھے لکھے لوگوں میں بھی خاص کر مغربی جرمنی میں ہمارے ماننےوالوں کی کچھ کمی نہ تھی اور منظم پرولتاریہ میں بھی تعلقات کا سلسلہ کافی پھیلا ہوا تھا ۔ ہمارا فرض تھا کہ اپنے خیالات کو ایک سائنسی بنیاد دیں لیکن اسی قدر اہمیت ہمارے نزدیک اس بات میں تھی کہ یورپ کے اور سب سے مقدم جرمنی کے پرولتاریہ کو اپنے عقیدے کا حامی بنایا جائے۔ جیسے ہی ذہن کا مطلع صاف ہوا ہم اپنے کام میں لگ گئے ۔ بروسلز میں ہم نے ایک جرمن ورکرز سوسائٹی قائم کی اور اخبار «Deutsche-Brüsseler-Zeitung» ہاتھ میں لے لیا جو فروری کے انقلاب (۹۲) تک ہمارے خیالات کے ترجمان کا کام کرتا رہا ۔ ہم نے انگریزی چارٹسٹ تحریک کے انقلابی حصے سے ربط پیدا کیا جولین ہارنی کے ذریعے جو اس تحریک کے مرکزی ترجمان «The Northern Star» (۹۳) کا ایڈیٹر تھا اور میں بھی اس پرچے میں لکھا کرتا تھا ۔ اسی طرح بروسلز کے ڈیموکریٹوں سے بھی ہم نے کارٹل قسم کا معاملہ کر لیا (مارکس وہاں کی ڈیموکریٹک ایسوسی‌ایشن (۹۴) کا نائب صدر تھا) اور «Réforme» اخبار (۹۵) کے فرانسیسی سوشل ڈیموکریٹ حلقے سے بھی ربط بن گیا ۔ اس اخبار کو میں انگریزی اور جرمن تحریکوں کی خبریں بھیجا کرتا تھا ۔ غرض یہ کہ ریڈیکل اور پرولتاری جماعتوں سے ، ان کے اخباروں رسالوں سے ہمارے تعلقات حسب منشا بن‌چکے تھے ۔

انصاف لیگ (League of the Just) سے ہمارے تعلقات کی صورت یہ تھی کہ : لیگ کے وجود کا علم تو ہمیں تھا ہی ۔ ۱۸۴۳ ء میں شاپیر نے مجھے اس لیگ میں شامل ہونے کی بھی پیشکش کی ، مگر میں قدرتاً تب اس پر راضی نہیں ہوا ۔ تاہم صرف لندن‌والوں سے ہی ہماری خط و کتابت جاری نہیں رہی بلکہ ڈاکٹر ایوربیک کے ساتھ اور بھی نزدیکی

واسطہ قائم رکھا جو اس زمانے میں پیرس کے حلقوں کا لیڈر تھا۔ لیگ کے اندرونی معاملات میں پڑے بغیر ہر ایک اہم واقعے کی خبر ہمیں رہتی تھی۔ ادھر یہ بھی ہوتا کہ لیگ کے سب سے اہم ممبروں کے نظریات و خیالات پر ہم زبانی تقریر سے، خط و کتابت اور اخباری کالموں کے ذریعے اثر ڈالتے رہتے تھے۔ اسی غرض سے ہم لیتھو پر چھاپے ہوئے سرکلروں سے بھی کام لیا کرتے تھے جو ایسے خاص موقعوں پر جب بنتی ہوئی، تشکیل پاتی ہوئی کمیونسٹ پارٹی کے اندرونی معاملات کا سوال آتا، ہم دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اپنے دوستوں اور غائبانہ ربط رکھنےوالوں کو بھیجا کرتے تھے۔ انھی سرکلروں میں بعض اوقات انصاف لیگ بھی زیربحث آجاتی تھی۔ چناں‌چہ ایک دفعہ یہ ہوا کہ ویسٹ فال کے ایک نوجوان طالب‌علم ہرمن کریگے نے جو امریکہ گیا تھا، وہاں لیگ کے پیغامبر کا روپ بھر لیا اور اس دیوانے ہارو ہارینگ سے وابستہ ہو گیا تاکہ جنوبی امریکہ میں سب کچھ تہ‌وبالا کرنے کے لئے لیگ سے کام لیا جائے۔ وہاں اس نے ایک اخبار * نکالا جس میں گویا لیگ کی طرف سے ایسے بےلگام کمیونزم کا پرچار شروع کر دیا جو ”محبت“ کے خواب و خیال پر مبنی تھا، محبت سے ابلا جا رہا تھا اور بس سراپا محبت تھا۔ اس کے رد میں ہم نے اپنا ایک سرکلر روانہ کیا، سرکلر رنگ لایا ** اور ہرمن کریگے لیگ کے منظر سے غائب ہو گیا۔

بعد میں وائیٹلنگ بروسلز آیا۔ مگر اب وہ پہلے کا سادہ‌لوح نوجوان چھوٹا درزی نہیں رہ گیا تھا جسے خود اپنی ذہانت کا بار سنبھالنا مشکل ہو، بلکہ اپنے ذہن کو اس مسئلے پر صاف کرنے کی کوشش میں تھا کہ کمیونسٹ سماج کا رنگ روپ کیسا ہوگا۔ تب تک وہ ایک بڑا آدمی ہو چکا تھا اور اپنی بلند صفات کے باعث حاسدوں کے ہاتھ سے اذیتوں کا نشانہ بن‌چکا تھا، ہر طرف اسے اپنے حریف، خفیہ دشمن، پھندے اور جال دکھائی دیتے تھے، ایک پیغمبر جو دیس بدیس دھکے

---

*(۹۶) «Der Volks-Tribun» ۔ (ایڈیٹر)

** ملاحظہ ہو مارکس، اینگلس ”کریگے کے خلاف سرکلر“۔ (ایڈیٹر)

کھاتا پھرتا تھا ، جس کی جیب میں تیربہدف نسخہ پڑا ہوا تھا کہ زمین پر جنت اتار لانے کی کیا تدبیر ہے اور جس کے دماغ پر یہ خیال مسلط ہو گیا تھا کہ ہر شخص اس نسخے کو چرا لینے کی فکر میں ہے ۔ لندن میں لیگ کے ممبروں سے اس نے ناتہ توڑ لیا تھا اور بروسلز میں ، مارکس میاں بیوی اس کے ساتھ ایسے تپاک سے پیش آئے کہ اتنا ضبط و برداشت انسان کے بس کی بات نہیں تھی لیکن وہاں بھی اس کی کسی سے نہیں بنی ۔ نتیجہ یہ کہ وہ تھوڑے ہی دنوں میں امریکہ روانہ ہو گیا تاکہ وہاں اپنی پیغمبری کا فرض انجام دیتا پھرے ۔

انصاف لیگ میں اور خاص کر اس کے لندن کے لیڈروں میں جو خاموش تبدیلی آرہی تھی ، ان تمام باتوں نے اس کو اور سہارا دیا ۔ پہلے سے جو کمیونزم کے تصورات چلے آرہے تھے — فرانسیسیوں کا سیدھا سا مساویانہ کمیونزم اور وائیٹلنگ‌والا کمیونزم — دونوں کی کوتاہی زیادہ سے زیادہ ان پر کھلتی گئی ۔ وائیٹلنگ نے بالکل شروع کی مسیحیت میں جو کمیونزم کا سراغ لگایا تھا ، چاہے اس کی کتاب ''غریب گناہگاروں کا وعظ،، میں بعض مقامات کتنے ہی لاجواب کیوں نہ ہوں ، لیکن نتیجہ یہ دکھایا کہ سوئٹزرلینڈ میں تحریک کو بڑی حد تک پہلے تو البرخت جیسے احمقوں کو سونپ دیا اور پھر کوہلمین جیسے بہروپیے پیغمبروں نے اس سے اپنا الو سیدھا کیا ۔ بعض ادبی مصنفین نے جو ''سچے سوشلزم،، کی آواز اٹھائی ، یہ ''سچا سوشلزم،، بھی فرانسیسی اشتراکی لفظوں اور جملوں کو ہیگل کی بگڑی ہوئی جرمن زبان کا جامہ پہنانا اور خواب و خیال کی جذباتی محبت بکھاننا ہی تھا (ملاحظہ ہو ''کمیونسٹ مینی‌فسٹو،، کا وہ حصہ ، جہاں جرمن یا ''سچے،، سوشلزم کا بیان آیا ہے *) جسے کریگے نے اور متعلقہ ادب کے مطالعے نے لیگ کے اندر رواج دیا ۔ اس ''سچے،، سوشلزم کی رونی صورت اور بےبسی کا اثر یہ پڑا کہ انصاف لیگ کے پرانے پرانے انقلابی بددل ہوتے چلے گئے ۔ پہلے کے نظریات کی بےربطی سے اور ان کے باعث عملی الجھاوے پڑنے سے تنگ آتے آتے آخر لندن میں یہ محسوس کیا جانے

---

* دیکھئے اسی سلسلے کا حصۂ اول ، صفحات ۸۷ — ۸۳ ۔ (ایڈیٹر)

لگا کہ مارکس نے اور میں نے جو نیا نظریہ نکالا ہے وہی درست ہوگا۔ اس خیال کے پھیلنے میں ایک اور حقیقت کا ہاتھ بھی ضرور تھا اور وہ یہ کہ لندن کے لیڈروں میں اب ایسے دو آدمی موجود تھے جن کی نظریاتی علم کی صلاحیت مذکورہ بالا تمام لوگوں سے کہیں بڑھی ہوئی تھی : ایک تو ہیلبرون کا رہنےوالا ، نازک کام کا مصور کارل فینڈر اور دوسرا تھیورینگیا کا ٹیلر ماسٹر جارج ایکاریوس۔ *

اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ ۱۸۴۷ء کے موسم بہار میں مول (Moll) بروسلز میں مارکس سے ملا اور اس کے فوراً بعد پیرس میں مجھ سے ملا اور ہم دونوں کو اپنے ساتھیوں کی رائے سے باصرار لیگ میں شامل ہونے کے لئے کہتا رہا۔ اس کا بیان تھا کہ یہ لوگ ہمارے نقطۂ نظر کی عام سچائی کے اتنے ہی قائل ہو چکے ہیں جتنا انہیں اس بات کا احساس ہے کہ لیگ کو اب پرانے سازشی ڈھروں سے اور طور طریقوں سے نکالنے کی شدید ضرورت ہے۔ اگر ہم لیگ میں شامل ہو جائیں تو یہ موقع دیا جائےگا کہ اپنے تنقیدی کمیونزم کو لیگ کی پوری کانگرس کے سامنے مینی‌فسٹو کی صورت میں پیش کر دیں اور بعد میں اسے لیگ کا مینی‌فسٹو بنا کر شائع کر دیا جائے۔ اسی طرح ہمیں یہ اختیار بھی حاصل ہوگا کہ لیگ کی گئی گزری تنظیم کی جگہ ایسی جماعت کو بٹھانے میں اپنا حق ادا کریں جو نئے وقتوں اور نئے مقصدوں کے مناسب حال ہو۔

ہمیں اس میں زرا بھی شبہ نہیں تھا کہ جرمن مزدور طبقے کے درمیان بہرحال ایک تنظیم کی ضرورت ہے اور کچھ نہیں تو پروپیگنڈے کی غرض

---

* فینڈر کا انتقال کوئی آٹھ سال پہلے لندن میں ہوا۔ وہ بےحد ذہین ، بالغ‌نظر ، نکتہ‌سنج اور منطقی‌مزاج کا آدمی تھا۔ ایکاریوس بعد میں کئی برسوں تک انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی‌ایشن کی جنرل کونسل کا سکریٹری رہا۔ اس کونسل میں لیگ کے جو پرانے ممبر شامل ہو گئے تھے ، انھی میں ایکاریوس ، فینڈر ، لیسنر ، لوخنیر ، مارکس اور میرے علاوہ بھی کئی ایک تھے۔ ایکاریوس نے آگے چل کر خود کو انگریزوں کی ٹریڈیونین سرگرمیوں میں محو کر لیا۔

سے سہی ، اور یہ تنظیم چوں کہ اپنے کردار کے لحاظ سے صرف مقامی نہیں ہوگی ، لہذا جرمنی کی حدوں سے باہر بھی صرف خفیہ جماعت بن کر رہ سکتی ہے ۔ قطعی اسی قسم کی تنظیم لیگ کی صورت میں پہلے سے موجود تھی ۔ لیگ میں جو بات پہلے ہمیں قابل اعتراض نظر آتی تھی اب خود لیگ کے نمائندے ہی اسے غلط مان کر رد کئے دے رہے تھے ، بلکہ اب تو ہمیں تنظیم کے کام میں ہی ہاتھ بٹانے کو بلایا جارہا تھا ۔ کیا ہم انکار کر سکتے تھے ؟ ہرگز نہیں ۔ چناں‌چہ ہم لیگ میں چلے گئے ۔ مارکس نے نہایت قریبی دوستوں کو لے کر بروسلز میں لیگ کے ایک حلقے (کمیونٹی) کی بنیاد ڈالی اور میں پیرس کے تین حلقوں میں شریک ہو گیا ۔

۱۸۴۷ ء کے موسم گرما میں لیگ کی پہلی کانگرس لندن میں منعقد ہوئی تو وولف (W. Wolf) بروسلز کے حلقوں کی طرف سے نمائندہ ہو کر آیا اور میں پیرس کی طرف سے ۔ اس کانگرس میں سب سے پہلے لیگ کی نئے سرے سے تنظیم کی گئی ۔ سازشی زمانے کے جو پرانے فرضی نام باقی رہ گئے تھے ، انھیں فہرست سے خارج کر دیا گیا ۔ اب لیگ کی تنظیم یوں بنی کہ حلقے (کمیونٹی) ، دائرے (سرکل) ، رہنمایانہ دائرے ، مرکزی کمیٹی اور کانگرس ۔ چناں‌چہ اس کا نام قرار پایا '' کمیونسٹ لیگ '' ۔ اس کے قواعد و ضوابط کی دفعہ اول میں ہی یہ جملہ آتا ہے : '' لیگ کا مقصد ہے بورژوازی کو اقتدار سے بےدخل کرنا ، پرولتاریہ کا عمل دخل قائم کرنا ، پرانے بورژوا سماج کا صفایا کرنا جس کی بنیاد طبقاتی عناد اور تناتنی پر ہے ، اور ایسے نئے سماج کی بنیاد ڈالنا جو طبقوں سے اور ذاتی ملکیت سے پاک ہو '' ۔ اس جماعت کا ڈھانچہ پوری طرح جمہوری رکھا گیا کہ بورڈوں کا چناؤ ہو اور ہمیشہ انھیں ہٹایا جا سکے ۔ چناؤ کی اسی تدبیر نے سازش کے پیچھے سر کھپانے کی راہ بند کر دی جو ڈکٹیٹری کی طلبگار ہوتی ہے ۔ اور لیگ کو کم‌ازکم معمول کے پرامن حالات میں صرف پروپیگنڈا کرنےوالی سوسائٹی میں بدل ڈالا ۔ یہ نئے قواعد و ضوابط بحث‌مباحثے کے لئے حلقوں کو بھیجے گئے (کام کا ایسا ہی جمہوری طریقہ اختیار کیا گیا) ، حلقوں سے گزر کر وہ دوسری کانگرس میں زیربحث آئے اور آخر آٹھویں دسمبر ۱۸۴۷ ء

کو اس کانگرس نے انھیں منظور کر لیا۔ ویرموتھ اور شٹیبر کی مرتبہ حصۂ اول کے ضمیمہ نمبر ۱۰ میں صفحہ ۲۳۹ پر انھیں دیکھا جا سکتا ہے۔

کمیونسٹ لیگ کی دوسری کانگرس اسی سال نومبر کے آخر اور دسمبر کے شروع میں منعقد ہوئی تھی۔ مارکس بھی اس بار شریک ہوا اور اس نے کافی لمبے چوڑے مباحثے میں نئے نظریے کی کھل کر وضاحت بھی کی — کانگرس دس دن چلتی رہی۔ جتنی ردوقدح تھی، شکوک و شبہات تھے، آخر میں سب ٹھنڈے پڑ گئے اور نئے بنیادی قواعد کو اتفاق رائے سے پاس کر دیا گیا۔ مارکس کو اور مجھے یہ فرض سونپا گیا کہ لیگ کا مینی‌فسٹو تیار کریں۔ اس کے فوراً بعد یہ کام انجام پا گیا۔ فروری کے انقلاب سے چند ہفتے پہلے ''مینی‌فسٹو'' چھپنے کے لئے لندن بھیجا گیا۔ تب سے آج تک وہ دنیا بھر کا چکر کاٹ چکا ہے، اور قریب قریب تمام زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے اور آج بھی بہت سے ملکوں میں وہ پرولتاری تحریک کے گائیڈ کا فرض انجام دے رہا ہے۔ لیگ کا پرانا موٹو (حرف اول) تھا کہ ''سب لوگ بھائی بھائی''، اب اس کی جگہ یہ نیا جنگی نعرہ آیا ''تمام ملکوں کے محنت کشو، ایک ہو!''، جس نے اس جدوجہد کے انٹرنیشنل کردار کا کھلا اعلان کر دیا۔ سترہ سال بعد یہی جنگی نعرہ انٹرنیشنل ورکنگ‌مینز ایسوسی‌ایشن کا شناختی لفظ بن کر ساری دنیا میں گونجنے لگا اور آج تمام ملکوں کے جانباز پرولتاریہ نے اسے اپنے پرچم پر چڑھا لیا ہے۔

فروری (۱۸۴۸ء) کا انقلاب پھوٹ پڑا۔ لندن میں تب تک جو مرکزی کمیٹی کام کر رہی تھی، اس نے فوراً اپنے اختیارات بروسلز کے رہنمایانہ دائرے کے حوالے کر دئے۔ لیکن یہ فیصلہ ایسے وقت ہوا جب بروسلز محاصرے کی حالت میں پہنچ چکا تھا اور خصوصیت سے جرمن لوگ تو کہیں بھی جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ ہم سب کے سب پیرس روانہ ہونے کے لئے بالکل تیار کھڑے تھے، ایسی صورت میں نئی مرکزی کمیٹی بھی اسی فیصلے پر پہنچی کہ برخاست ہو جائے اور اپنے سارے اختیارات کارل مارکس کے حوالے کر کے اسے یہ حق دے دئے کہ وہ فوراً پیرس میں نئی مرکزی کمیٹی قائم کردے۔ جن پانچ آدمیوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا تھا (۳ مارچ ۱۸۴۸ء) وہ ابھی بمشکل الگ ہوئے ہوں گے

کہ اتنے میں پولیس مارکس کے مکان میں گھس پڑی اور اسے حراست میں لے کر مجبور کیا کہ فوراً دوسرے ہی دن فرانس کی طرف نکل جائے۔ خود مارکس بھی فرانس ہی جانا چاہ رہاتھا۔

پیرس میں ہم لوگ پھر اکٹھے ہو گئے۔ یہاں مندرجہ‌ذیل دستاویز تیار کی گئی اور اس پر نئی مرکزی کمیٹی کے تمام ممبروں نے دستخط کر دئیے۔ سارے جرمنی میں اس کی اشاعت کی گئی اور آج بھی بہت سے لوگ اس سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتے ہیں :

جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی کے مطالبے ۹۷

۱ - پورے جرمنی کو ایک ناقابل تقسیم ریپبلک قرار دیا جائے۔

۲ - قوم کے نمائندوں کو روپیہ دیا جائے تاکہ جرمن قوم کی پارلیمنٹ میں مزدور بھی جگہ لے سکیں۔

۳ - لوگوں کی ہتھیاربندی عام ہو۔

۷ - رجواڑوں کی جاگیریں اور دوسری بڑی جاگیریں ، تمام کانیں ، کھدائی‌والی زمینیں وغیرہ سرکاری ملکیت قرار دی جائیں۔ ان جاگیروں پر زراعت بڑے پیمانے پر کی جائے اور جدیدترین سائنسی ذریعوں سے کام لیا جائے اس غرض سے کہ پورے سماج کو ان کا فیض پہنچے۔

۸ - کسانوں کی ملکیت پر جو رہن‌نامے ہیں انھیں سرکاری ملکیت قرار دیا جائے ؛ کسانوں کی طرف سے اس قرضے کا جو سود ادا ہونا ہے وہ سرکار کو جائے۔

۹ - جن ضلعوں میں شکمی (مزارع‌والی) کاشتکاری بڑھی ہوئی ہے وہاں لگان یا وہ ادائگی جو کاشت پر کرنی ہوتی ہے سرکار کو ٹیکس کے طور پر جائےگی۔

۱۱ - ٹرانسپورٹ کے سارے ذریعے : ریلوے ، نہریں ، دخانی جہاز ،

سڑکیں ، ڈاک‌تار وغیرہ سرکاری قبضے میں جائیں - انھیں سرکاری ملکیت بنا کر غیرمالکانہ طبقے کی مرضی کے مطابق چلایا جائے -

۱۴ - وراثت کے حق کو محدود کیا جائے -

۱۵ - ٹیکس نیچے سے اوپر کی طرف درجہ بدرجہ بڑھا چڑھا کر رکھا جائے - روزمرہ کے استعمالی سامان پر سے ٹیکس ہٹا دئے جائیں -

۱۶ - قومی ورکشاپ قائم کئے جائیں - سرکار کی طرف سے تمام محنت کرنےوالوں کو گزر بسر کے قابل آمدنی کی گارنٹی ہو اور جو لوگ محنت کرنے کے قابل نہیں ہیں ان کی خبر گیری کی جائے -

۱۷ - بنیادی تعلیم مفت اور عام ہو -

جرمن پرولتاریہ ، پیٹی بورژوازی اور چھوٹی حیثیت کے کسانوں کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ پورا زور لگا کر ان مطالبوں کو حاصل کر لیں - ان مطالبوں کو عملی جامہ پہنانے سے ہی یہ ممکن ہوگا کہ جرمنی کے کروڑوں آدمی ، جنھیں آج تک تھوڑے سے لوگ اپنے فائدے کے لئے استحصال کرتے آئے ہیں اور جنھیں آئندہ بھی دبا کر رکھنے کی کوشش کی جائےگی ، اپنے حقوق اور وہ اختیارات حاصل کر سکیں‌گے جو ہر طرح کی دولت پیدا کرنےوالوں کی حیثیت سے ان کا حق ہے -

کمیٹی : کارل مارکس ، کارل شاپیر ، ھ - باؤیر ، ف - اینگلس ، ج - مول ، و - وولف

اس زمانے میں انقلابی جتھے تیار کرنے کا جنون پیرس میں عام تھا - اسپین ، اٹلی ، بلجیم کے لوگ ، ڈچ ، پولستانی اور جرمن جوق در جوق اس دھن میں لگے ہوئے تھے کہ اپنے اپنے ملک کو آزاد کرائیں گے - جرمن جتھے کی باگ‌ڈور ہیرویگھ ، بورنشٹیڈ اور برنشٹائن کے ہاتھ میں تھی - انقلاب کے فوراً بعد چوں کہ تمام غیرملکی مزدوروں کا روزگار چھن گیا اور مقامی پبلک بھی انھیں تنگ کرنے لگی ، لہذا ان انقلابی جتھوں میں ٹھٹھ لگ گئے - نئی فرانسیسی حکومت جو آئی اس نے دیکھا کہ یہ ایک سبیل بنیں‌گے باہر کے مزدوروں سے جان چھڑانے کا ، چناں‌چہ انھیں l'etape du soldat کے پروانے عطا کر دئے ، یعنی جن راستوں سے وہ

اپنے ملک پر بڑھنا چاہتے تھے ان پر ٹھیرنے کے ٹھکانے اور فی کس پچاس سینتم (پیسے) یومیہ الاؤنس سرحد پر پہنچنے تک۔ خوش بیان لامارتین جو فرانس کا وزیر خارجہ تھا، اور دلسوزی کے مارے بات بات پر آنکھوں میں آنسو بھر لایا کرتا تھا، اس نے موقع غنیمت جان کر جتھےوالوں کی اپنی اپنی حکومتوں کو پہلے سے خبر بھیج دی اور یوں ان کے ساتھ دغا کی۔

انقلاب کو یوں کھیل تماشا بنانے کی ہم نے ڈٹ کر مخالفت کی۔ جرمنی پر چڑھائی کرنا اور چڑھائی کر کے انقلاب کو زبردستی باہر سے لے جا کر اس کھلبلی میں اتار دینا جو فی‌الوقت جرمنی میں برپا تھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ خود جرمن انقلاب کی جڑ کھود دی جائے، حکومتوں کو مضبوط کیا جائے اور جتھےوالوں کو بےبسی کے عالم میں جرمن فوجوں کے حوالے کر دیا جائے۔ لامارتین نے اس کی ہامی بھر رکھی تھی۔ آگے چل کر جب ویانا اور جرمنی میں انقلاب کو فتح نصیب ہو گئی تو جتھے کا رہا سہا مقصد بھی فوت ہو گیا۔ مگر جب ایک دفعہ شروع ہو چکا تو کھیل برابر چلتا رہا۔

ہم نے ایک جرمن کمیونسٹ کلب (۹۸) قائم کیا جس میں مزدوروں کو ہدایت کر دی کہ وہ جتھے سے الگ ہی رہیں اور ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو واپس ہوں، وہاں پہنچ کر تحریک کے لئے کام کریں۔ ہمارے پرانے دوست فلوکن نے، جسے عارضی حکومت میں جگہ مل گئی تھی، ہمارے بھیجے ہوئے مزدوروں کو بھی سفر کی وہی سہولتیں دلوا دیں جو جتھےوالوں کو ملی تھیں۔ اس طرح سے ہم نے تین چارسو مزدوروں کو جرمنی بھجوا دیا اور ان میں لیگ کے ممبروں کی اکثریت تھی۔

پہلے سے ہی یہ بات قرین قیاس تھی کہ جو ہنگامہ‌خیز ہردل‌عزیز تحریک پھوٹ پڑی ہے اس کی نسبت سے لیگ ایک نہایت کمزور پرزہ ثابت ہوگی۔ لیگ کے تین چوتھائی ممبر جو پہلے باہر کے ملکوں میں رہتے تھے، اپنے وطن واپس آئے تو اپنی جائے رہائش بدل دی؛ پہلےوالے جمے‌جمائے حلقے بڑی حد تک بکھر گئے اور لیگ سے ان کا ہر قسم کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ ان میں سے وہ حصہ، جس کی آرزوئیں کچھ بڑھی ہوئی تھیں، ایسا گیا کہ پھر ربط پیدا کرنے کی بھی کوشش نہ کی، لیکن ہر ایک نے

اپنے اپنے علاقے میں بذات خود الگ چھوٹی سی تحریک کی داغ بیل ڈال دی ۔ آخر یہ کہ ہر ایک چھوٹی موٹی ریاست میں ، ہر ایک صوبے اور شہر میں حالات کچھ اس درجہ مختلف تھے کہ لیگ نہایت ہی گول مول ہدایات دینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھی ؛ یہ ہدایات اخبارات وغیرہ کے ذریعے زیادہ خوبی سے پھیلائی جا سکتی تھیں ۔ مختصر یہ کہ اس لمحے سے جب وہ اسباب ہی ناپید ہو گئے جنھوں نے لیگ کا خفیہ وجود ضروری بنا رکھا تھا ، اب اس خفیہ لیگ کے کوئی معنی نہیں رہے تھے ۔ ان لوگوں کو بھلا اس پر کیا حیرت ہوتی جنھوں نے خفیہ لیگ کے تن سے اس کے رہے سہے سازشی کردار کا جامہ پہلے ہی اتار لیا تھا ۔

یہ بات کہ کمیونسٹ لیگ انقلابی سرگرمی کی ایک لاجواب درسگاہ تھی ، اب کھل کر سامنے آگئی ۔ رائن کے ساحل پر ، جہاں سے «Neue Rheinische Zeitung» اخبار نے شائع ہو کر ایک مضبوط مرکز بنا لیا تھا ، نساؤ میں ، رائن کے گیسن وغیرہ میں ، ہر مقام پر لیگ کے ممبر انتہائی جمہوری تحریک کی رہنمائی سنبھالے ہوئے تھے ۔ ہمبرگ میں بھی یہی حال تھا ۔ جنوبی جرمنی میں پیٹی بورژوا ڈیموکریٹوں کے غلبے نے تحریک کا راستہ روک رکھا تھا ۔ بریسلاؤ میں ولہلم وولف ۱۸۴۸ء کی گرمیوں تک بہت سرگرمی سے معرکے سر کئے جا رہا تھا ۔ سلیشیا کے ووٹوں نے اسے فرینکفرٹ پارلیمنٹ میں بدلی کا ممبر مقرر کرا دیا (۹۹) ۔ آخر یہ کہ کمپوزیٹر اسٹفان بورن نے ، جو بروسلز اور پیرس میں لیگ کا سرگرم ممبر رہ کر کام کر چکا تھا ، برلن میں ’’ مزدور برادری ،، (ورکرز برادرھڈ) قائم کردی ، جو اچھی خاصی پھیل گئی اور ۱۸۵۰ء تک چلتی رہی ۔ بورن بڑی قابلیت کا نوجوان تھا مگر اسے سیاسی شخصیت بن کر ابھرنے کی زرا زیادہ ہی جلدی پڑی تھی ۔ طرح طرح کے اوت‌پٹانگ اور فالتو لوگوں سے اس نے ’’ بھائی چارہ ،، بنایا تاکہ ایک ہجوم اکٹھا کرلے ، لیکن وہ ایسا شخص نہیں تھا جو انمل بےجوڑ طبیعتوں میں ایکے کی روح پھونک سکتا اور افراتفری میں روشنی دکھا سکتا ۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ’’ برادری ،، کی طرف سے جو باقاعدہ تحریریں شائع ہوئیں ، ان میں ’’ کمیونسٹ مینی‌فسٹو ،، والے خیالات کو کاریگروں کی پرانی گلڈ کی یادوں اور اسی کی امنگوں میں الٹا سیدھا گھول کر ، لوئی بلان اور

پرودھوں کے خیالات کے اجزا ، تحفظ‌پسندی (protectionism) وغیرہ ملا کر ایک معجون مرکب پیش کر دی گئی ۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ سبھی کو خوش کرنے کی فکر میں تھے ۔ خصوصیت سے ہڑتالیں ، ٹریڈیونینیں اور مال تیار کرنےوالوں کی کوآپریٹیو سوسائٹیاں سب چلادی گئیں لیکن دماغ سے بالکل نکال دیا کہ سب سے مقدم سوال تو یہ ہے کہ سیاسی معرکے جیتنے کی راہ سے وہ میدان پہلے مار لیا جائے جس میدان میں اس قسم کی چیزوں کو پائدار بنیاد پر عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے ۔ آگے چل کر جب رجعت‌پرستی غلبہ حاصل کرنے لگی اور '' برادری '' کے لیڈروں کی سمجھ میں آ گیا کہ انقلابی جدوجہد میں براہ‌راست اترنا ضروری ہے ، تب قدرتی طور پر الجھے خیالات کے اس ہجوم نے انھیں بےسہارا چھوڑ دیا جسے انھوں نے اپنے ارد گرد اکٹھا کر لیا تھا ۔ بورن مئی ۱۸۴۹ ء میں ڈریسڈن کی بغاوت میں بھی شریک ہوا اور خوش‌قسمتی سے بچ نکلا ۔ لیکن پرولتاریہ کی زبردست سیاسی تحریک سے مقابلہ کیا جائے تو اس کے سامنے یہ '' مزدور برادری '' بالکل ہی علاحدہ لیگ (Sondernbund) ثابت ہوئی جو بڑی حد تک کاغذ پر رہی اور ایسا بےحیثیت، دبا ہوا رول انجام دیتی رہی کہ رجعت‌پرستی نے اسے ۱۸۵۰ ء تک کچلنا کچھ ضروری نہیں سمجھا اور جو شاخیں بچ رہی تھیں ان کی باری تو کئی سال بعد آئی ۔ اسٹفان بورن جس کا اصلی نام بٹرسیلخ تھا ، بڑی سیاسی شخصیت تو نہ بنا ، البتہ معمولی درجے کا سوئس پروفیسر بن گیا ، جس نے کارل مارکس کو گلڈ (کاریگر برادری) کی زبان میں ڈھالنا چھوڑ دیا ہے لیکن بچارے بےزبان رینان کو اپنی میٹھی میٹھی جرمن زبان میں ڈھالتا رہتا ہے ۔

پیرس میں ۱۳ جون ۱۸۴۹ ء کا واقعہ ، جرمنی میں مئی کی بغاوت کا شکست پانا ، روسیوں کے ہاتھوں ہنگری کے انقلاب کا کچلا جانا ، ان ، واقعات کے ساتھ ۱۸۴۸ ء کے انقلاب کا پورا ایک دور تمام ہو گیا ۔ البتہ رجعت‌پرستی نے جو فتح پائی وہ ہرگز مکمل فتح نہیں تھی ۔ ضرورت کا تقاضا تھا کہ بکھری ہوئی انقلابی طاقتوں کو اور اسی غرض سے لیگ کو بھی پھر سے جوڑا جائے ۔ صورت حال ، ۱۸۴۸ ء تک کی طرح ، پھر پرولتاریہ کی کھلی تنظیم کے خلاف جاتی تھی، لہذا اس بار پھر تنظیم کو خفیہ ہونا چاہئے تھا ۔

۱۸۴۹ ء کے موسم خزاں میں پہلے کی مرکزی کمیٹیوں اور کانگرسوں کے اکثر ممبر پھر لندن میں سرجوڑ کر بیٹھے۔ جن لوگوں کی کمی رہ گئی ان میں ایک تو شاپیر تھا جسے ویس‌باڈین میں جیل ہو گئی تھی اور وہاں سے چھوٹتے ہی ۱۸۵۰ ء کے موسم گرما میں لندن آپہنچا؛ دوسرا مول (Moll) تھا کہ جب وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر لگاتار کئی مشن اور ہلچل مچانےوالے سفر پورے کر چکا (آخر میں رائن صوبے میں خاص پروشیائی فوج کے اندر سے پفالٹس توپخانے کے لئے سوار توپچی رسالہ بھرتی کر لیا *) بعد میں بیزانسون کے مزدوروں کی اس کمپنی میں شریک ہوگیا اور ویلیخ کے فوجی کور میں شامل تھا۔ روٹن‌فیلس پل کے سامنے مرگ کے مقام پر ایک جھڑپ میں اس کے سر پر گولی لگی اور وہ مارا گیا۔ اس کے ہٹتے ہی منظر پر ویلیخ نمودار ہوا۔ یہ شخص ان جذباتی کمیونسٹوں میں سے تھا جو ۱۸۴۵ ء کے بعد سے مغربی جرمنی میں عام طور سے ملتے تھے، اور اسی خصوصیت کی بنا پر اپنی طبیعت سے، اندر ہی اندر ہمارے تنقیدی رجحان پر پیچ و تاب کھایا کرتا تھا۔ مزید یہ کہ وہ خود کو پورم پور پیغمبر سمجھتا تھا جس کے شانوں پر غیب سے یہ بار رکھا گیا ہے کہ جرمن پرولتاریہ کے سر کا بوجھ اتار ڈالے اور اس فرض منصبی نے ہی اسے سیاسی اور فوجی ڈکٹیٹری کا دعویدار بنا دیا تھا۔ مطلب یہ کہ بالکل شروع کا وہ مسیحی کمیونزم، جس کی تبلیغ کبھی وائیٹلنگ کیا کرتا تھا، اب اس میں ایک قسم کا کمیونسٹ اسلام بھی جوڑ دیا گیا۔ تاہم اس نئے مذہب کا پروپیگنڈا فی الوقت ویلیخ کے زیرہدایت صرف پناہ گزیں بارکوں تک محدود رہا۔

چنانچہ اب لیگ کی پھر سے تنظیم کی گئی۔ مارچ ۱۸۵۰ ء کا ”پیغام“ ** ایک ضمیمے (جلد ۹، شمارہ ۱) (۱۰۰) کے طور پر شائع ہوا۔ اور ہنریخ باؤیر کو ”پیغام“ پہنچانے کے لئے جرمنی بھیجا گیا۔

---

* یہاں اشارہ ہے انقلابی فوج کے اس توپخانے کی طرف جو مئی جون ۱۸۴۹ ء کی مسلح شورش میں باڈین پفالٹس میں پروشیائی فوج کے مقابلے پر لڑا۔ (ایڈیٹر)

** مارکس، اینگلس ”کمیونسٹ لیگ کے نام مرکزی کمیٹی کا پیغام“، مارچ ۱۸۵۰ ء۔ (ایڈیٹر)

یہ ”پیغام“، جسے مارکس نے اور میں نے مل کر حرف بہ حرف جوڑا تھا، آج بھی دلچسپی کا سامان رکھا ہے، کیوں کہ اب بھی چھوٹی حیثیت کی بورژوا جمہوریت ہی وہ فریق ہے جو یورپ میں اس ہنگامے کے وقت، جس کے دن نزدیک آ رہے ہیں، جرمنی میں طاقت اپنے ہاتھ میں لے گی کمیونسٹ مزدوروں سے سماج کی جان بچانے کے لئے (یورپ میں ۱۸۱۵ء، ۱۸۳۰ء، ۵۲ — ۱۸۴۸ء، ۱۸۷۰ء میں انقلابوں کی لہر آئی، یعنی ہماری صدی میں پندرہ سے اٹھارہ سال تک کے وقفے سے)۔ لہٰذا جو کچھ اس پیغام میں کہا گیا تھا وہ آج بھی چسپاں ہوتا ہے۔ ہنریخ باؤیر کے مشن کو بھرپور کامیابی نصیب ہوئی۔ چھوٹے قد کا یہ جوتے کا کاریگر پیدائشی ڈپلومیٹ تھا۔ لیگ کے جو پہلے والے ممبر تھے، کہ کچھ تو دل چھوڑ چکے تھے، اور کچھ اپنے طور پر کام چلا رہے تھے، انھیں وہ عملی تنظیم میں واپس لایا، خاص طور سے انھیں بھی ساتھ لے لیا جو ”مزدور برادری“ کے ان دنوں لیڈر تھے۔ لیگ نے مزدوروں، کسانوں کی انجمنوں اور کھیل کود کے کلبوں میں اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر اثرونفوذ پیدا کر لیا جتنا ۱۸۴۸ء سے پہلے تھا، یہاں تک کہ جون ۱۸۵۰ء میں حلقوں کے نام جو دوسرا سہ‌ماہی ”پیغام“ نکلا* اس کے ذریعے یہ رپورٹ ملی کہ بون یونیورسٹی کے طالب‌علم شورز (Schurz) کا بیان ہے کہ (بعد میں وہ امریکہ میں وزیر بھی رہا) ”جتنی بھی کام کی طاقتیں ہیں وہ سب لیگ‌والوں کے ہاتھ میں پہنچی ہوئی ملیں“ (دیکھئے ضمیمہ، جلد ۹، شمارہ ۲)۔ یہ نوجوان چھوٹی حیثیت کی بورژوا جمہوریت کے حق میں جرمنی کا دورہ کر رہا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ کمیونسٹ لیگ ہی ایک انقلابی تنظیم تھی جسے جرمنی میں کوئی مقام حاصل تھا۔

مگر خود اس تنظیم سے کیا مقصد حاصل کیا جائے، یہ بات منحصر تھی بنیادی طور سے اس پر کہ آیا انقلاب کے نئے ابال کے لئے حالات و واقعات بھی سازگار ہوں گے یا نہیں۔ ۱۸۵۰ء کے پورے سال میں ایسا ہونا زیادہ سے زیادہ خلاف قیاس بلکہ سچ پوچھئے تو ناممکن نظر

---

* مارکس، اینگلس ”کمیونسٹ لیگ کے نام مرکزی کمیٹی کا پیغام“، جون ۱۸۵۰ء۔ (ایڈیٹر)

آتا تھا - ۱۸۴۷ ء کا صنعتی بحران ، جس نے ۱۸۴۸ ء کے انقلاب کے لئے راہ ہموار کی تھی ، اب قابو میں آچکا تھا - صنعتی ہماہمی کا ایک نیا اور بےمثال دور شروع ہو رہا تھا - جو کوئی آنکھیں کھول کر دیکھتا وہ صاف اسی نتیجے پر پہنچتا کہ ۱۸۴۸ ء کا انقلابی طوفان رفتہ رفتہ اپنا زور کھو رہا ہے -

'' اس عام خوش‌حالی کے ہوتے ، جس میں بورژوا سماج کی پیداواری طاقتیں اتنی ہی مزے میں پھیلتی جا رہی ہیں ، جتنی وہ سرمایہ‌دارانہ رشتوں کی حدود میں پھیل سکتی تھیں ، اصلی انقلاب کی کوئی گنجائش نہیں - اس قسم کا انقلاب صرف انہی دوروں میں ممکن ہے جب یہ دونوں پہلو ، یعنی عہد حاضر کی پیداواری طاقتیں اور سرمایہ‌دارانہ پیداواری صورتیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہوں - براعظم یورپ کی ضابطہ پارٹی کی الگ الگ ٹکڑیوں میں جو آئے دن چپقلش ہوتی رہتی ہے اور پھر سب ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں ، یہ چپقلش نئے انقلابوں کا موقع تو کیا، فراہم کرتی ؛ اس کے برخلاف ہوتی ہی اس وجہ سے ہے کہ سماجی تعلقات کی بنیاد فی‌الحال خوب مضبوط ہے اور خود رجعت‌پرستی کو بھی خبر نہ ہوگی کہ یہ بنیاد کافی سرمایہ‌دارانہ ہے - اس میں کوئی شک نہیں کہ سرمایہ‌دارانہ ترقی کو روکنے کی تمام رجعت‌پرست کوششیں اس بنیاد سے ٹکر کھا کر اتنی ہی ناکام رہیں‌گی جیسے کہ ڈیموکریسی کی تمام اخلاقی بیزاری اور سارے پرجوش اعلان نامے -'' کارل مارکس اور میں نے ''مئی سے اکتوبر ۱۸۵۰ ء کے جائزے'' کے سلسلے میں اخبار ''نوئے رائنشے زائٹونگ ، سیاسی اور معاشی جائزے'' کے شمارہ ۵ و ۶ میں صفحہ ۱۵۳ پر یہ لفظ تحریر کئے تھے جو ہمبرگ سے ۱۸۵۰ ء میں شائع ہوئے -

ٹھنڈے دل سے صورت حال کے اس اندازے کو اکثر لوگوں نے عقیدے سے پھرجانا سمجھا ، ایسے وقت جب لیدرو رولین ، لوئی بلان ، مازینی ، کشوت اور ان سے کم درجے کے جرمن لیڈر روگے ، کینکیل ، گیوگ ، اور باقی لوگ لندن میں اس نیت سے جمع ہوئے کہ آئندہ کے لئے ، صرف اپنے ملکوں کی نہیں بلکہ پورے یورپ کی عارضی حکومتیں مقرر کر دیں - اس وقت صرف اتنی کسر رہ گئی تھی کہ یورپ کے انقلاب کی مدد میں جو رقم درکار ہے، وہ امریکہ سے بطور قرض حاصل

کرلی جائے ، پھر صرف چٹکی بجاتے انقلاب اٹھے گا اور سارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا ، جابجا مختلف رپبلکیں جو اسی کے ساتھ وجود میں آنے والی ھیں ، اپنی جگہ سنبھالتی چلی جائیں گی۔ کیا کچھ تعجب کی بات ھے کہ ویلیخ جیسا آدمی اس چکر میں آگیا ، اور شاپیر اپنی پرانی انقلابی بےتابی کے سارے اس حماقت میں مبتلا ھو گیا ، لندن کے مزدوروں کی اکثریت ، جو بڑی حد تک خود پناہ گزیں تھے ان لوگوں کی تقلید کرتے ھوئے اس کیمپ میں جا پہنچی جو انقلاب کے بورژوا جمہوری کاریگروں کا کیمپ تھا۔ بس اتنا ھی کہنا کافی ھے کہ ھم نے جو محتاط رویہ اختیار کیا وہ ان لوگوں کی سمجھ سے باھر تھا ، وہ تو صرف اسی کے قائل تھے کہ آدمی انقلاب کے مشغلے میں اتر آئے۔ ھم نے دوٹوک انکار کر دیا۔ لیگ میں کھنڈت پڑنی ھی تھی ؛ اس کے متعلق ”کولون میں کمیونسٹوں پر مقدمہ بےنقاب“ میں تفصیل سے مطالعہ کیا جاسکتا ھے۔ اس کے بعد ناتھ جونگ گرفتار ھو گیا اور پھر فوراً ھمبرگ میں ھاؤپٹ کو گرفتار کر لیا گیا۔ ھاؤپٹ نے گرفتاری کے بعد غداری کی اور کولون کی مرکزی کمیٹی والوں کے نام لے دئے ، مقدمے میں اس کو خاص گواہ کرکے پیش کیا جانا تھا۔ لیکن اس کے عزیزوں رشتہداروں کو یہ رسوائی گوارا نہ ھوئی اور انھوں نے ھاؤپٹ کو ریو ڈی جنیرو چلتا کردیا، جہاں وہ بعد میں ایک بزنس‌مین کی حیثیت سے جم گیا اور اس کی خدمات کے صلے میں اول تو پروشیا کا ، اور پھر جرمنی کا قونصل جنرل مقرر کر دیا گیا۔ اب وہ پھر یورپ چلاآیا ھے *۔

اس خیال سے کہ ”بےنقاب“ کے سمجھنے میں آسانی ھو ، میں

---

* شاپیر ۱۸۶۰ء کی دھائی ختم ھوتے ھوتے لندن میں انتقال کر گیا۔ ویلیخ امریکہ میں خانہ‌جنگی کے وقت موجود تھا اور کارھائے نمایاں انجام دئے۔ ٹینےسی کے معرکے میں بریگیڈیر جنرل کی حیثیت سے سینے پر زخم کھایا لیکن علاج ھوتےپر سلامت بچ گیا۔ ابھی دس سال پہلے امریکہ میں اس کا انتقال ھوا ھے۔ مذکورہ حضرات میں ھنریخ باؤیر آسٹریلیا گیا تھا ، پھر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ وائیٹلنگ اور ایوربیک دونوں امریکہ میں دنیا سے سدھارے۔

کولون مقدمے کے ملزموں کی فہرست دے دیتا ہوں: ۱ - پ - گ - روزر — سگار بنانےوالا ؛ ۲ - ہنریخ بیورگرس جو بعد میں لاندتاگ اسمبلی کا پروگریسسٹ ممبر (۱۰۱) ہوا ؛ ۳ - پیٹر ناتھ جونگ ٹیلر تھا ، کچھ سال پہلے بریسلاؤ میں فوٹوگرافری کرتا تھا ، اس کا بھی انتقال ہو گیا ؛ ۴ - و - ج - ریئف ؛ ۵ - ڈاکٹر ہرمن بیکر ، آجکل کولون کا چیف برگوماسٹر اور ایوان بالا کا ممبر ہے ؛ ۶ - ڈاکٹر رولینڈ دانیالس ڈاکٹری پیشے کا آدمی تھا ، جیل میں تپ دق کا مرض لگ گیا اور مقدمے کے چند سال بعد اسی بیماری میں انتقال کیا ؛ ۷ - کارل اوٹو ، کیمسٹ تھا ؛ ۸ - ڈاکٹر ابراھام یاکوبی ، آجکل نیویارک میں ڈاکٹری کرتا ہے ؛ ۹ - ڈاکٹر یوگان کلیئن فی‌الحال ڈاکٹری بھی کرتا ہے اور کولون میں میونسپل کونسل کا ممبر بھی ہے ؛ ۱۰ - فرڈیننڈ فریلی گراتھ ، جو ان دنوں لندن میں بھی رہتا تھا ؛ ۱۱ - ائی - ل - ایرھارڈ ، یہ کلرک تھا ؛ ۱۲ - فریڈرک لیسنر ٹیلر تھا ، اب لندن میں ہے - ان لوگوں پر جیوری کی موجودگی میں کھلا مقدمہ ۴ اکتوبر سے ۱۲ نومبر ۱۸۵۲ ء تک چلا - بغاوت پھیلانے کی تیاری کے جرم میں جن کو سزائیں ہوئیں ، وہ یہ تھے : روزر ، بیورگرس اور ناتھجونگ کو چھ چھ سال کی ، ریئف ، اوٹو اور بیکر کو پانچ پانچ سال کی ، لیسنر کو تین سال کے لئے قلعے میں نظربندی - دانیالس ، کلیئن ، یاکوبی اور ایرھارڈ کو بری کر دیا گیا -

کولون کے مقدمے کے ساتھ ہی جرمن مزدوروں کی کمیونسٹ تحریک کا پہلا دور تمام ہو گیا - ادھر مقدمہ ختم ہوا ادھر ہم نے اپنی لیگ توڑ دی ؛ کچھ مہینے بعد ویلیخ اور شاپیر کی علاحدہ لیگ (۱۰۲) بھی دفنا دی گئی -

* * *

تب اور اب کے درمیان پوری ایک نسل کا فاصلہ ہے - تب جرمنی دستکاری کا ملک تھا ، جہاں ہاتھ کے کام کی گھریلو صنعت پھیلی ہوئی تھی ؛ اور اب وہ ایک بڑا صنعتی ملک ہے جو لگاتار صنعتی کایا کلپ سے

گزر رہا ہے ۔ تب ایک ایک کرکے ایسے مزدور چھاننے پڑتے تھے جنھیں مزدور کی اپنی حیثیت کا علم ہو اور سرمایہ کے مقابل اپنے تاریخی معاشی ٹکراؤ کی سوجھ بوجھ ہو ، کیوں کہ تب تک اس ٹکراؤ نے سر اٹھانا شروع ہی کیا تھا ۔ اب پورے جرمن پرولتاریہ پر ہنگامی قانون (دیکھئے نوٹ نمبر ۶۶) عائد کئے جاتے ہیں صرف اس غرض سے کہ ایک دبے ہوئے طبقے کی حیثیت میں انہیں اپنی پوزیشن کا پورا شعور حاصل ہونے کی رفتار میں کچھ نہ کچھ روک لگتی رہے ۔ تب کچھ ہی لوگ ایسے تھے جن کے ذہن پرولتاریہ کے تاریخی فریضے کی گہرائی تک جا پہنچے اور وہ چھپتے چھپاتے آپس میں ملتے ، نقلی ناموں سے تین سے لے کر بیس آدمیوں تک کے چھوٹے چھوٹے حلقوں میں اکٹھے ہوا کرتے تھے ۔ آج جرمن پرولتاریہ کو کسی کھلی ہوئی یا خفیہ ، کسی بھی رسمی جماعت کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے * ۔ طبقے کے ہم‌خیال ساتھیوں کا کھلم کھلا ، سادہ‌سا باہمی ربط ہی اس کام کے لئے کافی ہے کہ کسی قواعد ضوابط کے ، بورڈوں ، تجویزوں اور دوسری کارآمد شکلوں کے اختیار کئے بغیر ہی پوری جرمن سلطنت کو جڑ بنیاد سے ہلا ڈالے ۔ بسمارک آج جرمن سرحدوں کے پار ، یورپ بھر کے جھگڑوں میں پنچ بنا پھرتا ہے ، لیکن خود جرمن سرحدوں کے اندر روز بروز جرمن پرولتاریہ کا وہ سانچے میں ڈھلا ہوا بدن خم‌ٹھونک کر سامنے آتا جا رہا ہے جس کی پیش‌بینی مارکس نے ۱۸۴۴ء میں ہی کر لی تھی ۔ یہ وہ دیوپیکر ہے کہ جو ملادلا شاہی جامہ کم نظروں (philistines) کے جسم پر سجتا ، وہ ابھی سے اس کے بدن پر پھنستا ہے ؛ اس (پرولتاریہ) کا ڈیل ڈول برابر بڑھتا جارہا ہے ، شانے چوڑے ہوتے جا رہے ہیں ، یہاں تک کہ وہ وقت آیا چاہتا ہے جب اس کے اپنی نشست سے اٹھنے کی دیر ہوگی اور شہنشاہی آئین کا پورا ڈھانچہ پرزے پرزے ہو کر رہ جائے گا ۔ اس سے بھی بڑھ کر ، ایک اور بات ، یورپ اور امریکہ کے پرولتاریوں کی بین‌اقوامی

---

* اینگلس نے یہ الفاظ طنزاً استعمال کئے ہیں بسمارک کی اس پالیسی کے جواب میں کہ پرولتاری پارٹی خلاف قانون قرار دی جائے اور مزدوروں کی تحریک کا گلا گھونٹ دیا جائے ۔ (ایڈیٹر)

تحریک آج اتنی جاندار ہوچکی ہے کہ اس کی وہ پہلی تنگ‌دامن شکل یعنی خفیہ لیگ ہی نہیں ، بلکہ دوسری شکل بھی ، جو پہلی سے کہیں زیادہ کشادہ تھی ، یعنی کھلی ہوئی انٹرنیشنل ورکنگ‌مینز ایسوسی‌ایشن — وہ بھی اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے ۔ صرف باہمی یگانگی کا احساس ، جس کی بنیاد میں محنت‌کش طبقے کی پوزیشن کے ایک جیسے ہونے کی سوجھ بوجھ موجود ہو ، اس مطلب کے لئے بہت کافی ہے کہ تمام ملکوں اور تمام زبانوں کے مزدوروں میں سے پرولتاریوں کی وہی ایک اور زبردست پارٹی بنائی جا سکے اور اسے مضبوطی سے تھاما جا سکے ۔ کمیونسٹ لیگ جس نظریے کی ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۲ء تک نمائندگی کرتی رہی ، اور جسے کسی زمانے میں بڑے ہوشمند کم نظریوں نے منہ چڑھا کر دیکھا کرتے تھے گویا یہ بھی کچھ دیوانے لوگوں کا خبط ہے ، کچھ ادھر ادھر بکھرے ہوئے تنگ‌نگاہ لوگوں کا خفیہ عقیدہ ہے ، آج اسی نظریے کے بےشمار ماننےوالے دنیا کے تمام متمدن ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں ، وہ ان میں بھی پائے جاتے ہیں جو سائبیریا کی کانیں کھودنے کی سزا کاٹ رہے ہیں اور ان میں بھی موجود ہیں جو کیلی‌فورنیا میں سونے کی کانیں کھود رہے ہیں ۔ اس نظریے کا بانی مبانی کارل مارکس ، جسے جیتے جی نفرتوں اور تہمتوں کا سب سے زیادہ نشانہ بننا پڑا تھا ، آخری عمر میں ایسا نکلا کہ پرانی اور نئی دونوں دنیاؤں کے پرولتاریوں کو ہمیشہ اس کی ضرورت رہی اور وہ ہمیشہ مشورے اور ہدایت دینے کے لئے آمادہ رہا ۔

لندن ، ۸ اکتوبر ۱۸۸۵ء

فریڈرک اینگلس

ذیل کی کتاب میں چھپا :
«Enthüllungen über den Kommunisten-Prozeß zu Köln». Hottingen-Zürich, 1885 اور اخبار «Der Sozialdemokrat» کے شمارے ۴۸ — ۴۶ میں ۱۲ ، ۱۹ اور ۲۶ نومبر ۱۸۸۵ء کو شائع ہوا ۔

اصل کے مطابق ترجمہ ۔

فریڈرک اینگلس

خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز

۱۸۸۴ء کے پہلے ایڈیشن کا دیباچہ

مندرجہ ذیل ابواب میں (۱۰۳) ایک اعتبار سے، ایک وصیت کو پورا کیا گیا ہے۔ خود کارل مارکس کا خیال تھا کہ مارگن کی تحقیقات کے نتیجوں کو ان نتیجوں کے ساتھ ملا کر پیش کرے، جن پر وہ (کسی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ ہم دونوں) تاریخ کا مادی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد پہونچے تھے اور اس طرح ان کی پوری اہمیت کو صاف کرے۔ کیونکہ مارگن نے اپنے ڈھنگ سے امریکہ میں تاریخ کے مادی تصور کو نئے سرے سے دریافت کیا تھا جس کا مارکس چالیس برس پہلے پتہ لگا چکا تھا اور عہد بربریت اور عہد تہذیب کا مقابلہ کرکے اس تصور کی مدد سے اہم سوالوں پر وہ بھی انہیں نتیجوں پر پہونچا جن پر مارکس پہونچ چکا تھا۔ اور جس طرح جرمنی کے سرکاری ماہرین اقتصادیات برسوں تک ''سرمایہ،، سے نہایت سرگرمی سے سرقہ بھی کرتے تھے اور برابر اسے چپ‌چاپ دبا دینے کی کوشش بھی کرتے تھے، اسی طرح کا سلوک انگلستان کے علم ''ماقبل تاریخ،، کے نمائندوں نے مارگن کی کتاب ''قدیم سماج،، * کے ساتھ کیا۔ میرے مرحوم دوست کو جو کام پورا کرنے

---

*«Ancient Society, or Researches in the Lines of Human Progress from Savagery through Barbarism to Civilization». By Lewis H. Morgan. London,

کا موقع نہ نصیب ہوسکا اسی سلسلے کی ایک حقیر کوشش میری یہ کتاب ہے ۔ لیکن مارگن سے اس نے جو طویل اقتباسات * لئے ان پر اس کے اپنے تنقیدی حاشئے بھی ہیں جن کو میں نے یہاں کہیں ممکن ہوا، نقل کر دیا ہے ۔

مادی تصور کے مطابق تاریخ میں فیصلہ کن چیز ، آخر میں فوری زندگی کی پیداوار اور پیداواردار پیداوار لیکن خود اس کے دو پہلو ہیں ۔ ایک طرف ذرائع زندگی یعنی غذا ، کپڑے، رہنے کےلئے گھر وغیرہ اور ان چیزوں کےلئے ضروری اوزاروں کی تیاری ہے ۔ اور دوسری طرف خود انسانوں کی پیدائش یعنی انسانی نسل کو بڑھانے کا کام ہے ** ۔ کسی خاص تاریخی عہد یا کسی خاص ملک کے لوگ جن سماجی اداروں کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں ان کو بنانے میں دونوں قسم کی پیدائش کا ہاتھ ہوتا ہے : ایک طرف وہ محنت کے ارتقا کی حالت سے اور دوسری طرف خاندان کے ارتقا کی حالت سے متعین ہوتے

MacMillan and Co., 1877. (''قدیم سماج یا عہد وحشت سے لے کر اور عہد بربریت سے ہوتے ہوئے عہد تہذیب تک انسانی ارتقا کے راستوں کی تحقیقات،، ۔) یہ کتاب امریکہ میں چھپی اور لندن میں مشکل سے ملتی ہے ۔ مصنف کا چند برس ہوئے انتقال ہوگیا ۔ (نوٹ از اینگلس ۔)

* اینگلس یہاں کارل مارکس کے مارگن کے ''قدیم سماج،، کے خلاصے کا ذکر کر رہے ہیں (دیکھئے ''مارکس اور اینگلس کی دستاویزات،، جلد ۹) ۔ (ایڈیٹر)

** یہاں اینگلس نے ذرائع زندگی کی پیدائش کے ساتھ انسانی نسل کو بڑھانے کے کام کو بھی سماج اور سماجی اداروں کی ترقی کو متعین کرنے والا سبب بتا کر غلطی کی ہے ۔ ''خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز،، کے اصل متن میں اینگلس نے خود ٹھوس مواد کا تجزیہ کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سماج اور سماجی اداروں کی ترقی سب سے زیادہ جس چیز پر منحصر ہے وہ مادی پیداوار کا طریقہ ہے ۔ (ایڈیٹر)

ہیں ۔ محنت کا ارتقا جتنا کم ہو اور اس لئے پیداوار کا حجم اور سماج کی دولت جتنی کم ہو، اتنی ہی سماجی نظام میں جنسی تعلقات کی اہمیت زیادہ معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن اس سماجی نظام کے اندر، جو جنسی تعلقات پر مبنی ہے، محنت کی پیداوار قوت برابر بڑھتی جاتی ہے ۔ اس کے ساتھ ذاتی ملکیت اور تبادلے میں اضافہ ہوتا ہے، دولت کا فرق بڑھتا ہے، دوسروں کی محنت کی طاقت کو استعمال کرنے کا امکان بڑھتا ہے اور اس طرح طبقاتی تضاد کی بنیاد تیار ہوتی ہے : نئے سماجی عناصر بڑھتے ہیں جو کئی پشت کی مدت میں سماج کے پرانے ڈھانچے کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ آخر میں دونوں کے بےمیل ہونے کی وجہ سے پورا انقلاب ہو جاتا ہے ۔ پرانا سماج جس کی بنیاد جنسی گروہوں پر تھی، نئے ابھرنےوالے سماجی طبقوں کی ٹکروں سے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے، اس کی جگہ ایک نیا سماج جنم لیتا ہے جو اپنے کو ریاست کی شکل میں منظم کرتا ہے، جس کی نیچے کی اکائیاں جنسی تعلقات کی بنیاد پر بننےوالے گروہ نہیں بلکہ علاقائی گروہ ہوتے ہیں ۔ اس سماج میں خاندانی نظام پوری طرح ملکیت کے نظام کے ماتحت ہوتا ہے اور اس میں وہ طبقاتی تضاد اور طبقاتی جدوجہد خوب کھل کر بڑھتی ہے، جو ابھی تک کی ساری لکھی ہوئی تاریخ کی اصلیت ہے ۔

مارگن کی عظمت یہ ہے کہ اس نے ہماری لکھی ہوئی تاریخ کی اس ماقبل تاریخی بنیاد اور اس کی نمایاں خصوصیتوں کا پتہ لگایا اور اس کو نئے سرے سے مرتب کیا ۔ اس کی عظمت اس بات میں بھی ہے کہ اس نے شمالی امریکہ کے انڈینوں کے ان گروہوں میں جو جنسی تعلقات پر مبنی تھے، قدیم ترین یونانی، رومی اور جرمن تاریخ کی سب سے اہم پہیلیوں کو، جن کو ابھی تک حل نہیں کیا جا سکا تھا، سلجھانے کی کنجی کھوج نکالی ۔ لیکن اس کی کتاب کوئی ایک دن کا کام نہیں تھی ۔ تقریباً چالیس برس تک جب تک کہ وہ اپنے مواد کو پوری طرح سمجھ لینے میں کامیاب نہیں ہو گیا، وہ اس کے ساتھ الجھا رہا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کتاب ہمارے زمانے کی گنتی کی چند عہدآفریں کتابوں میں سے ایک ہے ۔

آئندہ صفحات میں پڑھنےوالا عام طور پر آسانی سے پہچان لےگا کہ کون سی باتیں مارگن کی کتاب سے لی گئی ہیں اور کون سی میں نے بڑھائی ہیں ۔ ان تاریخی حصوں میں جہاں یونان‌وروم سے بحث کی گئی ہے، میں نے اپنے آپ کو مارگن کے فراہم کئے ہوئے مواد تک محدود نہیں رکھا بلکہ میرے پاس جو کچھ مسالہ موجود تھا، اس کو بھی استعمال کیا ۔ کیلٹ اور جرمن لوگوں سے جن حصوں میں بحث کی گئی ہے وہ زیادہ‌تر میرے اپنے ہیں ۔ اس موضوع پر مارگن کے پاس صرف پرانی اور پہلے کی استعمال کی ہوئی چیزیں تھیں اور جہاں تک جرمنی کے حالات کا تعلق ہے، بس ایک تاسیت کو چھوڑ کر اس کے پاس صرف سسٹر فری‌من کی مہمل ، لبرل خیالات کی غلط بیانیاں تھیں ۔ مارگن کی اقتصادی دلیلیں اس کے اپنے مقصد کےلئے بھلے ہی کافی رہی ہوں، لیکن میرے لئے وہ بالکل نا کافی تھیں ۔ انہیں میں نے نئے سرے سے مرتب کیا ہے ۔ اور آخری بات یہ کہ جہاں کہیں مارگن کا قول صاف صاف نقل نہیں کیا گیا، وہاں سبھی نتیجوں کی ذمہ‌داری مجھ پر ہے ۔

۲۶ مئی ۱۸۸۴ء کے قریب لکھا گیا ۔
اور مندرجہ‌ذیل کتاب میں شائع ہوا :
F. Engels. «Der Ursprung der Familie, des Privateigenthums und des Staats». Hottingen-Zürich, 1884.

چوتھے جرمن
ایڈیشن کے مطابق ۔

۱۸۹۱ء کے چوتھے ایڈیشن کا دیباچہ

اس کتاب کے پچھلے بڑے ایڈیشن تقریباً چھ مہینے سے نایاب ہیں اور ناشر * کا کچھ دنوں سے یہ تقاضہ رہا ہے کہ میں اس کا ایک نیا ایڈیشن تیار کر دوں۔ کچھ زیادہ ضروری کاموں میں مصروف رہنے کی وجہ سے ابھی تک میں اس کام کو پورا نہیں کرسکا۔ پہلے ایڈیشن کو شائع ہوئے سات برس کا عرصہ گزرگیا اور اس مدت میں خاندان کی ابتدائی شکلوں کے بارے میں ہماری معلومات میں اہم اضافہ ہوا ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اضافہ اور اصلاح و ترمیم کے کام کو محنت کے ساتھ کیا جائے۔ خاص کر اس لئے کہ اس نئے ایڈیشن کے لئے چھپائی کی مستقل پلیٹیں تیار کرنے کا ارادہ ہے جس کی وجہ سے آئندہ کچھ عرصے کے لئے کتاب میں کوئی تبدیلی کرنا میرے لئے ناممکن ہوجائے گا۔

لہذا میں نے پوری کتاب پر احتیاط کے ساتھ نظرثانی کی ہے اور کئی جگہ نئی باتوں کا اضافہ کیا ہے، جن میں میرا خیال ہے سائنس کی موجودہ حالت کا پورا دھیان رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس دیباچے میں میں باخوفن سے مارگن تک خاندان کی تاریخ کے بارے میں خیالات کے ارتقا کا مختصر حال بیان کردینا چاہتا ہوں۔ یہ خاص کر اس لئے

---

* ناشر کا نام دیتس تھا۔ (ایڈیٹر)

بھی ضروری ہے کہ ماقبل تاریخی عہد کے انگریز مورخ جن میں جارحانہ وطن پرستی موجود ہے، آج بھی انتہائی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ قدیم سماج کی تاریخ کے بارے میں ہمارے تصورات میں مارگن کی دریافتوں نے جو انقلاب پیدا کردیا ہے، اس کو اپنی خاموشی کے حربے سے دبا دیں حالانکہ مارگن کی تحقیقات کے نتیجوں کو اپنا بنالینے میں انہیں ذرا تامل نہیں ہوتا۔ دوسرے ملکوں میں بھی انگریزوں کی اس مثال پر اکثر عمل کیا جاتا ہے۔

میری کتاب کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوچکا ہے۔ سب سے پہلا ترجمہ اطالوی میں ہوا: «L'origine della famiglia, della proprietà privata e dello stato, versione riveduta dall' autore, di Pasquale Martignetti», Benevento, 1885. اس کے بعد رومانیہ کی زبان میں ایک ترجمہ ہوا: «Originăfamiliei, proprietătei private şi a statului, traducere de Joan. Nădejde». «Contemporanul» کے نام سے (۱۰۳) یاسی سے شائع ہونےوالے رسالے میں ستمبر ۱۸۸۵ء سے مئی ۱۸۸۶ء تک نکلا۔ اس کے بعد ڈنمارکی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا: «Familjens, Privatejendommens og Statens Oprindelse, Dansk, af Forfatteren gennemgaaet Udgave, besorget af Gerson Trier», Köbenhavn. 1888. آنری راوے کا کیا ہوا فرانسیسی ترجمہ جو موجودہ جرمن ایڈیشن پر مبنی ہے، ابھی پریس میں ہے۔

* * *

اس صدی کی ساتویں دھائی کے شروع تک خاندان کی تاریخ جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس شعبے میں علم تاریخ پر اس وقت تک مسی کی توریت کا اثر حاوی تھا۔ خاندان کی پدری شکل کو توریت میں جتنی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اتنی تفصیل سے اس کا بیان اور کہیں نہیں ملتا۔ چنانچہ اس کو نہ صرف خاندان کی سب سے قدیم شکل مان لیا گیا تھا بلکہ — کثرت زوجگی کے نظام کو الگ کرکے — اس کو اور موجودہ زمانے کے بورژوا خاندان کو ایک ہی چیز سمجھ لیا گیا تھا، گویا خاندان اصل میں کسی تاریخی ارتقا سے گذرا ہی نہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ بس اتنا مانا جاتا تھا کہ ممکن ہے قدیم زمانے میں

آزاد جنسی تعلقات کا کوئی دور رہا ہو ۔ اس میں شک نہیں کہ یک‌زوجگی کے علاوہ مشرق کی کثرت زوجگی اور ہندستان اور تبت میں کثرت شوہری کا حال بھی لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا ۔ لیکن یہ تینوں شکلیں اس وقت تک کسی تاریخی سلسلے کی کڑیاں نہیں بنی تھیں اور آپس میں بلا کسی تعلق کے ایک دوسرے کے متوازی دکھائی دیتی تھیں ۔ یہ امر کہ قدیم زمانے کے کچھ لوگوں میں اور آج‌کل کے کچھ وحشیوں میں بھی نسل باپ سے نہیں بلکہ ماں سے چلتی ہے اور اس‌لئے ان میں صرف عورت کے سلسلۂ نسب کو ہی صحیح سمجھا جاتا ہے، اور یہ کہ موجودہ زمانے کے بہت سے لوگوں میں چند مخصوص گروہوں کے اندر — جن کے بارے میں اس وقت تک زیادہ قریب سے چھان‌بین نہیں کی گئی تھی — شادی کرنے کی ممانعت ہے، اور یہ کہ یہ رواج دنیا کے سبھی حصوں میں پایا جاتا ہے — یہ باتیں لوگوں کو معلوم تھیں اور نئی مثالیں برابر سامنے آرہی تھیں ۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان سے کیا نتیجہ نکالا جائے ۔ یہاں تک کہ ای ۔ ب ۔ ٹیلر کی کتاب ''بنی‌نوع انسان کی ابتدائی تاریخ اور تہذیب کے ارتقا کی تحقیقات،، (۱۸۶۵ء) * میں ان باتوں کو اسی‌طرح کی ''عجیب و غریب رسموں،، کے زمرے میں ڈال دیا گیا ہے جیسے بعض وحشیوں میں جلتی لکڑی کو لوہے کے اوزاروں سے نہ چھونے کا رواج، اور اسی طرح کی دوسری مہمل اور بےمعنی مذہبی باتیں ۔

خاندان کی تاریخ کا مطالعہ ۱۸۶۱ء سے شروع ہوا جب باخوفن کی کتاب ''مادری حق،، شائع ہوئی ۔ اس کتاب میں مصنف نے مندرجہ ذیل خیالات پیش کئے ہیں : (۱) انسانوں میں شروع میں آزاد جنسی تعلقات کا رواج تھا ۔ مصنف نے اسے hetaerism (کئی عورتیں رکھنے کا رواج) کے غیرموزوں نام سے پکارا ہے ۔ (۲) اس آزاد جنسی تعلق کی وجہ سے کسی کے بارے میں‌بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا باپ کون ہے ۔ اس‌لئے نسب کا سلسلہ صرف ماں سے — مادری حق

---

* Tylor E.B., «Researches into the Early History of Mankind and the Development of Civilization», London, 1865. (ایڈیٹر)

کے مطابق ھی — چل سکتا تھا اور ابتدا میں قدیم زمانے کی سبھی قوموں میں یہ بات پائی جاتی تھی۔ (۳) چونکہ والدین میں صرف ماں کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا، اس لئے عورتوں کی بڑی قدر و منزلت ھونے لگی اور باخوفن کی رائے میں یہ اتنی بڑھ گئی کہ پوری طرح عورت کا راج (gynaecocracy) ھو گیا۔ (۴) یک‌زوجگی کا نظام جس میں عورت پر صرف ایک مرد کا حق مانا جاتا ھے، اس کے قائم ھونے کا مطلب ایک قدیم مذھبی اصول کی خلاف ورزی (یعنی اصل میں اس عورت پر دوسرے مردوں کے قدیم روائتی حق کی خلاف‌ورزی) تھی۔ اور اس لئے اس کی تلافی کرنے یا اس کا ھرجانہ ادا کرنے کے لئے عورت کو ایک خاص مدت کے لئے غیر مردوں کے حوالے کرنا پڑتا تھا۔

باخوفن کو قدیم کلاسیکی ادب کے بےشمار ٹکڑوں میں ان بیانات کے ثبوت ملے جنھیں اس نے بڑی محنت سے یکجا کیا۔ اس کی رائے میں ''کئی عورتیں رکھنے کے رواج،، سے یک‌زوجگی تک اور مادری حق سے پدری حق تک جو ارتقا ھوا، وہ — خاص کر یونانیوں میں — مذھبی خیالات کے ارتقا کی بدولت، پرانی روائتی دیوسالا میں جو پرانے روائتی خیالات کی حامل تھی، نئے خیالات کے نمائندے، نئے دیوتاؤں کے درآنے کی بدولت ھوا جنھوں نے پرانے دیوتاؤں کو دھکیل کر بہت پیچھے کر دیا۔ چنانچہ باخوفن کی رائے میں مرد اور عورت کے باھمی تعلقات اور سماجی حیثیت میں جو تاریخی تبدیلیاں ھوئی ھیں، ان کی وجہ ان خارجی حالات کی ترقی نہیں جن میں انسان زندگی بسر کرتے ھیں بلکہ انسانوں کے ذھن میں زندگی کے ان حالات کا مذھبی عکس ھے۔ چنانچہ باخوفن کا کہنا ھے کہ ایسکیلس کا ''آرسطیا،، اس کشمکش کی ڈرامائی تصویر پیش کرتا ھے جو زوال‌پذیر مادری حق اور ابھرتے ھوئے فتح‌مند پدری نظام کے حق میں سورمائی عہد میں چھڑی تھی۔ کلیتم‌نسترا نے اپنے عاشق اگیس‌تھس کی خاطر اپنے شوھر آگاممنون کو قتل کر دیا جو ٹروئے کی جنگ سے لوٹا ھی تھا۔ لیکن اس کا بیٹا آرسطس جو آگاممنان سے پیدا ھوا تھا، باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے اپنی ماں کو مار ڈالتا ھے۔ اس پر مادری حق کی عفریتی محافظ ایرینیئس آرسطس کا پیچھا کرتی ھیں کیونکہ مادری حق کے مطابق

ماں کا قتل سب سے سنگین جرم ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اپولو، جس نے اپنے ہاتف غیبی کے ذریعہ آرسطس کو اس جرم کی ترغیب دلوائی تھی اور ایتھنہ جسے ثالث بنایا جاتا ہے، آرسطس کو بچاتے ہیں۔ یہ دونوں دیوی دیوتا نئے نظام کے نمائندے ہیں جس کی بنیاد پدری حق پر ہے۔ ایتھنہ دونوں فریقوں کی بات سنتی ہے۔ آرسطس اور ایرینیئوں میں جو بحث ہوتی ہے اس میں پورے اختلاف کا خلاصہ سامنے آ جاتا ہے۔ آرسطس کہتا ہے کہ کلیتم‌نسترا نے دوہرا جرم کیا ہے۔ اپنے شوہر کو قتل کرکے اس نے میرے باپ کو بھی مار ڈالا ہے۔ اس لئے ارینیئں میرے پیچھے کیوں پڑی ہیں؟ کلیتم‌نسترا کو، جس کا جرم کہیں زیادہ بڑا ہے، انہوں نے کیوں سزا نہیں دی؟ جواب قابل غور ہے:

''اس نے جس مرد کو قتل کیا، اس سے اس کا خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔''*

جس مرد سے خون کا کوئی رشتہ نہ ہو، چاہے وہ قاتلہ کا شوہر ہی کیوں نہ ہو، اس کے خون کی تلافی ہو سکتی ہے اور ایرینیوں کو اس کی کوئی فکر نہیں۔ ان کا کام خون کے رشتہ‌داروں کے قتل کا انتقام لینا ہے، اور ان میں بھی سب سے زیادہ نفرت‌انگیز قتل، مادری‌حق کے مطابق، ماں کا قتل ہے۔ اب آرسطس کی طرف سے اپولو بحث میں شریک ہوتا ہے۔ ایتھنہ، ایریوپیگائیز سے — یعنی ایتھنز کے جیوریوں سے — اس مسئلے پر اپنی رائے دینے کو کہتی ہے۔ ملزم کو بری کر دینے اور سزا دینے، دونوں کے حق میں برابر برابر ووٹ پڑتے ہیں۔ تب عدالت کی صدر کی حیثیت سے ایتھنہ اپنا ووٹ آرسطس کے حق میں دیتی ہے اور اسے بری کر دیتی ہے۔ مادری حق کے مقابلے میں پدری حق کی جیت ہوتی ہے۔ خود ایرینیوں کے الفاظ میں ''چھوٹے سلسلۂ نسب کے دیوتا،، ایرینیوں پر فتح حاصل کرتے ہیں اور ایرینیئں آخر میں نیا عہدہ قبول کرکے نئے نظام کی خدمت

* ایسکیلس ''آرسطیا۔ ایومینید،،۔ (ایڈیٹر)

کرنے پر آمادہ ہوجاتی ہیں۔

''آرسطیا،، کی یہ نئی لیکن بالکل صحیح توجیہ جس حصے میں دی گئی ہے وہ پوری کتاب کے سب سے اچھے اور خوبصورت ٹکڑوں میں ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ خود باخوفن کو بھی ایرینیوں، اپولو اور ایتھنہ میں کم سے کم اتنا ہی عقیدہ ہے جتنا ایسکیلس کو اپنے زمانے میں تھا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باخوفن کو واقعی یقین ہے کہ یونان کے سورمائی عہد میں مادری حق کو ہٹانا اور اس کی جگہ پدری حق قائم کرنا انہیں دیوی دیوتاؤں کا معجزہ اور کارنامہ تھا۔ ظاہر ہے کہ مذہب کو دنیا کی تاریخ کا روح رواں بتلانےوالا نظریہ آخر میں محض مخفی قوتوں کی بھول‌بھلیوں میں پہونچ کر ہی دم لےگا۔ اس لئے باخوفن کی ضخیم کتاب کو پڑھنا کافی مشکل کام ہے اور بہت زیادہ سودمند بھی نہیں۔ لیکن ان سب باتوں سے باخوفن کی عظمت میں کوئی کمی نہیں آتی کیونکہ وہ اس راہ کا خضر تھا۔ وہ پہلا آدمی تھا جس نے قدیم زمانے کی اس حالت کے بارے میں، جس میں آزاد جنسی تعلقات کا رواج تھا، محض لفاظی سے کام نہیں لیا بلکہ اس کے بجائے یہ ثابت کر دکھایا کہ قدیم کلاسیکی ادب میں اس حالت کے بہت سے آثار بکھرے پڑے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یونانی اور ایشیائی لوگوں میں یک‌زوجگی کا رواج ہونے سے پہلے وہ حالت پائی جاتی تھی جس میں نہ صرف مردوں کا ایک سے زیادہ عورتوں سے جنسی تعلق ہوتا تھا بلکہ عورتوں کا بھی ایک سے زیادہ مردوں سے جنسی تعلق ہوتا تھا اور اس سے کسی مروجہ اصول کی خلاف ورزی نہیں ہوتی تھی۔ اس نے ثابت کیا کہ یہ رواج تو اب نہیں رہا لیکن اس کا اثر باقی ہے۔ صرف ایک مرد سے شادی کا حق خریدنے کےلئے عورتوں کو مجبور ہونا پڑتا تھا کہ ایک محدود دائرے کے اندر اپنے آپ کو غیر مردوں کے حوالے کریں۔ اور ان وجہوں سے شروع میں خاندان عورتوں سے، ایک ماں کے بعد دوسری ماں سے چلا کرتا تھا۔ یک‌زوجگی کا رواج ہونے کے بعد بھی بہت دنوں تک عورتوں سے نسل چلنے کا رواج قائم رہا حالانکہ اس وقت یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی تھی

یا کم‌ازکم مان لی‌جاتی تھی کہ بچے کا باپ کون ہے۔ اور شروع میں چونکہ بچے کی صرف ماں کے‌بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا اس لئے ماں کا اور عام طور پر عورتوں کا درجہ سماج میں بہت اونچا تھا۔ بعد میں انہیں کبھی یہ درجہ نہیں ملا۔ باخوفن نے یہ تمام باتیں اتنی صفائی سے نہیں کہیں۔ اس کے مذہبی صوفیانہ نظریہ نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا۔ لیکن اس نے ثابت کردیا کہ یہ تمام باتیں صحیح ہیں۔ اور ۱۸۶۱ء میں یہ ایک پورا انقلاب تھا۔

باخوفن کی ضخیم کتاب جرمن میں لکھی گئی تھی — یعنی اس قوم کی زبان میں جس کو اس زمانے میں موجودہ خاندان کی ماقبل تاریخی حالت میں سب سے کم دلچسپی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب کو کسی نے نہیں جانا۔ اس شعبے میں اس کا جو جانشین ہوا، وہ ۱۸۶۵ء میں سامنے آیا مگر اس نے باخوفن کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

یہ جانشین ج۔ ف۔ میکلینن تھا۔ وہ اپنے پیشرو کا بالکل الٹ تھا۔ ایک اگر صوفی اور صاحب کمال تھا تو دوسرا بےرس اور خشک وکیل۔ ایک میں اگر رنگینی اور شاعرانہ خیال‌آرائی تھی، تو دوسرا عدالت میں بحث کرنےوالے وکیل کی طرح سبھی ممکن دلیلوں کا طومار کھڑا کر دیتا تھا۔ میکلینن نے قدیم اور موجودہ زمانے کی بہت سی وحشی، بربری اور مہذب قوموں میں بھی شادی کی ایک ایسی شکل کا پتہ لگایا جس میں دولھا کو، اکیلے یا اپنے دوستوں کے ساتھ، دلہن کو اس کے رشتہ‌داروں کے یہاں سے زبردستی بھگا لے جانے کا سوانگ رچنا پڑتا تھا۔ شائد یہ رواج کسی پرانے رواج کی بچی ہوئی نشانی ہے جس میں ایک قبیلے کے مرد قبیلے کے باہر کی، دوسرے قبیلوں کی لڑکیوں کو سچ مچ زبردستی اغوا کر لے جاتے تھے اور اس طرح بیویاں لاتے تھے۔ مگر اس ''اغوائی شادی،، کی ابتدا کیسے ہوئی ہوگی؟ جب تک مردوں کو اپنے ہی قبیلے کے اندر کافی عورتیں مل سکتی تھیں، تب تک اس طریقے کو اختیار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اسی طرح سے اکثر یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ غیرترقی‌یافتہ لوگوں میں کچھ ایسے گروہ ہوتے ہیں (۱۸۶۵ء کے لگ بھگ ان گروہوں کو اور قبیلوں کو ایک ہی چیز سمجھا جاتا

تھا) جن کے اندر شادی کرنے کی ممانعت ہے جس کی وجہ سے مردوں کو اپنے لئے بیویاں، اور عورتوں کو اپنے لئے شوہر ان گروہوں کے باہر ڈھونڈھنے پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور لوگوں میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ ایک گروہ کے مردوں کو اپنے گروہ کی عورتوں سے ہی شادی کرنی پڑتی ہے۔ میکلینن نے پہلی قسم کے گروہوں کو گوت‌باہر شادی کرنےوالے گروہ، اور دوسرے کو گوت‌اندر شادی کرنےوالے گروہ کا نام دیا۔ اور پھر بلا کسی مزید درد سری کے یہ طے کر دیا کہ گوت باہر شادی کرنےوالے اور گوت اندر شادی کرنےوالے ''قبیلوں،، میں ایک ایسا تضاد ہے جو سختی کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ حالانکہ گوت باہر شادی کرنے کے رواج کے بارے میں اس کی اپنی چھان‌بین سے ہی صاف صاف اس بات کا ثبوت مل جاتا ہے کہ اگرچہ سبھی یا زیادہ‌تر صورتوں میں نہیں تو کم از کم بہت سی صورتوں میں یہ تضاد صرف اس کے تخیل کی اپج ہے، پھر بھی اس نے اسے اپنے سارے نظرئے کی بنیاد بنا ڈالا۔ چنانچہ اس کے مطابق گوت باہر شادی کرنےوالے قبیلے صرف دوسرے قبیلوں سے ہی بیویاں لا سکتے ہیں اور چونکہ عہد وحشت میں مختلف قبیلوں کے درمیان مستقل جنگ کی حالت رہتی تھی، اس لئے یہ صرف اغوا کے ذریعے ہی ممکن تھا۔

میکلینن اس کے بعد سوال کرتا ہے: گوت باہر شادی کرنے کا رواج کیسے شروع ہوا؟ ایک گوت یا خاندان کے اندر یا بہت قریبی رشتہ‌داروں کے ساتھ جنسی تعلق کی ممانعت کے تصورات سے اس کو کوئی مطلب نہیں کیونکہ یہ چیزیں تو بہت بعد کی ہیں۔ لیکن لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالنے کے رواج سے اس کا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ رواج بہت سے وحشی لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ اس سے الگ الگ ہر قبیلے میں مردوں کی کثرت ہو جاتی ہے جس کا لازمی اور فوری نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ایک عورت پر مشترک طور پر کئی کئی مردوں کا قبضہ ہونے لگا یعنی کثرت شوہری کا رواج ہو گیا۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچے کی ماں کا پتہ تو رہتا تھا مگر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا باپ کون ہے۔ اس لئے نسل صرف ماں سے چلتی تھی اور اس معاملہ میں مرد کی کوئی اہمیت

نہیں تھی، یعنی مادری حق قائم تھا۔ قبیلے کے اندر عورتوں کی کمیابی کثرت شوہری کی وجہ سے کسی حد تک کم ضرور ہو جاتی تھی لیکن پوری طرح دور نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کمی کا ایک اور نتیجہ یہ تھا کہ دوسرے قبیلوں کی عورتوں کو باقاعدہ، زبردستی اغوا کیا جاتا تھا۔ میکلینن نے لکھا ہے:

''گوت باہر شادی کرنے کا رواج، اور ایک ایک عورت کے متعدد شوہروں کا رواج، دونوں کی وجہ ایک ہے — مردوں اور عورتوں کی تعداد میں توازن کا نہ ہونا۔ اس لئے ہمیں مجبور ہو کر اس نتیجے پر پہونچنا پڑتا ہے کہ جن نسلوں میں گوت باہر شادی کرنے کا رواج ہے، ان سب میں شروع میں کئی کئی شوہروں کا رواج تھا... اس لئے ہمیں اس بات میں کوئی شبہہ نہیں ہونا چاہئے کہ گوت باہر شادی کرنےوالی نسلوں میں قرابت‌داری کا پہلا نظام وہ تھا جو صرف ماں کے ذریعہ خون کے رشتوں کو مانتا تھا،،۔ (میکلینن، ''قدیم تاریخ کا مطالعہ،،، ۱۸۸۶ء۔ ''قدیم شادی،،* صفحہ ۱۲۴۔)

میکلینن کی خوبی یہ ہے کہ اس نے اس بات کی طرف توجہ دلائی جسے وہ گوت‌باہر شادی کرنے کا رواج کہتا ہے اور یہ بتایا کہ اس کی کتنی بڑی اہمیت اور کتنا عام رواج تھا۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ گوت‌باہر شادی کرنےوالے گروہوں کو اس نے دریافت کیا تھا۔ اور یہ کہنا تو اور بھی غلط ہوگا کہ اس نے ان کو سمجھ لیا تھا۔ پہلے کے ان بہت سے مشاہدہ کرنےوالوں کے علاوہ جن کی مختصر یادداشتوں نے میکلینن کےلئے مواد کا کام دیا، لیتھم نے (''تشریحی علم الانسان،،، ۱۸۵۹ء** میں) ہندستان کے ماگر لوگوں (۱۰۵) میں اس دستور کا ٹھیک ٹھیک اور بالکل صحیح حال بیان کیا تھا اور

---

* Mac-Lennan J. F., «Studies in Ancient History, comprising a Reprint of Primitive Marriage», London, 1886. (ایڈیٹر)

** Latham R.G., «Descriptive Ethnology», Vols, I — II, London, 1859. (ایڈیٹر)

بتایا تھا کہ دنیا کے سبھی حصوں میں عام طور پر اس کا رواج پایا جاتا ہے۔ خود میکلینن نے اپنی کتاب میں اس حصے کو نقل کیا ہے۔ اور ہمارا مارگن بھی، ۱۸۴۷ء میں ہی، ایروکواس لوگوں کے بارے میں اپنے خطوط میں (جو کہ «American Review» میں شائع ہوئے تھے) اور ۱۸۵۱ء میں ''ایروکواس لوگوں کی انجمن،، * ناسی اپنی کتاب میں بتا چکا تھا کہ اس قبیلے میں بھی یہ دستور موجود تھا اور اس نے دستور کی بالکل صحیح تفصیل بیان کی تھی۔ اس کے برعکس ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ باخوفن کی صوفیانہ خیال‌آرائی نے مادری حق کے بارے میں جتنی الجھن پیدا کی تھی اس سے کہیں زیادہ الجھن میکلینن کی وکیلانہ ذہنیت نے اس موضوع کے بارے میں پیدا کی۔ میکلینن نے ایک اور قابل ذکر کام یہ کیا کہ اس نے یہ پتہ لگایا کہ شروع میں نسل ماں سے چلتی تھی۔ حالانکہ جیسا کہ بعد میں اس نے خود اعتراف کیا، باخوفن اس سے پہلے ہی اس بات کا پتہ لگا چکا تھا۔ لیکن اس معاملے میں بھی اس کی رائے بہت صاف نہیں ہے۔ وہ برابر ''محض عورتوں کے ذریعہ قرابت‌داری،، (kinship through females only) کا ذکر کرتا ہے اور اس جملے کو، جو ایک ابتدائی دور کے لئے بالکل صحیح تھا، ارتقا کے بعد کے ادوار پر بھی چسپاں کرتا ہے، جبکہ نسل اور وراثت کا سلسلہ تو یقیناً ابھی تک عورتوں سے چلتا تھا مگر قرابت‌داری مرد کی طرف سے بھی مانی جانے لگی تھی اور اس کا اظہار بھی ہونے لگا تھا۔ یہ ایک قانون‌داں کی محدود ذہنیت ہے جو اپنے لئے ایک بےلوچ قانونی اصطلاح گھڑتا ہے اور پھر اسے بلا کسی رد و بدل کے ان حالات پر بھی چسپاں کرتا ہے جو اس دوران میں بدل گئے ہیں اور جن پر وہ اصطلاح اب صادق نہیں آتی۔

میکلینن کا نظریہ بادی النظر میں قابل قبول ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود مصنف کی نظر میں بھی اس کی مضبوط بنیاد نہیں تھی۔ کم سے کم یہ بات خود اس کو بھی کھٹکتی ہے کہ (جھوٹ

---

* Morgan L.H., «League of the Ho-dê-no-sau-nee, or Iroquois». Rochester, 1851. (ایڈیٹر)

موٹ کے دکھاوٹی) ''اغوا کا رواج صاف طور پر انہیں نسلوں میں ہے اور وہی اس کو دھوم دھام سے مناتی ہیں جن میں قرابت‌داری مرد کی طرف سے ہوتی ہے،، (یعنی جن میں مرد سے نسل چلتی ہے) (صفحہ ۱۴۰)۔ ایک اور جگہ اس نے لکھا ہے کہ ''یہ ایک عجیب بات ہے کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، اب ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں گوت باہر شادی کرنے کے رواج کے ساتھ ساتھ قرابت‌داری کی سب سے پرانی شکل موجود ہو اور وہاں بچوں کو مار ڈالنے کا دستور بھی ہو،، (صفحہ ۱۴۶)۔ ان دونوں باتوں سے اس کے طرز فکر کی براہ راست تردید ہوتی ہے اور ان کے خلاف وہ محض نئے اور پہلے سے بھی زیادہ الجھے ہوئے مفروضات پیش کرسکتا ہے۔

پھر بھی انگلینڈ میں اس کے نظرئے کا بڑے زوروں سے خیر مقدم ہوا اور لوگوں نے اس کی بڑی تعریف کی۔ وہاں عام طور پر میکلینن کو خاندان کی تاریخ کا بانی اور اس شعبے کا سب سے ممتاز عالم مان لیا گیا۔ گوت باہر شادی کرنےوالے اور گوت اندر شادی کرنےوالے ''قبیلوں،، میں اس نے جو تضاد قائم کیا تھا، وہ چند مستثنیات اور رد و بدل کو مان لینے کے باوجود، مروجہ خیال کی بنیاد بنا رہا جس کی اس حیثیت کو سبھی تسلیم کرتے تھے۔ اس تضاد نے لوگوں کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال دیا جس سے اس شعبے میں آزادی کے ساتھ چھان‌بین کرنا اور کوئی خاص ترقی کرنا ناممکن ہو گیا۔ چونکہ انگلینڈ میں اور اس کی دیکھا دیکھی دوسرے ملکوں میں بھی میکلینن کی اہمیت کو بہت بڑھا چڑھا کر بتانا ایک فیشن سا ہو گیا ہے، اس لئے اس کے مقابلے میں یہ بتانا ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ گوت‌باہر شادی کرنےوالے اور گوت اندر شادی کرنےوالے ''قبیلوں،، میں ایک بالکل غلط تضاد کھڑا کرکے میکلینن نے جو نقصان پہنچایا اس کے مقابلے میں اس کی چھان‌بین سے فائدہ بہت کم ہوا ہے۔

اس دوران میں، جلد ہی ایسے بہت سے واقعات سامنے آ گئے جو میکلینن کے بنائے ہوئے خوبصورت چوکھٹے میں ٹھیک نہیں بیٹھتے تھے۔ میکلینن شادی کی صرف تین صورتوں سے واقف تھا: ایک شوہر کی بہت سی بیویاں یعنی کثرت ازواج، ایک بیوی کے بہت سے شوہر

یعنی کثرت شوہری، اور ایک میاں ایک بیوی یعنی یک‌زوجگی۔ لیکن جب ایک بار لوگوں نے اس مسئلے کی طرف توجہ کی تو اس بات کے نت نئے ثبوت ملنے لگے کہ ناترقی‌یافتہ لوگوں میں شادی کی ایسی صورتیں بھی پائی جاتی ہیں جن میں مردوں کا ایک گروہ مشترک طور پر عورتوں کے ایک گروہ کا مالک ہوتا ہے۔ اور لوباک نے (۱۸۷۰ء میں اپنی کتاب ''تہذیب کی ابتدا،، * میں) اس گروہ‌واری شادی (Communal marriage) کو ایک تاریخی حقیقت مان لیا۔

اس کے فوراً بعد ہی ۱۸۷۱ء میں مارگن نئی اور کئی پہلوؤں سے فیصلہ کن شہادتیں لے کر سامنے آیا۔ اس کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ ایروکواس لوگوں میں قرابت‌داری کا جو انوکھا طریقہ رائج ہے، وہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں رہنےوالے سبھی آدی باسیوں میں پایا جاتا ہے اور اس طرح وہ ایک پورے براعظم میں پھیلا ہوا ہے حالانکہ قرابت‌داری کا یہ سلسلہ ان رشتوں کے بالکل برعکس ہے جو وہاں کے مروجہ ازدواجی نظام سے پیدا ہوتے ہیں۔ تب اس نے امریکہ کی وفاقی حکومت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ دوسری قوموں میں قرابت‌داری کی جو صورتیں پائی جاتی ہیں ان کے بارے میں معلومات فراہم کرے۔ اور اس کام کے لئے اس نے خود سوالات اور جدول تیار کئے۔ ان سوالوں کے جو جواب آئے ان سے مارگن کو پتہ چلا کہ (۱) امریکہ کے انڈینوں میں قرابت‌داری کا جو سلسلہ پایا جاتا ہے، اس کا رواج ایشیا کے بہت سے قبیلوں میں بھی ہے اور کسی قدر بدلی ہوئی صورت میں افریقہ اور آسٹریلیا میں بھی۔ (۲) اس کی پوری توجیہ ایک قسم کی گروہ‌وار شادی سے ہو جاتی ہے جو ہوائی میں اور آسٹریلیا کے دوسرے جزیروں میں پائی جاتی ہے اور اب مٹنے لگی ہے۔ اور (۳) شادی کی اس شکل کے ساتھ ساتھ انہیں جزیروں میں قرابت‌داری کا ایک ایسا سلسلہ پایا جاتا ہے جس کی توجیہ صرف اس بات سے ہو سکتی ہے کہ پہلے

---

* Lubbock J., «The Origin of Civilisation and the Primitive Condition of Man, Mental and Social Condition of Savages», London, 1870. (ایڈیٹر)

وہاں گروہوار شادی کی ایک اس سے بھی زیادہ ابتدائی شکل رائج تھی جو اب مٹ چکی ہے۔ مارگن نے جو مواد جمع کیا اور اس سے جو نتیجے نکالے، ان کو اس نے ۱۸۷۱ء میں اپنی کتاب ''ہم‌خاندانی اور رشتہ‌داری کے نظام،، * میں شائع کیا اور اس طرح بحث کے دائرے کو بے حد وسیع کر دیا۔ اس نے پہلے قرابت‌داری کے نظاموں کو لیا اور ان کی روشنی میں اور ان کے مطابق خاندان کی شکلوں کو نئے سرے سے مرتب کیا اور اس طرح انسان کے ماقبل تاریخی حالات کی چھان‌بین اور اس کے زیادہ گہرے مطالعے کے لئے ایک نیا راستہ کھول دیا۔ اس طریقے کو صحیح مان لینے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ میکلینن کے خوبصورت محل ہوا میں بکھر جاتے۔

میکلینن نے اپنی کتاب ''قدیم شادی،، (''قدیم تاریخ کا مطالعہ،، ، ۱۸۷۶ء) کے ایک نئے ایڈیشن میں اپنے نظرئے کی پرزور حمایت کی۔ حالانکہ اس نے خود نہایت مصنوعی طور پر محض فرضی باتوں کی بنیاد پر خاندان کی تاریخ مرتب کی ہے مگر لوباک اور مارگن سے اس کا مطالبہ ہے کہ وہ اپنی ہر بات کے لئے ثبوت پیش کریں اور یہ ثبوت ایسے ہوں جن میں حجت کی گنجائش نہ ہو، جیسے ثبوت اسکاٹلینڈ کی عدالتوں میں مانے جائیں۔ اور یہ مطالبہ وہ آدمی کرتا ہے جو جرمنوں میں ایک شخص کی ماں کے بھائی اور بہن کے بیٹے کے درمیان قریبی تعلق ہونے کی بات سے (تاسیت، ''جرمنی،، ، باب ۲۰)، سیزر کی اس رپورٹ سے کہ بریٹون ** لوگ دس‌بارہ کی تعداد میں مل کر مشترک بیویاں رکھتے تھے، اور بربری لوگوں میں مشترک بیویوں کے رواج کے بارے میں قدیم زمانے کے مصنفوں کی تمام رپورٹوں سے، بلا کسی تامل کے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ان تمام لوگوں میں کثرت شوہری کا رواج تھا! اس کی باتوں کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے کوئی

---

* Morgan L.H., «Systems of Consanguinity and Affinity of the Human Family». Washington, 1871. (ایڈیٹر)

** بریٹون — پانچویں اور چھٹی صدی میں اینگلوسیکسن تسلط سے پہلے برطانیہ کی کیلٹ آبادی کا نام تھا۔ (ایڈیٹر)

سرکاری وکیل اپنا مقدمہ پیش کرتے ہوئے تو ہر طرح کی من‌مانی کرتا ہے لیکن مخالف فریق کے وکیل سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے ہر لفظ کو ثابت کرنے کے لئے بالکل پکے اور قانونی طور سے بالکل صحیح ثبوت پیش کرے۔

اس کا دعوی ہے کہ گروہوار شادی محض تخیل کی اڑان ہے اور اس طرح وہ باخوفن سے بھی بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مارگن نے جس چیز کو قرابت‌داری کا نظام سمجھا ہے، وہ شائستہ اور مہذب آداب معاشرت کے متعلق احکام سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ریڈ انڈین لوگ اجنبیوں اور گورے آدمیوں سے بھی ''بھائی،، یا ''باپ،، کہہ کر بات کرتے ہیں۔ یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ چونکہ کیتھولک پادریوں اور راہبہ عورتوں کو لوگ ''فادر،، (باپ) اور ''مدر،، (ماں) کہتے ہیں اور چونکہ راہب اور راہبہ عورتیں، اور یہاں تک کہ انگلینڈ میں فری‌میسن لوگ اور کرافٹ یونینوں کے ممبر بھی جلسوں میں ایک دوسرے کو بھائی بہن کہتے ہیں، اس لئے باپ، ماں، بھائی، بہن وغیرہ الفاظ محض القاب ہیں اور اس سے زیادہ ان کا کوئی مطلب نہیں۔ مختصر یہ کہ میکلینن کی دلیل بہت کمزور تھی۔

لیکن ایک بات رہ گئی ہے جس پر کسی نے میکلینن کی تردید نہیں کی۔ گوت‌باہر شادی کرنےوالے اور گوت‌اندر شادی کرنےوالے ''قبیلوں،، میں اس نے جو تضاد قائم کیا تھا اور جس پر اس کا سارا ڈھانچہ کھڑا تھا، وہ ذرا بھی نہیں ہلا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اب بھی خاندان کی پوری تاریخ کا محور مانا جاتا تھا۔ لوگ یہ مانتے تھے کہ میکلینن نے اس تضاد کی وضاحت کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکافی تھی اور اس سے خود ان واقعات کی تردید ہوتی تھی جن کو میکلینن نے پیش کیا تھا۔ لیکن خود اس تضاد کو، اس خیال کو کہ دو بالکل علحدہ اور خودمختار قسم کے قبیلے ہوتے ہیں، جن میں سے ایک طرح کے قبیلوں کے مرد اپنے قبیلے کے اندر کی ہی عورتوں سے شادی کرتے ہیں مگر دوسری طرح کے قبیلوں میں اس طرح کی شادی کی بالکل ممانعت ہوتی ہے ــ ان باتوں کو لوگ الہامی کتابوں کی طرح

ناقابل انکار صداقت سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر ژیرا تیولون کی کتاب ''خاندان کا آغاز،، (۱۸۷۴ء)* اور خود لوباک کی کتاب ''تہذیب کا آغاز،، (چوتھا ایڈیشن، ۱۸۸۲ء) کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

یہی وہ نقطہ ہے جہاں مارگن کی خاص تصنیف ''قدیم سماج،، (۱۸۷۷ء) بحث میں شامل ہوتی ہے۔ میری یہ کتاب اسی کتاب پر مبنی ہے۔ جن باتوں کو ۱۸۷۱ء میں مارگن نے نہایت مبہم طریقے سے محسوس کیا تھا، یہاں ان کو پوری سمجھ بوجھ کے ساتھ نہایت وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ مارگن کہتا ہے کہ گوت‌اندر شادی کرنے اور گوت‌باہر شادی کرنے میں کوئی تضاد نہیں۔ ابھی تک ایسا کوئی ''قبیلہ،، نہیں ملا ہے جس میں صرف گوت‌باہر ہی شادی کرنے کا رواج ہو۔ لیکن جس زمانے میں گروہ‌وار شادی کا رواج تھا — اور زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ کسی نہ کسی زمانے میں اس کا رواج ہر جگہ تھا — تب قبیلے کے اندر کئی گروہ ایسے ہوا کرتے تھے جن میں ایک دوسرے سے ماں کی طرف سے خون کا رشتہ ہوتا تھا۔ یہ گروہ گن کہلاتے تھے اور ان کے اندر شادی کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ اس لئے کسی بھی گن کے مرد قبیلے کے اندر ہی اپنے لئے بیویاں حاصل کر سکتے تھے اور عام طور پر وہ یہی کرتے تھے، مگر انہیں اپنے گن کے باہر ہی بیویاں حاصل کرنی پڑتی تھیں۔ اس طرح جبکہ گن، سختی سے گوت‌باہر شادی کرنے کے اصول پر عمل کرتا تھا، تب قبیلہ جس میں کئی گن شامل ہوتے تھے، اتنی ہی سختی سے گوت اندر شادی کرنے کے اصول پر عمل کرتا تھا۔ میکلینن نے بناوٹی ڈھنگ سے جو محل کھڑا کیا تھا ، اس کے آخری کھنڈر بھی اس کی تاب نہ لا کر زمین پر آرہے۔

لیکن مارگن کو اس سے ہی اطمینان نہیں ہوا۔ امریکہ کے قدیم باشندوں کا گن اس کے لئے ایک ذریعہ بن گیا جس کی مدد سے اس نے تحقیق کے اس شعبے میں، جس میں اب وہ داخل ہو رہا تھا ، دوسرا

---

* Giraud — Teulon A., «Les origines de la famille», Genève, Paris, 1874. (ایڈیٹر)

فیصلہ کن قدم اٹھایا ۔ مادری حق کی بنیاد پر منظم‌شدہ گن میں اس نے گنوں کی ابتدائی شکل دریافت کی جس سے بعدوالے وہ گن پیدا ہوئے جو پدری حق کی بنیاد پر منظم ہوئے — جنہیں ہم قدیم زمانے کی مہذب قوموں میں پاتے ہیں ۔ اس طرح یونانی اور رومی گن جو اس کے پہلے کے سبھی مورخوں کے لئے پہیلی بنے ہوئے تھے، امریکہ کے آدی‌باسیوں میں پائے جانےوالے گن کی روشنی میں سمجھ میں آ گئے اور قدیم سماج کی پوری تاریخ کے لئے ایک نئی بنیاد پڑ گئی ۔

ابتدائی مادری حق‌والے گن کے بارے میں یہ نئی بات معلوم ہوئی تھی کہ وہ پدری حق‌والے گنوں سے، جو مہذب قوموں میں پائے جاتے ہیں، پہلے کی منزل ہیں ۔ قدیم سماج کی تاریخ میں اس نئی دریافت کی وہی اہمیت ہے جو علم حیات کے لئے ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی اور علم اقتصادیات کے لئے مارکس کے قدر زائد کے نظریہ کی ۔ اس سے مارگن پہلی مرتبہ خاندان کی تاریخ کی ایک ایسی روپ ریکھا تیار کرنے میں کامیاب ہوا جس میں ارتقا کی کم از کم بنیادی منزلوں کو مجموعی حیثیت سے عارضی طور پر، اور اس وقت تک جتنا مواد مل سکا تھا اس کو دیکھتے ہوئے جس حد تک ممکن تھا، اس حد تک متعین کر دیا گیا تھا ۔ ظاہر ہے اس سے قدیم سماج کی تاریخ کے مطالعے میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے ۔ اب مادری حق‌والا گن وہ محور ہے جس کے گرد یہ پورا علم گھومتا ہے ۔ اس کا پتہ لگنے کے بعد اب ہمیں معلوم ہے کہ ہماری تحقیق کے کام کا رخ کیا ہو: کس چیز کی چھان‌بین کی جائے اور اس چھان‌بین کے نتیجوں کو کس طرح ترتیب دیا جائے ۔ چنانچہ مارگن کی کتاب کے شائع ہونے کے بعد، پہلے کے مقابلے میں اس شعبے میں بہت تیزی سے ترقی ہو رہی ہے ۔

مارگن نے جن باتوں کا پتہ لگایا ہے، انہیں اب انگلینڈ کے ماقبل تاریخی عہد کے مورخ بھی ماننے لگے ہیں یا یوں کہئے کہ انہوں نے چپ چاپ ان تمام باتوں کو اپنا لیا ہے ۔ لیکن ان میں سے شاید ہی کوئی یہ ماننے پر تیار ہو کہ ہمارے نقطۂ نظر میں جو انقلاب ہوا ہے، اس کا سہرا مارگن کے سر ہے ۔ انگلینڈ میں اس کی کتاب کے بارے میں جہاں تک ہو سکتا ہے لوگ چپ سادھے رہتے ہیں اور

خود مارگن کو بڑی سرپرستی کے انداز میں اس کی پرانی کتابوں کی تعریف کرکے نپٹا دیا جاتا ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر چن چن کر تنقید کی جاتی ہے اور دراصل جو اس کی عظیم دریافتیں ہیں ان پر خاموشی کی ایسی مہر لگا دی جاتی ہے جو کبھی ٹوٹنے میں نہیں آتی۔ ''قدیم سماج،، کا پرانا ایڈیشن اب نایاب ہے۔ امریکہ میں اس طرح کی کتابیں چھاپنے میں کوئی نفع نہیں۔ انگلینڈ میں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارگن کی کتاب کو باقاعدہ جان بوجھ کر دبایا گیا ہے۔ اور اس عہد آفریں کتاب کا واحد ایڈیشن جو اس وقت بازار میں مل سکتا ہے، وہ جرمن زبان میں ہے۔

ہمارے ماقبل تاریخی عہد کے مانے ہوئے مورخوں کی اس سردمہری کا کیا سبب ہے؟ اس سردمہری کو ایک سازش کا نتیجہ نہ سمجھنا بہت مشکل ہے — خاص طور پر اس لئے کہ یہ حضرات محض تکلفاً اور اخلاقاً مارگن کی کتابوں سے ان گنت اقتباس اپنی کتابوں میں شامل کرتے ہیں اور طرح طرح سے بھائی چارے کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ مارگن امریکی ہے اور ماقبل تاریخی عہد کے انگریز مورخوں کو یہ ماننے میں دقت ہوتی ہے کہ مواد جمع کرنے میں ان کی نہایت قابل تعریف محنت کے باوجود، عام نقطۂنظر کے لئے، جس پر اس مواد کی ترتیب اور تدوین کا انحصار ہے، انہیں دو بڑے غیرملکی عالموں، باخوفن اور مارگن کا سہارا لینا پڑتا ہے؟ جرمن کو تو وہ کسی طرح برداشت بھی کر سکتے ہیں لیکن امریکی کو کیسے گوارا کر سکتے ہیں؟ کسی امریکی کو دیکھ کر ہر انگریز کو حب الوطنی کا دورہ پڑنے لگتا ہے۔ میں جن دنوں امریکہ میں تھا تو مجھے اس کی نہایت مضحکہخیز مثالیں دیکھنے کو ملیں (۱۰۶)۔ اس کے ساتھ ایک بات اور ہے۔ میکلینن کو ایک طرح سے سرکاری طور پر انگلستان کی ماقبل تاریخی تحقیقات کا بانی اور رہنما مان لیا گیا تھا۔ اور ماقبل تاریخی عہد کے مورخوں میں یہ اخلاق اور شائستگی کا تقاضا سمجھا جاتا تھا کہ میکلینن نے تاریخی نظریے کی جو بناوٹی عمارت کھڑی کی تھی، اس کا تذکرہ نہایت احترام سے کیا جائے۔ یہ نظریہ بچوں کے قتل سے لے کر کثرت شوہری، اغوا کے ذریعے شادی

اور مادری حق کے خاندان تک حاوی ہے۔ ایک دوسرے سے بالکل الگ اور مختلف، دو قسم کے ''قبیلوں،، ، یعنی گوت‌باہر شادی کرنےوالے اور گوت‌اندر شادی کرنےوالے ''قبیلوں،، کے بارے میں ذرا سا بھی شک ظاہر کرنا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے جب مارگن نے ان سبھی مقدس خیالات کی جڑ کاٹ دی تو گویا اس نے بہت بڑا گناہ کیا۔ اور پھر مارگن نے اس مسئلے کو اس طرح سلجھایا کہ اس کے بارے میں بات کہتے ہی پوری چیز فوراً صاف ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میکلینن کے وہ پرستار جو ابھی تک اندھوں کی طرح گوت‌باہر شادی کرنے اور گوت‌اندر شادی کرنے کے رواجوں کے بیچ میں بھٹک رہے تھے، اب اپنا سر پیٹنے لگے اور چلانے لگے کہ ہم بھی کیسے احمق ہیں کہ اتنی ذرا سی بات کا اتنے دنوں تک خود پتہ نہیں لگا سکے۔

مارگن کا یہ قصور اس کے لئے کافی تھا کہ سرکاری علما اس کو سردمہری سے نظرانداز کر دیں۔ لیکن مارگن نے اتنے ہی پر قناعت نہیں کی۔ اس نے ان کی تلخیوں کا پیالہ لبریز کر دیا۔ اس نے تہذیب کو، جنس تبادلہ پیدا کرنےوالے سماج کو، جو ہمارے موجودہ سماج کی بنیادی صورت ہے، اپنی تنقید کا اس طرح ہدف بنایا جس سے فورئے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ لیکن اس نے صرف اتنا ہی نہیں کیا، اس نے سماج کی آئندہ تبدیلیوں کا ذکر کچھ ایسے الفاظ میں کیا جنہیں کارل مارکس استعمال کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے جیسا کیا ویسا پایا۔ میکلینن نے نہایت غصے میں اس پر یہ الزام لگایا کہ ''تاریخی طریقے سے اس کو عداوت ہے،، اور پروفیسر ژیرا تیولون نے جینیوا میں ۱۸۸۴ء میں اس رائے کی حمایت کی۔ کیا یہی وہ موسیو ژیرا تیولون نہیں تھے جو ۱۸۷۴ء میں (اپنی کتاب ''خاندان کا آغاز،، میں) میکلینن کے گوت‌باہر شادی کرنے کے رواج کے گورکھ دھندے میں بھٹک رہے تھے اور جنہیں مارگن نے ہی اس سے نجات دلائی تھی!

یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قدیم سماج کی تاریخ نے مارگن کی تحقیقات کی بدولت اور کون سی باتوں میں ترقی کی۔ اس کتاب کے دوران میں جہاں کہیں اس کی ضرورت ہوگی تذکرہ کیا جائےگا۔ مارگن کی اہم تصنیف کو شائع ہوئے چودہ برس کا عرصہ گذر گیا۔ اس دوران میں قدیم انسانی سماج کے بارے میں ہمارے پاس بہت سا نیا مواد

جمع ہو گیا ہے۔ علم‌الانسان کے عالموں، سیاحوں اور ماقبل تاریخ کے ماہروں کے علاوہ تقابلی قانون کے مطالعہ کرنےوالوں نے بھی اس شعبے میں نئے مواد اور نقطہ ہائے نظر کا اضافہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کچھ خاص باتوں کے متعلق مارگن کے بعض مفروضے کمزور پڑ گئے ہیں اور کہیں کہیں بےبنیاد ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن کہیں بھی نئے مواد نے اس کے بنیادی خیالات کو بدل کر ان کی جگہ نئے تصورات قائم نہیں کئے ہیں۔ قدیم سماج کی تاریخ کے مطالعہ میں مارگن نے جو ترتیب قائم کی تھی وہ بنیادی طور پر آج بھی صحیح ہے۔ ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ اس زبردست ترقی کے بانی کا نام چھپانے کی جتنی کوشش کی جاتی ہے، اس کی بتائی ہوئی بنیادی باتوں کو لوگ اتنا ہی روز بروز مانتے جاتے ہیں*۔

۱۶ جون، ۱۸۹۱ء، لندن

فریڈرک اینگلس

«Die Neue Zeit», Bd. 2, №41, 1890 — 1891. رسالے میں شائع ہوا اور مندرجہ‌ذیل کتاب کی صورت میں نکلا:

Friedrich Engels. «Der Ursprung der Familie, des Privateigenthums und des Staats». Stuttgart, 1891.

رسالے اور کتاب دونوں کی اصل سے مقابلہ کیا گیا۔

* ستمبر ۱۸۸۸ء میں نیویارک سے واپسی کے وقت میری ملاقات امریکی کانگرس کے ایک سابق ممبر سے ہوئی جو راچسٹر کے حلقے سے چنے گئے تھے۔ وہ لیوئس مارگن کو جانتے تھے۔ لیکن بد قسمتی سے وہ مجھے مارگن کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتا سکے۔ انھوں نے بتایا کہ مارگن راچسٹر میں خانگی زندگی بسر کرتا تھا۔ اپنے پڑھنے لکھنے کے علاوہ اسے اور چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا بھائی فوج میں کرنل تھا اور واشنگٹن میں جنگی محکمے میں کسی عہدے پر تھا۔ اپنے بھائی کی مدد سے مارگن نے حکومت کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اس کی تحقیقات میں دلچسپی لے اور اس کی کتابوں کو سرکاری خرچ سے چھاپے۔ کانگرس کے ان سابق ممبر کا کہنا تھا کہ جب تک وہ کانگرس کے ممبر تھے خود انھوں نے بھی مارگن کی مدد کی تھی۔

خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز

۱

تہذیب کے ماقبل تاریخی دور

مارگن پہلا شخص تھا جس نے ماہرفن کی گہری واقفیت کے ساتھ انسان کے ماقبل تاریخی دور میں ایک مخصوص نظم‌وترتیب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سوائے اس صورت کے جبکہ مزید اہم مواد ملنے کی وجہ سے تبدیلیاں کرنا ضروری ہو جائے، امید کی جا سکتی ہے کہ اس نے جو درجہ‌بندی کی ہے وہ قائم رہے گی۔

عہد وحشت، عہد بربریت اور عہدتہذیب، ان تین خاص دوروں میں قدرتاً مارگن کا تعلق محض پہلے دو سے اور اس عبوری دور سے ہے جو تیسرے عہد کی طرف لےجاتا ہے۔ ان دو عہدوں میں سے ہر عہد کو وہ ذرائع زندگی کی پیداوار کی نشوونما کے مطابق ابتدائی، درمیانی اور آخری ادوار میں تقسیم کرتا ہے کیونکہ جیساکہ مارگن کا کہنا ہے:

''عالم فطرت پر انسان کی ساری برتری کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ذرائع زندگی کی پیداوار میں اس نے کتنی مہارت حاصل کی ہے۔ انسان ہی ایک ایسی ہستی ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے غذا کی پیداوار پر پوری قدرت حاصل کرلی

ہے - انسانی ترقی کی بڑی منزلوں کا کم‌وبیش براہ‌راست تعلق ذرائع زندگی کے وسیلوں کی توسیع کے ساتھ ہے - ،، *

خاندان کا ارتقا بھی اس کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے لیکن اس میں ہمیں ایسی کوئی قطعی بنیاد نہیں ملتی جس سے مختلف ادوار کی حدبندی کی جا سکے -

۱ - عہد وحشت

۱ - ابتدائی دور - یہ نسل انسانی کے بچپن کا دور ہے - انسان ابھی تک اپنے ابتدائی مسکن یعنی گرم یا نیم گرم علاقوں کے جنگلوں میں رہتا تھا اور کم از کم ایک حد تک درختوں پر بسیرا کرتا تھا - یہی وجہ تھی کہ وہ اتنے دنوں تک بڑے بڑے شکاری جانوروں اور درندوں سے بچا رہا - پھل، گری دار میوے اور جڑیں، یہی اس کی غذا تھی - اس دور میں اس کا اصلی کارنامہ یہ تھا کہ اس نے بولنا سیکھا - تاریخی زمانے میں ہمیں جن لوگوں کا حال ملتا ہے ان میں سے کوئی بھی اس قدیم حالت میں نہیں تھا - اگرچہ یہ زمانہ ہزاروں برس تک رہا ہوگا پھربھی اس کا کوئی براہ‌راست ثبوت ہمارے پاس نہیں ہے - لیکن جب ایک بار ہم یہ مان لیتے ہیں کہ انسان عالم حیوانی سے پیدا ہوا ہے تو پھر اس عبوری دور کو بھی ماننا ضروری ہے -

۲ - درمیانی دور - اس کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب مچھلی (جس میں کیکڑے، گھونگھے اور دوسرے دریائی جانوروں کو بھی شامل کرتے ہیں) غذا میں کام آنے لگی اور آگ کا استعمال ہونے لگا - یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں کیونکہ مچھلی آگ کے استعمال کے بعد ہی اچھی طرح کھانے کے کام آسکتی ہے - اس نئی غذا نے انسان کو موسم اور مقام کی قید سے آزاد کر دیا - دریاؤں اور ساحلوں کے ساتھ

---

* دیکھئے ''مارکس اور اینگلس کی دستاویزات،، جلد ۹، صفحہ ۴ - (ایڈیٹر)

ساتھ چل کر انسان اپنی اس وحشت کی حالت میں بھی کرۂ زمین کے بڑے حصے پر پھیل گیا ۔ ابتدائی پتھر کے دور کے بے ڈھنگے، کھردرے پتھر کے اوزار — جن کو قدیم حجری دور کے اوزار کہتے ہیں — جو سب کے سب یا زیادہ تر اسی دور کے ہیں اور سبھی براعظموں میں بکھرے پڑے ہیں، انسان کی اس نقل و حرکت کا ثبوت ہیں ۔ نئے نئے علاقوں میں جا کر بسنے، برابر نئی چیزوں کی تلاش کی دھن میں لگے رہنے اور اب اس کے ساتھ رگڑ سے آگ جلانے کے فن پر قدرت پا لینے سے انسان کو کھانے کی نئی نئی چیزیں ملتی رہیں، جیسے غذائی جڑیں اور گٹھیاں جو گرم راکھ میں یا زمین میں کھدی ہوئی آگ کی بھٹیوں میں پکا لی جاتی تھیں، اور ابتدائی ہتھیاروں یعنی لاٹھی اور بھالے کی ایجاد کے بعد شکار میں مارے ہوئے جانور بھی غذا میں شامل کئے جانے لگے ۔ محض شکاری قومیں جن کا اکثر کتابوں میں ذکر آتا ہے یعنی ایسی قومیں جو محض شکار پر گذارہ کرتی ہوں، کبھی نہیں رہیں ۔ شکار کا نتیجہ اتنا غیریقینی ہوتا ہے کہ محض اس کے سہارے زندگی گذارنا ممکن ہی نہیں تھا ۔ کھانے کی چیزوں کا ملنا اب بھی نہایت غیریقینی تھا جس کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں آدم خوری کا رواج شروع ہوا اور بہت دنوں تک جاری رہا ۔ آسٹریلیا کے باشندے اور بہت سے پولینیزین آج بھی وحشت کے اس درمیانی دور میں ہیں ۔

۳ ۔ آخری دور ۔ اس کی ابتدا تیر کمان کی ایجاد سے ہوئی جس کی وجہ سے جنگلی جانوروں کا گوشت غذا کا باقاعدہ جزو بن گیا اور شکار کا عام رواج ہو گیا ۔ تیر، کمان اور اس کی تانت ایک پیچیدہ ہتھیار ہے جس کو ایجاد کرنے کے لئے بہت دنوں کے تجربے، تیزی اور ذہانت کی ضرورت تھی اور اسی لئے یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے ساتھ بہت سی دوسری ایجادوں سے بھی واقفیت ہو ۔ اگر ہم ان قوموں کا موازنہ ایک دوسرے سے کریں جو اگرچہ تیر اور کمان سے تو واقف تھیں مگر برتن بنانا نہیں جانتی تھیں (مٹی کے برتن بنانے کے فن سے مارگن کی رائے میں عہد بربریت کی طرف تغیر کی ابتدا ہوتی ہے) تو ہم دیکھیں گے کہ اس ابتدائی دور میں بھی لوگ گاؤں میں بسنے لگے ہیں،

ذرائع زندگی کی پیداوار پر کسی حد تک قدرت حاصل ہو چکی ہے: لکڑی کے برتن بھانڈے بنائے جاتے ہیں، انگلیوں سے (کرگھے کے بغیر) درختوں کی چھال کے ریشوں سے طرح طرح کی چیزیں بنائی جاتی ہیں، درخت کی چھال اور بید کی ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں، اور پتھر (حجر جدید) کے پالش کئے ہوئے چکنے اوزار بنائے جاتے ہیں۔ پھر بڑی حد تک آگ اور پتھر کی کلہاڑی کی مدد سے درخت کا تنا کھود کر ناؤ اور ڈونگی تیار ہونے لگی اور کہیں کہیں مکان بنانے کی لکڑی اور تختے بھی کاٹے جانے لگے تھے۔ مثال کے طور پر شمال مغربی امریکہ کے انڈینوں میں یہ سبھی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ وہ تیر کمان سے تو واقف ہیں مگر مٹی کے برتن بنانا بالکل نہیں جانتے۔ تیر کمان عہد وحشت میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو عہد بربریت میں لوہے کی تلوار اور عہد تہذیب میں بارود کے ہتھیار، توپ بندوق یعنی فیصلہ کن ہتھیار ہیں۔

۲۔ عہد بربریت

۱۔ ابتدائی دور۔ اس کی ابتدا مٹی کے برتن بنانے سے ہوئی۔ اس فن کی ابتدا بعض جگہوں میں یقیناً اور شاید سبھی جگہوں میں اس طرح ہوئی کہ ٹوکریوں یا لکڑی کے برتنوں کو آگ سے بچانے کے لئے ان پر مٹی کا لیپ چڑھایا جانے لگا۔ اس طرح جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ اندر کا برتن نکال لینے پر بھی مٹی کے سانچے سے کام چل سکتا ہے۔

اس نقطہ تک ہم مان سکتے تھے کہ ایک خاص زمانے کے دوران سبھی قوموں میں خواہ وہ کسی مقام سے تعلق رکھتی ہوں، ارتقا کا راستہ ایک ہی ہے۔ لیکن بربریت کے ساتھ ہم ایک ایسے دور میں داخل ہوتے ہیں جس میں دو بڑے براعظموں کی قدرتی خصوصیتوں کا فرق اپنا اثر دکھانے لگتا ہے۔ عہد بربریت کی نمایاں خصوصیت جانور پالنا، ان کی نسل بڑھانا اور پودوں کی کاشت کرنا ہے۔ اب جہاں تک

مشرقی براعظم یعنی نام نہاد پرانی دنیا کا تعلق ہے، یہاں پالنے کے قابل تقریباً سبھی جانور اور ایک کو چھوڑ کر کاشت کے قابل سبھی اناج موجود تھے۔ جبکہ مغربی براعظم یعنی امریکہ میں پالنے کے قابل ایک ہی دودھ پلانےوالا جانور تھا جسے لاما کہتے ہیں اور جو صرف جنوب کے ایک حصے میں پایا جاتا ہے، اور کاشت کے قابل صرف ایک اناج — مکا — تھا مگر وہ تھا سب سے اچھا۔ قدرتی حالات کے اس فرق کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانے سے دونوں نیم کرۂارض کے باشندے الگ الگ اپنی ڈگر پر چلنے لگے اور ارتقا کے مختلف ادوار کے بیچ کی حد فاصل دونوں جگہ اپنی الگ الگ خصوصیتوں کی حامل ہو گئی۔

۲۔ درمیانی دور۔ اس کی ابتدا مشرق میں جانور پالنے سے اور مغرب میں آب‌پاشی کےذریعہ غذائی پودوں کی کاشت کرنے اور مکان بنانے کےلئے کچی اینٹوں اور پتھر کے استعمال سے ہوتی ہے۔

پہلے ہم مغرب کو لیں‌گے کیونکہ یورپ‌والوں کی فتح کے وقت تک امریکہ کے لوگ کہیں بھی اس دور سے آگے نہیں بڑھے تھے۔

امریکہ میں رہنےوالے انڈینوں کا جب پتہ چلا تو اس وقت وہ عہد بربریت کے ابتدائی دور میں تھے (مسی‌سیپی کے مشرق میں رہنےوالے سبھی انڈین اسی دور سے گذر رہے تھے)۔ اس وقت وہ کسی حد تک مکئی اور شاید لوکی، تربوز اور دوسرے پھلوں کی بھی کاشت کرنے لگے تھے۔ اسی سے انہیں اپنی غذا کا بڑا حصہ ملتا تھا۔ یہ لوگ باڑوں سے گھرے ہوئے گاؤں میں لکڑی کے مکانوں میں رہا کرتے تھے۔ شمال مغرب کے قبیلے، خاص کر وہ جو دریائے کولمبیا کے علاقوں میں رہتے تھے، اس وقت بھی عہد وحشت کے آخری دور میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ نہ برتن بنانا جانتے تھے اور نہ کاشت کرنا۔ دوسری طرف نیو میکسیکو کے پوئبلو (۱۰۷) انڈین کہلانےوالے لوگ، میکسیکی لوگ، وسطی امریکہ اور پیرو کے باشندے، فتح امریکہ کے وقت عہد بربریت کے درمیانی دور میں تھے۔ وہ لوگ دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں یا پتھر کے قلعہ نما مکانوں میں رہتے تھے۔ وہ ان باغوں میں جن میں مصنوعی ذرائع سے آب‌پاشی ہوتی تھی، مکئی کی اور موسم اور جگہ کے مطابق اور دوسرے اناجوں کی کاشت کرتے تھے۔ یہی ان کی غذا

کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ انہوں نے کچھ جانور بھی پال رکھے تھے — میکسیکو کے باشندوں نے فیل مرغ اور دوسرے پرند پال رکھے تھے اور پیرو کے باشندوں نے لاما۔ اس کے علاوہ کئی دھاتوں کے استعمال سے واقف تھے مگر لوھے کا استعمال بالکل نہیں جانتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ پتھر کے ھتھیاروں اور اوزاروں سے بےنیاز نہیں ھو سکتے تھے۔ اسپین والوں نے ان کے ملک کو فتح کرنے کے بعد ان کی آزاد نشو و نما کا سلسلہ روک دیا۔

مشرق میں بربریت کے درمیانی دور کی ابتدا ان جانوروں کے پالنے سے ھوئی جو دودھ دیتے تھے اور جن کا گوشت کھایا جاتا تھا۔ لیکن معلوم ھوتا ھے کہ یہاں کے لوگ اس دور میں بہت دنوں تک کھیتی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ ایسا لگتا ھے کہ مویشی پالنے اور جانوروں کے بڑے بڑے جھنڈ اور ریوڑ بنانے کی وجہ سے ھی آریا اور سامی لوگ عہد بربریت کے باقی لوگوں سے مختلف ھو گئے تھے۔ یورپ اور ایشیا کے آریوں میں مویشیوں کے نام آج بھی مشترک ھیں لیکن قابل کاشت پودوں کے نام نہیں ملتے۔

عمدہ اور مناسب جگھوں میں جانوروں کے ریوڑ اور جھنڈ بننے سے گلہبانی کی زندگی کا آغاز ھوا، سامیوں میں دجلہ اور فرات کے سرغزاروں میں اور آریوں میں ھندستان کے میدانوں اور آمودریا اور سیردریا اور دان اور دنیپر کی وادیوں میں۔ مویشی پالنا غالباً انہیں چراگاھوں کی سرحدوں پر شروع ھوا ھوگا۔ اسی لئے بعد میں آنے والی نسلوں کو ایسا معلوم ھوا کہ گلہبانی کرنےوالی قوموں کا آغاز انہیں جگھوں میں ھوا ھوگا حالانکہ دراصل یہ علاقے ایسے تھے جو انسانیت کا گہوارہ ھونا تو دور کی بات رھی، ان کے وحشی آباواجداد کے لئے اور عہد بربریت کے ابتدائی دور کے لوگوں کے لئے بھی بالکل ناقابل رھائش تھے۔ دوسری طرف یہ بات تھی کہ عہد بربریت کے درمیانی دور کے لوگ ایک بار گلہبانی کی زندگی اختیار کر لینے کے بعد یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اپنے ان ھرے بھرے سیراب میدانوں اور چراگاھوں کو چھوڑ کر ان جنگلوں میں لوٹ جائیں جہاں ان کے آباواجداد رھا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب آریوں اور سامی

لوگوں کو اور بھی شمال اور مغرب کی طرف بڑھنے پر مجبور ہونا پڑا تب بھی مغربی ایشیا اور یورپ کے جنگلی علاقوں میں بسنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوا ۔ وہاں وہ صرف اسی وقت آباد ہو سکے جب انہوں نے اناج کی کھیتی سے ایسی حالت پیدا کر لی کہ ان ناموافق علاقوں میں بھی اپنے مویشیوں کے لئے چارہ فراہم کر سکیں اور خاص کر جاڑوں میں گذارہ کر سکیں ۔ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ان لوگوں نے اناج کی کھیتی پہلے پہل مویشیوں کو کھلانے کے لئے شروع کی تھی اور انسان کی خوراک کے لئے اس کو اہمیت بعد میں حاصل ہوئی ۔

آریوں اور سامیوں کو گوشت اور دودھ بہ افراط ملتا تھا ۔ بچوں کی نشو و نما پر ان غذاؤں کا بہت مفید اثر پڑتا ہے ۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ان دونوں نسلوں نے اوروں سے زیادہ ترقی کی ۔ سچ پوچھئے تو نیومیکسیکو کے پوئبلو انڈین جن کی غذا صرف ساگ ترکاری رہ گئی ہے ان انڈینوں کے مقابلے میں چھوٹے دماغ کے ہوتے ہیں جو بربریت کے ابتدائی دور میں ہیں اور خوب گوشت اور مچھلی کھاتے ہیں ۔ بہر حال، اس دور میں آدم خوری رفتہ رفتہ بند ہو گئی اور اگر کہیں باقی بھی رہی تو محض ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے یا جادو ٹونے کی شکل میں ۔ اور اس دور میں یہ دونوں قریب قریب ایک ہی چیز ہیں ۔

۳ ۔ آخری دور ۔ اس کی ابتدا اس زمانے سے ہوئی جب کچے لوہے کو پگھلا کر صاف کیا جانے لگا، اور جب حروف تہجی کے لکھنے کا فن ایجاد ہوا اور ادبی تحریروں میں اس سے کام لیا جانے لگا تو رفتہ رفتہ یہ دور ختم ہو کر تہذیب کے عہد میں مل گیا ۔ جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں اس دور کو آزادی کے ساتھ صرف مشرقی نیم کرہ کے لوگ ہی پورا کر سکے ۔ اس دور میں پیداوار میں جتنی ترقی ہوئی اتنی پہلے کے تمام ادوار میں کل ملا کر بھی نہیں ہوئی تھی ۔ سورمائی عہد کے یونانی، روم کی تعمیر سے کچھ پہلے کے اطالوی قبیلے، تاسیت کے زمانے کے جرمن اور وائیکنگ (۱۰۸) کے زمانے کے نارمن اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں ۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسی دور میں ہمیں پہلے پہل لوہے کے ہل ملتے ہیں جنہیں جانور چلایا کرتے تھے۔ اسی کی وجہ سے بڑے پیمانے پر کھیتی کرنا — کاشت کاری — ممکن ہو سکی اور اس زمانے کے نقطۂ نظر سے ذرائع زندگی میں لامحدود اضافہ ہوا۔ جنگل صاف کئے گئے، کھیت اور چراگاہیں بنائی گئیں۔ اور یہ کام لوہے کی کلہاڑی اور پھاوڑے کے بغیر بڑے پیمانے پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسی کی ساتھ آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ چھوٹے چھوٹے علاقوں میں گنجان بستیاں بس گئیں۔ کاشتکاری سے پہلے صرف بہت ہی مخصوص حالات پانچ لاکھ آدمیوں کو ایک مرکزی رہنمائی کے تحت لا سکتے تھے۔ زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

ہومر کی نظموں خصوصاً ''ایلیڈ،، میں ہمیں بربریت کا آخری دور اپنے عروج پر ملتا ہے۔ لوہے کے اچھے اوزار، دھونکنی، ہاتھ سے چلنےوالی چکی، کمہار کا چاک، تیل نکالنا اور شراب بنانا، دھاتوں کے صاف کرنے کا ترقی کرکے فن کی حیثیت اختیار کرنا، گاڑی اور جنگی رتھ، تختوں اور کڑیوں سے پانی میں چلنےوالے جہاز بنانا، فن تعمیر کی ابتدا، فصیلوں سے گھرے ہوئے شہر جن میں مینار اور فصیل نما دیواریں ہوتی تھیں، ہومر کی رزمیہ نظمیں اور پوری دیومالا — یہ ہے وہ اہم ترین وراثت جس کو لے کر یونانیوں نے بربریت سے تہذیب کے عہد میں قدم رکھا۔ اب ذرا اس کے مقابلے میں ہم ان جرمنوں کو دیکھیں جن کی تصویر سیزر اور خود تاسیت نے کھینچی ہے۔ وہ تمدن کی اس منزل کی دہلیز پر کھڑے تھے جہاں سے آگے بڑھ کر ہومر کے زمانے کے یونانی ایک زیادہ اونچی منزل میں داخل ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ دونوں کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ بربریت کے آخری دور میں پیداوار نے بہت ترقی کر لی تھی۔

مارگن کے خاکے کے مطابق وحشت اور بربریت سے ہوتے ہوئے تہذیب کی ابتدائی منزلوں تک انسانی ارتقا کی جو تصویر میں نے کھینچی ہے، اس میں بہت سی نئی باتیں ہیں۔ یہ باتیں ناقابل تردید بھی ہیں کیونکہ انہیں براہ راست پیداوار سے لیا گیا ہے۔ پھر بھی

ہماری داستان کے ختم ہونے تک اس تصویر کے جو نقوش ابھریں گے، ان کے مقابلے میں یہ رنگ بہت ہلکے اور پھیکے ہیں ۔ صرف اسی وقت یہ ممکن ہوگا کہ بربریت سے تہذیب تک کے تغیرات کی پوری تصویر اور دونوں کے نمایاں فرق کو پیش کیا جائے ۔ فی الحال مارگن نے ادوار کو جس طرح تقسیم کیا ہے، اسے عام لفظوں میں ہم یوں پیش کر سکتے ہیں : عہد وحشت جس میں انسان قدرت کے خزانے سے زیادہ تر وہی چیزیں لیتا تھا جو کھانے پینے کے لئے تیار ملتی تھیں ۔ انسان خود زیادہ تر ایسے اوزار تیار کرتا تھا جن سے ان چیزوں کو لینے میں آسانی ہو ۔ عہد بربریت جس میں انسان نے مویشی پالنا اور کھیتی کرنا یعنی اپنی محنت سے قدرت کی زرخیزی کو بڑھانے کا طریقہ سیکھا ۔ تہذیب کا عہد جس میں انسان نے قدرت کی نعمتوں سے مزید کام لینا سیکھا اور صنعت و حرفت اور فنون کی واقفیت حاصل کی ۔

۲
خاندان

مارگن نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ایروکواس لوگوں میں گذارا، جو آج بھی ریاست نیویارک میں رہتے ہیں۔ انہیں کے ایک قبیلے (سینیکا) نے اسے اپنا لیا تھا۔ مارگن نے ایک عجیب و غریب چیز یہ دیکھی کہ ان لوگوں میں قرابت‌داری کا جو نظام قائم ہے اس میں اور ان کے اصلی خاندانی تعلقات میں تضاد ہے۔ ان میں عام طور پر یہ رواج تھا کہ ایک ایک جوڑا آپس میں شادی کرتا تھا اور فریقین میں سے کوئی بھی آسانی کے ساتھ اس رشتے کو توڑ سکتا تھا۔ مارگن اس کو ''جوڑا خاندان،، کہتا تھا۔ ایسے شادی‌شدہ جوڑے کی اولاد کو سبھی جانتے اور مانتے تھے اور کسی کو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ باپ، ماں، بیٹا، بیٹی، بھائی اور بہن کس کو کہا جائے۔ لیکن حقیقت میں ان اصطلاحوں کا استعمال بالکل الٹے ڈھنگ سے ہوتا تھا۔ ایروکواس لوگ صرف اپنی ہی اولاد کو نہیں بلکہ اپنے بھائیوں کی اولاد کو بھی بیٹا بیٹی کہتے اور وہ انہیں باپ کہتے تھے۔ اس کے برعکس بہن کی اولاد کو وہ بھانجا بھانجی کہتے اور وہ انہیں ماموں پکارتی تھی۔ دوسری طرف ایروکواس عورتیں اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ اپنی بہن کی اولاد کو بیٹا بیٹی کہتیں اور وہ انہیں ماں کہتی۔ اس کے برعکس بھائی کی اولاد کو وہ بھتیجا بھتیجی کہتیں اور وہ انہیں پھوپھی کہتی۔ بھائیوں کی اولاد آپس میں ایک

دوسرے کو بھائی بہن کہا کرتی اور اسی طرح بہنوں کی اولاد بھی ایک دوسرے کو یہی کہتی۔ لیکن اس کے برعکس ایک عورت اور اس کے بھائی کی اولاد ایک دوسرے کو میرے پھوپھیرے بھائی یا بہن کہہ کر پکارتی۔ اور یہ محض کوری اصطلاحیں نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے خون کے رشتوں کی قربت، ان کے ہم جد ہونے اور ان کی برابری اور نابرابری کے خیالات کام کر رہے ہیں اور یہ خیالات قرابت‌داری کے ایک مکمل نظام کی بنیاد کا کام دیتے ہیں جس میں ایک ایک شخص کے سینکڑوں مختلف رشتوں کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ، یہ نظام نہ صرف امریکہ کے تمام انڈینوں میں پایا جاتا ہے (جن میں ابھی تک کوئی اس سے مستثنی نہیں ملا) بلکہ اس کا رواج جوں کا توں، بلا کسی تبدیلی کے ہندستان کے قدیم باشندوں میں، دکن کے دراوڑ اور شمالی ہندستان کے گوڑا قبیلوں (۱۰۹) میں پایا جاتا ہے۔ جنوبی ہندستان کے تاملوں میں اور ریاست نیویارک میں ایروکواس قبیلے کے سینیکا لوگوں میں رشتہ‌داری کی جو صورتیں پائی جاتی ہیں، وہ دو سو سے زیادہ رشتوں میں آج بھی دونوں جگہ ایک ہیں۔ اور امریکہ کے سارے انڈینوں کی طرح ہندستان کے ان قبیلوں میں بھی خاندان کی مروجہ شکل سے پیدا ہونےوالے تعلقات میں اور ہم‌خاندانی کے نظام میں تضاد ہے۔

اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ عہد وحشت اور عہدبربریت میں سبھی لوگوں کے یہاں سماجی نظام کے اندر قرابت‌داری کی ایک فیصلہ کن اہمیت ہوتی ہے۔ لہذا ایک ایسے وسیع نظام کی توجیہ محض الفاظ کے ذریعہ نہیں کی جا سکتی — ایک ایسا نظام جو عام طور سے سارے امریکہ میں اور اسی طرح ایشیا میں بھی ایک بالکل مختلف نسل کے لوگوں میں پھیلا ہوا ہے اور جس کی کم و بیش بدلی ہوئی صورتیں سارے افریقہ اور آسٹریلیا میں پائی جاتی ہیں، ایسے نظام کی تاریخی توجیہ ضروری ہے۔ اس کی توجیہ اس طرح نہیں کی جا سکتی جس طرح مثال کے طور پر میکلینن نے کرنے کی کوشش کی تھی۔ باپ، بیٹے، بھائی اور بہن کی اصطلاحیں محض رسمی نہیں بلکہ ان کے ساتھ باہمی حقوق اور فرائض کا ایک مخصوص، متعین اور بہت ہی واضح

تصور وابستہ ہے جو مجموعی طور پر ان لوگوں کے سماجی آئین کا ایک ضروری حصہ ہوتا ہے۔ اور اب اس کی توجیہ مل گئی ہے۔ جزیرہ ہائے سینڈیچ (ہوائی) میں موجودہ صدی کے ابتدائی نصف حصے تک خاندان کی ایک ایسی شکل موجود تھی جس میں ٹھیک اسی طرح کے باپ اور ماں، بھائی اور بہن، بیٹے اور بیٹی، چچا اور چچی، بھتیجے اور بھتیجی ہوتے تھے جس طرح کی امریکی اور قدیم ہندستانی ہم‌خاندانی کے نظام کو ضرورت تھی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہم خاندانی کا جو نظام ہوائی میں رائج تھا، اس میں اور وہاں کے خاندان کی اصلی صورت میں بھی تضاد تھا۔ وہاں سبھی چچیرے، پھوپھیرے، ممیرے اور خلیرے بھائی بہن، حقیقی بھائی بہن سمجھے جاتے تھے۔ اور وہ سب صرف اپنی ماں اور اس کی اپنی بہنوں کی یا اپنے باپ اور اس کے اپنے بھائیوں کی اولاد نہیں بلکہ اپنے ماں‌باپ کے سبھی بھائیوں اور بہنوں کی مشترک اولاد تصور کئے جاتے تھے۔ چنانچہ اگر امریکہ کے ہم خاندانی نظام کی تہہ میں خاندان کی ایک زیادہ قدیم شکل تھی جو امریکہ میں تو رائج نہیں رہی لیکن ہوائی میں اب بھی پائی‌جاتی ہے تو ہوائی کا ہم‌خاندانی نظام خاندان کی ایک اور بھی قدیم شکل کی طرف اشارہ کررہا ہے، جس کا وجود اگرچہ آج کہیں ثابت نہیں کیا جا سکتا پھر بھی کبھی نہ کبھی ضرور رہا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم‌خاندانی کا وہ نظام جو اس سے مناسب رکھتا ہے، کبھی قائم نہ ہوتا۔

مارگن کا کہنا ہے کہ ''خاندان ایک زندہ اور متحرک چیز ہے۔ وہ کبھی ایک حال پر نہیں رہتا۔ جس طرح سماج نیچے سے اوپر کی طرف ترقی کرتا ہے، اسی طرح خاندان بھی نیچے سے اوپر کی طرف ترقی کرتا رہا۔ اس کے برعکس ہم‌خاندانی کا نظام مجہول اور غیر متحرک ہوتا ہے۔ صرف طویل وقفوں کے بعد ہی وہ خاندان میں ترقی دکھاتا ہے۔ ہم خاندانی کے نظام میں کوئی بڑی تبدیلی صرف اسی وقت ہوتی ہے جب خاندان میں کوئی بڑی تبدیلی ہو چکی ہو۔''

اس پر مارکس نے یہ اضافہ کیا کہ ''یہی بات عام طور سے سیاسی، قانونی، مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں پر بھی صادق آتی ہے۔ ''* خاندان زندہ حالت میں رہتا ہے لیکن ہم‌خاندانی کا نظام جامد اور بےجان ہوجاتا ہے اور اگرچہ رسمی طور پر اس کا ڈھانچہ باقی رہتا ہے پھربھی خاندان ترقی کرکے اس سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن جس طرح پیرس کے قریب ایک ایسے جانور کے ڈھانچے کی ہڈیوں سے جس کے بچہ رکھنے کی تھیلی ہوتی ہے، کیووئے یقین کے ساتھ اس نتیجے پر پہونچا کہ یہ ڈھانچہ پیٹ کی تھیلی میں بچے کو رکھ کر لے جانےوالے کسی جانور کا ہے، اور ایسے جانور اگرچہ اب نہیں ملتے مگر اس علاقے میں ضرور کبھی رہتے ہونگے، اسی طرح تاریخی طور پر پرانے زمانے سے ہمیں ہم‌خاندانی (سگوتری) کا جو نظام ملا ہے، اس سے ہم بھی اتنے ہی یقین کےساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے مناسب رکھنےوالی، خاندان کی ایک شکل کبھی رائج ہوگی جو اب مٹ چکی ہے۔

ہم‌خاندانی کے وہ نظام اور خاندان کی وہ شکلیں جن کا ابھی ذکر ہوا موجودہ زمانے کے مروجہ نظاموں اور شکلوں سے مختلف ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ان میں ہر بچے کے کئی کئی باپ اور مائیں ہوتی ہیں۔ ہم خاندانی کے امریکی نظام کے مطابق، جس سے ہوائی‌والا خاندان مناسب رکھتا ہے، بھائی اور بہن ایک ہی بچے کے باپ اور ماں نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس ہم‌خاندانی کا ہوائی‌والا نظام جس خاندان پر مبنی ہے، اس میں یہی رواج تھا۔ ہمیں خاندان کی مختلف شکلیں ملتی ہیں اور یہ ان شکلوں سے بالکل مختلف ہیں جو عام طور پر مروج مانی جاتی ہیں۔ خاندان کے روایتی تصور میں صرف یک‌زوجگی ہے جس کےساتھ ساتھ کچھ مردوں کے لئے کثرت ازدواج اور شاید کچھ عورتوں کے لئے کثرت شوہری کی بھی گنجائش ہے۔ لیکن اس تصور میں اس حقیقت پر چپ چاپ پردہ ڈال دیا جاتا ہے ــ جیسا کہ

---

* دیکھئے ''مارکس اور اینگلس کی دستاویزات،، جلد ۹، صفحہ ۲۱۔ (ایڈیٹر)

اخلاق‌پرست کم‌نظر اکثر کیا کرتے ہیں — کہ سرکاری سماج کی عاید کی ہوئی بندشیں خاموشی اور اتنی ہی بےشرمی کے ساتھ عمل میں توڑی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس قدیم سماج کی تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں ایسے حالات کا پتہ چلتا ہے جن میں مرد متعدد بیویوں سے شادی کرتے تھے اور ان کی بیویاں متعدد شوہروں سے۔ اور اس لئے ان کی اولاد سبھوں کی مشترک اولاد سمجھی جاتی تھی۔ ان حالات میں رفتہ رفتہ تبدیلی ہوتی رہی یہاں تک کہ وہ بالکل مٹ گئے اور ان کی جگہ پر ایک مرد اور ایک عورت کے بیاہ کا رواج ہوا۔ ان تبدیلیوں کی نوعیت یہ تھی کہ مشترک شادی کے تعلق کا دائرہ جو شروع میں بہت وسیع تھا اور جس میں بہت سے لوگ آ سکتے تھے، رفتہ رفتہ محدود ہوتا گیا حتی کہ آخر میں اس میں محض ایک عورت اور ایک مرد رہ گئے۔ چنانچہ آج کل عام طور پر اسی کا رواج ہے۔

اس طرح خاندان کی پچھلی تاریخ مرتب کرنے میں حال سے ماضی کی طرف جاتے ہوئے، مارگن اپنے اکثر رفیقوں کی طرح، ایک ایسی قدیم منزل پر جا پہنچا جبکہ قبیلے کےاندر جنسی تعلقات کی مکمل آزادی تھی — ہر عورت ہر مرد کےلئے روا تھی اور اسی طرح ہر مرد ہر عورت کےلئے۔ ایک ایسی قدیم حالت کا تذکرہ گذشتہ صدی سے ہی ہوتا آرہا ہے لیکن یہ تذکرہ نہایت عام لفظوں میں کیا جاتا تھا۔ باخوفن پہلا آدمی تھا جس نے اس حالت کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا اور تاریخی اور مذہبی روایات میں اس کے آثار ڈھونڈھنے کی کوشش کی۔ باخوفن نے یہ ایک نہایت گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ آج ہمیں معلوم ہوچکا ہے کہ اس نے جن آثار کا پتہ لگایا وہ ہمیں آزاد جنسی تعلقات کے سماجی دور تک واپس نہیں لےجاتے بلکہ اس کے بہت بعد کے سماجی دور تک پہنچاتے ہیں جس میں گروہوار شادی کا رواج تھا۔ وہ قدیم سماجی دور اگر سچ‌مچ کبھی رہا ہوگا تو اس کا تعلق اتنے قدیم زمانے سے ہے کہ ہم یہ امید نہیں کر سکتے کہ پچھڑے ہوئے وحشیوں میں، جن کی ترقی رک گئی ہے، اس کے وجود

کا کوئی براہ راست ثبوت مل سکے ۔ باخوفن کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی تحقیقات میں اس سوال کو پیش پیش رکھا *۔

انسان کی جنسی زندگی کے اس ابتدائی دور کو ماننے سے انکار کرنا آج کل ایک فیشن سا ہو گیا ہے ۔ اس کا مقصد انسانیت کو اس ''کلنک،، سے بچانا ہے ۔ اس سلسلے میں ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس کی کوئی براہ راست شہادت نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ دوسرے حیوانات کی مثال بھی پیش کی جاتی ہے ۔ لیتورنیو نے حیوانی دنیا سے بہت سے واقعات جمع کرکے (''شادی اور خاندان کا ارتقا،، ۱۸۸۸ء **) یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حیوانوں میں بھی پوری طرح آزاد جنسی تعلق ایک ابتدائی اور ادنی سطح کی چیز ہے ۔ لیکن ان تمام

---

* باخوفن نے جو کچھ دریافت یا سچ پوچھئے تو قیاس کیا تھا، اس کو وہ خود نہیں سمجھتا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اس قدیم حالت کو hetaerism (یعنی کئی عورتیں رکھنے کا رواج ۔ مترجم) سے تعبیر کرتا ہے ۔ اس لفظ کو پہلے پہل یونانیوں نے استعمال کیا تھا ۔ اس سے ان کی مراد وہ جنسی تعلق تھا جو ان مردوں میں جو بن بیاہے تھے یا جن کی ایک بیوی تھی اور بن بیاہی عورتوں میں ہوتا تھا ۔ اس وقت شادی کی ایک مخصوص صورت ضروری تھی جس کے دائرے کے باہر یہ جنسی تعلق ہوا کرتا تھا ۔ اس میں عصمت‌فروشی بھی شامل ہے ۔ اگر اور کچھ نہیں تو اس کا وجود ممکن تو ہو ہی چکا تھا ۔ یہ لفظ کسی اور مفہوم میں کبھی استعمال نہیں ہوا ۔ اور مارگن کی طرح میں بھی اس کو صرف اسی معنی میں استعمال کرتا ہوں ۔ باخوفن نے اپنی نہایت اہم دریافتوں کو نہایت پراسرار اور ناقابل فہم بنا دیا ۔ اس کی وجہ اس کا یہ مہمل عقیدہ تھا کہ تاریخی ارتقا کے دوران میں مرد عورت کے درمیان جو تعلق قائم ہوتے ہیں، وہ اس زمانے کے انسان کے مذہبی خیالات کا نتیجہ ہوتے ہیں، ان کے اصلی حالات زندگی کا نہیں ۔

** Letourneau Ch., «L'evolution du marriage et de la famille», Paris, 1888. (ایڈیٹر)

واقعات سے میں صرف اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جہاں تک انسان اور اس کے ابتدائی حالات زندگی کا تعلق ہے، ان سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ ریڑھ کی ہڈی‌والے جانوروں میں نر اور مادہ بہت دنوں تک جوڑا بنائے رہتے ہیں ــ اس کی وجہ جسمانی ہے۔ مثلاً پرندوں میں مادہ کو انڈے سینے کے زمانے میں مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن پرندوں میں جوڑوں کی وفاداری کی مثالوں سے انسانوں کے لئے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ انسان پرندوں کی نسل سے نہیں ہے۔ اور اگر ایک نر اور ایک مادہ کا جوڑا ہی تمام خوبیوں کی معراج ہے تو پھر شرافت کا سہرا کینچوے کے سر بندھنا چاہئے۔ اس کے جسم میں پچاس سے دو سو تک حصے ہوتے ہیں اور ہر حصے کے اندر نر اور مادہ کے پورے جنسی اعضا موجود ہوتے ہیں۔ اس کی ساری زندگی ان دو سو میں سے ہر ایک حصے میں خود اپنے ہی ساتھ جنسی عمل کرنے میں گذر جاتی ہے۔ اگر ہم دودھ پلانے‌والے جانوروں کو ہی دیکھیں تو ہمیں ان میں جنسی زندگی کی سبھی شکلیں ملیں‌گی۔ آزاد جنسی تعلق کے ساتھ‌ساتھ گروہ‌وار شادی کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں، ایک نر کے لئے کئی مادائیں اور ایک نر اور ایک مادہ کا تعلق بھی ملتا ہے۔ لیکن ان میں ایک مادہ سے کئی نروں کا تعلق نہیں پایا جاتا۔ یہ صرف انسانوں میں ہی ممکن تھا۔ یہاں تک کہ ہمارے سب سے قریبی رشتہ‌داروں یعنی چوپایوں میں بھی نر اور مادہ کے ملنے کی زیادہ سے زیادہ ممکن صورتیں پائی جاتی ہیں اور اگر ہم اس دائرے کو اور بھی محدود کردیں اور محض چار انسان نما لنگوروں کو لیں تو لیتورنیو ہمیں بتائےگا کہ ان میں کہیں ایک نر اور ایک مادہ کا تعلق پایا جاتا ہے اور کہیں ایک نر کےساتھ کئی مادائیں ہوتی ہیں۔ دوسری طرف سوسورے جس کی رائے ژیرا تیولوں نے نقل کی ہے، کہتا ہے کہ وہ ایک نر اور ایک مادہ کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ اپنی کتاب ''انسانی شادی کی تاریخ،،* میں وسٹرمارک نے انسان نما

---

* Westermarck E., «The History of Human Marriage», London and New York, 1891. (ایڈیٹر)

لنگوروں میں ایک نر اور ایک مادہ کے ساتھ رہنے کے متعلق جو حال میں دعوے کئے ہیں اس سے بھی کوئی بات ثابت نہیں ہوتی ۔ مختصر یہ کہ سبھی روایتیں کچھ اس قسم کی ہیں کہ غریب لیتورنیو کو آخر یہ مان لینا پڑا کہ ''دودھ پلانےوالے جانوروں میں ذہنی ارتقا کی سطح اور جنسی تعلق کی شکل میں کوئی خاص ربط نہیں ہے،، ۔ اور اسپناس اپنی کتاب ''حیوانی سماج،، * میں صاف کہتا ہے کہ ''جانوروں میں سب سے اعلی سماجی گروہ جو دیکھنے میں آتا ہے، جھنڈ یا غول ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کئی خاندانوں سے مل کر بنتا ہے ۔ لیکن خاندان اور غول میں شروع ہی سے تضاد ہوتا ہے ۔ ان کی ترقی میں الٹی نسبت ہوتی ہے ۔ ،،

ان باتوں سے ظاہر ہے کہ آدم نما بندروں کے خاندان اور دوسری سماجی گروہ بندیوں کے بارے میں ہمیں یقینی طور پر تقریباً کچھ نہیں معلوم ۔ جو باتیں معلوم بھی ہیں وہ ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں ۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ کیونکہ وحشی انسانوں کے قبیلوں کے بارے میں بھی ہمیں جو کچھ معلوم ہے وہ باتیں بہت متضاد ہیں اور ان کو تنقیدی نظر سے جانچنے اور چھان‌بین کرنے کی سخت ضرورت ہے ۔ لیکن بندروں کے سماجوں کا مطالعہ انسانی سماج کے مقابلے میں اور بھی مشکل ہے ۔ ان کے بارے میں جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ بھروسے کے قابل نہیں ہیں ۔ لہذا ان سے جو نتیجے نکالے جاتے ہیں انہیں فی الحال ٹھکرا دینا چاہئے ۔

لیکن اسپناس کی کتاب سے جو عبارت ابھی نقل کی گئی اس میں ہمارے لئے ایک بہت اچھا اشارہ موجود ہے ۔ اعلی حیوانوں میں غول اور خاندان لازم و ملزوم نہیں بلکہ ان میں آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے ۔ اسپناس نے بڑی خوبی سے دکھایا ہے کہ جوڑا ملنے کے زمانے میں نروں کے آپس کے رشک و رقابت کی وجہ سے غول میں مل جل کر رہنےوالوں کا شیرازہ منتشر ہونے لگتا ہے یا کچھ عرصے کے لئے ٹوٹ جاتا ہے ۔

* Espinas A., «Des sociètès animales. Etude de Psychologie Comparèe», Paris, 1877, pp. 303—304. (ایڈیٹر)

''جہاں خاندان کی شیرازہ‌بندی مضبوط ہے وہاں غول شاذونادر ہی پائے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جہاں آزاد جنسی تعلق یا کثرت ازدواج ہے وہاں گویا قدرتی طور پر غول بن جاتے ہیں... غول بننے کے لئے ضروری ہے کہ خاندان کی بندشیں ڈھیلی پڑ چکی ہوں اور فرد پھر آزاد ہو گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پرندوں میں منظم جھنڈ شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے برعکس دودھ پلانےوالے جانوروں میں کم و بیش منظم سماج موجود ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں فرد خاندان کے اندر جذب نہیں ہوا ہے... چنانچہ ابتدا میں غول کے اجتماعی احساس (ضمیر اجتماعی) کا سب سے بڑا دشمن خاندان کا اجتماعی احساس ہے۔ ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایک ایسی سماجی ہیئت قائم ہو سکی ہے جو خاندان سے زیادہ اعلیٰ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر ایسے خاندان شامل تھے جن میں بنیادی تبدیلی ہو چکی تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ٹھیک اسی وجہ سے یہ خاندان بعد میں اپنے آپ کو پہلے سے کہیں زیادہ موافق حالات میں نئے سرے سے منظم کر سکے۔'' (اسپناس۔ ایضاً (پہلا باب)۔ ژیرا تیولون نے اپنی کتاب ''شادی اور خاندان کا آغاز'' ۱۸۸۴ء* میں نقل کیا۔ صفحات ۵۲۰—۵۱۸۔)

اس سے یہ ظاہر ہے کہ حیوانی سماجوں سے بلا شک انسانی سماجوں کی بابت کچھ نتیجے نکالے جا سکتے ہیں، لیکن محض منفی اعتبار سے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ریڑھ کی ہڈی‌والے اعلیٰ حیوانوں میں خاندان کی صرف دو شکلیں پائی جاتی ہیں، ایک نر کی کئی مادائیں یا ایک نر اور ایک مادہ کے جوڑے۔ دونوں شکلوں میں بالغ نر یا شوہر ایک ہی ہوسکتا ہے۔ نر کے رشک و رقابت کا جذبہ جس سے خاندان کا بندھن اور اس کی حدود دونوں ظاہر ہوتی

---

* Giraud—Teulon A., «Les origines du marriage et de la famille». Genève, 1884. (ایڈیٹر)

ہیں، حیوانی خاندان اور غول میں ٹکر پیدا کرتا ہے۔ غول جو کہ ایک اعلیٰ سماجی شکل ہے، جوڑا بنانے کے زمانے میں کہیں بالکل ناممکن ہوجاتا ہے، کہیں اس کے بندھن ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور کہیں اس کا شیرازہ بالکل منتشر ہو جاتا ہے۔ نر کے رشک و رقابت کی وجہ سے اس کا مسلسل ارتقا بہرحال مشکل ہو جاتا ہے۔ صرف اتنا ہی یہ ثابت کرنے کےلئے کافی ہے کہ حیوانی سماج اور قدیم انسانی سماج میں آپس میں تضاد ہے اور قدیم انسان جب حیوانیت کی منزل سے قدم آگے بڑھا رہا تھا تو اسے خاندان کی کوئی واقفیت نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو ایک ایسے خاندان کی جو حیوانوں میں نہیں پایا جاتا۔ وسٹرمارک نے شکاریوں کی رپورٹوں کی بنیاد پر کہا ہے کہ گوریلا اور شمپانزی لنگوروں میں غول‌پسندی کی سب سے اونچی شکل ایک نر اور ایک مادہ کا جوڑا ہے۔ اس شکل میں یعنی اکیلے بھی، وہ نہتا حیوان جو انسانیت کے عالم میں قدم رکھ رہا تھا، چھوٹی تعداد میں زندہ رہ سکتا تھا۔ حیوانیت کی منزل سے ترقی کرکے آگے بڑھنے اور فطرت میں ترقی کا یہ سب سے بڑا قدم اٹھانے کے لئے ایک اور چیز کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ دفاع اور بچاؤ کےلئے فرد کی ناکافی طاقت کی جگہ غول کی متحدہ طاقت اور مشترکہ کوشش لے لے۔ آدم‌نما بندر آج جن حالات میں رہتے ہیں، اس قسم کے حالات سے نکل کر انسانی منزل میں پہنچنا بالکل ناممکن ہوگا۔ ان انسان‌نما بندروں کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بھٹکی ہوئی شاخ ہے جو رفتہ رفتہ سٹ چلی ہے یا بہرحال جس کا زوال ہونے لگا ہے۔ یہی وجہ بہت کافی ہے کہ ان کے اور قدیم انسان کے خاندان کی شکلوں کا آپس میں موازنہ کرکے جو نتیجے نکالے جاتے ہیں، ان کو قبول نہ کیا جائے۔ حیوانیت سے انسانیت کا ارتقا جن وسیع اور پائدار گروہوں کے ذریعے ممکن تھا، ان کے بننے کی پہلی شرط یہ تھی کہ بالغ نروں میں ایک دوسرے کے لئے رواداری ہو اور رشک و رقابت کا جذبہ ختم ہو چکا ہو۔ اور سچ پوچھئے تو خاندان کی وہ سب سے ابتدائی شکل کون سی ہے جس کا پکا ثبوت تاریخ میں ملتا ہو اور جو آج بھی کہیں دیکھنے میں آتی ہے؟ وہ گروہ‌وار شادی ہے جس

میں مردوں کا پورا کا پورا گروہ اور عورتوں کا پورا گروہ ایک دوسرے سے تعلق رکھتا ہے، جس میں رشک و رقابت کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔ اور پھر ارتقا کے ایک اور بعد کے دور میں کثرت شوہری کی مستثنی صورت ملتی ہے جو رشک و رقابت کے جذبے کے بالکل منافی ہے اور اس لئے جانوروں میں بالکل نہیں پائی جاتی۔ لیکن گروہ وار شادی کی جو شکلیں ہمیں ملتی ہیں، ان کے ساتھ ایسے پیچیدہ حالات وابستہ ہوتے ہیں کہ لازمی طور پر ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے پہلے جنسی تعلق کی کچھ ان سے بھی زیادہ ابتدائی اور سادہ شکلیں رہی ہونگی۔ اور اس طرح، آخری تجزیہ میں، ہم آزاد جنسی تعلق کے ایک دور میں پہنچ جاتے ہیں جو حیوانیت سے انسانیت کی طرف تغیر کا دور بھی تھا۔ جانوروں میں شادی کی شکلوں کا حوالہ دے کر ہم ایک بار پھر اسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے یہ سمجھا گیا تھا کہ ہم ہمیشہ کے لئے آگے بڑھ چکے ہیں۔

تو پھر آزاد جنسی تعلق کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کل جنسی تعلقات پر جو پابندیاں لگی ہوئی ہیں، یا جو اب سے پہلے کے زمانوں میں لگی ہوئی تھیں، وہ اس وقت نہیں تھیں۔ ہم رشک و رقابت کی دیواروں کو گرتے ہوئے دیکھ چکے ہیں۔ اگر کوئی بات یقینی ہے تو وہ یہ کہ رشک و رقابت کا جذبہ نسبتاً بعد کے زمانے کی پیداوار ہے۔ قریبی رشتہ‌داروں سے جنسی تعلق کے تصور پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ نہ صرف شروع میں بھائی بہن شوہر اور بیوی کی حیثیت سے رہتے تھے بلکہ کئی انسانی گروہوں میں آج بھی والدین اور اولاد میں جنسی تعلقات جائز سمجھے جاتے ہیں۔ بینکرافٹ نے اپنی کتاب ''شمالی امریکہ کی ساحل پیسفک کی ریاستوں کی نسلیں،، * میں بتایا ہے کہ آبنائے بیرنگ کے کاویات لوگوں میں، الاسکا کے نزدیک رہنے والے کادیاک لوگوں میں، اور برطانوی شمالی امریکہ کے اندرونی علاقے کے طینہ لوگوں میں اس کا رواج اب بھی پایا

* Bancroft H.H., «The Native Races of the Pacific States of North America». Vols. I—V. New York, 1875. (ایڈیٹر)

جاتا ہے ۔ لیتورنیو نے بھی بتایا ہے کہ چھپیوا قبیلے کے انڈین لوگوں میں، چلی کے رہنےوالے کوکوس لوگوں میں، کیرے بین (۱۱۰) اور ہند چین کے کرین لوگوں میں بھی اس کا وجود پایا جاتا ہے ۔ پارتھویوں، ایرانیوں، سکائی‌تھنوں اور ہنوں وغیرہ کے بارے میں جو روایتیں قدیم یونانیوں اور رومیوں میں ملتی تھیں، ان میں بھی اس چیز کا ذکر ملتا ہے ۔ اس اصول کے اختراع سے پہلے کہ محرمات میں جنسی تعلق معیوب ہے (اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک اختراع ہے اور نہایت مفید اور اہم ہے) والدین اور ان کی اولاد کے درمیان جنسی تعلقات، الگ الگ پشتوں کے مختلف افراد کے جنسی تعلقات سے زیادہ قابل نفرت نہیں ہو سکتے تھے ۔ دو مختلف پیڑھیوں کے افراد کے درمیان جنسی تعلق تو آج انتہائی تنگ نظر، اخلاق پرست ملکوں میں بھی پایا جاتا ہے اور اس پر کسی خاص نفرت کا اظہار بھی نہیں کیا جاتا ۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ساٹھ برس سے اوپر کی ''دوشیزائیں،، بھی، اگر کافی دولت‌مند ہوں تو تیس برس کے قریب کے نوجوانوں سے شادی کرتی ہیں ۔ لیکن خاندان کی ان قدیم‌ترین شکلوں سے جو ہمیں معلوم ہیں، اگر ہم محرمات کے ساتھ جنسی تعلق کے تصور کو جو ان سے وابستہ ہیں (جو تصور ہمارے اپنے تصورات سے بالکل مختلف اور اکثر صورتوں میں بالکل متضاد ہیں) الگ کر دیں، تو جنسی تعلق کی ایک ایسی شکل رہ جاتی ہے جس کو آزاد جنسی تعلق کا ہی نام دیاجا سکتا ہے ۔ آزاد جنسی تعلق اس‌لئے کہ رسم‌ورواج نے آگے چل کر جو پابندیاں لگائیں ان کا اس وقت کوئی وجود نہیں تھا ۔ لیکن اس سے یہ کوئی لازمی نتیجہ نہیں نکلتا کہ روز اندھادھند آزاد جنسی تعلق کا بازار گرم رہتا تھا ۔ ایک محدود مدت کےلئے الگ الگ جوڑے بنا کر رہنے کا رواج عقل یا امکان سے باہر نہیں تھا ۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ گروہ وار شادی میں بھی اب زیادہ‌تر ایسے ہی جوڑے دیکھنے میں آتے ہیں ۔ وسٹرمارک نے سب سے بعد میں خاندان کی اس قدیم شکل کو ماننے سے انکار کیا ہے ۔ اگر اس کی تعریف کے مطابق ہر وہ تعلق شادی ہے جس میں مرد اور عورت بچہ پیدا ہونے تک ساتھ رہتے ہیں، تو کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح

کی شادی آزاد جنسی تعلق کی حالتوں میں بھی ہو سکتی تھی، اور وہ آزاد جنسی تعلق، یعنی جنسی تعلق پر رسم‌ورواج کی لگائی ہوئی پابندیوں کے نہ ہونے کی ضد نہیں تھی۔ وسٹرمارک بلاشبہ یہ نقطۂ‌نظر لے کر چلا ہے کہ

''آزاد جنسی تعلق کا مطلب ہے کہ انفرادی رجحانات کو دبانا پڑتا ہے،، اور اس لئے ''اس کی سب سے سچی شکل عصمت‌فروشی ہے۔ ،،

اس کے برعکس میرا خیال یہ ہے کہ جب تک ہم قدیم حالات کو چکلہ گھروں کی عینک سے دیکھنا بند نہیں کریں‌گے، تب‌تک ہم انہیں بالکل نہیں سمجھ سکیں‌گے۔ گروہ‌وار شادی پر غور کرتے وقت ہم اس بات کا پھر ذکر کرنےوالے ہیں۔

مارگن کی رائے میں آزاد جنسی تعلق کی اس ابتدائی حالت سے، شاید بہت شروع میں ہی، خاندان کی یہ شکلیں پیدا ہوئیں:

۱۔ سگوتر یا یک‌جدی خاندان۔ یہ خاندان کی پہلی منزل ہے۔ یہاں شادی پیڑھیوں کے مطابق گروہوں میں ہوتی ہے۔ خاندان کے دائرے کے اندر سبھی دادا اور دادیاں ایک دوسرے کے شوہر اور بیوی ہوتے ہیں۔ ان کے بچوں کی یعنی ماؤں اور باپوں کی بھی یہی حیثیت ہوتی ہے۔ اور ان کے بچوں سے پھر مشترک شوہروں اور بیویوں کا ایک تیسرا دائرہ تیار ہوجاتا ہے۔ ان کے بچے یعنی پہلی پیڑھی کے پڑپوتے اور پڑپوتیاں، چوتھے دائرے کے شوہر اور بیویاں بن جاتے ہیں۔ اس طرح خاندان کی اس شکل میں صرف سلف اور خلف، ماں‌باپ اور ان کے بچے (ہماری آج کل کی زبان میں) ایک دوسرے کے ساتھ شادی کے حقوق اور ذمہ‌داریاں نہیں قبول کر سکتے۔ بھائی بہن، دور اور نزدیک کے چچیرے، ممیرے، پھوپھیرے بھائی بہن سب ایک دوسرے کے بھائی بہن ہوتے ہیں اور ٹھیک اسی لئے وہ سب ایک دوسرے کے شوہر اور بیوی ہوتے ہیں۔ اس منزل پر بھائی بہن کے رشتے میں یہ بات شامل ہے کہ وہ ایک دوسرے کے

ساتھ جنسی تعلق رکھتے ہیں اور یہ عام چلن ہوتا ہے * ۔ ٹھیٹھ صورت میں ایسے خاندان میں ایک جوڑے کی اولاد ہوگی اور پھر ان میں ہر پیڑھی کی اولاد، سب کی سب، ایک دوسرے کی بھائی بہن ہوگی اور

---

* واگنر کی ''نی‌بیلونگ،، (Nibelung) کے متن میں قدیم زمانے کی جو بالکل جھوٹی تصویر کھینچی گئی ہے، اس کے بارے میں مارکس نے ایک خط میں بہت ہی سخت الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ۔ یہ خط اس نے ۱۸۸۲ء کے موسم بہار میں لکھا تھا (۱۱۱) ۔ ''یہ بھلا کسی نے کبھی کاہے کو سنا ہوگا کہ بھائی بہن کو اپنی دلہن بنا کر سینے سے لگالے؟،، (۱۱۲) واگنر کے ان ''شہوت‌پرست خداؤں،، کو، جو بالکل نئے ڈھنگ سے اپنے معاملات عشق میں محرمات کے ساتھ جنسی تعلق کا نمک مرچ بھی لگالیا کرتے تھے، مارکس نے یہ جواب دیا کہ ''قدیم زمانے میں بہن ہی بیوی ہوتی تھی اور یہی اخلاقاً جائز سمجھا جاتا تھا،، ۔ (۱۸۸۴ء کے ایڈیشن کے لئے اینگلس کا نوٹ) ۔

واگنر کے ایک فرانسیسی دوست اور مداح بونیئے اس نوٹ سے متفق نہیں ہیں ۔ وہ اس بات کا حوالہ دیتے ہیں کہ ''ایلڈر ایڈا،، (Edda) میں بھی، جسے واگنر نے اپنا نمونہ بنایا تھا، ''آگسدریکا،، (Ogisdrecka) میں (۱۱۳) لوکی، فرےیا کو الزام دیتا ہے کہ ''تیرا اپنا بھائی دیوتاؤں کے سامنے تجھ سے ہم‌آغوش ہوا ہے،، ۔ ان دوست کا دعوی ہے کہ اس وقت تک بھائی اور بہن کی شادی کی ممانعت ہو چکی تھی ۔ ''آگسدریکا،، اس زمانے کی ترجمان ہے جب پرانی دیومالا میں لوگوں کا عقیدہ ختم ہو چکا تھا ۔ یہ دیوتاؤں پر سچ‌مچ لوکیان کے طرز کا طنز ہے ۔ اگر لوکی میفسٹوفیلیس (ورغلانے‌والے شیطان ۔ مترجم) کی صورت میں اس طرح فرےیا کو الزام دیتا ہے، تو یہ بات واگنر کے خلاف پڑتی ہے ۔ چند بندوں کے بعد لوکی، نیورد سے بھی کہتا ہے : ''اپنی بہن سے تمہارے (ایسا) ایک لڑکا ہوا،، (vidh systur thinni gaztu slikan mög) ۔ یہ صحیح ہے کہ نیورد آسا نسل کا نہیں بلکہ وانا نسل کا تھا (۱۱۴) اور ''اینگلینگ کی رزمیہ

ٹھیک اسی وجہ سے وہ سب کے سب ایک دوسرے کے شوہر بیوی ہونگے۔

سگوتر خاندان بالکل مٹ چکا ہے۔ سب سے کم مہذب قوموں میں بھی، جن کا حال تاریخ میں ملتا ہے، خاندان کی اس شکل کا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس کی جانچ کی جا سکے۔ لیکن ہوائی میں سگوتری یا ہم خاندانی کا جو نظام ملتا ہے، اور جو آج بھی پولینیزیا کے سبھی جزیروں میں پھیلا ہوا ہے، وہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ خاندان کی یہ شکل کسی زمانے میں ضرور رہی ہوگی۔ اس میں سگوتری یا ہم‌خاندانی کے ایسے درجے ملتے ہیں جو خاندان کی اس شکل کے اندر ہی پیدا ہو سکتے تھے۔ اور خاندان کا بعد کا تمام تر ارتقا بھی، جو کہ اس شکل کو ایک ضروری ابتدائی منزل کی حیثیت سے لازمی بنا دیتا ہے، ہمیں اسی نتیجے پر پہنچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

۲ - پونالوان خاندان۔ اگر خاندان کی تنظیم میں ترقی کا پہلا قدم یہ تھا کہ والدین اور بچوں میں آپس میں جنسی تعلق کا سلسلہ بند ہوا،

داستان،، میں وہ کہتا ہے کہ وانا دیش میں بھائیوں اور بہنوں کی شادی کا رواج ہے لیکن آساؤں میں ایسا نہیں ہے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وانا آسا سے زیادہ پرانے دیوتا تھے۔ بہرحال نیورد آساؤں کے درمیان اس طرح رہتا تھا جس طرح اپنے برابروالوں کے درمیان رہا جاتا ہے۔ اس‌لئے ''آگسدریکا،، سے اصل میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس زمانے میں نارویائی دیوتاؤں کے رزمیہ داستان (Saga) کا آغاز ہوا، اس زمانے میں بھائیوں اور بہنوں کی شادی، کم سے کم دیوتاؤں میں، مکروہ نہیں مانی جاتی تھی۔ اگر واگنر کی غلطی کو درگذر ہی کرنا ہے تو شاید ''ایڈا،، کے بجائے گوئٹے کا حوالہ دینا بہتر ہوگا کیونکہ گوئٹے نے دیوتا اور اپسرا کے گیت میں عورتوں کے دیوداسی ہونے کے بارے میں ایسی ہی غلطی کی تھی اور اسے آج کل کی عصمت فروشی سے بہت زیادہ ملتا جلتا قرار دیا ہے۔ (۱۸۹۱ء کے ایڈیشن میں اینگلس کا نوٹ۔)

تو اس کا دوسرا قدم یہ تھا کہ بھائی بہنوں میں بھی اس تعلق کو ختم کیا گیا۔ چونکہ بھائی بہنوں کی عمر میں زیادہ فرق نہیں ہوتا اس لئے یہ قدم، پہلے کے مقابلے میں زیادہ اہم اور کہیں زیادہ مشکل تھا۔ یہ قدم رفتہ رفتہ ہی اٹھایا گیا تھا۔ پہلے شائد سگے بھائی بہنوں میں (یعنی جو ایک ماں سے ہوں) جنسی تعلق کو بند کیا گیا ہوگا۔ وہ بھی شائد شروع میں اکا دکا معاملے میں ایسا کیا گیا ہوگا اور بعد میں یہ عام اصول بن گیا ہوگا۔ (جزیرۂ ہوائی میں موجودہ صدی میں بھی اس عام اصول کے استثنا ملتے تھے)۔ اور آخر میں بڑھتے بڑھتے رشتے کے بھائی بہنوں، یا ہماری آج کل کی اصطلاح میں قریب یا دور کے چچیرے، ممیرے، خلیرے اور پھوپھیرے بھائی بہنوں کی شادی پر پابندی لگی ہوگی۔ مارگن کے الفاظ میں ''قدرتی انتخاب کے اصول پر عمل در آمد کی یہ ایک اچھی مثال ہے''۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ جن قبیلوں میں یہ قدم اٹھا کر قریبی رشتہ‌داروں سے جنسی تعلق قائم کرنا اور بچے پیدا کرنا روک دیا گیا، انہوں نے ان قبیلوں کے مقابلے میں کہیں جلدی اور زیادہ مکمل ترقی کی جن میں بھائی بہنوں کی شادی کا رواج تھا اور اسے ضروری فرض سمجھ کر کیا جاتا تھا۔ اور اس قدم کا بڑا زبردست اثر پڑا۔ اس کا ایک ثبوت گنوں کا ادارہ ہے جو براہ راست اسی قدم کا نتیجہ تھا اور اس سے بہت دور نکل گیا تھا۔ گن کا ادارہ بربریت کے عہد میں اگر دنیا کی سب نہیں تو زیادہ‌تر قوموں میں سماجی نظام کی بنیاد تھا اور یونان و روما میں تو ہم اس سے براہ راست تمدن کے عہد میں داخل ہوتے ہیں۔

ہر قدیم خاندان حد سے حد چند پشتوں کے بعد بٹ جاتا تھا۔ بربریت کے درمیانی دور کے آخری حصے تک بھی، ہر جگہ بلااستثنی قدیم کمیونسٹی مشترک گھرانے میں رہنے کا رواج تھا۔ اور اس کی وجہ سے خاندانی برادری کی ایک آخری حد متعین ہو جاتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ کتنی بڑی ہوسکتی ہے۔ اس میں حالات کے مطابق ردوبدل ہو سکتا تھا لیکن ہر جگہ یہ بات بڑی حد تک متعین ہوتی تھی۔ جب ایک ماں کی اولاد میں جنسی تعلق معیوب سمجھا جانے لگا

تو لازم تھا کہ پرانی خاندانی برادریوں کی تقسیم پر اور نئی خاندانی برادری (Hausgemeinden) کی بنیاد پر اس نئے تصور کا اثر پڑے (یہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ خاندانی برداری اور خاندانی گروہ ایک ہی چیز ہو)۔ بہنوں کا ایک یا ایک سے زیادہ گروہ ایک گھرانے کے بنیادی مرکز بن جاتے تھے اور ان کے سگے بھائی دوسرے گھرانے کے۔ اس طریقے سے یا اس ملتے جلتے کسی اور طریقے سے، سگوتری یعنی یک‌جدی خاندان سے ترقی کر کے خاندان کی وہ شکل پیدا ہوئی جس کو مارگن پونالوان خاندان کہتا ہے۔ جزیرۂ ہوائی کے رواج کے مطابق بہت سی بہنوں کے — خواہ وہ سگی بہنیں ہوں یا دو تین درجے تک کی ہم‌جدی بہنیں — مشترک شوہر ہوتے تھے جن کی وہ مشترک بیویاں ہوتی تھیں۔ لیکن ان کے بھائیوں کو اس رشتے سے الگ رکھا جاتا تھا۔ وہ اب ان کے شوہر نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ شوہر لوگ اب ایک دوسرے کو بھائی نہیں کہتے تھے اور سچ پوچھئے تو اب ان کا آپس میں بھائی ہونا ضروری بھی نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے کو ''پونالوا،، کہتے تھے جس کا مطلب ہے یارغار یا ساجھے‌دار۔ اسی طرح سگے یا رشتے کے بھائیوں کے ایک گروہ کی شادی مشترکہ طور پر عورتوں کے ایک گروہ سے ہوتی تھی۔ لیکن یہ عورتیں ان کی بہنیں نہیں ہوتی تھیں اور یہ عورتیں ایک دوسرے کو ''پونالوا،، یعنی سکھی کہا کرتی تھیں۔ خاندان کی بناوٹ کی یہی قدیم کلاسیکی صورت (Familienformation) تھی جس میں آگے چل کر متعدد تبدیلیاں ہوئیں۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ خاندان کے ایک مخصوص دائرے کے اندر سبھی شوہر اور سبھی بیویاں مشترک ہوتی تھیں لیکن بیویوں کے بھائی — ابتدا میں سگے بھائی اور آگے چل کر ہم جدی بھائی بھی — اس دائرے سے الگ رکھے جاتے تھے۔ اور اسی طرح دوسری طرف شوہروں کی بہنیں بھی اس دائرے سے الگ رکھی جاتی تھیں۔

رشتے ناتوں کے وہ سبھی مدارج جن کا اظہار امریکی نظام میں ہوتا ہے، خاندان کی اس شکل میں ہمیں پوری صحت کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ میری ماں کی بہنوں کے بچے اب تک اس کے بھی بچے ہوتے

ہیں - اسی طرح میرے باپ کے بھائیوں کے بچے میرے باپ کے بھی بچے ہوتے ہیں - اور وہ سب میرے بھائی بہن ہوتے ہیں - لیکن میری ماں کے بھائیوں کے بچے اب اس کے بھتیجے بھتیجیاں کہلاتے ہیں اور میرے باپ کی بہنوں کے بچے، اس کے بھانجے بھانجیاں - اور وہ سب میرے ممیرے پھوپھیرے بھائی بہن ہیں - کیونکہ میری ماں کی بہنوں کے شوہر اس کے بھی شوہر ہوتے ہیں اور میرے باپ کے بھائیوں کی بیویاں اس کی بھی بیویاں ہیں — اگر عملاً ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تو اصولاً تو اس کو مانا جاتا ہے — پھر بھی بھائیوں اور بہنوں میں جنسی تعلق کی سماجی ممانعت کی وجہ سے اب رشتے کے بھائی بہن جو اب تک بلا امتیاز اپنے بھائی بہن سمجھے جاتے تھے، اب دو درجوں میں بٹ جاتے ہیں - کچھ تو پہلے کی طرح ہم جدی بھائی بہن رہتے ہیں - باقی کو یعنی ایک طرف بھائیوں کی اولاد کو اور دوسری طرف بہنوں کی اولاد کو اب آپس میں بھائی بہن نہیں کہا جا سکتا - ان کے والدین یا ماں باپ میں سے کوئی ایک یا دونوں مشترک نہیں ہو سکتے اور اس لئے پہلی بار یہ ضروری ہوا کہ بھانجے بھانجیوں، بھتیجے بھتیجیوں اور ممیرے، پھوپھیرے بھائی بہنوں کا امتیاز قائم کیا جائے جو پہلے کے خاندانی نظام میں بےمعنی ہوتا - سگوتری یا ہمخاندانی کا امریکی نظام، خاندان کی ہر اس شکل میں جس کی بنیاد انفرادی شادی پر ہو، نہایت مہمل اور بےمعنی معلوم ہوتا ہے - لیکن پونالوان خاندان کی بنیاد پر اس نظام کی ایک ایک بات معقول اور فطری ثابت ہوتی ہے - جس حد تک سگوتری یا ہمخاندانی کے اس نظام کا رواج تھا، کم سے کم اسی حد تک، پونالوان خاندان کا یا اس سے ملتی جلتی کسی اور شکل کا رواج رہا ہوگا -

یہ ثابت ہوچکا ہے کہ خاندان کی یہ شکل ہوائی میں موجود تھی اور اگر امریکہ میں اسپین سے گئے ہوئے سابقہ ہسپانوی راہبوں کی طرح کے دھرماتما پادری ان غیرمسیحی رشتوں کو صرف ''بدکاری،، *

* اب اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ بلا فرق و امتیاز جنسی تعلق کے وہ آثار، اس کے نامنہاد «Sumpfzeugung» ، جن کو

نہ سمجھتے تو غالباً سارے پولینیزیا میں خاندان کی یہی شکل موجود ہوتی۔ سیزر کے زمانے میں برطانیہ‌والے بربریت کی درمیانی منزل سے گذر رہے تھے۔ اور جب سیزر ان کے بارے میں کہتا ہے کہ ''دس دس اور بارہ بارہ کے گروہوں میں وہ لوگ مشترک بیویاں رکھتے تھے اور زیادہ‌تر بھائی بھائی مشترک بیویاں رکھتے تھے اور باپ اور بیٹے ساتھ ساتھ،، تو ظاہر ہے کہ یہ بات گروہ وار شادی پر ہی صادق آ سکتی ہے۔ عہد بربریت کی ماؤں کے دس یا بارہ بیٹے اتنے بڑے نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ مشترک بیویاں رکھ سکیں۔ لیکن امریکہ میں پائے جانے والے سگوتری نظام میں جو کہ پونالوان خاندان سے مطابقت رکھتا ہے، بھائیوں کی تعداد بہت بڑی ہوتی ہے کیونکہ ایک آدمی کے دور و نزدیک کے رشتے کے سبھی بھائی سگے بھائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سیزر کا یہ فقرہ ''باپ اور بیٹے ساتھ ساتھ،، شاید غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس نظام میں یہ ناممکن نہیں ہے کہ باپ اور بیٹے یا ماں اور بیٹی شادی کے ایک ہی گروہ میں ہوں، اگرچہ باپ اور بیٹی یا ماں اور بیٹے ایک ہی گروہ میں نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی طرح ہیروڈوٹس اور دوسرے قدیم مصنفوں نے وحشی اور بربر لوگوں میں بیویوں کے مشترک ہونے کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں، وہ بھی گروہ‌وار شادی کی اس شکل یا اس سے ملتی جلتی کسی اور شکل کی بنیاد پر ہی آسانی سے سمجھی جا سکتی ہیں۔ واٹسن اور کئے نے اپنی کتاب ''ہندستان کے باشندے،، *

باخوفن سمجھتا تھا کہ اسی نے سب سے پہلے دریافت کیا ہے، گروہ‌وار شادی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ''اگر باخوفن ان ''پونالوان،، شادیوں کو ''غیرقانونی،، سمجھتا ہے تو اسی طرح اس زمانے کا آدمی آج کل کی، قریب یا دور کے رشتے کے بھائی بہنوں کی آپس کی شادیوں میں سے زیادہ‌تر کو بدکاری یعنی سگوتر بھائیوں اور بہنوں کی شادی سمجھے گا،، (مارکس)۔ (دیکھئے ''مارکس اور اینگلس کی دستاویزات،، جلد ۹، صفحہ ۱۸۷۔)

* Watson J.F. and Kaye J.W., «The People of India». Vols. I-VI. London, 1868—1872. (ایڈیٹر)

میں دریائے گنگا کے شمال میں رہنےوالے اودھ کے ٹھاکروں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ

''وہ بڑی تعداد میں تقریباً بغیر کسی فرق اور امتیاز کے،، (یعنی جنسی مفہوم میں) ''ساتھ رہتے ہیں اور جب دو آدمیوں کی شادی ہوتی ہے تو یہ رشتہ محض برائے نام ہوتا ہے۔ ،،

زیادہ تر صورتوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گن کے ادارے کی ابتدا براہراست پونالوان خاندان سے ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ آسٹریلیا کا شادی بیاہ کا طبقاتی نظام بھی اس کا نقطۂ آغاز ہو سکتا تھا (۱۱۵)۔ آسٹریلیا کے باشندوں میں گن موجود ہیں لیکن ان میں پونالوان خاندان کا وجود نہیں ہے۔ ان کے یہاں گروہوار شادی کی ایک اور زیادہ بھونڈی شکل ملتی ہے۔

گروہوار خاندان کی سبھی شکلوں میں جہاں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بچے کی ماں کون ہے وہاں کہیں بھی اس کا یقین نہیں ہوتا کہ اس کا باپ کون ہے۔ اگرچہ عورت اپنے پورے خاندان کے سبھی بچوں کو اپنا کہتی ہے اور سب کے ساتھ ماں کا سا برتاؤ کرتی ہے، پھربھی وہ یہ جانتی ہے کہ کون اس کے اپنے بطن سے ہے اور کون نہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جہاں کہیں گروہوار شادیوں کا رواج ہوتا ہے وہاں صرف ماں کی اولاد کا پتہ چلتا ہے اس‌لئے نسل صرف ماں سے چلتی ہے۔ سبھی وحشی قوموں میں اور ان قوموں میں بھی جو بربریت کے ابتدائی دور میں ہیں، یہی بات پائی جاتی ہے۔ باخوفن کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسی نے پہلے پہل یہ بات دریافت کی۔ محض ماں کی جانب سے نسل کا سلسلہ اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی بنیاد پر وراثت کے جو رشتے قائم ہوئے، ان کو وہ مادری حق کا نام دیتا ہے۔ اختصار کی خاطر میں اسی اصطلاح کو برقرار رکھنا چاہتا ہوں حالانکہ یہ لفظ کوئی بہت موزوں نہیں کیونکہ سماج کی ترقی کے اس منزل پر قانونی مفہوم میں حقوق کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

اگر پونالوان خاندان کے دو مخصوص گروهوں میں سے هم ایک گروه کو لےلیں یعنی اس گروه کو جس میں کئی ماں جانیاں اور رشتے کی بہنیں هوتی هیں (یعنی وہ جو سگی بہنوں کی اولاد هیں، پہلی، دوسری پشت اور آگے تک) اور جس میں ان کے ساتھ ان کے بچے اور ماں کی طرف سے ان کے سگے اور رشتے کے بھائی بھی شامل هوتے هیں (جو همارے مفروضے کے مطابق ان کے شوهر نہیں هو سکتے) تو یہ انہیں اشخاص کا دائرہ هوگا جو گن کی ابتدائی شکل میں اس ادارے کے رکن هوتے هیں۔ ان سبھوں کی مشترک مورث اعلی ایک عورت هوتی هے۔ اس کے کنبے کی لڑکیاں اس کی اولاد هونے کی وجه سے هر پشت میں ایک دوسرے کی بہنیں هوتی هیں۔ لیکن ان بہنوں کے شوهر اب ان کے بھائی نہیں هو سکتے یعنی وہ اس مورث اعلی عورت کی اولاد نہیں هو سکتے اور اس لئے وہ اس سگوتری گروه میں جو آگے چل کر گن بنا، شامل نہیں هو سکتے۔ لیکن ان کے بچے اس گروه میں شامل هیں کیونکه ماں کی نسل هی فیصله کن هے اور یہ اس لئے که صرف اسی کا یقین هے۔ جب ایک مرتبه سبھی ماں جائے بھائیوں اور بہنوں میں اور ان میں بھی جو ماں کی طرف سے دور کے رشتے کے بھائی بہن هیں، جنسی تعلقات پر روک لگا دی جاتی هے تو یہی گروه گن میں بدل جاتا هے — یعنی ماں کی جانب سے رشتهداروں کا ایک نہایت محدود حلقه بن جاتا هے جنہیں آپس میں شادی کرنے کی اجازت نہیں هوتی۔ اور اس وقت سے یه دوسرے عام سماجی اور مذهبی اداروں سے اپنے آپ کو برابر تقویت پہونچاتا رهتا هے اور اپنے قبیلے کے دوسرے گنوں سے اپنے کو علحدہ کرتا جاتا هے۔ آگے چل کر هم اس پر زیادہ تفصیل سے غور کریں گے۔ لیکن جب هم پاتے هیں که پونالوان خاندان سے گن کا ارتقا محض منطقی ضرورت کے طور پر هی ثابت نہیں بلکه ظاهر بھی هے تو پھر تقریباً پورے وثوق کے ساتھ یه کہنے کی بنیاد مل جاتی هے که ان تمام قوموں میں جن میں گن کا سراغ ملتا هے یعنی تقریباً سبھی غیر متمدن اور متمدن قوموں میں پہلے خاندان کی یه شکل موجود تھی۔

جس وقت مارگن نے اپنی کتاب لکھی تھی اس وقت تک گروهوار

شادی کے بارے میں ہماری واقفیت بہت کم تھی۔ اس وقت آسٹریلیا کے باشندوں میں، جو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے، گروہ‌وار شادی کے رواج کے بارے میں کچھ باتیں معلوم تھیں۔ اس کے علاوہ مارگن نے ۱۸۷۱ء میں وہ ساری چیزیں شائع کر دی تھیں جو اسے ہوائی کے پونالوان خاندان کے بارے میں معلوم ہو سکیں۔ پونالوان خاندان سے ایک طرف تو امریکی انڈینوں میں پایا جانےوالا سگوتری یا ہم‌خاندانی کا نظام پوری طرح سمجھ میں آ جاتا تھا اور اسی نظام سے مارگن کی تمام چھان‌بین کی ابتدا ہوئی تھی۔ دوسری طرف اس سے مادری حق‌والے گن کے ارتقا کی پہلی کڑی مل جاتی تھی۔ اور آخر میں، وہ آسٹریلیا کے طبقوں کے مقابلے میں ارتقا کی زیادہ اونچی منزل کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ مارگن نے کیوں پونالوان خاندان کو، جوڑا خاندان سے پہلے کی، ارتقا کی ایک ضروری منزل قرار دیا۔ اور یہ بھی مان لیا کہ پہلے زمانے میں اس کا عام رواج تھا۔ اس کے بعد ہمیں گروہ وار شادی کی اور بھی کئی شکلوں کا پتہ چلا ہے اور اب ہم جانتے ہیں کہ اس معاملے میں مارگن حد سے زیادہ آگے بڑھ گیا تھا۔ پھر بھی خوش قسمتی سے اس کو اپنے پونالوان خاندان میں گروہ‌وار شادی کی اعلیٰ ترین اور بنیادی (کلاسیکی) شکل مل گئی جس سے ایک زیادہ اونچی منزل کی طرف خاندان کے ارتقا کو زیادہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

گروہ‌وار شادی کے متعلق ہم اپنی معلومات میں سب سے زیادہ بنیادی اضافے کے لئے ایک انگریز پادری لاریمر فیسون کے احسان مند ہیں۔ اس نے شادی کی اس شکل کا مطالعہ برسوں اس کے اصلی وطن آسٹریلیا میں رہ کر کیا تھا۔ اسے جنوبی آسٹریلیا میں ماؤنٹ گمبیر کے علاقے میں رہنےوالے حبشیوں میں اس کے ارتقا کا سب سے ابتدائی دور ملا تھا۔ وہاں پورا قبیلہ دو بڑے طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک کا نام تھا کروکی اور دوسرے کا کومائٹ۔ ان میں سے ہر طبقے کے اندر آپس میں جنسی تعلقات کی سخت ممانعت تھی۔ اس کے برعکس ایک طبقے کا ہر مرد دوسرے طبقے کی ہر عورت کا پیدائشی شوہر اور وہ اس کی پیدائشی بیوی ہوتی تھی۔ افراد کا نہیں بلکہ پوری کی پوری

جماعت کا، پورے کے پورے طبقے کا، ایک دوسرے کے ساتھ بیاہ ہوتا تھا۔ اور یہ خیال رہے کہ یہاں عمر کے فرق یا کسی خاص خونی رشتے کی وجہ سے کوئی پابندی نہیں لگتی تھی۔ پابندی صرف ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ اپنے طبقے کے اندر کسی کے ساتھ جنسی تعلق نہیں ہو سکتا تھا۔ کوسائٹ طبقے کی ہر عورت کروکی طبقے کے ہر مرد کی بیوی تھی اور چونکہ مادری حق کی رو سے کوسائٹ عورت کے بطن سے پیدا ہونے والی لڑکی بھی کوسائٹ تھی، اس لئے وہ لڑکی بھی کروکی طبقے کے ہر مرد کی، جس میں اس کا باپ بھی شامل تھا، پیدائشی بیوی تھی۔ بہرحال اس طبقاتی تنظیم نے، جیسا کہ ہم اس کو جانتے ہیں، یہاں اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ اس لئے یہ تنظیم یا تو ایک ایسے زمانے میں قائم ہوئی ہوگی جبکہ بہت قریبی رشتہ‌داروں کے ساتھ جنسی تعلق پر پابندی لگانے کی تمام‌تر دھندلی خواہشات کے باوجود ماں باپ اور بچوں کے جنسی تعلق کو بہت زیادہ معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا — اور ایسی صورت میں یہ طبقاتی نظام براہ راست آزاد جنسی تعلق کی حالت سے پیدا ہوا ہوگا — یا پھر طبقوں کے قائم ہونے سے پہلے ہی ماں باپ اور بچوں کے جنسی تعلق پر رسم و رواج نے پابندی لگا رکھی ہوگی اور ایسی صورت میں موجودہ حالت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے پہلے سگوتر خاندان قائم تھا اور یہ موجودہ حالت اس کے بعد ارتقا کی پہلی منزل تھی۔ یہ دوسرا مفروضہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آسٹریلیا میں والدین اور اولاد کے درمیان جنسی تعلق کی کوئی مثال نہیں ملی ہے۔ عام طور پر گوت‌باہر شادی کی بعد کی شکل، یعنی مادری حق والے گن کے وجود کے لئے یہ لازمی شرط ہے کہ ایسے تعلقات کی جو ممانعت تھی وہ اس کے قائم ہونے سے پہلے سے موجود ہو۔

جنوبی آسٹریلیا کے ماؤنٹ گمبیر کے علاوہ یہ دو طبقےوالا نظام اس سے اور زیادہ مشرق میں دریائے ڈارلنگ کے کنارے اور شمال مشرق میں کوئنس‌لینڈ میں بھی پایا جاتا ہے۔ غرضکہ یہ نظام دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس نظام میں صرف ماں جائے بھائی بہنوں

میں، بھائیوں کی اولاد میں اور ماں کی طرف سے بہنوں کی اولاد میں شادی کرنا منع ہے کیونکہ یہ سب ایک ہی طبقے میں شامل ہیں۔ اس کے برعکس بھائی بہن کے بچوں میں شادی کی اجازت ہے۔ بہت قریبی رشتہ‌داروں میں شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے پر پابندی لگانے کے لئے، دریائے ڈارلنگ کے ساحل پر نیو ساؤتھ ویلس میں کمیلاروئی قبیلے میں اور بھی کئی قدم اٹھائے گئے تھے۔ وہاں پرانے دو طبقے بٹ کر چار ہو گئے تھے اور ان چار طبقوں میں سے ہر طبقے کی شادی دوسرے کسی ایک طبقے کے ساتھ ہوتی تھی۔ پہلے دو طبقے پیدائشی طور پر ایک دوسرے کے شوہر اور بیوی ہوتے تھے۔ ان کے بچے تیسرے یا چوتھے طبقے میں شامل ہو جاتے جس کا انحصار اس بات پر تھا کہ ماں کا تعلق پہلے طبقے سے ہے یا دوسرے سے۔ اسی طرح تیسرے اور چوتھے طبقے کی شادی ایک دوسرے کے ساتھ ہوتی تھی اور ان کی اولاد پھر پہلے یا دوسرے طبقے میں شامل ہوتی۔ اس طرح ایک پشت کے لوگ ہمیشہ پہلے اور دوسرے طبقے میں ہوتے تھے اور دوسری پشت کے لوگ ہمیشہ تیسرے اور چوتھے میں۔ اور اس کے بعد کی پشت کے لوگ پھر پہلے یا دوسرے طبقے میں ہوتے تھے۔ اس نظام میں ماں کی جانب سے (یعنی ممیرے، خلیرے) بھائیوں اور بہنوں کے بیٹے بیٹیوں میں شادی نہیں ہو سکتی لیکن ان کے پوتے پوتیوں میں ہو سکتی ہے۔ یہ ایک عجیب پیچیدہ نظام ہے جس کی پیچیدگی اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس پر، بہر صورت آگے چل کر، مادری حق والے گن کا پیوند لگا دیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں ہم اس تفصیل میں نہیں جائیں‌گے۔ مختصر یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت قریبی رشتہ‌داروں میں شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کے رواج پر پابندی لگانے کا جذبہ بار بار اثرانداز ہوتا رہا ہے لیکن مقصد کا واضح احساس نہ ہونے کی وجہ سے وہ آپ ہی آپ گویا اندھیرے میں راستہ ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔

گروہ‌وار شادی آسٹریلیا میں اب بھی طبقہ‌وار شادی ہے، جس میں مردوں کے پورے طبقے کی جو اکثر اس براعظم کے طول و عرض میں بکھرا ہوا ہوتا ہے، عورتوں کے ایک پورے طبقے سے جو اسی

طرح بکھرا ہوتا ہے، شادی ہوتی ہے۔ یہ گروہوار شادی زیادہ نزدیک سے دیکھنے پر اتنی بھیانک اور قابل‌نفرت نہیں معلوم ہوگی جتنی ان کم ظرفوں کو معلوم ہوتی ہے جن کے خیالات چکلہ گھروں کے تصور سے داغدار ہو چکے ہیں۔ اس کے برعکس کتنے ہی برس گذر گئے تھے مگر کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ گروہوار شادی جیسی کوئی چیز ہے۔ اور سچ پوچھئے تو ابھی حال میں پھر اس کے وجود کو ماننے سے انکار کیا گیا ہے۔ سطحی نظر سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک قسم کی ڈھیلی ڈھالی یک‌زوجگی ہے اور کہیں کہیں کثرت ازدواج ہے جس میں کبھی کبھار بےوفائی بھی کی جاتی ہے۔ ان ازدواجی تعلقات کو متعین کرنےوالے قانون کا پتہ لگانے کے لئے برسوں مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے جیسا کہ فیسون اور ہاوٹ نے کیا تھا* (اپنی عملی شکل میں تو ان تعلقات میں ایک عام یورپین کو وہی چیز نظر آتی ہے جو خود اس کے اپنے ملک میں رائج ہے) جس قانون کے مطابق آسٹریلیا کا ایک حبشی جب ایک خیمے سے دوسرے خیمے میں اور ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں گھومتا ہوا اپنے وطن سے ہزاروں میل دور، اجنبی لوگوں میں پہونچ جاتا ہے، جن کی زبان بھی وہ نہیں سمجھ سکتا تو وہاں اسے اکثر ایسی عورتیں مل جاتی ہیں جو نہایت معصومیت کے ساتھ اور بلا کسی جبر و اکراہ کے اپنے آپ کو اس کے سپرد کردیتی ہیں، اور جس قانون کے مطابق ایک شخص جس کی کئی بیویاں ہوں، اپنی ایک بیوی کو رات میں اپنے مہمان کے پاس بھیج دیتا ہے۔ جہاں یورپ‌والوں کو محض بد کرداری اور بےراہ‌روی اور بےقانونی نظر آتی ہے، وہاں دراصل قانون کی پوری فرماں روائی ہے۔ وہ عورتیں اس اجنبی مرد کے ازدواجی طبقے سے تعلق رکھتی ہیں اور اس‌لئے اس کی پیدائشی بیویاں ہیں۔ وہی اخلاقی قانون جو ان کو ایک دوسرے کےلئے جائز کرتا ہے وہی قانون ازدواجی طبقے

---

* Fison L. and Howitt A.W., «Kamilaroi and Kurnai», Melburne, Sydney, Adelaide and Brisbane. 1880. (ایڈیٹر)

سے باہر جنسی تعلقات پر پابندی لگاتا ہے اور اس کی خلاف‌ورزی پر ذات برادری اور قبیلے سے باہر کرنے کی سزا دیتا ہے۔ جب کبھی عورتوں کو اغوا کیا جاتا ہے، جیسا بعض جگہ اکثر ہوتا ہے اور بعض علاقوں میں ہمیشہ ہی ہوتا ہے، تو اس میں بھی سختی کے ساتھ اس طبقہ‌واری قانون کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

یہاں عورتوں کے اغوا سے یہ ظاہر ہونے لگتا ہے کہ انفرادی شادی کی طرف قدم اٹھایا جا چکا ہے۔ کم سے کم جوڑا شادی کی صورت میں تو یہاں اس کی ایک جھلک ملتی ہی ہے۔ ایک نوجوان مرد جب خود یا اپنے دوستوں کی مدد سے لڑکی کو اغوا کرکے لے جاتا ہے تو یکے بعد دیگرے وہ سب اس کے ساتھ ہم بستری کرتے ہیں۔ لیکن بیوی وہ اسی نوجوان کی سمجھی جاتی ہے جس نے اس کو اغوا کیا ہے۔ اور اس کے برعکس اگر وہ اغوا کی ہوئی عورت اس مرد کے پاس سے بھاگ جائے اور دوسرے مرد کے ہاتھوں میں پڑ جائے تو وہ اس دوسرے کی بیوی ہو جائے گی اور پہلے مرد کا حق ختم ہو جائے گا۔ غرضکہ گروہ‌وار شادی کے نظام میں، جو عام طور پر ابھی تک قائم ہے، اس کے پہلو بہ پہلو اور اس کے اندر انفرادی رشتے، زیادہ یا کم عرصے کے لئے جوڑا بنا کر رہنے اور کئی کئی بیویاں رکھنے کا رواج بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ گروہ‌وار شادی کا نظام یہاں بھی رفتہ رفتہ مٹ رہا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ یورپ کے اثر کی وجہ سے پہلے کون مٹے گا — گروہ‌وار شادی کا نظام یا آسٹریلیا کے حبشیوں کی یہ نسل جس میں اس کا رواج ہے۔

بہرحال ، پورے کے پورے طبقوں کی شادی، جس کا رواج آسٹریلیا میں پایا جاتا ہے، گروہ‌وار شادی کی سب سے ادنی اور ابتدائی شکل ہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے پونالوان خاندان اس کے ارتقا کی سب سے اعلی شکل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی شکل کا تعلق خانہ بدوش وحشیوں کی سماجی حالت سے ہے اور دوسری کے لئے قدیم کمیونسٹی برادریوں کی کم و بیش مستقل بستیاں ضروری تھیں۔ اور اس کے بعد ہم براہ راست ارتقا کی دوسری اور اس سے اعلی منزل میں پہنچ جاتے ہیں۔ بلا شک ان دونوں کے بیچ میں ارتقا کی چند درمیانی

منزلیں بھی ملیں‌گی لیکن ابھی تو ہم نے تحقیق و تفتیش کا دروازہ کھولا ہی ہے۔

۳۔ جوڑا خاندان۔ کم یا زیادہ عرصے کے لئے جوڑا بنا کر رہنے کا رواج گروہ‌وار شادی کے دنوں میں ہی یا اس سے کچھ پہلے شروع ہو چکا تھا۔ مرد کی کئی کئی بیویاں ہوتی تھیں جن میں ایک خاص بیوی ہوتی تھی (جس کو سب سے چہیتی بیوی کہنا دشوار ہوگا) اور عورت کے متعدد شوہروں میں وہ اس کا خاص شوہر ہوتا تھا۔ یہ بھی ایک وجہ تھی جس سے پادریوں کو بڑی الجھن ہوئی۔ انہیں گروہ‌وار شادی میں کبھی بیویوں کی عام ساجھےداری اور آزاد جنسی تعلق دکھائی دیا اور کبھی محض زناکاری نظر آئی۔ لیکن جیسے جیسے گن کی ترقی ہوئی اور ایسے ''بھائیوں،، اور ''بہنوں،، کے طبقے بڑھتے گئے جن میں شادی نہیں ہو سکتی تھی ویسے ویسے لوگوں کی جوڑوں میں رہنے کی عادت بھی لازمی طور پر بڑھتی گئی۔ گن نے خون کے رشتہ‌داروں میں شادی کو روکنے کے رجحان کو تقویت دے کر، اس چیز کو اور آگے بڑھایا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایروکواس اور امریکہ کے اکثر دوسرے انڈین قبیلوں میں جو بربریت کے ابتدائی دور میں ہیں، ان سبھی رشتہ‌داروں میں شادی کی ممانعت ہے جن کو ان کا نظام رشتہ‌دار مانتا ہے۔ اور ایسے رشتہ‌داروں کی کئی سو قسمیں ہیں۔ شادی پر پابندیوں کی اس بڑھتی ہوئی پیچیدگی نے گروہ‌وار شادی کو زیادہ سے زیادہ ناممکن بنا دیا۔ اس کی جگہ جوڑا بنا کر رہنےوالا خاندان آیا۔ اس میں ایک مرد اور ایک عورت ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن مرد کو کئی بیویاں کرنے اور گاہے بگاہے بےوفائی کرنے کا حق رہتا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح ہے کہ معاشی وجہوں سے کئی شادیوں کے حق سے بہت کم مرد فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دوسری طرف عورت جب تک ساتھ رہتی ہے، اس سے پوری وفاداری کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اسے زناکاری کی نہایت سخت سزا دی جاتی ہے۔ لیکن مرد عورت جب چاہیں آسانی سے شادی کے اس رشتے کو توڑ سکتے ہیں اور بچے پہلے کی طرح اب بھی صرف ماں کے ہونگے۔

خون کے رشتہ‌داروں میں آپس میں شادی پر پابندیاں برابر بڑھتی جا رہی تھیں ۔ اور اس میں قدرتی انتخاب کا اصول بھی اپنا اثر دکھا رہا تھا ۔ مارگن کے لفظوں میں

''سگوتری باہر گنوں میں شادی کی وجہ سے جسمانی اور ذہنی اعتبار سے زیادہ تنومند اور قوی نسل پیدا ہوئی ۔ جب دو ترقی‌پذیر قبیلے مل کر ایک ہوتے ہیں تو ... ایک نئی کھوپڑی اور دماغ کی نشوونما ہوتی ہے جس کی لمبائی اور چوڑائی دونوں کی صلاحیتوں کے برابر ہوتی ہے'' ۔ *

چنانچہ گن کی بنیاد پر جو قبیلے قائم ہوئے انہوں نے اپنے سے زیادہ پسماندہ قبیلوں پر فوقیت حاصل کر لی یا اپنی مثال کے زور سے انہیں اپنے نقش قدم پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا ۔

غرضکہ ماقبل تاریخی زمانے میں خاندان کے ارتقا کی صورت یہ تھی کہ وہ دائرہ جس کے اندر مرد اور عورت کو آپس میں شادی کرنے کی آزادی تھی، روز بروز محدود ہوتا جا رہا تھا ۔ شروع میں پورا قبیلہ اس دائرے میں آ جاتا تھا ۔ لیکن آگے چل کر پہلے قریبی اور پھر دور کے رشتہ‌دار اس دائرے سے نکال دئے گئے اور آخر میں تو وہ لوگ بھی اس دائرے سے خارج کر دئے گئے جن سے محض شادی کا رشتہ تھا، یہاں تک کہ عملاً ہر قسم کی گروہ‌وار شادی ناممکن ہو گئی ۔ اور آخر میں صرف ایک چیز رہ گئی، ایک عورت اور ایک مرد کا جوڑا بنا کر رہنا ۔ ان میں اس وقت بہت ہی ڈھیلا ڈھالا تعلق ہوتا تھا ۔ یہ گویا ایک یونٹ رہ گیا تھا جس کے منتشر ہونے پر سرے سے شادی ہی مٹ جاتی ۔ اسی ایک بات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ جب یک‌زوجگی کی ابتدا ہوئی تو موجودہ مفہوم میں انفرادی جنسی محبت کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا ۔ اس دور کے لوگوں کا رویہ دیکھئے تو یہ بات اور بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ

---

* مزید ملاحظہ ہو ''مارکس اور اینگلس کی دستاویزات''، جلد ۹، صفحہ ۲۸ ۔ (ایڈیٹر)

جاتی ہے ۔ خاندان کی پہلے کی شکلوں میں مردوں کو کبھی عورتوں کی کمی نہیں ہوئی تھی بلکہ ضرورت سے زیادہ عورتیں ہوتی تھیں ۔ لیکن اب اس کے برعکس عورتوں کی کمی ہو گئی اور ان کی جستجو ہونے لگی ۔ اس لئے جوڑا بنانے کے رواج کے ساتھ ساتھ عورتوں کو اغوا کرنے اور ان کو خریدنے کا سلسلہ شروع ہوا ۔ یہ باتیں اپنے سے کہیں زیادہ گہری تبدیلی کا پتہ دے رہی تھیں ۔ لیکن اس علامت سے زیادہ ان کی اور کوئی اہمیت نہیں تھی ۔ لیکن ان علامتوں کو، عورتوں کو حاصل کرنے کے ان مختلف طریقوں کو، اسکاٹلینڈ کے ایک کٹھ ملا میکلینن نے مختلف قسم کے خاندانوں کی حیثیت دے دی ۔ ان کو اس نے ''اغوا کے ذریعہ شادی،، اور ''خرید و فروخت کے ذریعہ شادی،، کا نام دیا ۔ اس کے علاوہ امریکہ کے انڈینوں اور کچھ اور قبیلوں میں بھی (جو ارتقا کے اسی دور میں ہیں) شادی طے کرنا ان دونوں فریق کا کام نہیں جن کی شادی ہوتی ہے بلکہ ان کی رائے تو اکثر پوچھی تک نہیں جاتی ۔ یہ کام ان دونوں کی ماؤں کا ہے ۔ چنانچہ اس طرح اکثر ایسے لوگوں کی منگنی کر دی جاتی ہے جو ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہوتے ہیں اور جنہیں اپنی شادی کی خبر اس وقت ہوتی ہے جب اس کے دن نزدیک آ جاتے ہیں ۔ شادی سے پہلے دولہا کی طرف سے دلہن کے رشتہ‌داروں کو (یعنی اس کی ماں کی طرف کے رشتہ‌داروں کو، اس کے باپ یا اس کے رشتہ‌داروں کو نہیں) تحفے دئے جاتے ہیں ۔ یہ تحفے دراصل اس لڑکی کی قیمت ہوتی ہے ۔ شوہر اور بیوی دونوں میں سے کوئی بھی اپنی مرضی سے شادی کو توڑ سکتا ہے ۔ لیکن متعدد قبیلوں میں، مثال کے طور پر ایرو کواس قبیلوں میں لوگ عام طور پر شادی کے بعد علحدگی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ اگر کسی بات پر جھگڑا ہوتا ہے تو گن کی بنیاد پر جو فریقین کے رشتہ‌دار ہوتے ہیں وہ بیچ بچاؤ کرتے اور دونوں کو پھر سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اور جب ان کوششوں میں کسی طرح کامیابی نہیں ہوتی تب کہیں شادی کا رشتہ توڑا جاتا ہے ۔ ایسا ہونے پر بچے ماں کے ساتھ رہتے ہیں اور فریقین میں سے ہر ایک کو دوبارہ شادی کی اجازت ہوتی ہے ۔

جوڑا بنا کر رہنےوالا خاندان اتنا کمزور اور غیر مستقل ہوتا تھا کہ الگ خانہداری کی اس کو کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ اس کے لئے کوئی مفید چیز بھی نہیں تھی۔ لہذا قدیم زمانے سے جو کمیونسٹی گھرانہ چلا آ رہا تھا، وہ اس جوڑا خاندان کی وجہ سے ٹوٹا نہیں۔ لیکن کمیونسٹی گھرانے میں گھر کے اندر عورت کا بول بالا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے محض سگی ماں کا پتہ ہونے اور باپ کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہ کہہ سکنے کی وجہ سے عورت یعنی ماں کی قدر اور عزت بہت زیادہ کی جاتی تھی۔ یہ بالکل بےبنیاد خیال ہے کہ جب سماج کی ابتدا ہوئی اس وقت عورت مرد کی غلام تھی۔ یہ خیال ہمیں اٹھارھویں صدی کے ''عہد روشن خیالی،، سے وراثت میں ملا ہے۔ عہد وحشت اور عہد بربریت کے ابتدائی اور درمیانی دور کے اور ایک حد تک آخری دور کے لوگوں میں بھی عورتیں نہ صرف یہ کہ آزاد تھیں بلکہ ان کو ایک بڑی باعزت حیثیت حاصل تھی۔ اشیر رائٹ نے، جو کئی برس تک ایروکواس لوگوں کے سینیکا قبیلے میں پادری تھا، اس بات کی تصدیق کی ہے کہ اس وقت تک جوڑا خاندان میں عورت کا رتبہ بہت اونچا تھا۔

''جہاں تک ان کے خاندانی نظام کا تعلق ہے، جب یہ لوگ پرانے لمبے گھروں میں رہتے تھے،، (یہ کمیونسٹی گھرانے تھے جن میں متعدد خاندان شامل تھے) ''...تو غالباً ان میں کسی ایک جرگے (گن) کا غلبہ ہوتا تھا۔ عورتیں دوسرے جرگوں (گنوں) کے لوگوں کو شوہر بناتی تھیں۔ گھر میں عموماً عورتوں کی حکمرانی تھی۔ مال اسباب مشترک ہوتا تھا۔ لیکن اگر کوئی بدنصیب شوہر یا عاشق اتنا نالایق ہوتا کہ اپنے حصے کا کام نہ کرسکتا تو اس بےچارے کی شامت آجاتی تھی۔ پھر چاہے اس کے کتنے ہی بچے ہوں اور گھر میں اس کا کتنا ہی سامان پڑا ہو، اس کو کسی وقت بھی بوریا بستر باندھ کر گھر سے نکل جانے کا حکم دیا جا سکتا تھا۔ اور ایک مرتبہ حکم مل جانے پر اس کی خلاف‌ورزی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں

تھا۔ گھر اس کے لئے جہنم کا نمونہ بن‌جاتا اور ایسے مجبور ہوکر خود اپنے جرگے (گن) میں واپس ہو جانا پڑتا تھا یا — جیسا کہ اکثر ہوتا تھا — کسی اور جرگے میں جاکر پھر شادی کی کوشش کرنی پڑتی تھی۔ اور سبھی جگہوں کی طرح جرگوں (گنوں) کے اندر بھی عورتوں کا بڑا اقتدار تھا۔ جب کبھی ضرورت ہوتی وہ بلا پس و پیش سردار کو معزول کرکے عام سپاہیوں کی صف میں بھیج دیتی تھیں، یا اس زمانے کی اصطلاح میں، اس کے سینگ توڑ دیتی تھیں۔ ،،*

قدیم زمانے میں عام طور پر عورتوں کا بول بالا تھا۔ اس کی مادی بنیاد یہی کمیونسٹی گھرانے تھے جس کی زیادہ‌تر عورتیں اور کبھی کبھی تو سبھی عورتیں ایک گن کی ہوتی تھیں اور مرد دوسرے مختلف گنوں کے ہوتے تھے۔ اس چیز کی دریافت کا سہرا بھی باخوفن کے سر ہے۔ یہ اس کا تیسرا بڑا کارنامہ ہے۔ اسی کےساتھ میں یہ بھی کہہ دوں کہ سیاحوں اور پادریوں نے جو رپورٹیں دی ہیں کہ وحشی اور بربر قوموں میں عورتوں کو بڑی محنت مشقت کرنی پڑتی ہے تو اس سے مذکورہ بالا باتوں کی تردید نہیں ہوتی۔ جن اسباب کی بنیاد پر عورتوں اور مردوں میں کام کی تقسیم ہوتی ہے وہ ان اسباب سے بالکل مختلف ہیں جن سے سماج میں عورتوں کا رتبہ طے ہوتا ہے۔ ان قوموں میں، جن کی عورتیں اس سے کہیں زیادہ محنت مشقت کرتی ہیں جتنی ہم یورپ‌والے مناسب سمجھتے ہیں، عورتوں کی کہیں زیادہ سچی عزت ہوتی ہے۔ تمدن کے عہد کی وہ نازپروردہ خواتین جن کی زندگی جھوٹی نازبرداری کے ماحول میں بسر ہوتی ہے اور جنہیں سچ‌مچ کے کام کاج سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ان کا سماجی رتبہ عہد بربریت کی سخت محنت‌مشقت کرنےوالی عورتوں کے رتبے سے بہت نیچا ہوتا ہے۔ عہد بربریت کی عورتوں کو ان کی جاتیوں کے مرد سچ‌مچ

---

* مزید ملاحظہ ہو ''مارکس اور اینگلس کی دستاویزات،، جلد ۹، صفحات ۲۷ — ۲۶۔ (ایڈیٹر)

مالکن (lady, Irowa, Frau) سمجھتے تھے اور سماج میں دراصل یہی ان کی حیثیت بھی تھی۔

امریکہ میں اب گروہوار شادی کی جگہ جوڑا بیاہ مکمل طور پر رائج ہو چکا ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ کرنے کے لئے شمال مغربی اور خاص کر جنوبی امریکہ کی قوموں کے حالات کا زیادہ گہرا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ سب قومیں ابھی تک عہد وحشت کے آخری دور میں ہیں۔ جنوبی امریکہ کی قوموں میں جنسی آزادی کی اتنی مثالیں ملتی ہیں کہ ان کو دیکھتے ہوئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ گروہوار شادی بالکل مٹ چکی ہے۔ اس کے سارے اثرات تو یقیناً نہیں مٹے ہیں۔ شمالی امریکہ کے کم سے کم چالیس قبیلوں میں یہ رواج ہے کہ جو شخص کسی خاندان کی سب سے بڑی لڑکی سے شادی کرتا ہے اس کا حق سبھی بہنوں پر ہو جاتا ہے۔ بالغ ہونے پر انہیں بھی وہ اپنی بیوی بنا سکتا ہے۔ یہ اس دور کی بچی کھچی نشانی ہے جب سبھی بہنوں کے شوہر مشترک ہوتے تھے۔ اور بینکرافٹ بتاتا ہے کہ جزیرہ نما کیلی‌فورنیا کے قبیلوں میں (جو عہد وحشت کے آخری دور سے گذر رہے ہیں) کچھ ایسے تیوہار منائے جاتے ہیں جن کے موقع پر متعدد ''قبیلے،، بلا کسی تفریق و امتیاز کے مجامعت کی غرض سے اکٹھا ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دراصل وہ گن ہیں جن کے یہ تیوہار ان بھولے بسرے دنوں کی یاد دلاتے ہیں جب کہ ایک گن کی سبھی عورتیں دوسرے گن کے سبھی مردوں کی مشترک بیویاں اور ایک گن کے سبھی مرد دوسرے گن کی عورتوں کے مشترک شوہر ہوا کرتے تھے۔ آسٹریلیا میں آج بھی اس کا رواج ہے۔ کچھ قوموں میں یہ ہوتا ہے کہ بڑے بوڑھے، سردار اور کاہن پجاری مشترک بیویوں کی رسم سے فائدہ اٹھا کر خود اپنا الو سیدھا کرتے ہیں اور زیادہ‌تر عورتوں کو اپنے‌لئے مخصوص کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کو بھی بعض خاص تیوہاروں اور تقریبوں کے موقع پر پرانی جنسی ساجھے‌داری کو وقتی طور پر زندہ کرنے کی اجازت دینی پڑتی ہے اور اپنی بیویوں کو یہ موقع دینا ہوتا ہے کہ وہ نوجوانوں کے ساتھ داد عیش دیں۔ وسٹرمارک نے (اپنی

کتاب کے صفحات ۲۸، ۲۹ پر) عیش‌ونشاط کی ایسی تقریبوں Saturnalia (۱۱۶) کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں جبکہ مختصر عرصے کےلئے پھر جنسی تعلق کی پرانی آزادی قائم ہو جاتی ہے۔ مثال کےلئے اس نے بتایا ہے کہ ایسی تقریبیں ہندستان کی 'ھو، جاتی کے لوگوں میں، سنتھالوں میں، پنجا اور کوتار جاتیوں کے لوگوں میں اور افریقہ کی کچھ قوموں میں ہوتی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وسٹرمارک ان تقریبوں کو گروہوار شادی کی بچی کھچی نشانی نہیں مانتا۔ اس خیال کو تو وہ سرے سے ٹھکرا دیتا ہے۔ ان کو وہ جوڑا ملنے کے موسم کا اثر مانتا ہے جو قدیم انسان اور دوسرے حیوانوں دونوں میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔

اب ہم باخوفن کی چوتھی بڑی دریافت کو لیتے ہیں اور وہ ہے گروہوار شادی سے جوڑا بیاہ کے تغیر کی عام صورت۔ جس چیز کو باخوفن دیوتاؤں کے قدیم احکام کی خلاف ورزی کرنے کا کفارہ یا پرائشچت بتاتا ہے، جو عورت نے اپنی عفت و عصمت کا حق حاصل کرنے کے لئے ادا کیا تھا، وہ دراصل اس کفارے کی ڈھکی چھپی صورت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جس کی قیمت ادا کرکے عورت نے مشترک شوہروں کے پرانے رواج سے چھٹکارا پایا اور اپنے آپ کو صرف ایک ہی مرد کے سپرد کرنے کا حق حاصل کیا تھا۔ یہ کفارہ محدود سپردگی کی شکل میں ادا کیا جاتا ہے۔ بابل کی عورتوں کو سال میں ایک مرتبہ میلتا کے مندر میں اپنے آپ کو دینا پڑتا تھا۔ مشرق قریب کی دوسری قوموں کے لوگ اپنی لڑکیوں کو کئی برس کے لئے انائیطس کے مندر میں بھیج دیا کرتے تھے جہاں انہیں اپنی پسند کے مردوں سے آزاد جنسی محبت کا سودا کرنا ہوتا تھا اور اس کے بعد ہی انہیں شادی کرنے کی اجازت مل سکتی تھی۔ بحیرۂ روم سے لے کر دریائے گنگا تک تقریباً سبھی ایشیائی قوموں میں اس طرح کے ریت رواج پائے جاتے ہیں جن پر مذہب کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا نجات کے لئے کفارے کی قربانی ہلکی ہوتی گئی۔ جیسا کہ باخوفن لکھتا ہے:

''پہلے ہر سال قربانی دینی پڑتی تھی۔ اب ایک ہی مرتبہ یہ رسم ادا کرنے سے کام چل جاتا ہے۔ پہلے بیاہی عورتوں سے عام جنسی تعلق کا رواج تھا، اب صرف کنواریوں کے ساتھ ایسا کیا جاتا ہے۔ پہلے ازدواجی زندگی کے دوران میں یہ کرنا پڑتا تھا، اب شادی کے پہلے تک اس پر عمل کرنا کافی ہوتا ہے۔ پہلے بلا فرق و امتیاز ہر کسی کی آغوش میں اپنے آپ کو دینا پڑتا تھا، اب صرف چند مخصوص لوگوں کی آغوش میں دینا پڑتا ہے،، (''مادری حق،، ، صفحہ ۱۹) *۔

دوسری قوموں میں تو یہ مذہبی پردہ بھی نہیں ہے۔ مثلاً قدیم زمانے میں تھریشیا کے باشندوں میں، کیلٹ لوگوں میں اور ہندستان کے بہت سے آدی‌باسیوں میں، ملایا کے باشندوں میں، بحیرۂ جنوبی کے جزیروں کے لوگوں میں اور بہت سے امریکی انڈینوں میں تو آج بھی لڑکیوں کو شادی سے پہلے پوری جنسی آزادی ہوتی ہے۔ خاص کر جنوبی امریکہ کے تقریباً ہر علاقے میں یہی صورت ہے۔ اگر کوئی شخص ملک کے اندرونی حصے میں کسی حد تک بھی گیا ہے تو وہ اس کی تصدیق کرے گا۔ مثال کے طور پر اگاسیز نے (''برازیل کی سیاحت،، ، مطبوعہ بوسٹن اور نیویارک۔ ۱۸۸۶ء ، صفحہ ۲۶۶) ** انڈین نسل کے ایک دولتمند خاندان کے بارے میں لکھا ہے کہ جب خاندان کی ایک لڑکی سے اس کا تعارف کرایا گیا اور اس نے اس لڑکی کے باپ کے بارے میں پوچھا جو اس کے خیال میں لڑکی کی ماں کا شوہر تھا اور پیراگوائے کے خلاف جنگ میں ایک فوجی افسر کی حیثیت سے حصہ لے رہا تھا، تو لڑکی کی ماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ اس کا کوئی باپ نہیں — یہ ایک اتفاق کی پیدائش ہے (naô tem pai, è filha da fortuna) ۔

---

* Bachofen J.J., «Das Mutterrecht», Stuttgart, 1861. (ایڈیٹر)

** Professor and Mrs. Louis Agassiz, «A Journey in Brazil». Boston and New York, 1886. (ایڈیٹر)

''انڈین یا دوغلی نسل کی عورتیں اپنے ناجائز بچوں کا ذکر ہمیشہ اسی طرح کرتی ہیں اور ایسا کرتے ہوئے انہیں احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ کوئی غلط یا شرم کی بات ہے۔ اور یہ کوئی غیرمعمولی بات نہیں بلکہ معاملہ اس کا الٹ ہے۔ اکثر بچے صرف اپنی ماؤں کو جانتے ہیں کیونکہ ان کی پرورش کی ساری ذمہ‌داری ماں پر ہوتی ہے۔ وہ اپنے باپ کو بالکل نہیں جانتے اور شاید عورت کو کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس کی یا اس کے بچوں کی کوئی ذمہ‌داری باپ پر ہے۔ ''

ایک متمدن آدمی کو جو بات اتنی عجیب معلوم ہوگی وہ دراصل مادری حق اور گروہ‌وار شادی کا ایک عام قاعدہ ہے۔

کچھ اور قوموں میں یہ رواج ہے کہ شادی کے موقع پر دولہا کے دوست اور رشتہ‌دار یا شادی میں آئے ہوئے دوسرے مہمان پرانے روایتی حق کے مطابق پہلے دلہن کے ساتھ ہمبستری کرتے ہیں اور دولہا کی باری سب سے آخر میں آتی ہے۔ مثال کے طور پر قدیم زمانے میں بالیری جزیروں میں اور افریقہ کے آگیلا لوگوں میں اور موجودہ زمانے میں حبشہ کے باریا لوگوں میں بھی اس کا رواج پایا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ دوسری قوموں میں یہ رواج ہے کہ ایک سرکاری آدمی، قبیلے یا گن کا سردار، کاسیک، شمان، پروہت، پرنس یا جو بھی اس کا خطاب ہو، پوری برادری کی نمائندگی کرتا ہے اور دلہن کے ساتھ پہلی رات کا حق ادا کرتا ہے۔ اس رواج کو کتنے ہی خوش‌رنگ پردوں سے ڈھانکنے کی کوشش کی جائے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلی شب کا حق (jus primae noctis) الاسکا علاقے کے زیادہ تر باشندوں میں (دیکھئے بینکرافٹ کی کتاب ''دیسی نسلیں''، پہلا حصہ، صفحہ ۸۱)، شمالی میکسیکو کے تاہو لوگوں میں (ایضاً، صفحہ ۵۸۴) اور کچھ اور جاتیوں میں گروہ‌وار شادی کی ایک بچی کھچی نشانی کے طور پر آج تک چلا آتا ہے۔ اور زمانہ‌وسطی میں کم‌از کم ان ملکوں میں جہاں قدیم کیلٹ جاتی کے لوگ رہتے تھے، اس کا برابر رواج رہا۔ ان میں یہ رسم براہ‌راست گروہ‌وار شادی

سے نکلی تھی۔ اس کی ایک مثال آراگاں کا علاقہ ہے۔ کیسٹیل میں کسان کبھی زرعی غلام نہیں رہے مگر آراگاں میں بدترین قسم کی زرعی غلامی قائم تھی اور وہ اس وقت تک رہی جب تک کہ ۱۴۸۶ء میں فرڈیننڈ کیتھولک نے ایک فرمان کے ذریعے اس کو ختم نہ کر دیا۔ اس فرمان میں کہا گیا ہے کہ

''ہم فیصلہ دیتے اور اعلان کرتے ہیں کہ اگر کوئی کسان شادی کرتا ہے تو... اوپر جن لارڈوں (senyors, barons) کا ذکر کیا گیا، وہ پہلی رات اس کی دلہن کے ساتھ نہیں سوئیں گے اور نہ شادی کی رات کو جب عورت سو رہی ہو تو اپنے اقتدار کی نشانی کے طور پر اس عورت اور اس کے بستر کو روندیں گے۔ اور نہ ہی یہ لارڈ کسانوں کے بیٹے اور بیٹیوں سے ان کی مرضی کےخلاف اجرت پر یا اجرت کے بغیر کام لیں گے''۔ (سوگن ہائم کی کتاب ''زرعی غلامی'' میں اصلی کیٹےلونین زبان ہی میں اقتباس دیا گیا ہے۔ سنٹ پیٹرسبرگ، ۱۸۶۱ء، صفحہ ۳۵۵*)۔

باخوفن نے برابر یہ کہا ہے کہ اس نظام کو جس کو وہ ''ہیتائرازم'' یا «Sumpfzeugung» (کئی عورتیں رکھنے کا رواج) کے نام سے یاد کرتا ہے، بدلنے میں عورتوں کا بڑا دخل رہا ہے۔ اس نظام کے بدلے یک‌زوجگی یعنی ایک مرد ایک عورت کی شادی کا رواج اصل میں عورتوں کی کوششوں سے ہوا۔ اور اس کی یہ رائے بالکل صحیح ہے۔ زندگی کی اقتصادی حالتوں کی نشوونما کی وجہ سے یعنی قدیم کمیونزم کے زوال اور آبادی کے زیادہ سے زیادہ گنجان ہونے

---

* ایس۔ سوگن ہائم ''انیسویں صدی کے وسط تک یورپ میں زرعی غلامی اور بیگاری کے خاتمے کی تاریخ''۔ یہ کتاب سنٹ‌پیٹرسبرگ میں ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ (Sugenheim S., «Geschichte der Aufhebung der Leibeigenschaft und Hörigkeit in Europa bis um die Mitte des neunzehnten Jahrhunderts». St. Petersburg, 1861.) (ایڈیٹر)

کے ساتھ ساتھ پرانے روایتی جنسی تعلقات کی ابتدائی سادگی اور بھولاپن اور اس کا قدیم جنگلی کردار مٹتا گیا اور اتنا ہی زیادہ وہ جنسی تعلق عورتوں کو ہتک‌آمیز اور ظالمانہ معلوم ہونے لگا۔ قدرتاً ان کے دل میں اس خواہش نے زور پکڑا ہوگا کہ کسی طرح انہیں عفت اور پاکیزگی کی زندگی بسر کرنے کا حق ملے، کوئی ایسی صورت پیدا ہو کہ وہ اس مصیبت سے نجات پائیں اور ایک وقت میں صرف ایک مرد سے عارضی یا مستقل شادی کرسکیں۔ مردوں سے یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس تبدیلی کو لانے میں پیش‌قدمی سے کام لیں‌گے۔ اگر اور باتوں سے ہم آنکھیں بند بھی کر لیں تو بھی مردوں کے ایسا نہ کر سکنے کی کم از کم ایک وجہ یہ ہے کہ آج تک وہ عملاً گروہ‌وار شادی کی لذتوں سے دست‌بردار ہونے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکے ہیں۔ جب عورتوں نے تبدیلی کراکے جوڑا بیاہ کو رواج دے دیا تب ہی مردوں نے سختی سے یک‌زوجگی کے اصول پر عمل شروع کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس اصول کو انہوں نے محض عورتوں پر ہی لاگو کیا۔

جوڑا خاندان کی ابتدا اس زمانےمیں ہوئی جب عہد وحشت اور عہد بربریت مل رہے تھے یعنی اس کی ابتدا عہد وحشت کے آخری دور میں اور کہیں کہیں تو بربریت کے پہلے دور میں ہوئی۔ خاندان کی یہ شکل عہد بربریت کی خصوصیت ہے اسی طرح جیسے گروہ‌وار شادی عہد وحشت کی اور یک‌زوجگی کا اصول تمدن کے عہد کی خصوصیت ہے۔ اس جوڑا خاندان کو ترقی کرکے پائدار یک‌زوجگی تک پہنچنا تھا۔ لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ ابھی تک جو اسباب کام کر رہے تھے، ان سے مختلف اسباب میدان میں آئیں۔ جوڑا بیاہ میں گروہ گھٹتے گھٹتے اپنی آخری اکائی تک یعنی ایک مرد اور ایک عورت ان دو جوہروں سے مرکب ایک سالمہ تک پہنچ گیا۔ قدرتی انتخاب کے اصول نے گروہ‌وار شادی کے دائرے کو محدود کرتے کرتے اپنا کام پورا کر دیا۔ اب اس سلسلے میں اس کو کچھ اور نہیں کرنا تھا۔ اب اگر نئی سماجی قوتیں روح‌رواں بن کر میدان میں نہ آتیں تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ جوڑا خاندان سے خاندان

کی کوئی نئی شکل جنم لیتی۔ لیکن ان سماجی قوتوں کا عمل شروع ہوچکا تھا۔

اب ہم جوڑا خاندان کے کلاسیکی وطن امریکہ سے رخصت ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس یہ سوچنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ امریکہ میں خاندان کی اس کے علاوہ کوئی اور ترقی‌یافتہ شکل قائم ہوئی تھی یا یہ کہ امریکہ کی دریافت سے اور اس پر یورپ‌والوں کے قبضے سے پہلے وہاں کسی جگہ بھی سخت قسم کی یک‌زوجگی قائم ہوئی تھی۔ لیکن پرانی دنیا میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔

وہاں جانور پالنے اور مویشیوں کی نسل بڑھانے سے دولت کا ایک نیا سوتا کھیل گیا جس کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے بالکل نئے سماجی رشتے قائم ہونے لگے تھے۔ عہد بربریت کے ابتدائی دور تک غیرمنقولہ دولت میں صرف مکان، کپڑے، بھدے قسم کے زیور اور غذا حاصل کرنے اور پکانے کے سامان، کشتیاں، ہتھیار اور بہت معمولی قسم کے گھر کے برتن تھے۔ غذا ہر روز نئے سرے سے حاصل کرنی ہوتی تھی۔ لیکن اب گھوڑوں، اونٹوں، گدھوں، بیلوں، بھیڑ بکریوں اور سوروں کی شکل میں گلہ‌بانی کی زندگی بسر کرنےوالی ترقی‌پذیر قوموں کو — پنجاب اور وادیٔ گنگا کے آریوں کو، اس زمانے کے نسبتاً بہت زیادہ سیراب آسودریا اور سیردریا کے ہرے بھرے گھاس کے میدانوں میں رہنےوالے آریوں کو اور دجلہ و فرات کے کنارے رہنےوالے سامیوں کو، اتنی کثیر دولت مل گئی تھی جس کی محض دیکھ بھال اور معمولی نگرانی سے کام چل جاتا تھا۔ یہ دولت دن‌دونی رات چوگنی ہو رہی تھی اور اس سے انہیں دودھ اور گوشت کی صورت میں نہایت عمدہ اور صحت بخش غذا مل رہی تھی۔ غذا حاصل کرنے کے پہلے کے سبھی طریقے اب پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ شکار کرنا جو پہلے ایک ضروری کام تھا اب محض شوق کی چیز رہ گیا۔

لیکن یہ نئی دولت کس کی تھی؟ ظاہر ہے کہ شروع میں اس پر پورے گن کا قبضہ تھا۔ لیکن مویشیوں کی ریوڑوں پر بہت پرانے زمانے میں ہی ذاتی ملکیت قائم ہو چکی ہوگی۔ یہ کہنا مشکل

ہے کہ موسی کے نام سے جو پہلی کتاب موسوم ہے اس کے مصنف نے بابا ابراہیم کو جب اپنے گلوں اور مویشیوں کے مالک کی حیثیت سے دیکھا تو وہ اپنے کنبے کے بزرگ ہونے کے ناتے اپنی ذاتی حیثیت سے اس کے مالک تھے یا ایک گن کے موروثی سردار کی حیثیت سے۔ لیکن ایک بات صاف ہے اور وہ یہ کہ ہم ابراہیم کو موجودہ زمانے کے مفہوم میں ملکیت کا مالک نہیں کہہ سکتے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی یقینی ہے کہ مستند تاریخ کی ابتدا میں ہمیں ہر جگہ یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ مویشیوں کے ریوڑ خاندان کے سرداروں کی اسی طرح علحدہ ملکیت ہوتے تھے جس طرح بربریت کے عہد کی فنی پیداوار، دھات کے برتن، عیش و عشرت کے سامان اور آخر میں انسانی مویشی یعنی غلام، خاندان کے سرداروں کی الگ الگ ملکیت ہوا کرتے تھے۔

اب چونکہ غلامی کا بھی رواج ہو چکا تھا۔ عہدبربریت کے ابتدائی دور کے لوگوں کے لئے غلام کارآمد نہیں ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ امریکہ کے انڈین لوگ اپنے جنگ کے دشمنوں سے جو سلوک کرتے تھے وہ اس سے بہت مختلف تھا جو بربریت کے آخری دور میں ان سے کیا جاتا تھا۔ مرد یا تو قتل کر دئے جاتے یا بھائی بنا کر فاتحوں کے قبیلے میں شامل کر لئے جاتے تھے۔ عورتوں سے یا تو شادی کر لی جاتی تھی یا انہیں ان کے بچوں سمیت جو قتل ہونے سے بچ گئے تھے، قبیلے میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ اس دور میں ابھی انسان کی قوت محنت سے اتنا نہیں پیدا ہوتا تھا کہ محنت کرنےوالے کا اپنا خرچ پورا کرنے کے بعد اس میں سے کچھ بچ سکے۔ لیکن جب مویشی پالے جانے لگے اور ان کی نسل بڑھائی جانے لگی، دھاتوں سے کام لیا جانے لگا، کپڑے کی کتائی بنائی ہونے لگی اور پھر جب کھیت بنا کر کھیتی کی جانے لگی تو یہ حالت بدل گئی۔ جس طرح پہلے بیویاں بڑی آسانی سے مل جاتی تھیں مگر بعد میں ان میں قدرتبادلہ پیدا ہو گئی تھی اور وہ خریدی جانے لگی تھیں، اسی طرح بعد میں، خاص کر جانوروں کے ریوڑوں کے خاندانی ملکیت بن جانے کے بعد، انسان کی قوت محنت بھی خریدی جانے لگی۔ خاندان اتنی تیزی سے

نہیں بڑھتا تھا جتنی تیزی سے مویشی کے ریوڑ بڑھتے تھے۔ ریوڑ کی دیکھ بھال کے لئے زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہونے لگی۔ جنگ کے قیدیوں سے یہ کام بہت اچھی طرح لیا جا سکتا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مویشی کی طرح خود ان کی نسل بھی بڑھائی جا سکتی تھی۔

اس طرح کی دولت جب ایک مرتبہ الگ الگ خاندانوں کی نجی ملکیت بن گئی اور اس میں تیزی سے اضافہ ہوا تو اس نے اس سماج پر جو جوڑا خاندان اور مادری حق‌والے گن کی بنیاد پر قائم تھا، کاری چوٹ لگائی۔ جوڑا بیاہ سے خاندان میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہو گیا تھا۔ سگی ماں کے ساتھ ساتھ اب ایک مستند سگا باپ بھی موجود تھا جو آج کل کے کتنے ہی ''باپوں،، سے زیادہ مستند تھا۔ خاندان کے اندر اس زمانے میں جو تقسیم محنت رائج ہو چکی تھی، اس کے مطابق غذا حاصل کرنا اور اس کے لئے ضروری اوزار تیار کرنا مرد کا کام تھا اور اس لئے ان پر ملکیت بھی مرد کی تھی۔ میاں بیوی الگ ہوتے تو جس طرح گھرداری کا سامان عورت کے پاس رہ جاتا، اسی طرح مرد ان اوزاروں کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ چنانچہ اس زمانے کے سماجی رسم و رواج کے مطابق مرد غذا حاصل کرنے کے لئے نئے ذرائع یعنی مویشیوں کا اور کچھ دنوں کے بعد محنت کے نئے آلات یعنی غلاموں کا بھی مالک ہو گیا۔ لیکن اسی سماج کے رسم و رواج کے مطابق اس کا ترکہ اس کی اولاد کو نہیں مل سکتا تھا کیونکہ اس معاملے میں اصل صورت حال یوں تھی:

مادری حق کی رو سے، یعنی جب تک نسل محض عورت سے چلتی تھی اس وقت تک اور گنوں میں وراثت کے ابتدائی رسم و رواج کے مطابق، گن کے کسی رکن کے مرنے پر اس کا ترکہ پہلے اس کے گن کے رشتہ‌داروں کو ملتا تھا۔ اصول یہ تھا کہ جائداد گن کے اندر رہے۔ شروع میں، زیربحث اشیائے منقولہ کی کوئی خاص اہمیت نہ ہونے کی وجہ سے یہ ممکن ہے کہ عملاً وہ گن کے سب سے قریبی رشتہ‌داروں کو یعنی ماں کی جانب سے خون کے رشتہ‌داروں کو مل جاتی ہو۔ لیکن مرنے‌والے کے بچے اس کے گن کے بچے نہیں بلکہ

اپنی ماں کے گن کے بچے ہوتے تھے۔ شروع میں ماں کے اور سبھی رشتہ‌داروں کے ساتھ بچوں کو بھی ماں کی جائداد کا ترکہ ملتا تھا اور شاید آگے چل کر اس پر ان کا سب سے پہلا حق مان لیا گیا تھا۔ لیکن انہیں اپنے باپ سے کوئی ترکہ نہیں ملتا تھا کیونکہ وہ اس کے گن کے نہیں تھے اور باپ کی ساری دولت کا اس کے گن میں رہنا ضروری تھا۔ لہذا مویشیوں کے گلے کے مالک کے مرنے پر اس کا گلہ سب سے پہلے اس کے بھائیوں اور بہنوں کو اور اس کی بہنوں کی اولاد کو یا اس کی ماں کی بہنوں کی اولاد کو ملتا تھا۔ اس کی اپنی اولاد اس سے محروم رہتی تھی۔

اس طرح جیسے جیسے دولت بڑھتی گئی، ویسے ویسے اس کی وجہ سے ایک طرف خاندان کے اندر عورت کے مقابلے میں مرد کی اہمیت اور اس کا رتبہ زیادہ اونچا ہوتا گیا اور دوسری طرف مرد کے دل میں یہ خواہش زور پکڑتی گئی کہ وہ اپنی طاقت سے فائدہ اٹھا کر وراثت کے پرانے طریقے کو الٹ دے تاکہ اس کے اپنے بچے حق‌دار ہو سکیں۔ لیکن جب تک نسل ماں سے چلتی تھی تب تک یہ ناممکن تھا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ مادری حق کو ختم کر دیا جائے۔ اور یہی کیا گیا۔ اور اس میں اتنی مشکل نہیں ہوئی جتنی آج معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس انقلاب سے جو کہ بنی‌نوع انسان کے لئے ایک نہایت ہی فیصلہ‌کن انقلاب تھا، گن کے کسی ایک بھی زندہ رکن کی زندگی میں کوئی خلل نہیں پڑا۔ سبھی لوگ جیسے پہلے تھے ویسے ہی رہے۔ صرف اتنا فیصلہ کافی تھا کہ آئندہ گن کے مردوں کی اولاد گن میں رہے‌گی اور عورتوں کی اولاد اس گن سے الگ کر کے اپنے باپ کے گن میں شامل کر دی جائے‌گی۔ اس طرح عورتوں سے نسل کا سلسلہ اور ماں سے وراثت پانے کا حق ختم ہو گیا۔ اور اس کے بدلے مردوں سے نسل کا سلسلہ اور باپ سے وراثت پانے کا حق قائم ہوا۔ متمدن قوموں میں یہ انقلاب کب اور کس طرح آیا اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ یہ بالکل ماقبل تاریخ کے زمانے کی بات ہے۔ لیکن یہ انقلاب ہوا ضرور تھا۔ اور اس کا بہت کافی ثبوت موجود ہے۔ ہمیں جگہ جگہ مادری حق کے کتنے

ھی بچے بچائے آثار ملے ھیں ۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ وہ قابل ذکر ھیں جنہیں باخوفن نے جمع کیا ھے ۔ یہ انقلاب کتنی آسانی سے ھو جاتا تھا، یہ بات امریکہ کے متعدد انڈین قبیلوں سے ظاھر ھو جاتی ھے، جن کے درمیان یہ انقلاب ابھی حال میں آیا ھے اور آج بھی چل رھا ھے ۔ یہاں یہ انقلاب کسی حد تک بڑھتی ھوئی دولت اور زندگی کے بدلے ھوئے حالات (جنگلوں سے آکر میدانوں میں بس جانے) کے زیر اثر، اور کسی حد تک تمدن اور پادریوں کے اخلاقی اثر کے تحت ھو رھا ھے ۔ دریائے مسوری کے آٹھ قبیلوں میں سے چھ میں مردوں کی طرف سے نسل اور وراثت کا سلسلہ قائم ھوگیا ھے ۔ لیکن دو میں آج بھی عورتوں سے نسل چلتی ھے اور ترکہ ماں سے ملتا ھے ۔ شانی، سیاسی اور ڈیلاویر قبیلوں میں یہ رسم ھے کہ اولاد کو باپ کے گن کے ناموں میں سے کوئی ایک نام دے کر اس گن میں شامل کر دیا جاتا ھے تاکہ انہیں اپنے باپ کی وراثت مل سکے ۔ ''تغیرپسندی کی یہ انسانی خاصیت ھے کہ چیزوں کا نام بدل کر وہ سمجھتا ھے کہ اس نے ان کی خاصیت بدل دی اور جب کبھی اپنی کسی غرض کو پورا کرنے کے لئے مصلحت کا تقاضا ھوا تو اس نے رسم و رواج کی بندشوں کو توڑ کر باھر نکلنے کا بہانہ خود اسی رسم و رواج کے اندر ڈھونڈھ نکالا!،، (مارکس) * ۔ اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ سخت افراتفری اور گڑبڑی کی حالت پیدا ھو گئی ۔ حالات کو سدھارنے کا صرف ایک ھی راستہ رہ گیا تھا کہ مادری حق کی جگہ پدری حق کا رواج ھو اور اسی طرح کسی حد تک یہ افراتفری دور بھی کی گئی ۔ ''بحیثیت مجموعی یہ ایک نہایت ھی قدرتی تبدیلی معلوم ھوتی ھے،، (مارکس) ** ۔ باقی رھا یہ سوال کہ یہ تبدیلی پرانی دنیا کی متمدن قوموں میں کس طرح اور کن ذریعوں سے عمل میں آئی اور اس کے بارے میں تقابلی قانون کے ماھروں کی رائے، جو کہ

---

* دیکھئے ''مارکس اور اینگلس کی دستاویزات،، جلد ۹، صفحہ ۱۱۱ ۔ (ایڈیٹر)

** اسی کتاب کا صفحہ ۱۱۲ ۔ (ایڈیٹر)

تقریباً محض مفروضات پر مبنی ہے، کیا ہے تو کوالیفسکی کی کتاب ''خاندان اور ملکیت کے آغاز اور ارتقا کا ایک خاکہ،، * پڑھنی چاہئے۔ یہ کتاب اسٹاک‌ہوم سے ۱۸۹۰ء میں چھپی تھی۔ مادری حق کا خاتمہ عورتوں کی ایک عالمگیر تاریخی شکست تھی۔ مرد نے گھر کے اندر بھی باگ‌ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی۔ عورت اپنے رتبے سے گر گئی۔ اس کے ہاتھ پیر باندھ دئے گئے۔ اسے مرد کی شہوت کا غلام بنالیا گیا اور محض بچے پیدا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھ لیا گیا۔ عورت کا یہ گرا ہوا مرتبہ سورمائی عہد کے اور اس سے بھی زیادہ کلاسیکی عہد کے یونانیوں میں خاص طور سے دیکھنے میں آتا ہے۔ رفتہ رفتہ اسے طرح طرح کے خوش‌نما پردوں سے ڈھانک کر اور سجا کر اور ایک حد تک اس کی سختی کو کم کرکے پیش کیا گیا۔ لیکن اسے مٹایا کبھی نہیں گیا۔

اب محض مردوں کی جو حکومت قائم ہوئی اس کا پہلا اثر خاندان کی ایک درمیانی شکل میں ظاہر ہوا — یعنی پدری خاندان کا جنم ہوا۔ اس کی اصل خصوصیت یہ نہیں تھی کہ ایک ایک مرد کی بہت سی بیویاں ہوتی تھیں۔ اس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں‌گے۔ پدری خاندان کی اصل خصوصیت یہ تھی کہ

''متعدد افراد جن میں غلام بھی ہوتے تھے اور آزاد لوگ بھی، خاندان کے بزرگ کے پدرانہ اقتدار کے سایے میں منظم ہوتے تھے۔ سامی لوگوں میں اس بزرگ خاندان کی کئی کئی بیویاں ہوتی تھیں۔ غلام کی ایک بیوی اور بچے ہوتے تھے۔ اور ساری تنظیم کا مقصد ایک محدود علاقے میں مویشیوں کے گلوں اور ریوڑوں کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ ،، (۱۱۷)

خاندان کی اس شکل کی اصلی خصوصیت یہ تھی کہ غلاموں کو خاندان میں شامل کرلیا گیا تھا اور بزرگ خاندان کا اقتدار مانا جاتا

* Kovalevsky M., «Tableau des origines et de l'évolution de la famille et de la propriètè». Stockholm, 1890. (ایڈیٹر)

تھا ۔ چنانچہ اس طرح کے خاندان کا مکمل نمونہ رومن خاندان میں ملتا ہے ۔ لفظ familia کا مطلب ابتدا میں وہ نہیں تھا جو آج کل کے کم‌نظروں کا آدرش ہے اور جو کہ جذباتیت اور گھریلو کشیدگی سے مرکب ہوتا ہے ۔ رومنوں میں شروع میں یہ لفظ شادی‌شدہ جوڑے اور ان کے بچوں کے لئے استعمال ہی نہیں ہوتا تھا ۔ اس کا اطلاق صرف غلاموں پر ہوتا تھا ۔ Famulus کا مطلب تھا گھریلو غلام، اور familia کا لفظ مجموعی طور پر ایک شخص کے سبھی غلاموں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا ۔ یہاں تک کہ گیوس کے زمانے میں بھی لوگ، familia, id est patrimonium (یعنی بطور ترکہ) اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ جایا کرتے تھے ۔ رومنوں نے ایک نئے سماجی ادارے کے لئے یہ اصطلاح بنائی تھی ۔ اس ادارے میں اس کے سردار کے تحت اس کی بیوی اور بچے اور متعدد غلام ہوتے تھے اور رومن پدری اقتدار کے تحت سردار کو ان کی زندگی اور موت پر اختیار ہوتا تھا ۔

> ''لہذا یہ اصطلاح لاطینی قبیلوں کے اس آہنی خاندانی نظام سے زیادہ پرانی نہیں تھی جو کھیت بنا کر کھیتی کرنے کا طریقہ شروع ہونے، غلامی کے قانونی ہوجانے اور ساتھ ہی یونانیوں اور (آریائی) اطالویوں کے علحدہ ہونے کے بھی بعد قائم ہوا تھا ۔ ''
> (۱۱۸)

مارکس نے اس پر اپنا اضافہ اور کیا ہے : ''موجودہ خاندان میں ایک ادھوری شکل میں نہ صرف غلامی (servitus) بلکہ زرعی غلامی بھی شامل ہے کیونکہ خاندان کا تعلق شروع ہی سے کھیتی‌باڑی کے کام سے رہا ہے ۔ بہت چھوٹے پیمانے پر اس کے اندر وہ سارے تضاد موجود ہیں جو آگے چل کر سماج اور اس کی ریاست کے اندر بڑے پیمانے پر پھیل جاتے ہیں ۔ ''*

---

* دیکھئے ''مارکس اور اینگلس کی دستاویزات''، جلد ۹، صفحہ ۳۱ ۔ (ایڈیٹر)

خاندان کی اس طرح کی شکل اس امر کا اظہار کرتی ہے کہ جوڑا خاندان یک‌زوجگی میں تبدیل ہوگیا۔ بیوی کی عصمت یعنی بچوں کی ولایت کا تحفظ کرنے کےلئے عورت کو مرد کے مطلق اقتدار کے سپرد کردیا گیا۔ اگر وہ اس کو قتل بھی کرتا ہے تو اپنے حق سے کام لیتا ہے۔

پدری خاندان کے ساتھ ہم لکھی ہوئی تاریخ کے دور میں قدم رکھتے ہیں، یہ ایک ایسا دور ہے جس میں تقابلی قانون کا علم ہماری بہت مدد کرتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو اس کی مدد سے ہم بہت کچھ آگے بڑھے ہیں۔ ہم میکسم کوالیفسکی کے احسان مند ہیں کہ اس نے (اپنی کتاب ''خاندان اور ملکیت کے آغاز اور ارتقا کا ایک خاکہ،، میں جو ۱۸۹۰ء میں اسٹاک ہوم سے شائع ہوئی ہے، صفحات ۱۰۰ — ۶۰) یہ ثابت کر دیا کہ پدری گھرانے کی برادری — (patriarchalische Hausgenossenschaft) — جس کی مثال ہمیں آج بھی سربیا اور بلغاریہ کے باشندوں میں ''زدروگا،، (جس کا مطلب برادری سے ملتا جلتا ہے) یا ''براتستوا،، (برادری) کے نام سے ملتی ہے اور جو کسی قدر بدلی ہوئی صورت میں مشرق کی قوموں میں بھی پائی جاتی ہے — وہ برادری اس تغیری دور کی چیز ہے جو گروہ وار شادی سے ترقی کرکے مادری حق پر مبنی خاندان اور موجودہ زمانے کے انفرادی خاندان کے درمیان کا دور تھا۔ کم از کم جہاں تک پرانی دنیا کی متمدن قوموں، آریوں اور سامیوں، کا تعلق ہے یہ بات ثابت معلوم ہوتی ہے۔

اس طرح کی خاندانی برادری کی سب سے عمدہ مثال ہمیں آج کل جنوبی سلاف لوگوں کے ''زدروگا،، میں ملتی ہے۔ اس کے اندر ایک باپ کی اولاد کی کئی پشتیں اور ان سب کی بیویاں شامل ہوتی ہیں۔ اور یہ سب لوگ ساتھ ایک گھر میں رہتے ہیں، مل جل کر کھیتی کرتے ہیں، ایک مشترک ذخیرے سے اپنی کھانے اور کپڑے کی ضرورت پوری کرتے ہیں اور استعمال کے بعد جو کچھ بچ رہتا ہے اس کے سب اجتماعی مالک ہوتے ہیں۔ اس برادری کا انتظام گھر کے مالک، دوماچین (domàćin) کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ بیرونی معاملوں

میں وہی اس کی نمائندگی کرتا ہے ۔ چھوٹی موٹی چیزیں الگ کرتا ہے ۔ گھر کی آمد و خرچ کا انتظام کرتا ہے ۔ گھر کے حساب کتاب کی اور کام کاج کو ٹھیک سے چلانے کی ذمہ‌داری اسی پر ہوتی ہے ۔ گھر کے مالک کا انتخاب ہوتا ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ عمر میں سب سے بڑا ہو ۔ گھر کی عورتوں اور ان کے کام کی نگرانی گھر کی مالکہ، دوماچیتسا (domaćica) کرتی ہے ۔ وہ عموماً دوماچین کی بیوی ہوتی ہے ۔ برادری کی لڑکیوں کے لئے شوہر چننے میں اس کی رائے اہم اور اکثر فیصلہ کن سمجھی جاتی ہے ۔ لیکن پھربھی آخری فیصلے کا اختیار خاندانی کاؤنسل کو ہے جس میں تمام بالغ مرد اور عورتیں شامل ہوتی ہیں ۔ گھر کا مالک اپنا حساب اسی کاؤنسل کے سامنے پیش کرتا ہے ۔ اسی کاؤنسل میں سارے اہم فیصلے کئے جاتے ہیں ۔ وہی خاندان کے افراد کے درمیان انصاف کرتی ہے ۔ اسی میں اہم چیزوں کا، خاص کر زمین کی خرید و فروخت وغیرہ کا معاملہ طے کیا جاتا ہے ۔

ابھی صرف دس برس پہلے کی بات ہے کہ اتنی بڑی بڑی خاندانی برادریوں کا وجود روس میں بھی ثابت ہوا (۱۱۹) ۔ اب یہ بات عام طور سے مان لی گئی ہے کہ روسیوں کے عام رسم‌ورواج میں اس کی جڑیں اتنی ہی مضبوطی سے پیوست ہیں جتنی ''آبش‌چینا،، یعنی دیہی برادری کی ۔ روس کے سب سے پرانے مجموعہ‌قوانین — یاروسلاف کے ''پراودا،، — میں ان برادریوں کا ذکر اسی نام (ویرو) سے آتا ہے جس نام سے دال‌میشین قوانین میں (۱۲۰) ۔ پولستانی اور چک لوگوں کی تاریخی دستاویزوں میں بھی ان برادریوں کا ذکر ملتا ہے ۔

ہیوزلر کے کہنے کے مطابق (دیکھئے اس کی کتاب ''جرمن نظام اختیارات،، *) جرمنوں میں بھی اقتصادی اکائی موجودہ مفہوم میں انفرادی خاندان نہیں تھا بلکہ گھریلو برادری (Hausgenossenschaft) تھی جس میں کئی پشت کے لوگ یا کئی انفرادی خاندان اور اکثر

---

* Heusler A,. «Institutionen des Deutschen Privaterechts». Bd. II, Leipzig, 1886, S. 271. (ایڈیٹر)

بہت سے غلام بھی شامل ہوتے تھے۔ دیکھا گیا ہے کہ رومن خاندان کی جڑیں بھی اسی نوع کی گھریلو برادری سے جا ملتی ہیں اور اس وجہ سے آج کل بڑے زوروں پر یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ کیا خاندان میں اقتدار مطلق ہمیشہ گھر کے مالک کے ہاتھ میں تھا اور اس کے مقابلے میں خاندان کے باقی افراد حقوق سے بالکل محروم ہوتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آئرلینڈ کے کیلٹ لوگوں میں بھی اس قسم کی خاندانی برادریاں موجود تھیں۔ فرانس کے نیویرنائی علاقے میں پارسونیری (parçonneries) کے نام سے انقلاب فرانس تک ان کا وجود قائم تھا۔ اور فرانشے کومٹ میں تو وہ آج تک نہیں مٹیں۔ لوھان (ساونے اور لوار) کے ضلع میں اب تک کسانوں کے بڑے بڑے گھر دیکھنے میں آتے ہیں جن میں ایک نہایت اونچا سا مشترک ہال ہوتا ہے جس کی دیواریں سب سے اوپری چھت تک جا پہنچتی ہیں، جس کے چاروں طرف سونے کے کمرے ہوتے ہیں اور جن تک پہونچنے کے لئے چھ سے آٹھ تک سیڑھیاں بنی ہوتی ہیں۔ ان میں ایک خاندان کی کئی کئی پشت کے لوگ رہتے ہیں۔

ہندستان میں سکندر اعظم کے زمانے میں ہی نیارکس نے گھریلو برادریوں کا ذکر کیا ہے جو مشترک کھیتی کرتے تھے اور اس علاقے میں یعنی پنجاب میں اور ہندستان کے سارے شمال مغربی حصے میں اس طرح کی گھریلو برادریاں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ کوالیفسکی خود بھی قفقاز میں اس طرح کی برادریوں کے وجود کی شہادت دے سکا ہے۔ الجیریا کے کابیلوں میں یہ آج تک پائی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسریکہ میں بھی ان کا وجود تھا۔ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ زوریتا نے قدیم میکسیکو میں کالپولیس (calpullis) (۱۲۱) کا جو ذکر کیا ہے وہ اسی قسم کی گھریلو برادری تھی۔ دوسری طرف کونوف نے («Ausland» (۱۲۲) ۱۸۹۰ء کے ۴۲ سے ۴۴ تک کے شماروں میں) کافی وضاحت سے یہ ثابت کیا ہے کہ جس زمانے میں یورپ‌والوں نے پیرو کو فتح کیا تو وہاں قدیم جرمن لوگوں کے مارک نظام سے ملتا جلتا ایک دستور موجود تھا (اور عجیب بات یہ ہے کہ جرمنوں کی طرح پیرو کے لوگ بھی دیہاتی برادری

کی زمین مارک کو marca کہتے تھے) ۔ ان میں کھیتی کی زمین کو وقتاً فوقتاً برادری کے لوگوں میں نئے سرے سے بانٹ دیا جاتا تھا یعنی لوگ کھیتی الگ الگ کرتے تھے ۔

بہر حال اتنی بات تو ظاہر ہے کہ پدری گھرانے کی برادری جو زمین کی مشترکہ ملکیت اور مشترکہ کھیتی کی بنیاد پر قائم تھی، اب پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہم حیثیت اختیار کر لیتی ہے ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ پرانی دنیا کی متمدن اور دوسری قوموں میں اس پدری گھرانے کی برادری نے مادری حق والے خاندان سے یک‌زوجگی کے خاندان تک ایک درمیانی عبوری منزل کی حیثیت سے اہم تاریخی خدمت انجام دی ہے ۔ کوالیفسکی نے اس سے مزید جو نتیجہ نکالا اس کی طرف ہم بعد میں لوٹیں‌گے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسی عبوری منزل سے اس دیہی یا مارک برادری کا ارتقا بھی ہوا تھا جس میں لوگ کھیتی الگ الگ کرتے تھے اور قابل کاشت اور چراگاہ کی زمینیں پہلے وقتاً فوقتاً اور پھر مستقل طور پر لوگوں میں بانٹ دی جاتی تھیں ۔

جہاں تک ان گھرانوں کے اندر خاندانی زندگی کا تعلق ہے ہمیں یہ بات دھیان میں رکھنی چاہئے کہ کم از کم روس میں گھر کے مالک کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ نوجوان عورتوں اور خاص کر اپنی بہوؤں کے سلسلے میں اپنی حیثیت سے بہت ناجائز فائدہ اٹھاتا تھا، اور اکثر وہ انہیں ایک حرم کی سی شکل دے دیتا تھا ۔ روس کے عوامی گیتوں میں ان حالتوں کی بڑی پرزور ترجمانی کی گئی ہے ۔

مادری حق کے خاتمے کے بعد یک‌زوجگی کے نظام نے بڑی تیزی سے ترقی کی ۔ لیکن اس کا ذکر کرنے سے پہلے ہم شادی کی ان شکلوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں جس میں ایک شوہر کی کئی بیویاں یا ایک بیوی کے کئی شوہر ہوتے تھے ۔ شادی کی یہ دونوں شکلیں اگر کسی ملک میں ساتھ ساتھ ملیں تو اور بات ہے — گو جیسا کہ سب کو معلوم ہے وہ ساتھ ساتھ نہیں ملتیں — ورنہ ظاہر ہے کہ وہ صرف گویا مستثنی حیثیت سے تاریخ کی تفریحی پیداوار کی حیثیت سے ہی پائی جاتی ہیں ۔ سماجی اداروں سے قطع نظر، یہ کہا

جا سکتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی تعداد بحیثیت مجموعی ہمیشہ برابر رہی ہے۔ اور اس لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ کثرت ازدواج یعنی ایک شوہر کی متعدد بیویوں کے نظام میں جو مرد اکیلے بچ رہے ہوں وہ ان عورتوں سے مطمئن ہو جائیں جو کثرت شوہری یعنی ایک عورت کے متعدد شوہروں کے نظام میں اکیلی بچ رہی ہوں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ شادی کی ان دونوں شکلوں میں سے کسی کا بھی عام رواج نہیں ہو سکا۔ ظاہر ہے مرد کی متعدد بیویوں کا دستور دراصل غلامی کے نظام کی پیداوار تھی اور محض ایک مستثنی حیثیت رکھتی تھی۔ سامیوں کے پدری خاندان میں محض سردار خاندان اور زیادہ سے زیادہ اس کے دو ایک بیٹوں کی متعدد بیویاں ہوتی تھیں۔ خاندان کے باقی لوگوں کو ایک ہی بیوی پر قناعت کرنی پڑتی تھی۔ آج بھی تمام مشرقی ملکوں میں یہی حال ہے۔ کئی کئی بیویاں رکھنا دولتمندوں اور کچھ نوابوں کے ٹھاٹ کی بات ہے۔ وہ باندیاں خرید کر گھر میں ڈال لیا کرتے ہیں۔ عام لوگ ایک ہی شادی کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندستان اور تبت میں ایک عورت کے متعدد شوہروں کا دستور مستثنی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ یقیناً ایک دلچسپ سوال ہے کہ گروہوار شادی سے اس کی ابتدا کیسے ہوئی۔ ابھی اس موضوع کا اور زیادہ گہرا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ چیز مسلمانوں کے حرم کے مقابلے میں جہاں رشک و رقابت کا دور دورہ تھا، کہیں زیادہ قابل برداشت تھی۔ کم از کم ہندستان کے نائر لوگوں میں تو یقیناً تین، چار یا زیادہ مردوں میں ایک بیوی مشترک ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ان میں سے ہر مرد کو اختیار ہوتا ہے کہ چاہے تو دوسرے تین چار مردوں کے ساتھ ایک اور بیوی رکھے اور اسی طرح اوروں کے ساتھ مل کر تیسری اور پھر چوتھی بیوی رکھے اور اس طرح اپنی بیویوں کی تعداد بڑھاتا رہے۔ تعجب کی بات ہے کہ ان شادی کلبوں یا بیاہ منڈلیوں کو دیکھ کر جن میں ایک مرد بیک وقت کئی منڈلیوں کا رکن ہو سکتا تھا، اور جن کا حال خود میکلینن نے بیان کیا ہے، میکلینن نے ایک نئی قسم کی شادی — کلب شادی — نہیں دریافت کر لی۔ لیکن یہ شادی

کلب صحیح معنی میں کثرت شوہری نہیں ہے ۔ اس کے برعکس جیسا کہ ژیرا تیولوں نے لکھا ہے یہ گروہوار شادی کی ایک مخصوص شکل ہے جس میں مرد بھی کئی شادیاں کرتے ہیں اور عورتیں بھی ۔

۴ ۔ یک‌زوجگی کا خاندان ۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ یہ خاندان بربریت کے درمیانی اور آخری دور کے بیچ کے عبوری زمانے میں جوڑا خاندان سے پیدا ہوا ۔ اور اس کی مکمل فتح اس بات کی علامت تھی کہ تمدن کا عہد شروع ہو چکا ہے ۔ یک‌زوجگی کی بنیاد مرد کی فوقیت پر ہے ۔ اس کا علانیہ مقصد ایسے بچے پیدا کرنا ہے جن کی ولدیت کے بارے میں کوئی شبہ نہ ہو ۔ اس کی ضرورت اس‌لئے ہوتی ہے کہ وقت آنے پر بچے اپنے باپ کے اصلی وارث کی حیثیت سے اس کی دولت کا ترکہ پائیں ۔ یک‌زوجگی اور جوڑا بیاہ میں فرق ہے ۔ یک‌زوجگی میں شادی کا رشتہ کہیں زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور فریقین میں سے کوئی بھی جب چاہے اس کو توڑ نہیں سکتا ۔ عام طور سے اب صرف مرد ہی کو یہ رشتہ منقطع کرنے اور بیوی کو چھوڑنے کا اختیار ہوتا ہے ۔ اب بھی اس کو اپنی بیوی سے بےوفائی کرنے کا حق حاصل ہے ۔ کم‌ازکم رسم‌ورواج نے تو اس پر اپنی مہر لگا ہی دی ہے ۔ (* Code Napoléon میں شوہر کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو داشتہ رکھ سکتا ہے بشرطیکہ اسے گھر کے اندر نہ لائے (۱۲۳) ۔) جیسے جیسے سماج کی نشوونما ہوتی ہے مرد اس حق سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے ۔ لیکن اگر بیوی پرانے جنسی رواج کو یاد کرکے ان پر عمل کرنا چاہے تو اسے پہلے سے بھی زیادہ سخت سزا ملتی ہے ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ یونانیوں میں خاندان کی اس نئی شکل پر بڑی سختی کے ساتھ عمل کیا جاتا تھا ۔ جیسا کہ مارکس نے بتایا ہے ** یونانی دیومالا میں دیویوں کی جو حیثیت ہے، وہ ایک پرانے دور

---

* ضابطہ نپولین ۔ (ایڈیٹر)

** دیکھئے ''مارکس اور اینگلس کی دستاویزات،، جلد ۹، صفحہ ۳۲ ۔ (ایڈیٹر)

کی ترجمانی کرتی ہے جب عورتوں کو زیادہ آزادی حاصل تھی اور ان کی زیادہ عزت کی جاتی تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سورمائی عہد میں مردوں کے غلبے اور غلام عورتوں کے مقابلے کی وجہ سے عورتیں اپنے بلند مرتبے سے گر گئیں۔ ''اوڈیسی،، میں آپ پڑھیں گے کہ تیلی ماکس اپنی ماں کو ڈانٹ کر خاموش کردیتا ہے*۔ ہومر کی نظموں میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب کبھی جنگ میں نوجوان عورتیں پکڑی گئیں، ان کو جنسی لذت کشی کا ذریعہ بنایا گیا۔ فوج کے افسر اپنے اپنے درجے کے مطابق ایک کے بعد ایک آتے ہیں اور سب سے خوبصورت عورتوں کو اپنے اپنے لئے چن لیتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ''ایلیڈ،، کی پوری داستان اس ایک واقعے کے گرد گھومتی ہے کہ اکیلیس اور آگامنون میں ایک ایسی غلام لڑکی کے بارے میں جھگڑا ہوگیا ہے۔ ہومر کی نظموں میں ہر اہم ہیرو کےساتھ ایک غلام لڑکی ضرور ہوتی ہے جو اس کے خیمے میں رہتی ہے اور جس کے ساتھ وہ ہمبستر ہوتا ہے۔ ان لڑکیوں کو ان کے مالک اپنے ساتھ گھر لےجاتے ہیں جہاں ان کی بیویاں ہوتی ہیں۔ ایسکیلس کے یہاں اسی طرح اگامنون کیسنڈرا کو اپنے گھر لے گیا تھا**۔ ان باندیوں سے جو بیٹے پیدا ہوتے ہیں انہیں باپ کی جائداد کا چھوٹا سا حصہ ملتا ہے اور انہیں آزاد سمجھا جاتا ہے۔ تیلامون کا ایک ایسا ہی ناجائز بیٹا تیوکراس تھا جسے اپنے باپ کا نام اختیار کرنے کی اجازت دےدی گئی تھی۔ بیاہتا بیوی سے امید کی جاتی تھی کہ وہ یہ سب کچھ خاموشی کے ساتھ برداشت کرلےگی اور خود شوہر کی پوری طرح وفادار رہےگی۔ یہ صحیح ہے کہ تمدن کے عہد کے مقابلے میں سورمائی دور میں یونانی بیوی کی زیادہ عزت کی جاتی تھی۔ لیکن شوہر کی نظروں میں اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں تھی کہ وہ اس کے جائز وارثوں کی ماں ہے، اس کے گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے اور اس کی باندیوں کی نگرانی کرتی ہے جنہیں وہ جب چاہے

---

* ہومر ''اوڈیسی،، گیت اول۔ (ایڈیٹر)

** ایسکیلس ''آرسطیا۔ اگامنون،،۔ (ایڈیٹر)

داشتہ بنا سکتا ہے اور اکثر وہ ایسا کرتا بھی ہے۔ یک‌زوجگی کے ساتھ چونکہ برابر غلامی کا رواج رہا اور خوبصورت نوجوان باندیوں کا وجود رہا جو ہمیشہ مردوں کی پوری پوری ملکیت ہوتی تھیں، اس لئے شروع ہی سے یک‌زوجگی پر اس کا اثر پڑا۔ اور اس کی وجہ سے یک‌زوجگی کا یہ مخصوص کردار ہو گیا کہ عورتوں کے لئے تو ایک شوہر کی پابندی ہے مگر مردوں کے لئے یک‌زوجگی نہیں ہے۔ اور آج بھی یہی حالت چلی آرہی ہے۔

جہاں تک سورمائی عہد کے بعد کے یونانیوں کا تعلق ہے ہمیں ڈورین اور ایونی لوگوں میں فرق کرنا چاہئے۔ ڈورین لوگوں کی سب سے اچھی اور نمایاں مثال اسپارٹا میں ملتی ہے۔ ان میں شادی کے ایسے رشتے ملتے ہیں جو کئی باتوں میں ہومر کے بتائے ہوئے رشتوں سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ اسپارٹا میں ہمیں چوڑا بیاہ کی ایک شکل بھی ملتی ہے جسے وہاں کی ریاست نے مروجہ خیالات کے مطابق کسی قدر بدل دیا تھا۔ جوڑا بیاہ کی یہ ایک ایسی شکل تھی جس میں اس وقت تک گروہ‌وار شادی کے اثرات بھی موجود تھے۔ جس شادی سے بچے نہیں ہوتے تھے، اسے منقطع کر دیا جاتا تھا۔ بادشاہ انکسندریدس (تقریباً ۵۶۰ ق۔ م۔) کی پہلی بیوی لاولد تھی۔ اس لئے اس نے دوسری شادی کی اور دو گھر بسائے۔ اسی زمانے کا ایک اور بادشاہ ارسطونس ہے۔ اس کی دو بیویاں لاولد تھیں۔ اس نے ایک کو چھوڑ دیا اور تیسری شادی کی۔ دوسری طرف کئی بھائی مل کر ایک بیوی رکھ سکتے تھے۔ اگر کسی شخص کو اپنے دوست کی بیوی پسند آ جاتی تو وہ اس کا حصہ‌دار بن سکتا تھا۔ اور جیسا کہ بسمارک کہے گا، اگر کہیں کوئی مضبوط ''سانڈ،، ہو، چاہے وہ شخص ہم‌شہر نہ ہو، تو بھی اپنی بیوی کو اس کے سپرد کرنا مناسب سمجھا جاتا تھا۔ پلوتارک کی ایک کتاب میں ایک جگہ یہ تذکرہ ہے کہ ایک اسپارٹن عورت نے اپنے ایک عاشق کو، جو بہت دنوں سے اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا، اپنے شوہر کے پاس بھیج دیا۔ شوہان نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ان دنوں جنسی آزادی زیادہ تھی۔ زنا کاری یعنی شوہر کے پیٹھ پیچھے بیوی کا اس

سے بیوفائی کرنا، ان دنوں سننے میں بھی نہیں آتا تھا۔ دوسری طرف، اسپارٹا میں، کم از کم اس کے عروج کے زمانے میں گھریلو غلامی نہیں تھی۔ زرعی غلام ایلوٹ، الگ جاگیروں پر رہتے تھے اور اس لئے اسپارٹیاٹیز (۱۲۴) کو ان کی عورتوں سے ہمبستری کی ترغیب کم ہی ملتی تھی۔ ان حالات میں یہ قدرتی بات تھی کہ دوسری تمام یونانی عورتوں کے مقابلے میں اسپارٹا کی عورتوں کی زیادہ عزت ہوتی تھی۔ قدیم زمانے کے مصنفوں نے یونانی عورتوں میں صرف اسپارٹا کی عورتوں اور ایتھنز کی ہیتائری عورتوں کے سب سے اونچے حصے کا ذکر ادب اور احترام کےساتھ کیا ہے اور ان کے اقوال کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے۔

ایونی لوگوں میں جن کی نمایاں مثال ایتھنز کے لوگ ہیں، حالات کچھ اور تھے۔ وہاں لڑکیاں صرف چرخہ کاتنا، کپڑا بننا اور سینا پرونا سیکھتی تھیں۔ بہت ہوا تو کچھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا۔ مردوں سے انہیں بالکل الگ رکھا جاتا تھا۔ وہ صرف عورتوں سے ہی مل سکتی تھیں۔ عورتیں گھر کے ایک علحدہ حصے یعنی خلوت میں رہتی تھیں۔ یہ حصہ عام طور پر اوپر کی منزل پر یا مکان کے پیچھے کی طرف ہوتا تھا، جہاں مردوں کا اور خاص کر کسی اجنبی مرد کا گذر آسانی سے نہیں ہو سکتا تھا اور مرد مہمانوں کے آنے پر بی‌بیاں وہاں چلی جاتی تھیں۔ بی‌بیاں صرف کسی باندی کو ساتھ لے کر ہی باہر جا سکتی تھیں ورنہ نہیں، گھر کے اندر ان پر پہرہ سا رہتا تھا۔ اریسطوفینس لکھتا ہے (۱۲۵) کہ بدکاروں کو دور رکھنے کے لئے مولوسین کتے پالے جاتے تھے۔ ایشیائی شہروں میں عورتوں پر پہرہ دینے کے لئے خواجہ سرا رکھے جاتے تھے۔ ہیروڈوٹس کے زمانے میں بھی جزیرہ کیوس میں غلاموں کو آختہ کرکے خواجہ سرا تیار کئے جاتے تھے اور ان کا بیوپار کیا جاتا تھا۔ اور واکس‌متھ کا کہنا ہے کہ وہ صرف بربریوں کے لئے نہیں ہوتے تھے۔ یوری‌پیڈیز کے ڈراموں میں بیوی کو اوئیکوریما (oikurema) کہا گیا ہے * جس کے معنی ہیں گھر کی نگہداشت کرنےوالی چیز (یہ لفظ بےجنس کا ہے) اور ایتھنز کے لوگوں کی نظر

---

* یورپیڈیز ''آرسطیا''۔ (ایڈیٹر)

میں بیوی کا کام بچے پیدا کرنے کے علاوہ اگر کچھ تھا تو صرف یہ کہ وہ گھر کی سب سے بڑی ملازمہ تھی۔ شوہر اکھاڑے میں کسرت اور ورزش کرتا تھا ، شہری معاملات میں حصہ لیتا تھا۔ بیوی کو ان سب سے علحدہ رکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ شوہر کے پاس اکثر لونڈیاں باندیاں ہوتی تھیں اور ایتھنز کے عروج کے زمانے میں کثرت سے طوائفیں تھیں ، بڑے پیمانے پر عصمت فروشی ہوتی تھی اور حکومت اگر کچھ اور نہیں تو اس کو پسندیدگی کی نظر سے تو دیکھتی ہی تھی۔ یونان میں جتنی عورتوں نے بھی امتیاز حاصل کیا وہ اسی عصمت‌فروشی کی بنیاد پر۔ وہ اپنی زندہ دلی اور خوش گوئی اور فنون لطیفہ کے اعلی ذوق کی بدولت قدیم نسائیت کی عام سطح سے اسی قدر بلند تھیں جس قدر اسپارٹا کی عورتیں اپنے کردار کی بدولت۔ ایتھنز کے خاندانی نظام کی پستی کا اس سے بڑا کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا کہ عورت کو اپنا مرتبہ حاصل کرنے کے لئے پہلے طوائف بننا پڑتا تھا۔

رفتہ رفتہ ایتھنز کا یہ خاندان ایک نمونہ بن گیا اور صرف ایونی کے باقی لوگ ہی نہیں بلکہ خاص یونان اور اس کی نو آبادیات کے سارے یونانی لوگ بھی اپنے خاندانی تعلقات کو زیادہ سے زیادہ اسی سانچے میں ڈھالنے لگے۔ لیکن اس تمام علحدگی اور نگرانی کے باوجود یونان کی عورتیں اکثر اپنے شوہروں کو دھوکہ دینے کے مواقع نکال ہی لیتی تھیں۔ ان کے شوہر جنہیں اپنی بیوی سے محبت کا اظہار کرنے میں شرم محسوس ہوتی تھی ، طوائفوں اور داشتہ عورتوں کے ساتھ جی کھول کر داد عیش دیا کرتے اور طرح طرح سے محبت کے مزے لوٹتے تھے۔ لیکن عورتوں کی یہ گراوٹ مردوں کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہی۔ اس نے انہیں بھی اخلاقی پستی کے گڑھے میں گرا دیا یہاں تک کہ وہ لڑکوں سے محبت کے جنسی مرض میں مبتلا ہو گئے اور گینی‌مید کا قصہ گھڑ کر انہوں نے خود کو اور اپنے خداؤں کو رسوا کیا۔

قدیم زمانے کی سب سے متمدن اور ترقی‌یافتہ قوم میں جہاں تک ہم پتہ لگا سکے ہیں ، یک‌زوجگی کی ابتدا اسی طرح ہوئی۔ کسی اعتبار سے بھی یہ انفرادی جنسی محبت کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ شادیاں پہلے کی طرح اب بھی مصلحت کی بنا پر کی

جاتی تھیں ۔ یہ خاندان کی وہ پہلی شکل تھی جس کی بنیاد قدرتی نہیں بلکہ اقتصادی حالات پر تھی — یعنی ابتدائی مشترکہ ملکیت پر ، جس کی نشو ونما قدرتی طور پر ہوئی تھی ، ذاتی ملکیت کی فتح — یہی اس کی بنیاد تھی ۔ یونان‌والے علانیہ کہتے تھے کہ یک‌زوجگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ خاندان کے اندر مرد کی حکمرانی ہو ، ایسے بچے پیدا ہوں جو صرف اس کے نطفے سے ہوں اور جو اس کے وارث بنیں ۔ ان باتوں سے قطع نظر ، شادی ایک بار تھی ، خدا ، ریاست اور اپنے آباو اجداد کا عائد کیا ہوا فریضہ تھی جس کو کسی طرح ادا کرنا تھا۔ ایتھنز میں قانون نے شادی کو لازمی قرار دیا تھا ۔ اور اتنا ہی نہیں ۔ مرد پر کم از کم کچھ فرائض شوہری بھی عائد کر دئیے گئے تھے جن کو پورا کرنا ضروری تھا ۔

چنانچہ تاریخ میں یک‌زوجگی نہ تو مرد اور عورت کی کسی مصالحت کا نتیجہ تھی اور نہ شادی کی کوئی اعلیٰ شکل ۔ اس کے برعکس وہ عورتوں پر مردوں کے تسلط کا اظہار تھا ۔ دونوں جنسوں کے درمیان ایک ایسے تضاد اور اختلاف کا اعلان تھا جس کی مثال ماقبل تاریخی زمانے میں کہیں نہیں ملتی ۔ میں نے اور مارکس نے مل کر ۱۸۴۶ء میں ایک کتاب لکھی تھی جو ابھی تک غیرمطبوعہ * ہے ۔ اس پرانے غیرمطبوعہ مسودے میں مجھے ایک فقرہ ملا کہ ”محنت کی سب سے پہلی تقسیم مردوں اور عورتوں میں بچہ پالنے کے لئے ہوئی“ ۔ اور آج میں اس پر یہ اضافہ کر سکتا ہوں کہ تاریخ میں پہلا طبقاتی اختلاف یک‌زوجگی کے نظام کے اندر مردوں اور عورتوں کے اختلاف کے ابھرنے کے ساتھ ساتھ نمودار ہوتا ہے ۔ اور پہلا طبقاتی ظلم عورتوں پر مردوں کے ظلم کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے ۔ یک‌زوجگی کا نظام تاریخی حیثیت سے ترقی کا ایک بڑا قدم تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ ایک ایسا قدم تھا جس نے غلامی اور انفرادی دولت کے ساتھ اس دور کا آغاز کیا جو آج تک قائم ہے اور جس میں ہر قدم جو اٹھتا ہے وہ ایک اعتبار سے پیچھے بھی لے جاتا ہے ، جس میں ایک گروہ کی خوش‌حالی اور ترقی دوسرے گروہ پر مصیبت اور

---

* یہ اشارہ ”جرمن آئڈیالوجی“ (فکریات) کی طرف ہے ۔ (ایڈیٹر)

ظلم ڈھا کر حاصل کی جاتی ہے ۔ یک‌زوجگی متمدن سماج کی وہ بالکل ابتدائی صورت ہے جس کے اندر ہم ابھی سے ان تمام اختلافوں اور تضادوں کی نوعیت کا مطالعہ کر سکتے ہیں جو متمدن سماج میں پوری طرح بڑھ کر سامنے آتے ہیں ۔

جوڑا خاندان یا خود یک‌زوجگی کے بعد بھی جنسی تعلق کی پرانی نسبتی آزادی کا بالکل خاتمہ نہیں ہوا ۔

'' ترقی‌پذیر خاندان کو اب بھی شادی کا وہی پرانا نظام گھیرے ہوئے تھا جو پونالوان گروہوں کے رفتہ رفتہ ختم ہو جانے کی وجہ سے اب ایک چھوٹے سے دائرے کے اندر محدود ہو گیا تھا اور اول الذکر کے پیچھے پیچھے وہ نظام تمدن کے دور تک جا پہنچتا ہے ... آخر میں وہ ہیتائرازم کے نئے نظام میں گم ہوجاتا ہے جو آج بھی تمدن کے دور میں خاندان کے ساتھ لگے ہوئے ایک تاریک سائے کی طرح انسانیت کا پیچھا کر رہی ہے ۔ ''

ہیتائرازم سے مارگن کی مراد شادی کے رشتے کے باہر مردوں اور بن‌بیاہی عورتوں کا وہ جنسی تعلق ہے جو یک‌زوجگی کے نظام کے ساتھ ساتھ قائم رہتا ہے اور جیسا کہ سبھی جانتے ہیں تمدن کے پورے عہد میں مختلف صورتوں میں پھلتا پھولتا رہا ہے اور برابر علانیہ عصمت‌فروشی کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے ۔ ہیتائرازم کا براہ راست تعلق گروہ‌وار شادی سے ہے ۔ اس کا تعلق قربانی کے طور پر عورتوں کی سپردگی کی رسم سے ہے جو یہ قیمت ادا کر کے اپنی عفت و پاک‌دامنی کا حق خریدا کرتی تھیں ۔ روپیہ لے کر اپنے آپ کو مردوں کی آغوش میں دے دینا شروع میں ایک مذہبی کام تھا جس کو محبت کی دیوی کے مندر میں انجام دیا جاتا تھا اور وہ روپیہ مندر کے خزانے میں داخل کر دیا جاتا تھا ۔ ارمینیا میں انائیطس کے مندر اور کورنتھ میں ایفروڈائٹ کے مندر کی ہائروڈیول (۱۲۶) اور ہندستان کے مندروں کی دیو داسیاں ، جنہیں بیادیر بھی کہا جاتا ہے (یہ پرتگلی زبان کے لفظ «bailadeira» کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب ناچنے‌والی لڑکی ہوتا ہے) — یہ تاریخ کی پہلی طوائفیں تھیں ۔ قربانی کے طور پر سپردگی کی یہ رسم ادا کرنا پہلے

سبھی عورتوں کے لئے ضروری تھا۔ بعد میں مندروں کی یہ پجارنیں ہی سب عورتوں کی طرف سے یہ خدمت انجام دینے لگیں۔ دوسری قوموں میں ہیتائرازم کی ابتدا جنسی تعلق کی اس آزادی سے ہوئی جو لڑکیوں کو شادی سے پہلے حاصل تھی۔ یہ بھی گروہوار شادی کے اثرات میں سے ہے جو ہم تک ایک دوسرے راستے سے ہو کر پہنچی ہے۔ ملکیت کا اختلاف اور امتیاز پیدا ہونے پر — جو بربریت کے آخری دور میں ہی ہو چکا تھا — غلاموں کی محنت کے علاوہ کہیں کہیں مزدوری پر بھی کام ہونے لگا تھا۔ اور اسی کے ساتھ اس کے لازمی جزو کی حیثیت سے لونڈیوں باندیوں کے ساتھ زبردستی زناکاری کے علاوہ آزاد عورتوں کی پیشہور عصمتفروشی کا بھی آغاز ہوا۔ جس طرح تمدن سے پیدا ہونےوالی ہر چیز دو مونہی اور دو رخی ہوتی ہے اور اس کے اندر تضاد اور اختلاف کے پہلو پوشیدہ ہوتے ہیں، اسی طرح گروہوار شادی سے تمدن کو جو وراثت ملی، اس کے بھی دو پہلو ہوتے ہیں: ایک طرف یکزوجگی ہے اور دوسری طرف ہیتائرازم، جس میں اس کی انتہائی صورت عصمت فروشی بھی شامل ہے۔ دوسرے اداروں کی طرح، ہیتائرازم، بھی ایک سماجی ادارہ ہے۔ یہ قدیم جنسی آزادی کی ہی ایک صورت ہے مگر اب یہ آزادی صرف مردوں کے لئے رہ گئی ہے اور اگرچہ حقیقت میں لوگ نہ صرف یہ کہ اس کو برداشت کرتے ہیں بلکہ بڑے جوش و خروش سے اس پر عمل کرتے ہیں، لیکن زبان سے، خاص طور پر حکمراں طبقے کے لوگ، اس کی مذمت کرتے ہیں۔ ہیتائری نظام کی اس لعنت ملامت سے مردوں کو، جو اس آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہیں، دراصل کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اس کی چوٹ صرف عورتوں پر پڑتی ہے۔ ان سے سماجی طور پر قطع تعلق سا کرکے انہیں سماج باہر کر دیا جاتا ہے تاکہ ایک بار پھر عورت پر مردوں کے کامل اقتدار کا اعلان کیا جا سکے اور یہ بتایا جا سکے کہ یہی سماج کا بنیادی قانون ہے۔

لیکن اس سے خود یکزوجگی کے اندر ایک اور تضاد نمودار ہوتا ہے۔ شوہر تو ہیتائرازم کے مزے لوٹ کر اپنی زندگی کو رنگین بنا لیتا ہے لیکن بیوی اکیلی پڑی اپنی قسمت کو روتی ہے اور جس طرح آدھا سیب کھا لینے کے بعد ہاتھ میں پورا سیب نہیں رہےگا، اسی طرح یہ بھی

نہیں ہو سکتا کہ تضاد کا ایک پہلو ہو اور دوسرا نہ ہو ۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو جب تک اپنی بیویوں سے سبق نہیں ملا ، وہ یہ نہیں سوچتے تھے ۔ یک‌زوجگی کے ساتھ دو نئی شخصیتیں مستقل طور پر سماج کے پردے پر ابھر آتی ہیں ، جن کا پہلے کوئی وجود نہ تھا ۔ ایک تو بیوی کا آشنا اور دوسرا قرمساق یعنی غیر مردوں سے آشنائی کرنےوالی عورت کا شوہر ۔ مردوں نے عورتوں پر فتح پا لی تھی مگر فاتح کے سر پر تاج رکھنے کا کام مفتوح نے نہایت فراخ دلی سے ہاتھوں میں لے لیا ۔ یک‌زوجگی اور ہیتائرازم کے ساتھ ساتھ زناکاری بھی سماج کا ایک ناگزیر دستور بن گئی ۔ اسے ناجائز قرار دیا گیا ، اس کے لئے سخت سزائیں دی گئیں ، مگر اس کو مٹایا نہیں جا سکا ۔ اپنے بچوں کی ولدیت کے بارے میں باپ کا یقین پہلے کی طرح اب بھی محض اخلاقی اعتماد پر مبنی تھا اور یہ تضاد جو کسی طرح حل نہیں ہوتا تھا ، اس کو حل کرنے کی غرض سے ضابطہ نپولین کی دفعہ ۳۱۲ میں اعلان کیا گیا : «L'enfant conçu pendant le mariage a pour père le mari» یعنی ”شادی‌شدہ زندگی کے دوران میں جس بچے کا حمل قرار پائے گا ، اس کا باپ شوہر کو سمجھا جائے گا ۔“

تین ہزار برس میں یک‌زوجگی کے نظام کا ماحصل بس اتنا ہی ہے ۔

غرضکہ یک‌زوجگی کے خاندان کے اندر ، اس کی ان شکلوں میں جن میں اس کی تاریخی ابتدا کی صحیح تصویر ملتی ہے اور جو مرد اور عورت کی اس شدید کشمکش کو جو مردوں کے واحد غلبے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ، صاف طور پر سامنے لے آتی ہیں ، ہمیں مختصر پیمانے پر وہی اختلاف اور تضاد دکھائی دیتا ہے جن میں سے ہو کر یہ سماج جو تمدن کی ابتدا سے ہی مختلف طبقوں میں بٹا ہوا ہے ، آگے بڑھتا ہے اور جن تضادوں کو وہ نہ تو حل کر سکتا ہے اور نہ دور کر پاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ میں یہاں یک‌زوجگی کی صرف ان صورتوں کا ذکر کررہا ہوں جن میں شادی‌شدہ زندگی صحیح معنی میں ان اصولوں پر چلتی ہے جن سے اس پورے رواج کی ابتدائی نوعیت متعین ہوتی تھی ، لیکن جن میں بیوی شوہر کے غلبے کے خلاف بغاوت پر کمربستہ ہوجاتی ہے ۔ لیکن سبھی شادیوں میں ایسا نہیں ہوتا ۔ اور یہ بات

جرمنی کے ان کم‌نظروں سے زیادہ بہتر اور کون سمجھ سکتا ہے جو نہ گھر میں حکومت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ ملک میں اور اس لئے جن کی بیویاں پورے جواز کے ساتھ اس منصب کو قبول کرتی ہیں جس کے لئے ان کے شوہر نااہل ثابت ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتے ہیں کہ ان فرانسیسیوں سے ان کی حالت کہیں زیادہ اچھی ہے جو انکی مصیبت کے ساتھی ہیں۔ ان بےچاروں کی حالت تو اور بھی بدتر ہوتی ہے۔

لیکن یک‌زوجگی کا خاندان ہمیشہ اور ہر جگہ اتنی سخت صورت لے کر نہیں آیا جتنی سخت صورت میں وہ یونان میں ظاہر ہوا تھا۔ رومنوں میں، جو کہ دنیا کے آئندہ فاتحوں کی حیثیت سے اگر یونانیوں سے شائستگی میں کم تھے تو دور اندیشی میں بڑھے ہوئے، عورت کو زیادہ آزادی تھی اور اس کی زیادہ عزت کی جاتی تھی۔ رومن مرد یہ سمجھتا تھا کہ چونکہ اسے اپنی بیوی پر زندگی اور موت کا اختیار حاصل ہے، اس لئے اس کی عصمت پوری طرح محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ شوہر کی طرح بیوی کو بھی اختیار تھا کہ جب چاہے اپنی مرضی سے شادی کا رشتہ توڑ دے۔ لیکن یک‌زوجگی کے نظام میں سب سے بڑی ترقی اس وقت ہوئی جب جرمنوں نے تاریخ کے دائرے میں قدم رکھا کیونکہ غالباً ان کے افلاس کی وجہ سے ان میں اس وقت تک جوڑا بیاہ سے یک‌زوجگی پوری طرح ابھرنے نہیں پائی تھی۔ ہم اس نتیجے پر تین باتوں سے پہنچتے ہیں جن کا تذکرہ تاسیت نے کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اگرچہ انہیں شادی کے تقدس کا پورا احترام تھا — ”ہر مرد ایک بیوی سے مطمئن ہے اور عورتیں عفت‌وپاکدامنی کے بندھنوں سے بندھی رہتی ہیں“ — اونچے درجے کے مردوں اور قبیلوں کے سرداروں میں کئی بیویاں رکھنے کا رواج تھا۔ یعنی یہاں بھی امریکنوں کی سی حالت تھی، جن میں جوڑا بیاہ کا رواج تھا۔ دوسری بات یہ کہ ان لوگوں میں مادری حق کی جگہ پدری حق کچھ ہی دن پہلے قائم ہوا تھا کیونکہ ماں کے بھائی کو، جو کہ مادری حق کے مطابق گن کےاندر سب سے قریبی رشتہ‌دار ہوتا تھا، اب بھی باپ کے مقابلے میں زیادہ قریبی رشتہ‌دار سمجھا جاتا تھا۔ یہ بات بھی امریکی انڈینوں کے نقطۂ نظر سے ملتی ہے جن میں

مارکس نے ، جیسا کہ وہ اکثر کہا کرتا تھا ، ہمارے ماضی کے ماقبل تاریخی زمانے کو سمجھنے کی کنجی پائی تھی ۔ اور تیسری بات یہ کہ جرمنوں میں عورتوں کی بڑی عزت کی جاتی تھی اور امور عامہ میں بھی ان کا اثر تھا ۔ یہ بات بھی مرد کے غلبے کے خلاف ہے جو یک‌زوجگی کی خصوصیت ہے ۔ تقریباً یہ سبھی باتیں ایسی ہیں جن پر جرمنوں اور اسپارٹاوالوں میں اتفاق ہے ۔ جرمنوں کی طرح ان میں بھی جوڑا بیاہ پوری طرح نہیں بٹا تھا ۔ چنانچہ اس سلسلے میں بھی جرمنوں کے عروج کے ساتھ ایک بالکل نئی چیز نے عالمگیر غلبہ حاصل کرلیا ۔ رومنوں کی دنیا کے کھنڈروں پر مختلف نسلوں کی آمیزش سے یک‌زوجگی کا جو نیا نظام رائج ہوا اس نے مردوں کے تسلط کو کسی قدر نرم شکل میں پیش کیا اور عورت کو باہری دکھاوے کے لئے ہی سہی ، کلاسیکی قدیم زمانے سے کہیں زیادہ آزادی اور عزت عطا کی ۔ اس کی وجہ سے پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ اخلاقی ترقی کا وہ سب سے بڑا قدم اٹھایا جائے جو یک‌زوجگی کی بنیاد پر اور اس کی بدولت آج تک اٹھایا جا سکا ہے ۔ یہ ترقی کہیں یک‌زوجگی کے اندر ہے ، کہیں اس کے متوازی ہے اور کہیں اس کے خلاف بھی ہے ۔ اور وہ ہے جدید انفرادی جنسی محبت ، جو اس سے پہلے دنیا میں کہیں نہیں دیکھی گئی تھی ۔

لیکن یہ ترقی یقیناً اس بات کا نتیجہ تھی کہ جرمنی کے لوگ اس وقت تک جوڑا بنا کر رہتے تھے اور اس میں عورت کی جو حیثیت تھی ، اسی کو انہوں نے یک‌زوجگی کے نظام پر چسپاں کر دیا ۔ اور یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ جرمنوں کے مزاج کی شہرۂ آفاق اور حیرت انگیز اخلاقی پاکیزگی اس ترقی کا باعث ہوئی ۔ جرمنوں کی اخلاقی پاکیزگی بس اسی قدر تھی کہ جوڑا خاندان میں عملاً وہ نمایاں اخلاقی تضاد نہیں ابھرے تھے جو یک‌زوجگی میں نمودار ہوئے ۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ جرمن لوگ اپنی خانہ بدوشی میں اور خاص کر جنوب مشرق میں بحیرۂ اسود کے ساحلوں پر گھاس کے میدانوں میں رہنےوالے خانہ بدوشوں کے پاس پہنچ کر ، اخلاقی اعتبار سے بہت گر گئے تھے ۔ انہوں نے ان خانہ بدوشوں سے گھوڑ سواری کے علاوہ ان کی غیرفطری اخلاقی برائیاں بھی سیکھ لی تھیں ۔ اس کی تصدیق امیانس نے تائفالی کے بارے میں اور

پروکوپیئس نے ہیرولی کے بارے میں پوری صفائی کے ساتھ کر دی ہے (۱۲۷)۔

اگرچہ یک‌زوجگی ہی خاندان کی ایک ایسی شکل ہے جس سے جدید جنسی محبت کو فروغ ہو سکتا تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اس خاندان کے اندر یہ محبت محض یا بڑی حد تک شوہر اور بیوی کی باہمی محبت بن کر بڑھی۔ مرد کے غلبے کے تحت یک‌زوجگی کے سخت اور بےلوچ نظام کی فطرت ہی کچھ ایسی تھی کہ اس محبت کی نشو و نما کا امکان نہیں رہا تھا۔ ان سبھی طبقوں میں جو تاریخی طور پر سر گرم عمل رہے ہیں، یعنی سبھی حکمران طبقوں میں شادی کی وہی حیثیت تھی جو جوڑا بیاہ کے زمانے سے چلی آرہی تھی — یعنی یہ مصلحت کا معاملہ تھا جس کو والدین طے کیا کرتے تھے۔ اور جنسی محبت کی پہلی صورت جو عشق بن کر اٹھی، ایک ایسا عشق جس میں مبتلا ہونے کا حق ہر شخص کو (کم از کم حکمران طبقے کے ہر شخص کو) تھا اور جو جذبۂ جنسی کی اعلیٰ‌ترین شکل سمجھی جاتی تھی — اور یہی اس کی اصلی خصوصیت بھی تھی — یہ پہلی صورت، عہد وسطیٰ کے سورماؤں کی یہ سرفروشانہ محبت ازدواجی محبت ہرگز نہیں تھی۔ اس کے برعکس فرانس کے پرووانسال لوگوں میں جہاں سورماؤں کے اس عشق کی اصلی شکل ملتی ہے، یہ عشق بیاہتا عورت کے ساتھ علانیہ زناکاری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے شاعر اسی کے گیت گاتے تھے۔ آلبا گیت (albas)، جرمن میں ٹاگیلیڈر (Tagelieder) (یعنی نغمات سحر) پرووانسال لوگوں کی عشقیہ شاعری کا سب سے شاداب پھول ہے۔ ان گیتوں میں بڑی رنگینی کے ساتھ یہ داستان سنائی گئی ہے کہ عاشق اپنی محبوبہ کے ساتھ جو کسی اور کی بیوی ہے، سو رہا ہے اور دربان جو باہر کھڑا پہرہ دے رہا ہے، سحر کی پہلی مدھم کرن (alba) کے پھوٹتے ہی عاشق کو آواز دیتا ہے کہ وہ چپ چاپ نکل چلے۔ اور تب جدائی کی گھڑی آتی ہے جو پورے قصے کا نقطۂ عروج ہے۔ شمالی فرانس کے لوگوں نے اور قابل قدر جرمنوں نے بھی سورماؤں کے عشق کے ان طور طریقوں کے ساتھ ساتھ شاعری کا یہ طرز بھی جو اس عشق کے لئے بہت موزوں تھا، اختیار کر لیا۔ اور ہمارے اپنے والفرام فان‌اشن‌باخ

نے اس موضوع پر تین نغمات سحر لکھے ہیں جو بہت خوبصورت ہیں اور جو مجھے اس کی تینوں طویل رجزیہ نظموں سے زیادہ پسند ہیں ۔

خود ہمارے زمانے کی بورژوا شادی دو طرح کی ہوتی ہے ۔ کیتھولک ملکوں میں والدین پہلے کی طرح اب بھی اپنے نوجوان بورژوا بیٹے کے لئے موزون سی بیوی ڈھونڈ لاتے ہیں اور لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یک‌زوجگی میں جو تضاد موجود ہے وہ کھل کر سامنے آجاتا ہے : شوہر ہیتائرازم کا راستہ لیتا ہے اور بیوی دل کھول کر زناکاری کرتی ہے ۔ کیتھولک کلیسا نے بلاشبہ طلاق کو صرف اس لئے مٹایا تھا کہ اس کو یقین تھا کہ موت کی طرح زناکاری کا بھی کوئی علاج نہیں ہے ۔ اس کے برعکس پروٹسٹنٹ ملکوں میں یہ قاعدہ ہے کہ بورژوا بیٹے کو اپنے طبقے کے اندر سے کم‌وبیش آزادی کے ساتھ اپنے لئے بیوی چن لانے کی اجازت ہوتی ہے ۔ اس لئے ان ملکوں میں شادی کی بنیاد کسی حد تک محبت پر ہو سکتی ہے ۔ اور پروٹسٹنٹ منافقت کے مطابق دکھاوے کے لئے ہمیشہ یہ فرض کر ہی لیا جاتا ہے کہ میاں بیوی میں محبت ہے ۔ یہاں مرد کسبیوں اور داشتہ عورتوں کے پیچھے اتنا زیادہ نہیں دوڑتے اور نہ عورتوں میں زناکاری کا اتنا زیادہ رواج ہوتا ہے ۔ شادی کی چاہے کوئی شکل ہو ، لوگ شادی کے بعد بھی وہی رہتے ہیں جو پہلے تھے اور چونکہ پروٹسٹنٹ ملکوں کے شہری زیادہ‌تر کم‌نظر ہوتے ہیں اس لئے اگر ہم پروٹسٹنٹ ملکوں میں بھی بہترین مثالوں کا اوسط نکالیں تو دیکھیں‌گے کہ یک‌زوجگی میں میاں بیوی ایک دوسرے سے اکتا جاتے ہیں ، زندگی اجیرن ہو جاتی ہے اور اسی کو ازدواجی مسرت سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ دونوں قسم کی شادیوں کی بہترین تصویر ناول میں ملتی ہے : فرانسیسی ناولوں میں کیتھولک قسم کی شادی کی تصویر اور جرمن ناولوں میں پروٹسٹنٹ قسم کی شادیوں کی ۔ دونوں میں مرد ” پا لیتا ہے “ — جرمن ناول میں نوجوان مرد لڑکی پا لیتا ہے اور فرانسیسی ناول میں شوہر قرمساقی کا تمغہ ۔ ان دونوں میں کس کی حالت زیادہ قابل رحم ہے ، یہ کہنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا ۔ جرمن ناول کا ٹھس‌پن فرانسیسی بورژواؤں میں کراہیت کا وہی احساس پیدا کرتا ہے جو فرانسیسی ناولوں کی ” بدکاری “ جرمن کم‌نظروں میں پیدا کرتی ہے ۔

لیکن ادھر حال میں چونکہ ”برلن عالمی شہر بن رہا ہے“ اس لئے جرمن ناولوں میں ہیتائرازم اور زناکاری کا ذکر، جو سب کو معلوم ہے کہ عرصے سے وہاں موجود تھی کھل کر زیادہ دلیری کے ساتھ ہونے لگا ہے۔

دونوں صورتوں میں شادی فریقین کی طبقاتی حیثیت پر منحصر ہوتی ہے اور اس حد تک وہ ہمیشہ مصلحت کی شادی ہوتی ہے۔ پھر دونوں ہی صورتوں میں بمصلحت کی یہ شادی اکثر نہایت بےحیائی سے عصمت‌فروشی کا جامہ پہن لیتی ہے — کبھی کبھی دونوں فریقوں پر لیکن عموماً بیویوں پر یہ بات زیادہ صادق آتی ہے۔ ایک بازاری طوائف اور اس قسم کی بیوی میں فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اجرت پر کام کرنےوالے مزدور کی طرح اپنے جسم کو تھوڑی تھوڑی دیر کےلئے کرایہ پر نہیں دیتی بلکہ اسے ہمیشہ کےلئے غلامی میں فروخت کردیتی ہے۔ اور فورئے کے الفاظ مصلحت کی ان سبھی شادیوں پر صادق آتے ہیں :

”جس طرح قواعد میں دو منفی سے مل کر ایک مثبت بنتا ہے اسی طرح شادی کے اخلاقیات میں دو عصمت‌فروشیوں (بدچلنیوں) سے مل کر ایک عصمت (نیک‌چلنی) بنتی ہے۔“

شوہر اور بیوی کے رشتے میں جنسی محبت کا قاعدہ صرف مظلوم طبقوں میں یعنی آج کل کے مزدور طبقے میں ہوسکتا ہے اور سچ پوچھئے تو انہیں میں ہوتا بھی ہے، چاہے ان کے شوہر اور بیوی کے رشتے کو باقاعدہ یہ حیثیت حاصل ہو یا نہ ہو۔ لیکن ان میں کلاسیکی یک‌زوجگی کی تمام بنیادیں گر جاتی ہیں کیونکہ ان میں ملکیت کا سرے سے کوئی وجود نہیں جس کی حفاظت کرنے اور جسے اپنے بچوں کو وراثت میں دینے کے لئے یک‌زوجگی کا نظام اور اس کے ساتھ مردوں کا تسلط قائم کیا گیا تھا۔ اسی لئے مزدور طبقے کےاندر مردوں کا غلبہ قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر اسی وجہ سے اس غلبے کو قائم کرنے کے ذرائع بھی ان کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ بورژوا قانون جو اس غلبے کو قائم رکھتا ہے، صرف ملکیت‌والوں کے لئے اور ان کی طرف سے مزدور

طبقے کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے ہے ۔ اس قانون سے فائدہ اٹھانے کے لئے روپئے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس لئے جہاں تک مزدور کا تعلق ہے وہ اپنے افلاس کی وجہ سے اپنی بیوی کے معاملے میں اس قانون سے کوئی کام نہیں لے سکتا ۔ یہاں فیصلہ کن حیثیت بالکل مختلف قسم کے شخصی اور سماجی رشتوں کی ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ بڑے پیمانے کی صنعت نے عورت کو گھر کی چاردیواری سے نکال کر محنت کی منڈی میں ، کارخانے میں پہنچا دیا ہے ۔ اکثر عورت ہی خاندان کی روزی کمانےوالی ہوتی ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں کے گھرانوں میں مردوں کے غلبے کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہی ۔ اگر کچھ رہ گئی ہے تو شاید عورتوں کے ساتھ بےرحمی سے پیش آنے کی عادت ہے جو یک‌زوجگی کے قائم ہونے کے بعد سے پوری طرح جڑ پکڑ چکی ہے ۔ چنانچہ پرولتاری خاندان کو صحیح معنی میں اب یک‌زوجگی کا خاندان نہیں کہہ سکتے اور یہ بات ان حالتوں میں بھی صحیح ہے جبکہ فریقین ایک دوسرے سے بڑی گہری محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ پوری وفاداری برتتے ہیں اور جہاں انہوں نے شادی کے موقع پر دینی اور دنیوی ساری رسمیں ادا کر لی ہوں ۔ یک‌زوجگی کے دو لوازمات ہیں جو مستقل طور پر اس کے ساتھ لگے رہتے ہیں ، ایک زناکاری اور دوسرے ہیتائرازم ۔ اور مزدور کی زندگی میں ان دونوں کے لئے تقریباً کوئی جگہ نہیں ہوتی ۔ عورت کو علحدہ ہونے کا حق عملاً پھر سے حاصل ہو چکا ہے اور جب مرد عورت میں نباہ نہیں ہو سکتا تو وہ الگ ہو جانے کو بہتر سمجھتے ہیں ۔ مختصر یہ کہ مزدوروں کی شادی لفظی اعتبار سے تو یقیناً یک‌زوجگی کی شادی ہے لیکن تاریخی طور پر قطعی نہیں ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے علم قانون کے ماہروں کا دعوی ہے کہ قانون‌سازی میں جوں جوں ترقی ہوئی ہے عورتوں کی شکایت کے اسباب کم ہوتے جا رہے ہیں ۔ موجودہ زمانے کے نظام‌قانون اس بات کو زیادہ سے زیادہ ماننے لگے ہیں کہ شادی تبھی کامیاب ہو سکتی ہے جب اس کی بنیاد دونوں فریقوں کی رضامندی پر ہو اور دوسرے یہ کہ ازدواجی زندگی کے دوران میں بھی دونوں فریقوں پر یکساں حقوق اور ذمہ‌داریاں

ہونی چاہئیں ۔ لیکن اگر ان دونوں باتوں پر پوری طرح عمل کیا جائے تو عورتیں جو کچھ چاہتی ہیں ، وہ انہیں حاصل ہوجائےگا ۔

یہ خاص وکیلانہ دلیل بالکل ویسی ہی دلیل ہے جس کے ذریعے ریڈیکل ، جمہوریت‌پسند بورژوا ، مزدوروں کو ٹال دیتے ہیں ۔ مزدوروں کے بارے میں بھی تو یہی کہا جاتا ہے کہ کارخانے میں کام کرنے کرانے کا معاہدہ سرمایہ‌دار اور مزدور دونوں اپنی اپنی مرضی سے کرتے ہیں ۔ لیکن دونوں کی اپنی اپنی مرضی کا مطلب صرف یہ ہے کہ قانون نے دونوں کو کاغذ پر برابر مان لیا ہے ۔ ایک فریق کو اپنی مخصوص طبقاتی حیثیت کی وجہ سے جو اختیار حاصل ہے اور دوسرے فریق پر وہ جتنا دباؤ ڈال سکتا ہے یعنی دونوں کی صحیح اقتصادی حالت ، یہ سب قانون کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور پھر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ کام کرنے کا معاہدہ جتنی مدت کےلئے کیا گیا ہے اس کے دوران میں دونوں فریقوں کے حقوق مساوی ہونے چاہئیں اور یہ حقوق اس وقت تک رہیں جب تک کوئی فریق انہیں باضابطہ ختم نہ کردے ۔ قانون کو اس سے کوئی مطلب نہیں کہ ٹھوس اقتصادی حالت سے مجبور ہوکر مزدور کو ان مساوی حقوق سے اس طرح دست‌بردار ہونا پڑتا ہے کہ ان کا شائبہ تک نہیں رہنے پاتا ۔

جہاں تک شادی کا تعلق ہے ، جیسے ہی فریقین اپنی مرضی سے شادی کرنے کی خواہش باقاعدہ ظاہر کرتے ہیں ، بڑے سے بڑا ترقی‌پسند قانون بھی بالکل مطمئن ہوکر بیٹھ جاتا ہے ۔ لیکن قانون کے پردے کے پیچھے کیا کچھ ہوتا ہے ، جہاں زندگی کے حقیقی واقعات عمل میں آتے ہیں ، یہ رضامندی حاصل کیونکر کی جاتی ہے ، ان باتوں سے قانون اور قانون بنانےوالوں کو کوئی مطلب نہیں ۔ اور یہ قانون بنانےوالے اگر مختلف ملکوں کے قانونوں کا محض معمولی سا موازنہ بھی کریں تو انہیں معلوم ہو جائےگا کہ یہ رضامندی حقیقت میں ہے کیا ۔ ان ملکوں میں جہاں اولاد کو اپنے والدین کی جائداد میں قانونی حق ہے اور انہیں وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا ، جیسے جرمنی میں اور ان ملکوں میں ہے جہاں فرانسیسی قانون رائج ہے اور دوسرے ملکوں میں بھی ، اولاد کو شادی کے معاملے میں والدین کی منظوری لینی پڑتی ہے ۔ ان ملکوں میں جہاں انگریزی

قانون چلتا ہے ، جہاں شادی کے لئے والدین کی منظوری قانونی طور پر ضروری نہیں ہے ، وہاں والدین کو اپنی جائداد کے بارے میں وصیت کر جانے کا پورا اختیار ہے اور وہ چاہیں تو اپنے بچوں کو ایک ایک پیسہ سے محروم کر سکتے ہیں ۔ چنانچہ یہ ظاہر ہے کہ اس کے باوجود یا شاید اسی وجہ سے انگلینڈ اور امریکہ میں بھی ان سبھی طبقوں میں جن کے پاس وراثت میں چھوڑ جانے کے لئے تھوڑی بہت دولت ہوتی ہے ، شادی کرنے کی آزادی فرانس یا جرمنی سے زیادہ نہیں ہے ۔

جہاں تک ازدواجی زندگی میں مرد اور عورت کی قانونی برابری کا سوال ہے ، وہاں بھی یہی حال ہے ۔ قانون کی نظر میں دونوں کی نابرابری جو کہ دراصل گذشتہ سماجی حالات کا اثر ہے ، عورتوں پر اقتصادی ظلم کا سبب نہیں بلکہ اس کا نتیجہ ہے ۔ قدیم کمیونسٹی گھرانوں میں جن میں متعدد جوڑے اور ان کے بچے رہتے تھے ، گھر کا انتظام عورتوں کے ذمے ہوتا تھا ۔ اور یہ گھر کا نظم و نسق اتنا ہی عوامی اور سماجی طور پر ضروری کام تھا ، جتنا مرد کا غذا فراہم کرنا ۔ پدری خاندان کے قائم ہونے پر یہ حالت نہیں رہی ۔ یک‌زوجگی کے انفرادی خاندان کے بعد تو حالت اور بھی بدل گئی ۔ گھر کے انتظام کی عمومی حیثیت ختم ہو گئی ۔ سماج کو اس سے کوئی تعلق نہیں رہا ۔ یہ ایک نجی خدمت ہو گئی ۔ سماجی پیداوار کے دائرے سے الگ کر دئیے جانے کے بعد بیوی گھر کی پہلی خادمہ بنی ۔ یہ صرف موجودہ زمانے کی بڑے پیمانے کی صنعت کا اثر تھا کہ سماجی پیداوار کے دروازے عورتوں کے لئے کھل گئے ۔ لیکن یہ صرف مزدور طبقے کی عورتوں کے لئے تھا ۔ تاہم ان کا بھی یہ حال ہے کہ جب وہ اپنے گھر کا کام کاج کرتی ہیں تو سماجی پیداوار کے دائرے سے باہر ہو جاتی ہیں اور انہیں اس کام کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا ۔ اور اگر وہ صنعت و حرفت میں حصہ لینا چاہتی ہیں اور آپ اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر اپنی روزی کمانے کی کوشش کرتی ہیں تو اپنے گھر کی ذمہ‌داریاں نہیں نبھا سکتیں ۔ کارخانے میں کام کرنے‌والی عورتوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا وہی ان عورتوں پر بھی صادق آتا ہے جو دوسرے پیشوں میں حتی کہ ڈاکٹری اور وکالت میں حصہ لیتی ہیں ۔ جدید انفرادی

خاندان عورت کی گھریلو غلامی پر مبنی ہے چاہے وہ کھلی غلامی ہو یا پوشیدہ۔ اور موجودہ سماج انہیں انفرادی خاندانوں کے سالموں (یونٹوں) سے مرکب ہے۔ آج کل زیادہ‌تر حال یہ ہے کہ مرد کماتا ہے اور اپنے گھروالوں کی پرورش کرتا ہے۔ کم از کم ملکیت‌والے طبقوں میں یہی ہوتا ہے — اور اس کی وجہ سے مرد کو ایک غالب حیثیت حاصل ہو جاتی ہے جس کے لئے کسی مخصوص قانونی حقوق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خاندان کے اندر شوہر بورژوا ہے اور بیوی مزدور۔ لیکن صنعت و حرفت کی دنیا میں مزدور طبقے کے کندھوں پر اقتصادی لوٹ اور ظلم و ستم کا جو جوا رکھا ہوا ہے اس کی ساری خصوصیتیں اسی وقت پوری طرح نمایاں ہوتی ہیں جب سرمایہ‌دار طبقے کے مخصوص قانونی اختیارات کا پردہ ہٹا دیا جاتا ہے اور دونوں طبقوں میں مکمل قانونی مساوات قائم کر دی جاتی ہے۔ جمہوری ریپبلک میں دونوں طبقوں کا اختلاف ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے برعکس ایسی ریپبلک اس اختلاف کے لئے میدان کارزار مہیا کرتی ہے۔ اسی طرح جدید خاندان میں عورت پر مرد کے غلبے کی مخصوص نوعیت اور مرد عورت میں صحیح معنی میں سماجی مساوات قائم کرنے کی ضرورت اور اس کا طریقہ صرف اسی وقت واضح طور پر سامنے آئےگا جب قانون کی نظر میں دونوں کو مکمل مساوات حاصل ہو جائےگی۔ تب ہی یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ عورتوں کی آزادی کی پہلی شرط یہ ہے کہ تمام عورتوں کو صنعت و حرفت کے میدان میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی طور پر خاندان کی یہ حیثیت کہ وہ سماج کی اقتصادی اکائی ہے، ختم کر دی جائے۔

* * *

اب تک ہم نے یہ دیکھا کہ شادی کی تین اہم شکلیں ہیں اور یہ تینوں انسانی ارتقا کی تین خاص منزلوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ وحشت کے عہد میں گروہ‌وار شادی، بربریت کے عہد میں جوڑا بیاہ اور تمدن کے عہد میں یک‌زوجگی، جس کے ساتھ لازم و ملزوم کے طور پر زناکاری اور عصمت‌فروشی لگی ہوتی ہے۔ بربریت کے آخری دور میں جوڑا بیاہ

اور یک‌زوجگی کے درمیان ایک دور آتا ہے جب کہ مردوں کا غلام عورتوں پر تسلط ہوتا ہے اور کثرت ازدواج یعنی کئی بیویاں رکھنے کا رواج ہوتا ہے ۔

ہم نے ابھی تک جو کچھ بیان کیا اس سے یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ اس سلسلے میں جو قدم اٹھائے گئے ہیں وہ اس عجیب و غریب حقیقت سے وابستہ ہیں کہ جہاں عورتیں گروہ‌وار شادی کی جنسی آزادی سے زیادہ سے زیادہ محروم ہوتی گئیں ، وہاں مرد نہیں ہوئے ۔ سچ پوچھئے تو مردوں کے لئے آج بھی گروہ‌وار شادی موجود ہے ۔ عورت کے لئے جو چیز جرم ہے ، جس کے لئے اسے قانونی اور سماجی ہر قسم کی سزا بھگتنی پڑتی ہے ، وہ چیز مرد کے لئے قابل فخر ہے اور بہت ہوا تو اس کے دامن پر بدچلنی کا ہلکا سا داغ پڑ جاتا ہے جسے وہ خوشی سے گوارا کر لیتا ہے ۔ ہمارے زمانے میں سرمایہ‌دارانہ جنس تبادلہ کی پیداوار کی وجہ سے پرانے ہیتائرازم میں جتنی زیادہ تبدیلی ہوتی ہے اور جس قدر وہ اپنے آپ کو اس پیداوار کے سانچے میں ڈھالتی ہے اسی قدر وہ کھلم کھلا عصمت‌فروشی کی صورت اختیار کرتی جاتی ہے اور اس کا اثر اتنا ہی زیادہ خراب اور تباہ‌کن ہوتا جاتا ہے ۔ اور اس کے اثر سے عورتوں سے کہیں زیادہ مردوں کے اخلاق پست ہوتے ہیں ۔ عورتوں میں عصمت‌فروشی صرف ان بدنصیبوں کو خراب کرتی ہے جو اس کے چنگل میں پھنستی ہیں اور پھر وہ بھی اتنی خراب نہیں ہوتیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے ۔ اس کے برعکس مردوں میں تو شروع سے آخر تک سب کا اخلاق بگڑ جاتا ہے ۔ چنانچہ دس میں نو صورتوں میں لمبے عرصے کا تعلق دراصل ایک ایسی تربیت‌گاہ کا کام دیتا ہے جہاں ازدواجی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ بےوفائی کرنے کی تربیت دی جاتی ہے ۔

اب ہم ایک ایسے سماجی انقلاب کی طرف بڑھ رہے ہیں جس میں یک‌زوجگی کے موجودہ نظام کی اقتصادی بنیادیں ختم ہو جائیں‌گی اور اسی کے ساتھ عصمت‌فروشی کی بنیاد بھی مٹ جائےگی کیونکہ عصمت‌فروشی اور یک‌زوجگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ یک‌زوجگی کی بنیاد یہ ہے کہ ایک ایک آدمی کے پاس ، اور وہ بھی مرد کے پاس ، کثیر دولت جمع

ہو جاتی ہے جس کو وہ صرف اپنے بچوں کے لئے چھوڑ جانا چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ کسی اور مرد کے بچے اس کی دولت کے وارث ہوں۔ اسی لئے یہ ضروری ہوا کہ عورت ایک ہی مرد سے شادی کرے۔ لیکن مرد کے لئے ایک ہی عورت سے شادی کرنا کوئی ضروری نہیں تھا۔ چنانچہ یہی ہوا — عورت کے لئے ایک شوہر کا دستور بنا اور یہ دستور مردوں کو کھلم کھلا یا چوری چھپے کئی بیویاں رکھنے سے نہیں روک سکا۔ لیکن آنے والا سماجی انقلاب اس مستقل دولت کے بڑے حصے کو جو آج وراثت میں باپ سے بیٹے کو ملتی ہے، یعنی ذرائع پیداوار کو، سماج کی ملکیت بنا دے گا، اور اس لئے یہ فکر کہ میرے بعد میری وراثت کس کو ملے گی بہت کم رہ جائے گی۔ تو کیا ان اقتصادی اسباب کے مٹنے پر یک‌زوجگی جو ان کا نتیجہ تھی، خود بھی مٹ جائے گی؟

اس سوال کے جواب میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ختم ہونے کے بدلے یک‌زوجگی کی تکمیل ہونے لگے گی۔ کیونکہ ذرائع پیداوار جب سماج کی ملکیت بن جائیں گے تو اجرتی محنت اور اجرت پر کام کرنے والا طبقہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور ساتھ ساتھ، اس بات کی ضرورت بھی نہیں رہے گی کہ کچھ عورتیں جن کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اپنے آپ کو پیسے کی خاطر مردوں کے حوالے کریں۔ عصمت‌فروشی مٹ جائے گی۔ یک‌زوجگی کا زوال نہیں ہوگا۔ وہ آخر کار ایک حقیقت بن جائے گی، ایک ایسی حقیقت جو مردوں کے لئے بھی ہوگی۔

اس سے بہرحال مردوں کی حالت بہت بدل جائے گی۔ لیکن عورتوں کی حالت میں بھی اور سبھی عورتوں کی حالت میں اہم تبدیلیاں ہوں گی۔ ذرائع پیداوار مشترکہ ملکیت بن جائیں گے تو ایک ایک خاندان سماج کی اقتصادی اکائی نہیں رہے گا۔ ذاتی خانہ داری بڑھ کر ایک سماجی صنعت کی صورت اختیار کرے گی۔ بچوں کی نگہداشت اور تعلیم و تربیت کی ذمہ‌داری سماج کے اوپر ہوگی۔ سماج سبھی بچوں کی نگہداشت ایک طرح سے کرے گا۔ بچوں میں یہ فرق نہیں کیا جائے گا کہ کون شادی کے بعد پیدا ہوا ہے اور کون شادی کے بغیر۔ اس طرح ”نتائج“ کی فکر جو آج اخلاقی اور اقتصادی دونوں اعتبار سے بڑی سماجی اہمیت

رکھتی ہے، اور جو آج ایک لڑکی کو اجازت نہیں دیتی کہ وہ جس مرد سے محبت کرتی ہے اس کی ہو رہے ، وہ فکر ختم ہو جائےگی۔ لیکن کیا اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ جنسی تعلقات زیادہ بےلگام ہو جائیں گے اور کیا اسی کے ساتھ عورتوں کی عصمت‌وعفت اور شرم وحیا کے سوال پر بھی رائے عامہ زیادہ فراخ دلی کا رویہ اختیار نہیں کرےگی ؟ اور کیا ہم نے یہ نہیں دیکھا کہ موجودہ زمانے میں یک‌زوجگی اور عصمت‌فروشی میں تضاد ہوتے ہوئے بھی چولی دامن کا ساتھ ہے ، دونوں ایک ہی سماجی حالت کے دو رخ ہیں ؟ کیا عصمت‌فروشی اپنے ساتھ یک‌زوجگی کو مٹائے بغیر ختم ہو سکتی ہے ؟

یہاں ایک نئی چیز سامنے آتی ہے اور وہ ہے انفرادی جنسی محبت۔ یک‌زوجگی کی جب ابتدا ہوئی اس وقت یہ انفرادی جنسی محبت زیادہ سے زیادہ محض ایک بیج کی صورت میں رہی ہوگی۔

عہد وسطی سے پہلے انفرادی جنسی محبت جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ جسمانی حسن ، گہرے تعلقات ، مزاج کی یکسانی وغیرہ ایسی باتیں ہیں جن سے مردوں عورتوں میں جنسی تعلق کی خواہش بیدار ہوتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ مرد اور عورت ، دونوں میں کوئی اس بات سے بےخبر یا بےنیاز نہیں رہتا کہ اتنا گہرا تعلق کس آدمی کے ساتھ قائم ہو رہا ہے۔ لیکن یہ تمام باتیں مل کر بھی ہمارے زمانے کی جنسی محبت سے بہت پیچھے ہیں۔ قدیم زمانے میں ہر جگہ شادی ماں باپ کرتے تھے۔ فریقین چپ‌چاپ ان کی باتوں کو مان لیتے تھے۔ قدیم زمانے میں زن وشو کی محبت اگر کہیں کچھ تھی تو وہ کوئی داخلی میلان نہیں بلکہ ایک خارجی فرض کی ادائگی تھی۔ وہ شادی کا سبب نہیں بلکہ اس کا ایک نتیجہ تھی۔ موجودہ زمانے میں عشق‌ومحبت کا جو مفہوم ہے ، اس مفہوم میں عشق‌وعاشقی کی باتیں قدیم زمانے میں سرکاری سماج کے باہر ہوتی تھیں۔ وہ چرواہے جن کی محبت اور خوشی اور غم کے گیت تھیوکری‌ٹس اور موس‌چس نے گائے ہیں یا لانگس نے ”دافنی اور کلوئی“ میں جن لوگوں کی داستان سنائی ہے وہ محض غلام تھے ، جن کا ریاست میں جو آزاد شہریوں کی چیز تھی ، کوئی حصہ نہیں تھا۔ غلاموں کے علاوہ اگر محبت کہیں ملتی ہے تو وہ نتیجہ

ہے قدیم دنیا کے زوال کا، جب اس کا شیرازہ منتشر ہونے لگا تھا۔ اور یہ محبت بھی ایسی عورتوں کے ساتھ کی جاتی تھی جو سماج کے اصلی دائرے سے باہر تھیں یعنی ہیتائری سے کی جاتی تھی جو یا تو اجنبی عورتیں تھیں یا غلامی سے آزاد کی ہوئی عورتیں تھیں۔ ایتھنز میں اس کے زمانۂ زوال کی ابتدا سے لے کر بعد تک اور روم میں شہنشاہوں کے عہد میں اسی قسم کی محبت پائی جاتی تھی۔ آزاد مرد اور عورت شہریوں میں اگر واقعی کبھی محبت ہوتی تھی تو وہ زناکاری کی صورت میں ہوتی تھی۔ اور جنسی محبت کا جو مفہوم ہمارے یہاں ہے وہ قدیم زمانے کے مشہور عشقیہ شاعر اناکریون کے لئے اتنا بےمعنی تھا کہ اسے اس بات سے بھی کوئی مطلب نہیں تھا کہ اس کا محبوب عورت ہے یا مرد۔

ہماری جنسی محبت قدیم زمانے کے لوگوں کی محض جنسی شہوت سے، ان کے ''ایراس،، سے بہت مختلف ہے۔ جنسی محبت کے لئے ضروری ہے کہ مرد عورت ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں۔ اس اعتبار سے عورت کا وہی درجہ ہے جو مرد کا۔ اس کے برخلاف قدیم زمانے کے ''ایراس،، میں عورت کی مرضی کا ہمیشہ خیال بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ دوسرے، جنسی محبت میں اب اتنی شدت اور پائداری آگئی ہے کہ دونوں فریق جدائی اور فراق کو اگر سب سے بڑی نہیں تو بہت بڑی مصیبت ضرور سمجھتے ہیں۔ ایک دوسرے کا وصال حاصل کرنے کے لئے وہ کیا کیا خطرے مول لیتے ہیں، جان جوکھم میں ڈالتے ہیں۔ قدیم زمانے میں اگر کبھی ایسا ہوتا بھی تھا تو محض زناکاری کے لئے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جنسی تعلق کے محاسبے کے لئے ایک نیا اخلاقی معیار قائم ہو رہا ہے۔ اب سوال صرف یہ نہیں ہے کہ جنسی تعلق جائز تھا یا ناجائز بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کی بنیاد باہمی محبت پر تھی یا نہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جاگیری یا بورژوا سماج میں اس نئے معیار کا بھی عملاً وہی حشر ہو رہا ہے جو اور سبھی اخلاقی معیاروں کا ہوا یعنی اسے بھی محض نظر انداز کر دیا گیا۔ لیکن اس کا حشر ان سبھوں سے زیادہ برا بھی نہیں ہوا۔ اور معیاروں کی طرح اسے بھی محض نظری طور پر، کاغذ کے اوپر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور سر دست اس سے زیادہ کوئی امید بھی نہیں کی جا سکتی۔

جنسی محبت کی طرف قدم اٹھانے کے بعد عہد قدیم نے جہاں سے سلسلہ توڑ دیا وہیں سے عہد وسطی نے اس کی ابتدا کی — یعنی زناکاری سے ۔ ہم سورماؤں کی سرفروشانہ محبت کا ذکر کر آئے ہیں جس سے '' نغمات سحر ،، کی تخلیق ہوئی تھی ۔ اس قسم کی محبت میں جس کا مقصد ازدواجی زندگی کے رشتے کو منقطع کرنا تھا اور اس محبت میں جس کی بنیاد پر ازدواجی زندگی قائم اور استوار ہوتی ہے ، بڑا گہرا فرق ہے اور ساونتوں سورماؤں کے عہد نے اس خلیج کو پاٹنے میں کبھی کوئی کامیابی حاصل نہیں کی ۔ جب ہم بدچلن لاطینیوں سے ہوکر پاکباز جرمنوں تک پہونچتے ہیں تو وہاں بھی یہی دیکھتے ہیں کہ '' نی بیلونگ کا گیت ،، میں کریم ہلدا کو درپردہ سگفرید سے عشق ہو گیا ہے ۔ اور وہ بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہے ۔ اس کے باوجود جب گنتھر اسے بتاتا ہے کہ اس کی سگائی ایک سورما سے کردی گئی ہے جس کا نام تک وہ اسے نہیں بتاتا تو کریم ہلدا یہی کہتی ہے کہ

'' آپ کو پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ آپ کا فرمان سر آنکھوں پر ۔ جیسا حکم دیں گے بندی تعمیل کرے گی ۔ حضور جس کو منتخب کریں گے میں اس کو اپنا شوہر بنا لوں گی ،، ۔ *

اسے یہ خیال تک نہیں آتا کہ اس معاملے میں اس کی اپنی محبت کا بھی کوئی سوال ہوسکتا ہے ۔ جس طرح گنتھر برون ہلدا کو کبھی ایک بار دیکھے بغیر بیاہ لایا تھا ، اسی طرح کریم ہلدا کو ایتزل کے ساتھ بیاہ دیاجاتا ہے جسے اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا ۔ '' گدرون ،، میں (۱۲۸) بھی یہی ہوتا ہے ۔ آئرلینڈ کا سیگبانت ناروے کی دوشیزہ اوتا سے شادی کی درخواست کرتا ہے اور ہیگیلنگ کا رہنے والا ہیتیل آئرلینڈ کی ہلدا سے اور آخر میں سورلینڈ کا سگفرید ، اور اورمانی کا ہارتموت ، اور سیلینڈ کا ہروگ گدرون سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور یہاں پہلی بار یہ واقعہ ہوتا ہے کہ گدرون خود اپنی پسند سے ہروگ کے حق میں فیصلہ کرتی ہے ۔ عام طور سے ایک نوجوان شہزادے کی

---

* دیکھئے '' نی بیلونگ کا گیت ،، ۱۰ واں گیت ۔ (ایڈیٹر)

دلہن کا انتخاب اس کے ماں باپ کرتے تھے۔ اور اگر وہ زندہ نہ ہوتے تو شہزادہ اپنے سب سے بڑے باجگذار سرداروں کے مشورے سے اس کا انتخاب کرتا تھا۔ ان سرداروں کے مشورے کی بڑی اہمیت تھی اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا کیونکہ کسی نائٹ یا بیرن (نوابوں کے مختلف درجے) کی شادی خود بادشاہ کی طرح سیاسی اہمیت رکھتی تھی۔ اس کے ذریعے نئے نئے لوگوں سے اتحاد کرکے اپنی طاقت میں اضافہ کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس معاملے میں انفرادی پسند ناپسند نہیں بلکہ خاندانی مفاد فیصلہ کن ہوتا تھا۔ ایسی شادی میں محبت کو کیا دخل ہو سکتا تھا؟

عہد وسطی کے شہروں میں "گلڈ" * کے اراکین کا بھی یہی حال تھا۔ انہیں جو مراعات حاصل تھیں — اہل حرفہ کی انجمنوں کی سندیں، اور ان کے مخصوص تحفظات، وہ مصنوعی دیواریں جو انہیں اہل حرفہ کی دوسری انجمنوں سے، اپنے ہم‌پیشہ دوسرے کاریگروں سے اور اپنے شاگردوں اور نوسکھئے لوگوں سے، قانونی طور پر الگ کرتی تھیں — وہی مراعات اس دائرے کو محدود کئے رکھتی تھیں جس کے اندر اس کو اپنی بیوی چننی تھی۔ کون سب سے اچھی اور موزوں ہوگی، یہ سوال انفرادی پسند ناپسند سے نہیں بلکہ خاندانی مفاد کی روشنی میں طے ہوتا تھا۔

مختصر یہ کہ عہد وسطی کے آخر تک زیادہ‌تر صورتوں میں شادی کی حیثیت وہی رہی جو اس عہد کے شروع میں تھی — یعنی یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس کا فیصلہ وہ دونوں فریق نہیں کرتے تھے جن کو اس سے سب سے زیادہ تعلق تھا۔ سب سے پہلے یہ حال تھا کہ انسان جب دنیا میں آتا تو اس کی شادی پیدائش سے پہلے ہی جنس مخالف کے ایک پورے گروہ کے ساتھ ہو چکتی تھی۔ گروہ‌وار شادی کی بعد کی شکلوں میں بھی غالباً اسی قسم کے تعلقات قائم رہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس گروہ کا دائرہ برابر محدود ہوتا جا رہا تھا۔ جوڑا بیاہ میں یہ

---

* گلڈ — قرون وسطی میں ہم‌پیشہ استاد کاریگروں کی انجمن یا برادری۔ (ایڈیٹر)

قاعدہ تھا کہ مائیں اپنے بچوں کی شادی طے کرتی تھیں ۔ اور وہاں بھی فیصلہ کن سوال یہ تھا کہ کون سا رشتہ ، گن اور قبیلے میں نئے جوڑے کی حیثیت کو مضبوط کرے گا ۔ اور جب اجتماعی ملکیت کے اوپر ذاتی ملکیت کا غلبہ ہوا اور وراثت کے خیال کے ساتھ ساتھ پدری حق اور یک‌زوجگی کا رواج ہوا تو شادی زیادہ سے زیادہ اقتصادی مصلحتوں پر منحصر ہونے لگی ۔ شادی کی وہ شکل تو نہیں رہی جس میں بیوی خریدی جاتی تھی لیکن شادی زیادہ سے زیادہ اس طرح انجام دی جانے لگی کہ نہ صرف عورت بلکہ مرد کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی ذاتی اوصاف کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس کی جائداد اور ملکیت کی بنیاد پر کیا جانے لگا ۔ شروع ہی سے حکمراں طبقوں میں جو رواج چلا آتا تھا اس میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ شادی میں دولہا دلہن کی اپنی مرضی اور پسند کو کوئی دخل ہونا چاہئے ۔ ایسی باتیں صرف رومان کی خیالی دنیا میں ممکن تھیں یا پھر مظلوم طبقوں میں ہو سکتی تھیں اور ظاہر ہے کہ وہ قابل اعتنا نہیں تھے ۔

یہ تھی صورت حال جب سرمایہ‌دارانہ پیداوار نے جغرافیائی دریافتوں کے دور کے بعد تجارت و حرفت کے ذریعے دنیا کو فتح کرنے کا بیڑا اٹھایا ۔ یہ خیال ہوتا ہے کہ شادی کا یہ طریقہ اس نظام پیداوار کے لئے بہت زیادہ موزوں تھا ۔ اور بات بھی یہی تھی ۔ لیکن تاریخ کی ستم‌ظریفیوں کی تہہ تک کون پہونچ سکتا ہے ؟ سرمایہ‌دارانہ نظام پیداوار نے ہی بیاہ کے اس طریقے کی بنیاد ہلا دی ۔ اس نے ہر چیز کو جنس تبادلہ (یعنی بکاؤ مال) بنا دیا ۔ اس نے تمام قدیمی روایتی تعلقات کا شیرازہ منتشر کر دیا ۔ موروثی رسم و رواج اور تاریخی حقوق کے بدلے اس نے خرید و فروخت یا ”آزاد“ معاہدے کو رواج دیا ۔ انگلینڈ کے ماہرعلم‌قانون میئن نے لکھا کہ پچھلے ادوار کے مقابلے میں ہماری ساری ترقی یہ ہے کہ ہم اب رتبے اور حیثیت سے ترقی کر کے معاہدے تک پہنچ گئے ہیں (from status to contract) ، ایک ایسی صورت حال سے جو باپ سے بیٹے تک جوں کی توں منتقل ہوتی تھی ، ہم ایک ایسی حالت میں پہنچ گئے جہاں اپنی رضامندی سے معاہدے کئے جاتے ہیں ۔ میئن کا خیال تھا کہ یہ لکھ کر اس نے کوئی بڑا

بھاری انکشاف کیا ہے حالانکہ اس کے قول میں جو کچھ سچائی ہے وہ پہلے ہی ''کمیونسٹ مینی‌فسٹو،، میں بیان کر دی گئی تھی* ۔

لیکن معاہدہ کرنے کے لئے ایسے لوگوں کا ہونا ضروری ہے جو اپنا، اپنے اعمال کا اور اپنی چیزوں کا آزادی کے ساتھ لین دین کر سکیں اور جو ایک دوسرے سے مساوات کی بنیاد پر مل سکیں ۔ سرمایہ‌دارانہ نظام پیداوار کا ایک خاص کام ایسے ہی ''آزاد،، اور ''مساوی،، لوگوں کی تخلیق کرنا تھا ۔ ابتدا میں اگرچہ یہ کام محض نیم شعوری طور پر اور قطعی طور پر مذہب کے پردے میں کیا گیا، تاہم لوتھر اور کالون کی تحریک اصلاح کے زمانے سے یہ پختہ اصول بن گیا کہ انسان اپنے اعمال کے لئے پوری طرح ذمہ‌دار اسی وقت ہوتا ہے جب اسے ان کاموں کو کرتے وقت اپنے ارادے کی پوری آزادی حاصل ہو اور یہ کہ غیراخلاقی کاموں کے لئے جو دباؤ ڈالا جاتا ہے اس کی مخالفت کرنا ہر انسان کا اخلاقی فرض ہے ۔ لیکن بیاہ کا جو طریقہ رائج تھا، اس کے ساتھ اس اصول کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ بورژوا تصورات کے مطابق شادی ایک معاہدہ ہے، ایک قانونی معاملہ ہے ۔ اتنا ہی نہیں ۔ وہ سب معاہدوں سے زیادہ اہم بھی ہے کیونکہ اس میں زندگی بھر کے لئے دو انسانوں کے جسم و جان کا فیصلہ ہو جاتا ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ بظاہر یہ سودا اپنی مرضی سے کیا جاتا تھا ۔ فریقین کی رضامندی کے بغیر شادی نہیں کی جاتی تھی ۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ رضامندی کیسے حاصل کی جاتی تھی اور اصل میں شادی کون لوگ طے کرتے تھے ۔ لیکن اگر اور سبھی معاہدوں کے لئے فیصلہ کرنے کی پوری آزادی کا مطالبہ تھا تو پھر اس معاہدے کے لئے بھی اس کا مطالبہ کیوں نہ ہو؟ کیا اس نوجوان لڑکے اور لڑکی کو جو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے باندھے جانے والے تھے، یہ حق نہیں تھا کہ آزادی کے ساتھ اپنے بارے میں، اپنے جسم اور اس کے اعضا کے بارے میں فیصلہ کریں؟ کیا سورماؤں کے سرفروشانہ عشق کی بدولت جنسی محبت کا فیشن نہیں ہو گیا تھا اور کیا سورماؤں کی، زناکاری کی محبت کے برخلاف شوہر اور بیوی کی محبت

---

* دیکھئے اس سلسلے کا حصہ اول، صفحات ۵۵—۵۱ ۔

اس کی صحیح بورژوا شکل نہیں تھی ؟ لیکن اگر شادی شدہ جوڑوں کا یہ فرض تھا کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کریں تو کیا یہ عاشق ومعشوق کا اتنا ہی زیادہ فرض نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کے علاوہ اور کسی سے شادی نہ کریں ؟ اور کیا ان محبت کرنےوالوں کا حق باپ ماں ، رشتہداروں اور دوسرے رشتے ناتے لگانےوالوں کے حق سے بلندتر نہیں تھا ؟ اگر آزادی کے ساتھ ذاتی تحقیق و تفتیش کرنے کا حق دراتا ہوا کلیسا اور مذہب کے دائرے میں گھس آیا تھا تو پھر وہ نئی نسل کے جسم و جان کے اوپر ، ان کی ملکیت ، خوشی اور غم کے اوپر پرانی نسل کے لوگوں کے ناقابل برداشت دعووں کے سامنے پہنچ کر کیسے رکجاتا ؟

ایک ایسے دور میں جبکہ سارے پرانے سماجی بندھن ڈھیلے ہو رہے تھے اور تمام روایتی تصورات کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں ، یہ سبھی سوالات لازمی طور پر اٹھ رہے تھے ۔ چشمزدن میں دنیا کی وسعت دس گنا بڑھ گئی تھی ۔ پہلے جہاں مغربی یورپوالوں کی نظروں کے سامنے کرۂزمین کے نصف کا بھی محض ایک چوتھائی حصہ تھا ، اب پورے کرۂ زمین کے دروازے ان پر کھل گئے تھے اور وہ باقی ساتوں ربعات پر اپنا جھنڈا نصب کرنے کے لئے دوڑ پڑے تھے ۔ عہد وسطی کے بندھے ٹکے طرز فکر نے ذہن پر جو ہزاروں سال پرانی چوکیاں بٹھا رکھی تھیں وہ دیکھتے دیکھتے اسی طرح ختم ہو گئیں جس طرح ارض وطن کی پرانی تنگ حدبندیاں ۔ ایک نہایت وسیع افق انسان کی ظاہری اور باطنی آنکھوں کے سامنے کھل گیا تھا ۔ وہ نوجوان جن کی آنکھوں میں ہندستان کی دولت سما گئی تھی ، جو میکسیکو اور پوٹوسی کی سونے چاندی کی کانوں پر اپنا ایمان دھرم کھو بیٹھے تھے ، ان کے لئے شرافت و نجابت کی اور پیشہور انجمنوں کے نسلاً بعد نسل چلے آنےوالے پرانے امتیازات اور مراعات کی کیا وقعت ہو سکتی تھی ؟ یہ بورژوا طبقے کا مہم جو سورمائی عہد تھا ، اس کا اپنا رومان بھی تھا ، پریم کے سپنے بھی تھے لیکن ان کی بنیاد بورژوا تھی اور آخر تک تجزیہ کیا جائے تو اس کے پیش نظر مقصد بھی بورژوا تھا ۔

چنانچہ اس طرح نوخیز بورژوا طبقے نے ، خاص کر پروٹسٹنٹ ملکوں

میں جہاں موجودہ نظام کی بنیادیں سب سے زیادہ ہل گئی تھیں ، شادی میں بھی معاہدے کی آزادی کو زیادہ سے زیادہ تسلیم کر لیا اور مذکورۂ بالا طریقے سے اس کو عملی جامہ بھی پہنایا ۔ شادی طبقاتی شادی ہی رہی مگر اپنے طبقے کی حدود کے اندر فریقین کو کسی حد تک انتخاب کی آزادی مل گئی ۔ اور کاغذ پر ، اخلاقیات کے اصولوں میں اور شاعری میں بھی یہ چیز مان لی گئی کہ ہر وہ شادی جس کی بنیاد فریقین کی باہمی جنسی محبت اور شوہر اور بیوی کی حقیقی اور آزادانہ رضامندی پر نہیں ہے وہ شادی اخلاق سے گری ہوئی ہے ۔ مختصر یہ کہ محبت کی شادی کو انسانی حق کا درجہ دے دیا گیا ۔ وہ صرف مرد کا حق (droit de l'homme) ہی نہیں بلکہ ایک مستثنی کے طور پر ، عورت کا حق (droit de la femme) بھی تھا ۔

لیکن ایک اعتبار سے یہ انسانی حق تمام دوسرے نام‌نہاد انسانی حقوق سے مختلف تھا ۔ عملاً ان نام‌نہاد انسانی حقوق کی عملداری حکمراں طبقے یعنی بورژوا طبقے تک ہی محدود تھی اور مظلوم طبقہ یعنی مزدور براہ راست یا بالواسطہ ان سے محروم تھے ۔ لیکن تاریخ کی ستم ظریفی نے یہاں بھی اپنا اثر دکھلایا ۔ حکمراں طبقے پر آج بھی ان اقتصادی اثرات کا غلبہ ہے جن سے ہم واقف ہیں اور اس لئے ان میں شاذ و نادر ہی ایسی شادیاں دیکھنے میں آتی ہیں جو حقیقی معنی میں فریقین کی اپنی رضامندی پر مبنی ہوتی ہیں ۔ لیکن ، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ، مظلوم طبقے میں یہی عام قاعدہ ہے ۔

غرضکہ شادی میں پوری آزادی کے اصول پر اسی وقت عملدر آمد ہو سکتا ہے جب سرمایہ‌دارانہ نظام پیداوار اور اس کے لائے ہوئے ملکیت کے رشتے مٹ جائیں اور اس کی وجہ سے وہ سبھی ضمنی اقتصادی مصلحتیں بھی ختم ہو جائیں جو آج تک شریک‌زندگی کے انتخاب پر اتنا گہرا اثر ڈالتی ہیں ۔ اور تب باہمی محبت کے سوا شادی کی اور کوئی بنیاد باقی نہیں رہے گی ۔

جنسی محبت کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ بلا شرکت غیرے محبوب کی طالب ہوتی ہے اگرچہ یہ بلا شرکت غیرے کے اصول پر آج کل صرف عورتوں کے سلسلے میں پوری طرح عمل کیا جاتا ہے ۔ اس لئے جو

شادی جنسی محبت پر مبنی ہوگی وہ اپنی خاصیت کی بنا پر یک‌زوجگی پر بھی مبنی ہوگی۔ باخوفن نے صحیح کہا تھا کہ گروہ‌وار شادی سے انفرادی شادی کی نشو و نما دراصل عورتوں کا کام ہے۔ یہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ صرف جوڑا بیاہ سے یک‌زوجگی کا ارتقا مرد کا کام ہو سکتا ہے۔ اور تاریخی طور پر سچ پوچھئے تو اس سے عورتوں کی حالت اور خراب ہو گئی اور مردوں کے لئے بےوفائی کرنا اور آسان ہو گیا۔ جب وہ اقتصادی مصلحتیں ختم ہو جائیں‌گی جن کی وجہ سے مجبور ہو کر عورتوں کو مردوں کی بےوفائی برداشت کرنی پڑتی تھی یعنی جب انہیں اپنی روزی کی اور اس سے بھی بڑھ کر اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر نہیں ستایا کرےگی تو عورتوں اور مردوں میں مساوات قائم ہو جائےگی۔ اور پچھلے تمام تجربوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مساوات کی وجہ سے عورتوں میں متعدد شوہروں سے شادی کرنے کا رجحان نہیں پیدا ہوگا بلکہ اس سے کہیں زیادہ مردوں میں حقیقی یک‌زوجگی پر عمل کرنے کا رجحان پیدا ہوگا۔

یک‌زوجگی کے نظام سے کچھ باتیں یقیناً مٹ جائیں‌گی۔ یہ مٹنےوالی باتیں اس کی وہ سبھی خصوصیتیں ہیں جو ملکیت کے تعلقات سے پیدا ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ لگ گئی ہیں۔ ان میں ایک خصوصیت تو مرد کا غلبہ ہے اور دوسری ہے شادی کے رشتے کا اٹوٹ ہونا۔ ازدواجی زندگی میں مرد کا تسلط اصل میں اس کے اقتصادی تسلط کا نتیجہ ہے اور اس کے ختم ہونے پر وہ بھی آپ ہی آپ ختم ہو جائےگا۔ شادی کے رشتے کے اٹوٹ ہونے کی وجہ ایک حد تک وہ اقتصادی حالات تھے جن کے تحت یک‌زوجگی قائم ہوئی تھی اور کسی حد تک اس زمانے کے روایتی اثرات تھے جب کہ ان اقتصادی حالات اور یک‌زوجگی کے تعلق کو صحیح طور پر سمجھا نہیں گیا تھا اور مذہب نے اس کو مبالغے کے ساتھ پیش کیا تھا۔ آج اس دیوار میں ہزاروں شگاف پڑ چکے ہیں۔ اگر صرف وہی شادیاں اخلاقی نقطۂ نظر سے صحیح ہیں جو محبت پر مبنی ہیں تو پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہی ازدواجی زندگی اخلاقی نقطۂ نظر سے صحیح ہے جس میں محبت قائم رہتی ہے۔ انفرادی جنسی محبت کی میعاد مختلف افراد میں خاص کر مردوں میں بہت مختلف ہوتی ہے۔ اور جب

انس باقی نہ رہے ، یا جب ایک نئی محبت کا پرجوش جذبہ اس کی جگہ لے لے تو علحدگی فریقین کے لئے اور خود سماج کے لئے بھی ایک رحمت ثابت ہوتی ہے ۔ اور ایسی صورت میں لوگ طلاق کے مقدموں کی فضول دلدل میں سے گذرنے کے تجربے سے بچ جائیں گے ۔

سرمایہ‌دارانہ نظام پیداوار کے مٹ جانے کے بعد جنسی تعلقات کی کیا صورت ہوگی ، اس کے بارے میں آج ہم جو قیاس آرائی کر سکتے ہیں وہ بہ‌حیثیت مجموعی منفی قسم کی ہے یعنی زیادہ‌تر وہ قیاس آرائی صرف اسی حد تک ہے کہ کونسی چیزیں مٹ جائیں‌گی ۔ لیکن کون سی نئی خصوصیتیں ہیں جن کا اضافہ ہوگا ؟ اس کا فیصلہ اس وقت ہوگا جب ایک نئی نسل پروان چڑھ چکے‌گی ۔ وہ ایسے مردوں کی نسل ہوگی جنہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی عورت کی عصمت چاندی کے چند سکوں کے عوض نہیں خریدی ہوگی اور نہ اسے حاصل کرنے کے لئے کسی اور طرح کے سماجی اختیار سے کام لیا ہوگا ۔ اور وہ ایسی عورتوں کی نسل ہوگی جو سچی محبت کے سوا اور کسی وجہ سے اپنے آپ کو کسی مرد کے حوالے کرنے پر مجبور نہیں ہوئی ہوں‌گی اور نہ انہیں اقتصادی مجبوریوں کے ڈر سے اپنے محبوب سے شادی کا خیال ترک کرنا پڑا ہوگا ۔ جب ایسے مرد اور ایسی عورتیں وجود میں آجائیں‌گی تو پھر انہیں اس بات کی مطلق پرواہ نہیں ہوگی کہ ہم کیا سوچتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہئے ۔ وہ خود اپنے ساتھ اپنا عمل لائیں‌گے اور اسی کے مطابق ہر فرد کے عمل کے بارے میں اپنی رائے عامہ تیار کریں‌گے ۔ اور یہیں یہ بات ختم ہو جاتی ہے ۔

اس اثنا میں ہم پھر مارگن کی طرف رجوع کریں جس کو چھوڑ کر ہم بہت دور نکل آئے ہیں ۔ تمدن کے عہد میں جن سماجی اداروں کی نشو و نما ہوئی ، ان کی تاریخی چھان‌بین مارگن کی کتاب کے دائرۂ بحث سے خارج ہے ۔ وہ اس عہد میں یک‌زوجگی کے انجام کے سوال پر صرف مختصر طور پر بحث کرتا ہے ۔ وہ بھی یک‌زوجگی کے خاندان کی نشو و نما کو ایک بڑی ترقی سمجھتا ہے ۔ اس کی رائے میں اس سے مردوں عورتوں کی مکمل مساوات قریب آجاتی ہے ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ منزل آ پہنچی ۔ وہ کہتا ہے کہ :

"جب ہم یہ مان لیتے ہیں کہ خاندان کی یکے بعد دیگرے چار شکلیں ہوئی ہیں اور اب یہ اس کی پانچویں شکل ہے تو فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ شکل آئندہ ہمیشہ رہے گی۔ اس کا ایک ہی جواب دیا جا سکتا ہے۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ جیسے جیسے سماج ترقی کرے گا، خاندان کی شکل میں بھی ترقی ہوگی، جیسے جیسے سماج میں تبدیلی ہوگی، خاندان کی شکل میں بھی تبدیلی ہوگی۔ یہی پہلے بھی ہوا ہے، یہی آئندہ بھی ہوگا۔ وہ سماجی نظام کی تخلیق ہے اور اس میں اسی کی تہذیب کی جھلک دکھائی دے گی۔ جس طرح تمدن کے آغاز کے زمانے سے آج تک یک‌زوجگی کے خاندان میں بڑی ترقی ہوئی ہے اور موجودہ زمانے میں نہایت سوجھ بوجھ کے ساتھ ہوئی ہے، اسی طرح کم از کم اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ اس میں ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ اس میں اتنی ترقی ہوگی کہ مردوں اور عورتوں میں مکمل مساوات قائم ہو جائے گی۔ اگر مستقبل بعید میں یک‌زوجگی کا خاندان سماج کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکا تو آج یہ کہنا ناممکن ہے کہ اس کے بعد آنے‌والے خاندانی نظام کی خاصیت اور فطرت کیا ہوگی۔"

۳
ایروکواس لوگوں کا گن

اب ہم مارگن کی ایک اور دریافت کو لیتے ہیں ، جو کم سے کم اتنی ہی اہم ہے جتنی یک‌جدی قرابت‌داری (سگوتر) کے نظاموں سے خاندان کی ابتدائی صورتوں کی دریافت تھی ۔ مارگن نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ امریکی انڈین قبیلوں کے اندر سگوتر لوگوں یعنی یک‌جدی قرابت‌داروں کی جو جماعتیں تھیں اور جن کے نام جانوروں کے نام پر رکھے جاتے تھے ، وہ بنیادی طور پر وہی چیز تھی جو یونانیوں کی گینیا (genea) اور رومیوں کی گنٹس (gentes) تھی ۔ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ گن کی ابتدائی صورت اصل میں وہ ہے جو امریکہ میں ملتی ہے اور یونان اور روم کے گن بعد کی پیداوار ہیں اور اسی سے ماخوذ ہیں ۔ اس نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ ابتدائی زمانے کے یونانیوں اور رومیوں میں سماج گنوں ، فریٹریوں (برادریوں) اور قبیلوں میں منظم تھا ۔ ہوبہو ویسی ہی تنظیم امریکی انڈینوں میں بھی پائی جاتی ہے ۔ اور (جہاں تک ہماری موجودہ واقفیت ہے) گن ایک ایسا ادارہ ہے جو تمدن کے عہد میں داخل ہونے تک اور یہاں تک کہ اس کے بعد بھی سبھی بربری لوگوں میں پایا جاتا ہے ۔ ان باتوں کا ثبوت مل جانے سے قدیم یونانی اور رومی تاریخ کی مشکل‌ترین گتھیاں چشم زدن میں سلجھ گئیں ۔ ساتھ ہی اس دریافت نے قدیم زمانے کے — یعنی ریاست کی ابتدا ہونے سے پہلے کے —

سماجی دستور کی بنیادی خصوصیتوں پر بھی کچھ روشنی ڈالی ہے جس کی کسی کو توقع تک نہ تھی ۔ ایک بار جان لینے کے بعد یہ بات کتنی ہی آسان اور سیدھی سادی کیوں نہ معلوم ہو لیکن مارگن اس کا پتہ ابھی حال میں ہی لگا سکا ہے ۔ ۱۸۷۱ء میں جب اس کی پہلی کتاب شائع ہوئی تھی تو اس وقت تک وہ اس راز کو نہیں پا سکا تھا * ۔ اور جب مارگن نے اس راز کو پالیا تو انگلستان کے ماقبل تاریخ کے ماہر جنہیں اپنے آپ پر بڑا اعتماد تھا ، مجبوراً کچھ دنوں کے لئے چپ چاپ چوہوں کی طرح اپنے بلوں میں جا گھسے ۔

مارگن نے یکجدی قرابت‌داروں (سگوتر لوگوں) کی اس جماعت کے لئے عام طور پر لاطینی زبان کے لفظ گنس (gens) کو استعمال کیا ہے ۔ یہ لفظ بھی اپنے یونانی مرادف گینوس (genos) کی طرح ایک ہی آریائی سادہ گن (gan) سے ماخوذ ہے (جرمن زبان میں قاعدہ کے مطابق آریائی گف بدل کر کاف ہو جاتا ہے، چنانچہ جرمن میں یہ لفظ کن (kan) ہے) جس کے معنی ہیں جننا ، جنم دینا ۔ گنس (gens) ، گینوس (genos) ، سنسکرت جاناس (dschanas) ، گوتھک کونی (kuni — مذکورۂ بالا قاعدے کے مطابق) ، قدیم نارڈک اور اینگلوسیکسن کائن (kyn) ، انگریزی کن (kin) ، وسطی شمالی جرمن زبان کا لفظ کیونے (künne) ، سبھی کا ایک ہی مطلب ہے — قرابت‌داری ، نسل ۔ لیکن لاطینی زبان کا گنس (gens) اور یونانی کا گینوس (genos) خاص طور پر ایسے قرابت‌داروں کی جماعت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جن کو ایک ہی مورث اعلی کی (اور اس صورت میں مرد مورث اعلی کی) اولاد ہونے کا دعوی ہے ، اور جو بعض سماجی اور مذہبی اداروں کے ذریعے سے ایک مخصوص کمیونیٹی یا برادری کے رشتے میں منسلک ہو گئے ہیں جس کے ابتدائی حالات اور نوعیت کے بارے میں آج تک ہمارے سبھی مورخ تاریکی میں تھے ۔

پونالوان خاندان کے سلسلے میں ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ شروع میں گن کیسے بنتا ہے ۔ اس میں وہ تمام لوگ شامل ہوتے تھے جو

---

* ملاحظہ ہو موجودہ کتاب ، صفحہ ۲۰ ۔ (ایڈیٹر)

پونالوان شادی کی بدولت اور ان تصورات کے مطابق جو قطعی طور پر اس کے لازم ملزوم تھے ، ایک خاص عورت مورث اعلی کی جو اس گن کی بانی تھی ، اولاد مانے جاتے تھے ۔ چونکہ خاندان کی اس شکل میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بچے کا باپ کون ہے ، اس لئے نسل صرف عورتوں سے چلتی ہے ۔ اور چونکہ بھائی بہن میں شادی نہیں ہو سکتی تھی اور مرد صرف دوسری نسل کی عورتوں سے شادی کر سکتے تھے ، اس لئے ایسی عورتوں سے جو بچے پیدا ہوتے تھے ، وہ مادری حق کے مطابق باپ کے گن سے باہر چلے جاتے تھے ۔ اس طرح ہر سگوتر میں صرف لڑکیوں کی اولاد قرابتداری کے دائرے میں رہ سکتی تھی اور بیٹوں کی اولاد اپنی ماں کے گنوں میں چلی جاتی تھی ۔ یکجدی قرابت داروں کی یہ (سگوتر) جماعت جب قبیلے کے اندر اپنی جیسی دوسری جماعتوں سے علحدہ ایک جماعت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو پھر اس کا کیا حشر ہوتا ہے ؟

مارگن نے ایروکواس لوگوں کے اور ان میں بھی خاص کر سینیکا قبیلے کے گن کو ابتدائی گنوں کی کلاسیکی شکل مانا ہے ۔ ہر قبیلے میں آٹھ گن ہیں جن کے نام مندرجۂ ذیل جانوروں کے نام پر رکھے گئے ہیں : (۱) بھیڑیا ، (۲) بھالو ، (۳) کچھوا ، (۴) اودبلاؤ ، (۵) ہرن ، (۶) چھا ، (۷) بگلا ، (۸) باز ۔ ان میں سے ہر گن میں حسب ذیل رسم و رواج پائے جاتے ہیں :

۱ ۔ گن اپنا ساشم (یعنی امن کے زمانے کا رہنما) اور اپنا سالار (یعنی جنگ کا رہنما) چنتا ہے ۔ ساشم کو گن کے اندر سے ہی چننا پڑتا تھا اور اس کا عہدہ گن کے اندر موروثی ہوتا تھا جس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ جیسے ہی یہ جگہ خالی ہوتی اس کو پر کر دیا جاتا تھا ۔ جنگی سالار گن کے باہر سے بھی چنا جا سکتا تھا اور کبھی کبھی جگہ خالی بھی رہتی تھی ۔ سابق ساشم کا بیٹا کبھی اس کا جانشین نہیں ہو سکتا کیونکہ ایروکواس لوگوں میں مادری حق کا رواج تھا اور اسی لئے بیٹا دوسرے گن کا رکن ہوتا تھا ۔ لیکن ساشم کا بھائی یا بھانجا اکثر اس کی جگہ پر چن لیا جاتا تھا ۔ انتخاب میں عورت اور مرد دونوں ووٹ دیتے تھے ۔ لیکن جو آدمی چنا جاتا تھا اسے باقی سات گنوں کی

منظوری بھی لینی پڑتی تھی ، اس کے بعد ھی اسے باقاعدہ ساشم کے عہدے پر بٹھایا جاتا تھا اور یہ رسم تمام ایروکواس لوگوں کے وفاق کی عام کاؤنسل انجام دیتی تھی۔ اس کی اھمیت آگے چل کر واضح ھوگی۔ گن کے اندر ساشم کا اقتدار محض بزرگانہ اور خالص اخلاقی نوعیت کا ھوتا تھا۔ اس کے ھاتھ میں جبر کے کوئی ذرائع نہیں تھے۔ اپنے عہدے کی بدولت وہ سینیکا قبیلے کی کاؤنسل کا رکن بھی تھا اور سبھی ایروکواس قبیلوں کی وفاقی کاؤنسل کا بھی۔ جنگی سالار صرف فوجی مہم کے دوران میں حکم دے سکتا تھا۔

۲ - گن اپنے ساشم اور جنگی سالار کو جب چاھے برطرف کر سکتا تھا۔ یہ کام بھی مرد اور عورت مل کر کرتے تھے۔ اس کے بعد برطرف کیا ھوا آدمی اوروں کی طرح ایک عام سپاھی یا شہری کی حیثیت سے رھتا تھا۔ قبیلے کی کاؤنسل گن کی خواھش کے خلاف بھی ساشم کو برطرف کر سکتی تھی۔

۳ - کسی شخص کو گن کے اندر شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ گن کا بنیادی قاعدہ تھا جو اس کی شیرازہ بندی کو قائم رکھتا تھا۔ اس منفی صورت میں دراصل خون کے اس نہایت مثبت رشتے کا اظہار ھوتا تھا جس کی بدولت ان افراد کو جو یہاں جمع تھے ، ملا کر گن بنایا گیا تھا۔ اس معمولی سی حقیقت کو دریافت کر کے مارگن نے پہلی مرتبہ گنوں کی نوعیت کا انکشاف کیا۔ اس وقت تک لوگ گن کی اصل ماھیت کو نہیں سمجھتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ وحشی اور بربری لوگوں کے بارے میں پہلے کی رپورٹوں میں ان مختلف جماعتوں کو جن سے مل کر گن کی تنظیم بنتی ھے ، بلا سوچے سمجھے اور بلا کسی فرق اور امتیاز کے قبیلہ ، جرگہ اور تھم وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا تھا اور کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ان کے اندر شادی کرنے کی ممانعت ھے۔ اور اس طرح وہ الجھن پیدا کی گئی جس کو دور کرنے کے لئے مسٹر میکلینن نے مداخلت کی اور انہوں نے نپولین کی طرح ایک فرمان نکال کر ربط و نظم قائم کرنا چاھا۔ انہوں نے فرمان صادر کر دیا کہ سبھی قبیلے دو گروھوں میں بٹے ھوتے ھیں ، ایک وہ جن میں شادی کرنا منع ھے (exogamous) اور دوسرے وہ جن میں اس

کی اجازت ہے (endogamous) ۔ اور اس طرح خوب گڑبڑ پیدا کرنے کے بعد وہ اس چھان‌بین میں لگ گئے کہ ان کے سہمل گروہوں میں سے کون سا گروہ زیادہ پرانا ہے ۔ گن کی دریافت کے ساتھ یہ بے وقوفی کی باتیں آپ ہی آپ ختم ہو گئیں — گن خون کے رشتوں کی بنیاد پر بنتے تھے اور اس کے رکن آپس میں شادی نہیں کر سکتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ ایروکواس لوگ ارتقا کی جس منزل پر تھے ، اس میں گن کے اندر شادی کی ممانعت کے اس قاعدہ پر سختی کے ساتھ عمل ہوتا تھا ۔

۴ ۔ مرنے‌والے کی جائداد گن کے باقی لوگوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی کیونکہ اس جائداد کو گن کے اندر ہی رہنا تھا ۔ چونکہ کوئی ایروکواس شخص مرنے پر بہت زیادہ ترکہ نہیں چھوڑ سکتا تھا اس لئے وہ گن کے اندر بہت ہی قریبی رشتہ‌داروں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا ۔ جب کوئی مرد مرتا تو اس کی جائداد اس کے سگے بھائی بہنوں میں اور اس کے ماموؤں میں بانٹ دی جاتی ۔ اور جب کوئی عورت مرتی تو اس کے اپنے بچوں اور اپنی بہنوں میں ، مگر اس کے بھائیوں کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ میاں بیوی کو بھی ایک دوسرے کا ترکہ نہیں ملتا تھا اور نہ بچوں کو باپ کی وراثت ملتی تھی ۔

۵ ۔ گن کے ممبروں کا فرض ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کی مدد اور حفاظت کریں اور خاص کر اگر باہر کا کوئی آدمی گن کے کسی ممبر کو نقصان پہونچا گیا ہو تو اس کا بدلہ لینے میں عملی مدد کریں ۔ فرد اپنی حفاظت کے لئے گن کی مدد پر بھروسہ کر سکتا تھا اور کرتا تھا ۔ اگر کوئی شخص اسے تکلیف پہونچاتا تو گویا وہ سارے گن کو تکلیف پہونچاتا تھا ۔ اسی سے ، یعنی گن کے خون کے رشتے سے ، خونی انتقام لینے کا رواج پیدا ہوا اور اسے فرض قرار دیا گیا ۔ ایروکواس لوگ اس فرض کو غیر مشروط طریقے پر مانتے تھے ۔ اگر گن کے باہر کے کسی آدمی نے گن کے کسی آدمی کو قتل کر دیا تو مقتول کے گن کے تمام ممبروں پر اس خون کا بدلہ لینا ضروری تھا ۔ پہلے تصفیہ کرانے کی کوشش کی جاتی تھی ۔ قاتل کے گن کی کاؤنسل بلائی جاتی اور مقتول کے گن کی کاؤنسل کے پاس معاملہ کا تصفیہ کر لینے کے لئے تجویزیں بھیجی جاتیں ۔ اس کا طریقہ زیادہ‌تر یہ ہوتا تھا کہ کاؤنسل اپنی

طرف سے معذرت کرتی اور خون‌بہا کے طور پر بیش قیمت تحفے بھیجتی۔ اگر ان کو قبول کر لیا جاتا تو بات رفت گذشت ہو جاتی۔ اور اگر نہیں تو مقتول کا گن بدلہ لینے کے لئے ایک یا متعدد آدمیوں کو تعینات کرتا تھا۔ ان کا کام قاتل کا پیچھا کر کے اس کو قتل کر دینا تھا۔ اگر یہ ہو جاتا تو قاتل کے گن کو شکایت کا کوئی حق نہیں تھا اور سمجھا جاتا کہ بدلہ پورا ہو گیا۔

۶ - گن کا اپنا مخصوص نام یا ناموں کا سلسلہ ہوتا تھا جسے سارے قبیلے میں صرف وہی گن استعمال کر سکتا تھا۔ چنانچہ کسی شخص کے نام سے ہی یہ پتہ لگ سکتا تھا کہ وہ کس گن کا آدمی ہے۔ جو شخص گن کا نام استعمال کرتا ، اسے گن کے حقوق بھی حاصل ہوتے تھے۔

۷ - گن اجنبی آدمیوں کو بھی اپنا ممبر بنا سکتا تھا۔ اور ایسا ہونے کے بعد وہ شخص پورے قبیلے کا ممبر سمجھا جاتا تھا۔ جنگ کے قیدیوں میں سے جن لوگوں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا ، وہ کسی گن میں شریک کر لئے جاتے تھے اور اس طرح پورے سینیکا قبیلے کے رکن بن جاتے تھے ، اور پھر انہیں قبیلے اور گن کے سارے اختیارات حاصل ہو جاتے تھے۔ اجنبیوں کو گن کے انفرادی ممبروں کی درخواست پر ہی ممبر بنایا جاتا تھا۔ مرد کہتے کہ فلاں اجنبی کو میرا بھائی یا بہن مان لیا جائے۔ اور عورتیں کہتیں کہ اسے میری اولاد مان لیا جائے۔ منظوری کے لئے ضروری تھا کہ گن کے اندر شامل کرنے کی رسم باقاعدہ طریقے سے انجام دی جائے۔ جن گنوں میں کسی‌سبب سے آدمیوں کی تعداد گھٹ کر بہت کم ہو جاتی تھی وہ اکثر دوسرے گنوں سے اجازت لے کر بہت سے لوگوں کو اپنے گن میں شامل کر لیتے تھے۔ ایروکواس لوگوں میں گن میں شامل کرنے کی رسم قبیلے کی کاؤنسل کے ایک عام جلسے میں انجام دی جاتی تھی اور اس کی حیثیت ایک مذہبی رسم کی ہو گئی تھی۔

۸ - انڈین گنوں میں مخصوص مذہبی رسموں کا وجود ثابت کرنا مشکل ہے۔ پھر بھی اس میں شک نہیں کہ انڈینوں کی مذہبی رسمیں کم و بیش گنوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایروکواس لوگوں میں سال میں چھ مذہبی تقریبیں ہوتی تھیں جن میں الگ الگ گنوں کے ساشم

اور جنگی سالار جو اپنے عہدے کی بدولت ''محافظ دین،، بھی سمجھے جاتے تھے، پروھتوں اور پجاریوں کا کام کرتے تھے۔

۹۔ ھر گن کا ایک قبرستان ھوتا تھا۔ ریاست نیویارک کے ایروکواس لوگ اب چاروں طرف سے گورے لوگوں سے گھر گئے ھیں، اس لئے ان کا قبرستان باقی نہیں رھا، لیکن پہلے تھا۔ دوسرے انڈین قبیلوں کے اب بھی خود اپنے قبرستان ھوتے ھیں۔ مثال کے طور پر اس ٹسکارور قبیلے کا، جس کو ایروکواس لوگوں سے قریبی تعلق ھے، اپنا قبرستان ھے۔ اگرچہ یہ لوگ عیسائی ھیں پھر بھی ان کے قبرستان میں ھر گن کے لئے قبروں کی ایک علحدہ قطار ھوتی ھے۔ ماں اور اس کے بچے ایک ھی قطار میں دفن کئے جاتے ھیں لیکن باپ کو اس قطار میں جگہ نہیں دی جاتی۔ ایروکواس لوگوں میں تجہیز و تکفین کے وقت سبھی آدمی ماتم کرتے ھیں، قبر تیار کرتے ھیں، جنازے پر تقریر کرتے ھیں، وغیرہ وغیرہ۔

۱۰۔ گن کی ایک کاؤنسل ھوتی تھی۔ یہ ایک جمہوری مجلس تھی جس میں گن کے تمام بالغ مرد اور عورتیں شامل ھوتی تھیں اور سب کی آواز برابر ھوتی تھی۔ یہی کاؤنسل ساشم اور جنگی سالار چنتی یا انہیں برطرف کرتی تھی۔ اسی طرح وھی کاؤنسل اور باقی ''محافظ دین،، کو بھی چنتی اور برطرف کرتی تھی۔ گن کے کسی ممبر کے مارے جانے پر یہی کاؤنسل خون بہا (wergeld) لینے یا خون کا بدلہ خون سے لینے کا فیصلہ کرتی۔ اسی میں اجنبیوں کو گن کے اندر شامل کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ گن میں یہی کاؤنسل سارے اختیارات کی مالک تھی۔

امریکی انڈینوں کے ایک عام گن کے مذکورۂ بالا اختیارات ھوتے تھے۔

''ایک انڈین گن کے سبھی رکن ذاتی طور پر آزاد ھیں۔ اور ایک دوسرے کی آزادی کی حفاظت کرنا ان کا فرض ھے۔ انفرادی حقوق اور اختیارات میں سب ایک دوسرے کے برابر ھیں۔ ساشم اور سالاروں کو بھی کوئی فوقیت نہیں۔ یہ ایک ایسی برادری ھے جو قرابت‌داری کے دھاگے سے بندھی ھوئی ھے۔ آزادی، مساوات

اور بھائی‌چارے کے اصول کا کبھی باقاعدہ اعلان نہیں کیا گیا مگر گن کے یہی بنیادی اصول ہیں ۔ گن ایک سماجی نظام کی اکائی ہے ، گن وہ بنیاد ہے جس پر انڈین سماج کی تنظیم ہوئی تھی ۔ آزادی اور خودداری کا احساس جو انڈینوں کے کردار کی عام خصوصیت ہے ، اسی کا نتیجہ ہے ۔ ،، *

جس وقت امریکہ دریافت ہوا انڈین سارے شمالی امریکہ میں ایسے گنوں میں منظم تھے جو مادری حق کے مطابق بنے تھے ۔ ڈکوٹا جیسے محض چند ہی قبیلے ایسے تھے جن میں گن کا زوال شروع ہو چکا تھا اور کچھ ایسے بھی تھے ، جیسے اوجبوا اور اوماہا ، جن کی تنظیم پدری حق کے مطابق کی گئی تھی ۔

امریکی انڈینوں کے بہت سے قبیلے ایسے تھے جن میں پانچ یا چھہ سے زیادہ گن تھے ۔ ان میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تین چار یا اس سے بھی زیادہ گنوں کو ملا کر ایک مخصوص گروہ بنا دیا جاتا تھا ۔ مارگن نے اس کے انڈین نام کا یونانی مرادف ڈھونڈ کر فریٹری (برادری) کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ سینیکا قبیلے میں اس طرح کی دو فریٹریاں تھیں ۔ پہلی میں ایک سے چار نمبر تک کے گن شامل تھے اور دوسری میں پانچ سے آٹھ نمبر تک کے ۔ زیادہ گہری چھان‌بین سے یہ پتہ لگا کہ یہ فریٹریاں اصل میں ان ابتدائی گنوں کی نمائندہ ہیں جن میں سب سے پہلے قبیلے کی تقسیم ہوئی تھی ۔ کیونکہ ایک گن میں شادی کی ممانعت ہو جانے کے بعد ضروری ہو گیا تھا کہ ہر قبیلے میں کم سے کم دو گن ہوں تاکہ قبیلہ اپنے آزاد وجود کو قائم رکھ سکے ۔ جیسے جیسے قبیلہ بڑھتا گیا ، ہر گن مزید دو یا زیادہ گنوں میں تقسیم ہوتا گیا اور ہر ایک ان میں سے ایک علحدہ گن بن گیا ۔ اور جو ابتدائی گن تھا یعنی جس میں سبھی لڑکی والے گن شامل ہیں ، فریٹری کی شکل میں زندہ رہا ۔ سینیکا قبیلے میں اور اکثر دوسرے انڈین قبیلوں میں ایک

---

* ملاحظہ ہو ،، مارکس اور اینگلس کی دستاویزات ،، جلد ۹ ، صفحہ ۱۷ ۔ (ایڈیٹر)

فریٹری کے گن آپس میں بھائی گن ہیں اور دوسری برادری یا فریٹری کے گن ان کے رشتے کے بھائی ہوتے ہیں۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ یکجدی قرابت‌داری (سگوتر) کے امریکی نظام میں یہ القاب نہایت حقیقی اور ٹھوس اہمیت رکھتے ہیں۔ ابتدا میں سینیکا قبیلے کا کوئی آدمی ہرگز اپنی برادری (فریٹری) کے اندر شادی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن بہت دن ہوئے کہ یہ پابندی اٹھا دی گئی ہے اور اب یہ محض اپنے گن تک محدود ہے۔ سینیکا قبیلے میں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ ''بھالو،، اور ''ہرن،، نام کے دو گن شروع میں تھے۔ دوسرے گن ان ہی کی شاخیں ہیں جو بعد میں ان سے پھوٹیں۔ ایک بار جب اس ادارے نے جڑ پکڑ لی تو پھر حسب ضرورت اس میں تبدیلی بھی ہوئی۔ توازن قائم رکھنے کے لئے اکثر ایسا بھی ہوا کہ کسی دوسری فریٹری کے پورے کے پورے گن ایسی فریٹری میں شامل کر دئے گئے جن کے گن ناپید ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف قبیلوں میں ہم ایک ہی نام کے متعدد گنوں کو مختلف برادریوں (فریٹریوں) میں منظم پاتے ہیں۔

ایروکواس لوگوں میں فریٹری (برادری) کے منصب کسی حد تک سماجی اور کسی حد تک مذہبی ہیں۔ (۱) فریٹریاں آپس میں گیند کھیلتی ہیں۔ ہر فریٹری اپنے بہترین کھلاڑیوں کو میدان میں اتارتی ہے۔ فریٹری کے باقی لوگ تماشا دیکھتے ہیں، جنہیں فریٹری کے مطابق الگ الگ صفوں میں کھڑا کر دیا جاتا ہے اور وہ اپنے اپنے فریق کی جیت کے بارے میں شرط بدتے ہیں۔ (۲) قبیلے کی کاؤنسل میں ہر برادری کے ساشم اور جنگی سالار ساتھ مل کر بیٹھتے ہیں۔ مختلف گروہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھتے ہیں اور تقریر کرنےوالا ہر فریٹری کے نمائندوں کو ایک علحدہ جماعت کی حیثیت سے خطاب کرتا ہے۔ (۳) اگر قبیلے میں کوئی آدمی قتل کر دیا گیا ہو اور قاتل اور مقتول ایک ہی فریٹری کے نہ ہوں تو مقتول کا گن اکثر اپنے برادر گنوں سے اپیل کرتا ہے۔ یہ گن مل کر فریٹری کی کاؤنسل بلاتے ہیں اور دوسری فریٹری سے بھی اپنی کاؤنسل بلانے کی درخواست کرتے ہیں تاکہ اس معاملے کا تصفیہ کیا جا سکے۔ اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ

برادری یا فریٹری ھی شروع میں اصل گن تھی اور چونکہ وہ اپنی شاخوں یعنی الگ الگ گنوں سے زیادہ طاقتور ھوتی ھے اس لئے اس کی کامیابی کی امید بھی زیادہ ھوتی ھے ۔ (۴) کسی فریٹری کے کسی اھم آدمی کے مرنے پر دوسری فریٹری تجہیز و تکفین کا انتظام کرتی ھے اور مرنےوالے کی فریٹری کے لوگ ماتم کرتے ھوئے جنازے کے ساتھ چلتے ھیں ۔ اگر کوئی ساشم مر جائے تو دوسری فریٹری کے لوگ ایروکواس لوگوں کی وفاقی کاؤنسل میں اطلاع دیتے ھیں کہ اس کی جگہ خالی ھو گئی ۔ (۵) ساشم کے انتخاب کے وقت فریٹری کی کاؤنسل پھر سامنے آتی ھے ۔ برادر گنوں کی منظوری کی حیثیت محض رسمی ھے لیکن دوسری فریٹری کے گن مخالفت کر سکتے ھیں ۔ ایسی صورت میں اس فریٹری کی کاؤنسل بیٹھتی ھے اور اگر وہ بھی مخالفت کرنے والوں کا ساتھ دیتی ھے تو انتخاب کو مسترد کر دیا جاتا ھے ۔ (۶) پہلے ایروکواس لوگوں میں خاص قسم کی پراسرار مذھبی رسمیں ھوتی تھیں جنھیں گورے لوگ medicine-lodges (جادو ٹونا) کہتے تھے ۔ سینیکا قبیلے میں یہ رسمیں دو مذھبی گروہ ادا کرتے تھے ۔ ھر گروہ ایک برادری کے لئے تھا ۔ نئے ممبروں کو شامل کرنے کے لئے باقاعدہ مذھبی رسمیں ادا کی جاتی تھیں ۔ (۷) اگر ، جیسا کہ تقریباً یقینی معلوم ھوتا ھے ، فتح امریکہ کے وقت (۱۲۹) تلس کلا کے چار حصوں (سربعوں) پر جو چار یکجدی گروہ (lineages) قابض تھے وہ چار برادریاں تھیں ، تو اس سے یہ ثابت ھو جائےگا کہ یونانیوں کی برادریوں اور جرمنوں کے اسی قسم کے یکجدی گروھوں (سگوتروں) کی مانند یہ فریٹریاں (برادریاں) بھی فوجی اکائی کا کام دیتی تھیں ۔ ان چاروں میں سے ھر یکجدی (سگوتر) گروہ لڑائی میں حصہ لیتا تھا ۔ اس کی اپنی الگ سپاہ ، الگ وردی اور جھنڈا اور الگ اپنا سالار ھوتا تھا ۔

جس طرح کئی گنوں سے مل کر ایک فریٹری (برادری) بنتی تھی اسی طرح ، اپنی کلاسیکی (قدیم) شکل میں ، کئی برادریوں سے مل کر ایک قبیلہ بنتا تھا ۔ اکثر ایسے قبیلوں میں جو کمزور ھو گئے ھیں ، یہ بیچ کی کڑی یعنی برادری ختم ھو گئی ھے ۔ امریکہ میں انڈین قبیلوں کی نمایاں خصوصیتیں کیا ھیں ؟

(۱) ہر قبیلے کا اپنا علاقہ اور اپنا نام ہوتا تھا۔ اس زمین کے علاوہ جہاں پر بستی ہوتی تھی ہر قبیلے کے پاس ایک بڑا علاقہ شکار کھیلنے اور مچھلی پکڑنے کے لئے ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بہت دور تک ایسی زمین تھی جو کسی قبیلے کی نہیں تھی اور جس کے بعد سے دوسرے قبیلے کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ جہاں دو قبیلے ایک دوسرے سے ملتی جلتی زبان بولتے تھے، وہاں بیچ کا یہ غیرمقبوضہ علاقہ نسبتاً مختصر ہوتا تھا اور جہاں ان کی بولیوں میں کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا وہاں وہ علاقہ زیادہ بڑا ہوتا تھا۔ ایسے ہی غیر مقبوضہ علاقوں میں جرمنوں کے سرحدی جنگل تھے، وہ بنجر زمین تھی جسے سیزر کے سوئیویوں نے اپنے علاقے کے چاروں طرف بنا رکھا تھا۔ ڈنمارک کے باشندوں اور جرمنوں کے درمیان کا îsarnholt (ڈینش زبان میں jarnved, limes Danicus) تھا، جرمنوں اور سلاف لوگوں کے درمیان کے سیکسن جنگل اور branibor تھے (جس کے معنی سلاف زبانوں میں ''حفاظتی جنگل'' کے ہیں)، جس سے شہر برانڈنبرگ کا نام ماخوذ ہے — یہ سب ایسے ہی غیرمقبوضہ علاقے تھے۔ ان غیرواضح سرحدوں کے بیچ میں جو علاقہ پڑتا تھا وہ قبیلے کی مشترک ملکیت تھی۔ پڑوس کے قبیلے والے بھی اسے تسلیم کرتے تھے اور اگر دوسرے لوگ اس میں گھسنے کی کوشش کرتے تو قبیلہ اس علاقے کی حفاظت کرتا اور انہیں آنے سے روکتا۔ سرحد کے غیرواضح ہونے کی وجہ سے عملی دشواریاں زیادہ‌تر اسی وقت پیدا ہوئیں جب آبادی بہت بڑھ گئی۔ قبیلے کا نام بہ ظاہر بہت سوچ سمجھ کر نہیں رکھا جاتا تھا۔ اکثر ان کا نام محض کسی اتفاق کی وجہ سے پڑ جاتا تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد پڑوس کے قبیلے والے کسی قبیلے کو اس کے اپنے نام سے نہیں بلکہ کسی اور نام سے پکارنے لگے۔ جرمنوں (die Deutschen) کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تاریخی طور پر ان کا پہلا جامع نام — جرمانی (Germanen) — انہیں کیلٹوں نے دیا تھا۔

(۲) ہر قبیلے کی اپنی ایک خاص بولی ہوتی تھی۔ اصل میں قبیلہ اور بولی دونوں کا دائرہ ایک ہوتا تھا۔ تقسیم در تقسیم سے نئے قبیلوں اور بولیوں کی نشو و نما امریکہ میں ابھی حال تک جاری تھی اور

یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا سلسلہ اب بند ہو گیا۔ جہاں دو کمزور قبیلے مل کر ایک ہو گئے ہیں وہاں مستثنی صورتوں میں ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی قبیلے کے اندر دو بہت ملتی جلتی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ ایک امریکی قبیلے میں اوسطاً دو ہزار آدمی ہوتے ہیں۔ لیکن چیروکی قبیلے میں چھبیس ہزار آدمی ہیں — ریاست‌ہائے متحدہ امریکہ میں ایک بولی بولنےوالے انڈینوں کی یہ سب سے بڑی تعداد ہے۔

(۳) گنوں کے منتخب کئے ہوئے ساشم اور جنگی سالاروں کو ان کے عہدے پر بٹھانے کا حق قبیلے کو تھا۔

(۴) قبیلے کو اختیار تھا کہ چاہے تو گن کی رائے کےخلاف بھی ان دونوں عہدہداروں کو برخاست کردے۔ چونکہ یہ ساشم اور جنگی سالار قبیلے کی کاؤنسل کے ممبر ہوتے ہیں اس لئے ان کے سلسلے میں قبیلے کے ان اختیارات کی تشریح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جہاں کہیں متعدد قبیلوں کا وفاق قائم ہوا تھا اور ایک وفاقی کاؤنسل میں سبھی قبیلوں کی نمائندگی ہوتی تھی وہاں مذکورۂبالا اختیارات اس ادارے کے ہاتھ میں سونپ دئےجاتے تھے۔

(۵) قبیلے کے مذہبی خیالات (دیومالا) اور عبادت کی رسمیں ایک سی ہوتی تھیں۔

"بربری لوگوں کے مخصوص انداز کےمطابق امریکہ کے انڈین ایک مذہبی قوم تھے۔" (۱۳۰)

ابھی تک تنقیدی نقطہٴنظر سے ان کی دیومالا کی جانچ پڑتال نہیں کی گئی ہے۔ ان لوگوں نے اپنے مذہبی عقائد کو شخصی صورت دےدی تھی — وہ طرح طرح کے بھوت پریت کو مانتے تھے۔ لیکن وہ بربریت کے جس ابتدائی دور میں تھے، اس میں ابھی تک ان ارواح کو مٹی یا پتھر کے سانچوں میں نہیں ڈھالا گیا تھا یعنی بت اور مورتیں نہیں بنائی گئی تھیں۔ فطرت اور اس کے عناصر کی یہ پرستش رفتہ رفتہ بہت سے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ ہر قبیلے کے اپنے اپنے تیوہار اور عبادت کی مخصوص صورتیں تھیں، جس میں ناچ اور کھیل

ہوتے تھے۔ ناچ سبھی مذہبی تقریبوں کا لازمی جزو تھا اور ہر قبیلے کے لوگ علحدہ علحدہ اپنی تقریبیں مناتے تھے۔

(۶) مشترک معاملات کے لئے قبیلے کی ایک کاؤنسل ہوتی تھی۔ اس میں مختلف گنوں کے سبھی ساشم اور جنگی سالار ہوتے تھے۔ یہ ان گنوں کے سچے نمائندے تھے کیونکہ انہیں ہر وقت برخاست کیا جا سکتا تھا۔ کاؤنسل کا کھلا اجلاس ہوتا تھا جس کے چاروں طرف قبیلے کے دوسرے لوگ کھڑے ہوتے تھے جنہیں بحث میں حصہ لینے اور رائے دینے کا حق ہوتا تھا۔ لیکن فیصلہ کرنے کا اختیار صرف کاؤنسل کو تھا۔ عام قاعدہ یہ تھا کہ ہر شخص جو وہاں پر موجود ہوتا کاؤنسل کو اپنی بات سنا سکتا تھا۔ عورتیں بھی کسی اپنی پسند کے ترجمان کے ذریعے سے اپنی رائے ظاہر کر سکتی تھیں۔ ایروکواس لوگوں میں آخری فیصلہ صرف اتفاق رائے سے ہو سکتا تھا۔ جرمن مارک کمیونٹی (برادریوں) کے زیادہ‌تر فیصلوں میں بھی یہی صورت تھی۔ دوسرے قبیلوں کے ساتھ اپنے تعلقات متعین کرنے کا کام خاص طور پر قبیلے کی کاؤنسل کا تھا۔ دوسرے قبیلوں کے سفیر اس کے سامنے حاضر ہوتے اور وہی دوسرے قبیلوں میں اپنے ایلچی بھیجتی۔ وہی کاؤنسل جنگ اور امن کا فیصلہ کرتی۔ جنگ چھڑنے پر وہی لوگ لڑنے کے لئے بھیجے جاتے تھے جو خود اپنی رضامندی سے آگے آتے تھے۔ اصولاً ایک قبیلے کی ان تمام قبیلوں سے جنگ تھی جن کے ساتھ باقاعدہ امن کا معاہدہ نہیں تھا۔ ایسے دشمنوں کے خلاف فوجی مہم کی تیاری زیادہ‌تر چند ایک ممتاز ساونت کرتے تھے۔ وہ ایک جنگی رقص کا انتظام کرتے اور جو کوئی اس ناچ میں شامل ہوتا وہ گویا اس مہم میں شریک ہونے کا اعلان کر دیتا تھا۔ ان لوگوں کو لے کر اسی وقت ایک دستہ بنا لیا جاتا اور وہ فوراً کوچ کر جاتا۔ جب قبیلے کے علاقے پر دوسرے لوگ حملہ کرتے تو اس کی حفاظت کا کام بھی اسی طرح رضاکاروں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ رضاکاروں کے ان دستوں کی روانگی اور واپسی کے موقع پر بڑی دھوم دھام سے جشن منایا جاتا۔ ان مہموں کے لئے قبیلے کی کاؤنسل کی منظوری ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی، منظوری نہ تو مانگی جاتی تھی اور نہ دی جاتی تھی۔ ان مہموں کا وہی حال تھا جو جرمن پابند خدمت

سپاہیوں کی نجی جنگی مہموں کا تھا جس کی تفصیل تاسیت نے بیان کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جرمنوں میں پابند خدمت سپاہیوں کی حیثیت کم و بیش مستقل سپاہیوں کی سی تھی۔ امن کے زمانے میں بھی ان کا ایک چھوٹا سا مضبوط دستہ ہوتا تھا جس میں جنگ کے زمانے میں اور رضاکار بھی شامل ہو جاتے تھے۔ ان فوجی دستوں میں بہت لوگ نہیں ہوتے تھے۔ امریکی انڈینوں کی نہایت اہم مہموں میں بھی، جن میں انہیں لڑنے کے لئے بہت دور جانا پڑتا تھا ، بہت کم لوگ جاتے تھے۔ جب کسی بڑی لڑائی کے لئے ایسے متعدد دستے ایک جگہ جمع ہوتے تو ہر دستہ صرف اپنے ہی سالار کا حکم مانتا تھا۔ جنگ کے داؤپیچ سالاروں کی کاؤنسل مل کر تیار کرتی تھی تاکہ پوری جنگ ایک ہی داؤپیچ کے مطابق لڑی جائے۔ چوتھی صدی میں اپر رھائن کے المانی لوگوں نے بھی جنگ کا یہی طریقہ اختیار کیا تھا جس کا حال امیانس مارسیلینس نے بیان کیا ہے۔

(۷) بعض قبیلوں میں ایک بڑا سردار ہوتا تھا۔ لیکن اس کے اختیارات بہت محدود تھے۔ وہ بھی ایک ساشم تھا جسے ایسے موقعوں پر جبکہ فوری قدم اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے ، عارضی فیصلے کرنے ہوتے تھے۔ لیکن یہ فیصلے اسی وقت تک کے لئے ہوتے تھے جب تک کہ کاؤنسل اپنے اجلاس میں کوئی آخری فیصلہ نہ کر لیتی۔ یہ ایک ایسا عہدہدار مقرر کرنے کی کوشش تھی جو فیصلوں پر عمل کرا سکے ، لیکن یہ نہایت کمزور کوشش تھی جس کا مقصد پوری طرح واضح نہیں تھا۔ اور جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا اس کوشش کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ دراصل جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے اگر سبھی جگہ نہیں تو زیادہتر جگہوں میں سب سے بڑا فوجی سالار ہی ترقی کر کے ایسا عہدہدار بن گیا۔

امریکہ کے انڈینوں کی بہت بڑی اکثریت کبھی بھی قبائلی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ یہ چھوٹے چھوٹے قبیلے تھے جن میں بہت کم لوگ ہوتے تھے ، جن میں آپس میں بڑے بڑے غیر مقبوضہ سرحدی علاقوں کی وجہ سے بہت فاصلہ ہوتا تھا اور جو ہمیشہ کے لڑائی جھگڑے کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے۔ اور یہ تھوڑے سے آدمی ایک بہت بڑے

علاقے میں بکھرے ہوئے تھے۔ عارضی مصلحتوں کی بنیاد پر قرابت دار قبیلوں میں کہیں کہیں اتحاد قائم ہوتا تھا تو وقتی خطرے کے گذر جانے کے بعد وہ ختم ہو جاتا تھا۔ لیکن بعض علاقوں میں ایسے قبیلے جو شروع میں قرابت‌دار تھے مگر آگے چل کر غیرمتحد ہو گئے تھے، پھر پائدار وفاقوں کی صورت میں متحد ہوئے اور اس طرح انہوں نے قوموں کی تشکیل کی طرف پہلا قدم اٹھایا تھا۔ ریاست‌ہائے متحدہ امریکہ میں ہمیں اس وفاق کی سب سے زیادہ ترقی‌یافتہ صورت ایروکواس لوگوں میں ملتی ہے۔ ان کا ابتدائی وطن دریائے مسی‌سپی کے مغرب میں تھا جہاں غالباً وہ عظیم ڈکوٹا نامی نسل کا حصہ تھے۔ وہاں سے نکل کر وہ بہت دنوں تک گھومتے پھرتے رہے اور پھر اس علاقے میں آبسے جو آج کل نیویارک کی ریاست ہے۔ وہ پانچ قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے — سینیکا، کایوگا، اونٹڈگا، اونیڈا اور موہاوک۔ وہ مچھلی، شکار کئے ہوئے جانور اور بہت ہی بھدی قسم کی باغبانی کی پیداوار پر گزربسر کرتے تھے۔ وہ ایسے گاؤں میں رہتے تھے جو زیادہ‌تر باڑوں سے گھرے ہوتے تھے۔ ان کی تعداد کبھی بھی بیس ہزار سے زیادہ نہیں ہوئی۔ ان میں متعدد گن تھے جو پانچوں قبیلوں میں پائے جاتے تھے۔ وہ ایک ہی زبان کی مختلف بولیاں بولتے تھے جو ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی تھیں۔ وہ ایک ہی سلسلے کے قطعۂ زمین پر رہتے تھے جو پانچوں قبیلوں میں بٹا ہوا تھا۔ چونکہ اس علاقے پر انہوں نے ابھی حال میں قبضہ کیا تھا اس لئے قدرتی بات تھی کہ جن لوگوں کو انہوں نے اس جگہ سے ہٹایا تھا ان کے مقابلے میں آپس میں ان پانچوں قبیلوں میں اتحاد تھا۔ حد سے حد پندرھویں صدی کی ابتدا میں یہ چیز بڑھ کر ایک ''مستقل اتحاد،، یا وفاق کی صورت اختیار کر چکی تھی، جسے اپنی اس طاقت کا اتنا گھمنڈ ہوا کہ اس نے فوراً ہی دوسروں پر چڑھائی شروع کر دی اور اپنی طاقت کے انتہائی عروج کے زمانے میں یعنی ۱۶۷۰ء کے لگ بھگ اس نے آس‌پاس کے بہت بڑے علاقے کو فتح کر لیا اور وہاں کے باشندوں میں کچھ کو نکال باہر کیا اور کچھ کو خراج ادا کرنے پر مجبور کیا۔ ان انڈینوں میں جو بربریت کے ابتدائی دور سے آگے نہیں بڑھے تھے (جن میں میکسیکو، جدید میکسیکو اور پیرو کے باشندوں کے

علاوہ باقی سب شامل تھے) ایروکواس لوگوں کی وفاقی تنظیم سب سے زیادہ ترقی‌یافتہ سماجی تنظیم تھی۔ اس وفاق کی بنیادی خصوصیتیں یہ تھیں :

(۱) مکمل برابری اور قبیلے کے تمام اندرونی معاملوں میں پوری آزادی کی بنیاد پر پانچ یکجدی قبیلوں میں مستقل اتحاد قائم تھا۔ وفاق کی اصل بنیاد یہی خون کا رشتہ تھا۔ ان پانچ قبیلوں میں تین پدری قبیلے کہلاتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے کے بھائی تھے اور باقی دو پسری قبیلے تھے۔ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ تین گن سب سے پرانے تھے اور ان کے زندہ نمائندے پانچوں قبیلوں میں موجود تھے اور دوسرے تینوں کے صرف تین قبیلوں میں تھے۔ ان گنوں میں سے ہر ایک کے ممبر پانچوں قبیلوں میں بھائی بھائی سمجھے جاتے تھے۔ بولی ٹھولی کے فرق کے باوجود زبان کی وحدت اس بات کا اظہار اور ثبوت تھی کہ پانچوں قبیلے ایک ہی نسل سے ہیں۔

(۲) وفاق کا انتظامی ادارہ ایک کاؤنسل تھی جس میں پچاس ساشم تھے جن میں ہر ایک کا درجہ اور اعزاز یکساں تھا۔ وفاق سے تعلق رکھنےوالی سبھی باتوں پر یہی کاؤنسل فیصلہ کیا کرتی تھی۔

(۳) جب وفاق قائم کیا گیا تو یہ پچاس ساشم نئے عہدہداروں کی حیثیت سے مختلف قبیلوں اور گنوں میں تقسیم کئے گئے تھے۔ یہ نیا عہدہ خاص طور پر وفاق کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ جب کبھی کسی ساشم کی جگہ خالی ہوتی تو جس گن سے اس کا تعلق ہوتا ، وہ نیا ساشم چن لیتا اور جب چاہتا وہ اسے ہٹا دیتا۔ لیکن ساشم کو عہدے پر بٹھانا وفاقی کاؤنسل کا کام تھا۔

(۴) یہ وفاقی ساشم اپنے اپنے قبیلے کے بھی ساشم ہوا کرتے تھے اور ان کو قبیلے کی کاؤنسل میں بیٹھنے اور ووٹ دینے کا حق تھا۔

(۵) وفاقی کاؤنسل کے سبھی فیصلے اتفاق رائے سے ہوتے تھے۔

(۶) قبیلہوار ووٹ دیا جاتا تھا۔ اس لئے کوئی ایسا فیصلہ کرنے کے لئے جسکی پابندی سب پر لازم ہو ، ہر قبیلہ اور اس قبیلے کے تمام کاؤنسل ممبروں کی منظوری ضروری تھی۔

(۷) پانچوں قبائلی کاؤنسلوں میں سے کوئی بھی اس وفاقی کاؤنسل کا

اجلاس بلا سکتی تھی۔ وفاقی لیکن کاؤنسل آپ اپنا اجلاس نہیں منعقد کر سکتی تھی۔

(۸) وفاقی کاؤنسل کے جلسے عام لوگوں کے سامنے ہوتے تھے۔ ایروکواس لوگوں کے کسی بھی قبیلے سے تعلق رکھنےوالا کوئی آدمی اپنی رائے دے سکتا تھا، لیکن فیصلہ کرنے کا اختیار صرف کاؤنسل کو تھا۔

(۹) وفاق کا کوئی باقاعدہ سردار یا انتظامی عہدہدار نہیں تھا۔

(۱۰) لیکن اس کے دو اعلی جنگی سردار ہوا کرتے تھے جن کے اختیار اور درجے برابر ہوتے تھے۔ (اسپارٹا میں اسی طرح دو ''بادشاہ،، اور روم میں دو مشیر یا قونصل ہوتے تھے۔)

یہ تھا وہ تمام سماجی دستور جس کے تحت ایروکواس لوگ چار سو برس سے زیادہ عرصہ تک زندگی بسر کرتے رہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ میں نے اس کے متعلق مارگن کا بیان کافی تفصیل سے نقل کیا ہے کیونکہ اس سے ہم ایک ایسے سماج کی تنظیم کا مطالعہ کر سکتے ہیں جس میں اس وقت تک ریاست کا وجود نہیں تھا۔ ریاست کے لئے ایک ایسے مخصوص اقتدارعامہ کی ضرورت ہے جو بحیثیت مجموعی ان لوگوں سے علحدہ ہو چکا ہو جو اس کے تحت رہتے ہیں۔ اور ماورر نے سچی فطری سمجھداری کا ثبوت دیا جب اس نے یہ کہا کہ جرمن مارک کا دستور دراصل ایک خالص سماجی چیز ہے جو ریاست سے بنیادی طور پر مختلف ہے اگرچہ آگے چل کر وہ بڑی حد تک ریاست کی بنیاد کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ ماورر نے اپنی تمام تصنیفات میں اس بات کی چھان بین کی ہے کہ مارکوں، گاؤں، بستیوں اور شہروں کے ابتدائی دستوروں سے باہر اور ان کے ساتھ ساتھ اقتدار عامہ کی تدریجی نشو و نما کیوں کر ہوئی۔ شمالی امریکہ کے انڈینوں کو دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک ایسا قبیلہ جو ابتدا میں متحد تھا کیوں کر ایک وسیع براعظم میں پھیل گیا، کیوں کر ایک ایک قبیلہ تقسیم ہوتے ہوتے، کئی قبیلوں کا گروہ، اور ایک پوری جاتی بن گیا۔ کس طرح زبانیں تبدیل ہوتی رہیں حتی کہ نہ صرف آپس میں ایک دوسرے کو سمجھنا ناممکن ہو گیا بلکہ ابتدائی وحدت کے تقریباً سارے

آثار مٹ گئے اور کس طرح قبیلے کے اندر ایک ایک گن ٹوٹ کر متعدد گنوں میں بٹ گیا۔ کس طرح پرانے مادری گن آج بھی فریٹری کی شکل میں قائم ہیں ، اور ان قدیم‌ترین گنوں کے نام آج بھی دور دور تک بکھرے ہوئے قبیلوں میں ملتے ہیں ، جن کو ایک دوسرے سے الگ ہوئے عرصہ گذر گیا۔ آج بھی زیادہ‌تر انڈین قبیلوں میں گنوں کے لئے بھیڑئے اور بھالو کا نام استعمال ہوتا ہے۔ اوپر جس دستور کا ذکر کیا گیا وہ عام طور پر ان سبھی قبیلوں میں پایا جاتا ہے سوائے اس کے کہ بہت سے قبیلے ابھی تک قرابت‌دار قبیلوں کے وفاق کی منزل تک نہیں پہونچ سکے ہیں۔

لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب ایک مرتبہ گن ایک سماجی اکائی بن گیا تو پھر اس کے بعد گن ، برادری (فریٹری) اور قبیلے کا پورا نظام ناگزیر طور پر — اس لئے کہ قدرتی طور پر — اس اکائی سے نشوونما پانے لگا۔ یہ تینوں مختلف درجے کے یک‌جدی (سگوتر) رشتہ‌داروں کے گروہ ہیں۔ ہر گروہ بذات خود مکمل ہے اور خود اپنے معاملات کا انتظام کرتا ہے۔ لیکن ہر گروہ سے باقی دونوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ جن معاملات کے سنبھالنے کی ذمہ‌داری ان پر ہوتی ہے وہ بربریت کے ابتدائی دور کے تمام پبلک معاملات ہیں۔ چنانچہ اگر کہیں ہم یہ دیکھیں کہ گن سماج کی اکائی ہے تو وہاں ہمیں امید کرنی چاہئے کہ قبیلے کی مذکورۂ بالا تنظیم سے ملتی جلتی تنظیم بھی ہوگی۔ اور جہاں کہیں کافی مواد ملے گا جیسا کہ مثال کے طور پر یونانیوں اور رومیوں میں ملا ہے ، وہاں ہمیں نہ صرف یہ کہ اس تنظیم کا پتہ چلے گا بلکہ ہمارے اندر یہ اعتماد پیدا ہوگا کہ جہاں کہیں پورا مواد نہ ملے وہاں امریکی سماجی دستور کے موازنے سے ہم نہایت مشکل شبہات اور گتھیوں کو حل کرنے میں مدد لے سکتے ہیں۔

اور یہ گن والا دستور اپنی طفلانہ سادگی میں ایک عجیب و غریب چیز ہے ! ہر کام نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام پاتا ہے جس کے لئے نہ پولیس کے کسی سپاہی کی ضرورت ہے ، نہ فوج کی۔ نہ وہاں بادشاہ اور امرا ہیں ، نہ کوئی گورنر اور منصف وغیرہ۔ نہ وہاں مقدمے چلتے ہیں اور نہ کسی کو قید کی سزا دی جاتی ہے۔ سارے اختلاف اور

جھگڑے وہ سب لوگ آپس میں مل کر لے لیتے ہیں جن کو اس سے تعلق ہوتا ہے ، مثلاً گن یا قبیلہ یا متعدد گن آپس میں مل کر طے کرتے ہیں ۔ خون کا بدلہ خون سے بالکل انتہائی صورتوں میں اور وہ بھی محض شاذ و نادر ہی لیا جاتا ہے ۔ ہمارے یہاں کی سزائے موت بھی تو اسی کی ایک مہذب صورت ہے جس میں تہذیب کی تمام خوبیاں اور خامیاں دونوں جمع ہو گئی ہیں ۔ اگرچہ آج کے مقابلے میں مشترک معاملات زیادہ ہیں — مثلاً خانہ‌داری، متعدد خاندانوں کے لوگ مل کر اور کمیونسٹی ڈھنگ سے چلاتے ہیں ، زمین قبیلے کی ملکیت ہوتی ہے اور صرف چھوٹے چھوٹے باغیچے عارضی طور پر الگ الگ گھرانوں کو دے دئے جاتے ہیں — پھر بھی ہماری طرح نظم‌و نسق کی ایک وسیع اور پیچیدہ مشینری کا وہاں کوئی وجود نہیں ۔ جن لوگوں کو کسی معاملے سے تعلق ہوتا ہے وہ اس کو طے کر لیتے ہیں اور زیادہ‌تر تو حال یہ ہے کہ صدیوں پرانے رسم و رواج نے پہلے ہی سب کچھ طے کر کے رکھ دیا ہے ۔ وہاں کوئی مفلس اور محتاج نہیں ہو سکتا کیونکہ کمیونسٹی گھرانے اور گن ضعیفوں، مریضوں اور جنگ کے اپاہجوں کے سلسلے میں اپنی ذمہ‌داری کا پورا احساس رکھتے ہیں ۔ سب آزاد اور برابر ہیں، اور اس میں عورتیں بھی شامل ہیں ۔ اس وقت تک غلامی کا کہیں کوئی گذر نہیں ۔ غیرقبیلے والوں کو اس وقت تک غلام بنانے کا کوئی سوال نہیں تھا ۔ جب ایروکواس لوگوں نے ۱۶۵۱ ء کے آس پاس ایریز لوگوں اور ”غیرجانب‌دار قوم“ (۱۳۱) کو فتح کیا تو ان کو انہوں نے برابری کی بنیاد پر اپنے وفاق میں شامل ہونے کی دعوت دی ۔ جب مفتوح لوگوں نے اس سے انکار کر دیا تبھی ان کو اس علاقے سے نکلنے پر مجبور کیا گیا ۔ اور ایسا سماج کس طرح کے مردوں اور عورتوں کو جنم دیتا ہے ، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ گورے جو ایسے انڈینوں سے مل سکے تھے جو ان کے اثر سے خراب نہیں ہو پائے تھے ، وہ سب ان کی خودداری اور وقار نفس ، ان کی صاف گوئی ، ان کے کردار کی مضبوطی اور ان کی دلیری کے مداح تھے ۔

ابھی حال ہی میں ہم نے افریقہ میں اس دلیری کی مثالیں دیکھیں ۔ چند سال پہلے زولو کافروں نے اور ان ہی کی طرح دو ایک مہینے پہلے

نوبین لوگوں نے — ان دونوں قبیلوں میں گن کی تنظیم ابھی زندہ ہے— وہ کچھ کر دکھایا جو کوئی بھی یورپین فوج نہیں کر سکتی تھی (۱۳۲) - ان کے پاس بندوقیں نہیں تھیں - وہ محض نیزے اور برچھے لے کر گولیوں کی بوچھار میں آگے بڑھتے رہے اور انگریزی سپاہ کی سنگینوں کی نوک تک بڑھتے چلے آئے اور اس قدر قریب آ کر انگریزوں کی پیدل سپاہ میں جو اپنی مضبوط صف‌بندی کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے ، انہوں نے بھگدڑ مچا دی اور کئی بار اسے مار بھگایا - یہ سب اس کے باوجود ہوا کہ دونوں کے ہتھیاروں میں بےانتہا فرق تھا اور زولو کافروں میں فوجی خدمت اور فوجی قواعد کا بالکل رواج نہیں تھا - وہ بڑے پھرتیلے ، مستعد اور جیوٹ ہوتے ہیں - انگریزوں کو یہ شکایت تھی کہ ایک کافر چوبیس گھنٹے میں ایک گھوڑے سے زیادہ چلتا ہے اور زیادہ تیزی سے چلتا ہے - ایک انگریز مصور کا کہنا ہے کہ ان کے جسم کے چھوٹے سے چھوٹے عضلات بھی کوڑا بنانے کی بٹی ہوئی رسی کی طرح سخت اور ابھرے ہوئے ہیں -

یہ تھا انسان اور انسانی سماج طبقاتی تقسیم سے پہلے - اور اگر ہم ان کی حالت کا موازنہ آج کل کے متمدن لوگوں کی بڑی اکثریت سے کریں تو موجودہ زمانے کے مزدوروں اور چھوٹے کسانوں میں اور قدیم زمانے کے گن کے آزاد لوگوں میں ہمیں بڑا فرق دکھائی دے‌گا -

لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے - ہمیں بھولنا نہیں چاہئے کہ وہ نظام مر رہا تھا - قبیلے کی منزل سے آگے اس کی کوئی نشوونما نہیں ہوئی - اور جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں‌گے قبیلوں کے وفاق نے ہی اس کے زوال کی گھنٹی بجا دی تھی - ایروکواس لوگوں نے دوسروں کو مطیع کرنے کی جو کوششیں کیں ان سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے - جو کچھ قبیلے سے باہر تھا وہ قانون کے احاطے سے باہر تھا - جہاں علانیہ امن کا معاہدہ نہیں ہوا وہاں قبیلے قبیلے میں جنگ تھی اور یہ جنگ ایسی بے رحمی سے لڑی جاتی تھی جو انسان کی خصوصیت ہے اور جس میں وہ تمام دوسرے حیوانوں سے بڑھا ہوا ہے - اس بے رحمی میں کمی آگے چل کر محض ذاتی مفاد کی خاطر ہوئی - جیسا کہ ہم نے امریکہ میں دیکھا گن کا دستور جب اپنے عروج پر

تھا تب بھی وہ پیداوار کی ایک نہایت غیرترقی‌یافتہ حالت پر مبنی تھا جس میں بہت تھوڑے سے لوگ ایک نہایت وسیع علاقے میں بکھرے ہوئے تھے۔ اور اس لئے انسان پر خارجی فطرت کا مکمل غلبہ تھا۔ فطرت انسان کے لئے اجنبی، مخالف اور ناقابل فہم چیز تھی۔ اس کے غلبے کی جھلک انسان کے طفلانہ مذہبی تصورات میں ملتی ہے۔ انسان کی دنیا اس کا قبیلہ تھا۔ وہ خود اس کی ذات کے لئے بھی اور اس کی نظروں میں باہروالوں کے لئے بھی آخری سرحد تھی۔ قبیلہ، گن اور ان کے ادارے مقدس اور احترام کے قابل تھے گویا وہ کسی برتر قوت کے مالک تھے جسے فطرت نے کھڑا کر دیا تھا۔ اور فرد اپنے احساسات، خیالات اور اعمال میں بالکل اس کے تابع تھا۔ اس عہد کے لوگ ہمیں نہایت شاندار معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں آپس میں کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا۔ مارکس کے لفظوں میں وہ ابھی تک گویا اولین برادری کی ناف کی ڈوری سے بندھے ہوئے تھے۔ ان اولین برادریوں کی طاقت کو توڑنا ضروری تھا، اور وہ توڑی بھی گئی۔ مگر اس کو ایسے اثرات نے توڑا جو ہمیں شروع ہی سے ذلیل اور پست معلوم ہوتے ہیں، جنہوں نے قدیم گن سماج کی سادگی اور اخلاقی عظمت کو برباد کر دیا۔ ادنی‌ترین مفاد کا خیال، ذلیل قسم کا لالچ، بےرحمانہ نفس پرستی اور عیاشی، کمینگی اور ہوس، مشترک ملکیت کی خود غرضانہ لوٹ — انہیں کے سائے میں نیا متمدن سماج، طبقاتی سماج، سامنے آتا ہے۔ چوری، عصمت‌دری، دھوکہ اور فریب — یہی سب پرانے، بےطبقہ گن سماج کی جڑیں کھوکھلی کرتے اور اس کو تہس‌نہس کرتے ہیں۔ اور نئے سماج کی ڈھائی ہزار برس کی تاریخ کا کارنامہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانوں کی بہت بڑی اکثریت پر ظلم ڈھا کر اور اس کا خون پی کر ایک چھوٹی سی اقلیت نے اپنے لئے عیش و عشرت کے محل تعمیر کئے۔ اور آج حالت پہلے سے کہیں زیادہ بدتر ہے۔

۴
یونانی گن

یونانی اور پیلاسگی لوگوں کے درمیان اور ان کے علاوہ کچھ اور لوگوں کے درمیان بھی ، جو انھی قبیلوں سے نکلے تھے ، ماقبل تاریخی زمانے ھی سے وھی تسلسل اور ترتیب ملتی ھے جسے ھم امریکہ کے قدیم باشندوں میں دیکھ چکے ھیں — یعنی گن ، فریٹری (برادری) ، قبیلہ اور پھر قبیلوں کا وفاق ، انھی کڑیوں میں ان کا سماج منظم تھا ۔ ھو سکتا ھے کہ کہیں کہیں، جیسے مثال کے طور پر ڈورین لوگوں میں ، فریٹری نہ ھو ۔ یہ بھی ممکن ھے کہ قبیلوں کا وفاق ھر جگہ پوری طرح نمودار نہ ھوا ھو ۔ لیکن گن ھر جگہ سماج کی بنیادی اکائی تھی ۔ یونانی جس وقت تاریخ کے افق پر نمودار ھوئے وہ تمدن کی دھلیز پر پہونچ چکے تھے ۔ یونانیوں اور ان امریکی قبیلوں کے درمیان جن کا ذکر اوپر ھوا ھے ، نشوونما کے دو بڑے دور پڑتے ھیں کیونکہ سورسائی عہد کے یونانی ایروکواس لوگوں سے دو دور آگے تھے ۔ یہی وجہ ھے کہ یونانی گن پر وہ پرانے دقیانوسی اثرات باقی نہیں رھے تھے جو ایروکواس لوگوں کے گن پر دکھائی دیتے تھے ۔ گروہوار شادی کے اثرات بہت دھندلے ھو چکے تھے ۔ مادری حق کی جگہ پدری حق قائم ھو چکا تھا ۔ اور اس طرح ذاتی دولت کے فروغ نے گن کے دستور میں پہلی بار رخنہ ڈال دیا تھا ۔ پہلے کے بعد قدرتی طور پر دوسرا رخنہ بھی پڑا :

پدری حق قائم ہو جانے کے بعد چونکہ ایک دولتمند لڑکی کا ترکہ اس کے شوہر کو ملے گا یعنی لڑکی کے گن کے باہر چلا جائے گا اور اس طرح پورے گن قانون کی بنیاد ہی ٹوٹ جائے گی، اس لئے ایسی صورتوں میں لڑکیوں کو نہ صرف اس بات کی اجازت دی گئی بلکہ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ گن کے اندر ہی شادی کریں تا کہ گھر کی دولت گھر میں رہے۔

گروٹ کی ''تاریخ یونان،، کے مطابق ایتھنز کے گن کو ایک شیرازے میں باندھنے والے عناصر یہ تھے :

(۱) مشترک مذہبی رسمیں اور ایک خاص دیوتا کے اعزاز میں پجاریوں کے مخصوص حقوق اور اختیارات۔ یہ دیوتا گن کا قدیم مورث اعلیٰ سمجھا جاتا تھا اور اس حیثیت سے اس کا ایک مخصوص لقب تھا۔

(۲) مشترک قبرستان (موازنہ کے لئے دیکھئے : دیموستھینیز کی کتاب ''یوبولائڈیز،،)۔

(۳) وراثت کے باہمی حقوق۔

(۴) کوئی اگر طاقت سے کام لے تو اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد، حفاظت اور حمایت کرنا ہر ایک کا فرض تھا۔

(۵) بعض صورتوں میں خاص کر کوئی لڑکی جب یتیم ہو جائے یا وراثت پانے والی ہو تو اس کی شادی گن کے اندر کرانا سبھوں کا باہمی حق اور فرض تھا۔

(۶) ملکیت، کم سے کم کچھ صورتوں میں، مشترکہ ہوتی تھی جس کا اپنا آرکون (مختار کل) اور اپنا خزانچی ہوتا تھا۔

فریٹری کئی گنوں کو ملا کر بنتی تھی۔ اس کے اندر مختلف حصوں میں اتنا گہرا تعلق نہیں تھا، پھر بھی وہاں ہمیں اسی طرح کے باہمی حقوق اور فرائض دکھائی دیتے ہیں۔ بعض مذہبی رسوم کو وہ ایک ساتھ ادا کرتے تھے۔ فریٹری کے کسی آدمی کے قتل ہوجانے پر قانونی چارہ جوئی کا حق سب کو تھا۔ اس کے علاوہ ایک قبیلے کی تمام فریٹریاں مقررہ عرصے پر بعض مشترک مذہبی رسوم کو ایک سرپنچ کی صدارت میں انجام دیتی تھیں۔ اس سرپنچ کو فائلوبیسیلیس (قبیلے کا بزرگوار) کہتے تھے جو اسرا (یعنی یوپیٹریڈیز) میں سے چنا جاتا تھا۔

یہ تو ہوا گروٹ کا بیان ۔ اس پر مارکس کہتا ہے کہ ” یونانی گن میں کوئی بھی وحشی (مثال کے طور پر ایروکواس) بلا تامل پہچان لیا جائے گا ،، * ۔ جب ہم آگے کچھ اور باتوں کا پتہ لگائیں گے تو اس کو پہچاننا اور بھی یقینی ہو جائے گا ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یونانی گن کی کچھ اور بھی خصوصیتیں ہوتی ہیں ۔ وہ یہ ہیں :

(۷) نسل پدری حق کے مطابق چلتی ہے ۔

(۸) گن کے اندر وارثہ عورتوں کو چھوڑ کر باقی لوگوں کی آپس میں شادی کی سخت ممانعت تھی ۔ یہ مستثنی صورت اور اس کے بارے میں یہ باقاعدہ ہدایت یہ بتا رہی ہے کہ پرانا قاعدہ قانون اس وقت تک جاری تھا ۔ اس کا ایک اور ثبوت بھی ہے : یہ ایک عام قاعدہ بن گیا تھا کہ جب کسی عورت کی شادی ہوتی تو وہ اپنے گن کے مذہبی رسوم کو ترک کر دیتی اور اپنے شوہر کے گن کے مذہبی رسوم اختیار کر لیتی ۔ اسے شوہر کی فریٹری میں شامل کر لیا جاتا تھا ۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ عام طور پر اپنے گن کے باہر شادی کرنے کا قاعدہ تھا ۔ دیکیارکس کی ایک مشہور عبارت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ۔ بیکر نے ” چاریکلیز ،، میں بھی یہی بات مانی ہے کہ کسی مرد یا عورت کو اپنے گن کے اندر شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی ۔

(۹) گن میں باہر کے لوگوں کو اپنا لینے کا حق تھا ۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ اس شخص کو کسی خاندان کے اندر اپنا لیا جاتا تھا ۔ لیکن اس کے لئے ایک باقاعدہ جلسۂ عام میں رسم ادا کرنی ضروری تھی ۔ لیکن اس اختیار سے بہت کم کام لیا جاتا تھا ۔

(۱۰) سرداروں کو منتخب اور معزول کرنے کا اختیار ۔ ہم جانتے ہیں کہ گن کا اپنا ایک آرکون (مختار کل) ہوتا تھا ۔ لیکن یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ یہ عہدہ بعض خاندانوں میں موروثی تھا ۔ زیادہ ترین قیاس یہ ہے کہ بربریت کے آخر تک اس عہدے کو سختی کے ساتھ

---

* ملاحظہ ہو ” مارکس اور اینگلس کی دستاویزات ،، جلد ۹ ، صفحہ ۱۳۴ ۔ (ایڈیٹر)

موروثی نہیں بنایا گیا اور ان حالات میں جبکہ ہر گن کے اندر غریبوں اور امیروں کو بالکل مساوی حق حاصل تھا ، ایسا کیا بھی نہیں جا سکتا تھا ۔

گروٹ ھی نہیں بلکہ نیبور ، موسن اور قدیم کلاسیکی عہد کے سب پہلے کے مورخ بھی گن کے مسئلے کو حل کرنے میں ناکام رہے۔ یہ صحیح ھے کہ انہوں نے اس کی بعض نمایاں خصوصیتوں کا پتہ لگا لیا تھا مگر گن کو وہ ھمیشہ خاندانوں کا ایک گروہ سمجھا کئے ، اور انہوں نے ایسی صورتحال پیدا کر دی جس میں ان کے لئے گن کی نوعیت اور اس کی ابتدا کو سمجھنا نا ممکن ھو گیا ۔ گن کے دستور کے تحت خاندان کبھی بھی تنظیم کی اکائی نہیں رھا ۔ اور یہ ممکن بھی نہیں تھا کیونکہ شوھر اور بیوی لازمی طور پر دو مختلف گنوں کے ھوتے تھے ۔ گن بحیثیت مجموعی فریٹری کے اندر تھے ۔ اور فریٹری قبیلے کے اندر تھی ۔ مگر جہاں تک خاندان کا تعلق ھے وہ آدھا شوھر کے گن میں اور آدھا بیوی کے گن میں بٹا ھوا تھا ۔ ریاست بھی قانون عامہ میں خاندان کو تسلیم نہیں کرتی اور آج تک اس کا وجود صرف دیوانی کے قانون میں تسلیم کیا گیا ھے ۔ تاھم آج تک کی قلمبند تاریخ میں ایک نہایت مہمل بات فرض کر لی گئی اور اٹھارھویں صدی میں تو اس کے خلاف کچھ بولنا بھی جرم سمجھا جانے لگا تھا ۔ اور وہ خیال یہ ھے کہ یک‌زوجگی کا انفرادی خاندان ھی وہ محور ھے جس کے گرد سماج اور ریاست نے رفتہ رفتہ تشکیل پائی ھے ۔ حالانکہ یہ انفرادی خاندان تمدن کے عہد سے شاید ھی کچھ پرانا ھو ۔

مارکس نے لکھا ھے کہ ”مسٹر گروٹ یہ بات بھی دھیان میں رکھیں‌گے کہ اگرچہ یونانی لوگ اپنے گنوں کا ماخذ دیومالا میں بتاتے تھے لیکن ان کے گن ان کی دیومالا اور اس کے دیوی دیوتاؤں اور نیم دیوتاؤں سے زیادہ پرانے ھیں ۔ اور آخرالذکر تو سب دراصل خود ان ھی لوگوں کی تخلیق ھیں ۔ “ *

---

* ملاحظہ ھو ”مارکس اور اینگلس کی دستاویزات“ جلد ۹، صفحہ ۱۳۶ ۔ (ایڈیٹر)

مارگن نے گروٹ کی رائے کو ترجیح دی ہے اور ایک ممتاز اور غیرمشتبہ گواہ کی حیثیت سے اس کا حوالہ دیا ہے ۔ گروٹ آگے چل کر بتاتا ہے کہ ایتھنز کے ہر گن کا نام اس کے کسی مشہور مورث اعلیٰ سے ماخوذ ہوتا تھا ۔ سولون کے زمانے سے پہلے تو عام طور پر ، اور اس کے بعد اس صورت میں جبکہ کوئی شخص بغیر وصیت کئے ہوئے مر جاتا تھا ، تب اس کا ترکہ اس کے گن والوں (gennêtes) کو ملتا تھا ۔ اگر کوئی شخص قتل ہو جاتا تو پہلے اس کے رشتہ‌داروں ، پھر اس کے گن والوں اور آخر میں اس کی فریٹری کے لوگوں کا حق اور فرض تھا کہ مجرم پر عدالتوں میں مقدمہ چلائیں ۔

”ایتھنز کے قدیم‌ترین قوانین کے بارے میں ہم جو کچھ سنتے ہیں وہ گنوں اور فریٹریوں کی تقسیم پر مبنی ہے ۔“

گن کا ایک مشترک مورث اعلیٰ کی نسل سے ہونا ، ایک ایسی پہیلی اور گتھی ہے جس‌سے (بقول مارکس) ”تعلیم‌یافتہ کم‌نظروں“ * کا دماغ چکرا گیا ہے ۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مشترک مورث کی بات محض افسانوی ہے — یہ کہنے کو تو وہ کہہ گئے ، لیکن یہ نہیں بتا سکے کہ علحدہ اور مختلف خاندانوں سے جن کو شروع میں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں تھا ، گن کیسے بن گئے ۔ لیکن یہ تو ان کو کسی نہ کسی طرح ثابت کرنا ہی تھا ۔ ورنہ پھر وہ گن کی توجیہ کیا پیش کرتے ! لہذا وہ چند الفاظ کے دائرے میں گھومتے رہتے ہیں اور اس فقرے سے آگے نہیں جاتے کہ نسب نامہ تو یقیناً فرضی ہے لیکن گن ایک حقیقی چیز ہے ۔ اور آخر میں گروٹ کہتا ہے (قوسین کے‌اندر کے فقرے مارکس کے ہیں) :

”سلسلۂ نسب کی بات ہمیں بہت کم سنائی دیتی ہے کیونکہ عوام کے سامنے اسے محض چند مخصوص ممتاز اور قابل احترام صورتوں کے سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے ۔ لیکن زیادہ نامور گنوں

* ملاحظہ ہو ”مارکس اور اینگلس کی دستاویزات“ ، جلد ۹ ، صفحہ ۱۳۷ ۔ (ایڈیٹر)

کی طرح بالکل معمولی گنوں کی بھی اپنی مشترک مذہبی رسمیں تھیں (کچھ عجیب سی بات ہے ، مسٹر گروٹ !) اور مشترک مافوق‌الانسانی مورث اعلی اور سلسلۂ نسب تھا (بالکل معمولی گنوں کے درمیان کتنی عجیب و غریب بات ہے یہ ، مسٹر گروٹ !) اسکیم اور آئڈیل بنیاد (جناب‌والا ، ideal نہیں ، مگر carnal ، جرمن زبان میں fleischlich — حیوانی بنیاد) سبھوں میں ایک ہی تھی ۔ ،، *

اس پر مارگن کے جواب کا خلاصہ مارکس نے اپنے لفظوں میں یوں کیا ہے : ،، یک‌جدی قرابت‌داری (سگوتر) کا نظام گن کی ابتدائی شکل کے لئے موزوں تھا ۔ دوسری قوموں کی طرح یونانیوں میں بھی اس کا وجود تھا ۔ اس نظام کی وجہ سے علم محفوظ رہا کہ گن کے سب لوگوں میں آپس میں کیا رشتہ ہے ۔ یہ ان کے لئے بڑی اہم بات تھی جس کو وہ اپنے ابتدائی بچپن کے زمانے سے ہی سیکھ لیتے تھے ۔ جیسے ہی یک‌زوجگی کا خاندان قائم ہوا یہ بات ختم ہو گئی ۔ گن کے نام ہی ایک نسب‌نامہ تیار کردیا تھا جس کے مقابلے میں یک‌زوجگی کا خاندان بہت معمولی چیز معلوم ہوتی تھی ۔ یہ نام جن لوگوں کے ساتھ لگا ہوتا تھا ، ان کے مشترک سلسلۂ نسب کی گواہی دیتا تھا ۔ لیکن گن کا نسب نامہ اتنی دور تک جاتا تھا کہ اس کے ممبروں کے لئے اب یہ ثابت کرنا ممکن نہیں تھا کہ ان میں آپس میں خون کا کیا رشتہ ہے ۔ صرف وہی تھوڑے سے لوگ اپنا رشتہ ثابت کرسکتے تھے جن کے مشترک مورث نسبتاً حال کے زمانے کے تھے ۔ نام خود مشترک سلسلۂ‌نسب کا ثبوت تھا اور ان لوگوں کو چھوڑ کر جو باہر سے گن میں اپنا لئے گئے تھے ، اور باقی لوگوں کے لئے وہ ایک قطعی اور پکا ثبوت تھا ۔ گروٹ * * اور نیبور کے کہنے

---

* ملاحظہ ہو ،، مارکس اور اینگلس کی دستاویزات ،، جلد ۹ ، صفحہ ۱۳۸ ۔ (ایڈیٹر)

* * مارکس کی تحریر میں گروٹ کے بجائے دوسری صدی کے یونانی عالم پولوکس کا نام ہے ، جس کے حوالے اکثر گروٹ کے یہاں ملتے ہیں ۔ (ایڈیٹر)

کا مطلب دراصل یہ ہے کہ گن کے لوگوں میں آپس میں یک‌جدی قرابت نہیں تھی۔ اس انکار کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گن محض ایک فرضی چیز ، محض واہمی کی پیداوار ہوکر رہ جائے گا۔ اس طرح کا خیال محض عینیت پرست سائنس‌دانوں ، یعنی حجرہ‌نشین کتابی کیڑوں کو ہی زیب دیتا ہے۔ چونکہ نسلوں کی سلسلہ‌بندی ، خاص کر یک‌زوجگی کے آغاز کے بعد سے ، بہت دور کی چیز ہو گئی ہے اور ماضی کی حقیقت من گھڑت قصے کہانیوں کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے ، اس‌لئے ان کم ظرفوں نے یہ نتیجہ نکالا اور اب بھی نکالتے ہیں کہ اس خیالی اور فرضی سلسلۂ نسب نے اصل میں گنوں کی تخلیق کی ہے۔ ،، *

امریکن انڈینوں کی طرح یہاں بھی فریٹری ایک مادری گن تھی جو کئی دختر گنوں میں بٹ گئی تھی اور ساتھ ہی انہیں متحد بھی کرتی تھی اور اکثر ان سبھوں کا سلسلۂ نسب ایک ہی مشترک مورث اعلی سے ملاتی تھی۔ چنانچہ جیسا کہ گروٹ نے لکھا ہے

،، ہیکتا کی فریٹری کے سب ہم‌عصر ممبروں کا مشترک مورث اعلی سولہ پشت پہلے کا ایک دیوتا تھا۔ ،،

اس‌لئے اس فریٹری کے سب گن آپس میں برادر گن تھے۔ ہومر نے اس وقت بھی فریٹری کو ایک فوجی اکائی بتایا ہے۔ اس کا تذکرہ ہومر کی اس مشہور عبارت میں ہے جہاں نسٹر اگامنون کو مشورہ دیتا ہے کہ ،، قبیلوں اور فریٹریوں کے حساب سے فوج کی صف‌بندی کرو تاکہ فریٹری فریٹری کی مدد کرے اور قبیلہ قبیلے کی ،، * *۔ فریٹری کا کوئی شخص اگر قتل کردیا جائے تو قاتل کو سزا دلوانا فریٹری کا حق بھی تھا اور اس کا فرض بھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ پہلے زمانے میں فریٹری کا ایک کام خونی انتقام لینا بھی تھا۔ اس کے علاوہ اس کی مشترک عبادت‌گاہیں اور مذہبی تہوار ہوتے تھے۔ آریوں کا پرانا روایتی دھرم

---

* ملاحظہ ہو ،، مارکس اور اینگلس کی دستاویزات ،، جلد ۹ ، صفحات ۱۳۹ — ۱۳۸ ۔ (ایڈیٹر)

* * ہومر ،، ایلیڈ ،، گیت دوم ۔ (ایڈیٹر)

فطرت کی پوجا کرتا تھا اور اس سے یونانیوں کی ساری دیومالا کا ارتقا دراصل گنوں اور فریٹریوں کی بدولت اور انہیں کے اندر ہوا۔ فریٹری کا ایک سردار بھی ہوتا تھا (جس کو فریٹریارکس کہتے تھے)۔ اور دی کولانژے کی رائے ہے کہ ہر فریٹری کی سبھائیں ہوتی تھیں جن کے فیصلوں پر عمل کرنا لازمی ہوتا تھا، ایک عدالت اور نظم و نسق کا محکمہ ہوتا تھا۔ بعد کے زمانے میں ریاست نے بھی اگرچہ گن کو نظر انداز کر دیا تھا مگر کچھ سرکاری کام فریٹری کے لئے چھوڑ دئے تھے۔

متعدد قرابت دار فریٹریوں سے مل کر قبیلہ بنتا تھا۔ اٹیکا میں چار قبیلے تھے جن میں ہر ایک میں تین فریٹریاں تھیں اور ہر فریٹری میں تیس گن تھے۔ قبیلوں، فریٹریوں اور گنوں کی اس باقاعدہ اور مفصل تقسیم کو دیکھ کر یہی خیال ہوتا ہے کہ اس نظام کی تشکیل تو خود بخود ہوئی تھی مگر بعد میں اس میں سوچ سمجھ کر اور باقاعدہ دخل اندازی کی گئی۔ یونانی تاریخ میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ یہ بات کب، کیسے اور کیوں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود یونانیوں نے جس زمانے تک کی یاد کو محفوظ رکھا ہے، وہ سورسائی عہد سے پیچھے نہیں جاتا۔

نسبتاً ایک چھوٹے سے علاقے میں یونانیوں کی گنجان آبادی بسی ہوئی تھی۔ بولیوں کا اختلاف امریکہ کے وسیع جنگلوں میں جتنا بڑھ گیا تھا، اتنا یونانیوں میں نہیں ہوا۔ تاہم یہاں بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ محض ایک ہی بولی بولنےوالے قبیلے ایک بڑی شیرازہ بندی میں متحد ہوئے۔ اور چھوٹے سے اٹیکا کی بھی اپنی ایک خاص بولی تھی جو آگے چل کر یونانی نثر کےلئے عام زبان بن کر چھا گئی۔

ہومر کی رزمیہ نظموں میں ہم پاتے ہیں کہ یونانی قبیلے مل کر چھوٹی چھوٹی جاتیاں بن گئیں۔ لیکن ان جاتیوں کے دائرے کے اندر گنوں، فریٹریوں اور قبیلوں نے اپنی آزادی برقرار رکھی۔ وہ دیواروں سے گھرے ہوئے شہروں میں رہنے لگے تھے۔ مویشیوں کے ریوڑ بڑھے، کھیت بنا کر کاشت کی جانے لگی اور دستکاری کی ابتدا ہوئی تو ساتھ ساتھ آبادی بھی بڑھی اور پھر دولت کا فرق بھی پیدا ہوا جس کی وجہ سے جمہوریت کے اس قدیم نظام میں جس کی فطری طور پر نشو و نما ہوئی

تھی امرا کا طبقہ پیدا ہو گیا۔ یہ چھوٹی چھوٹی جاتیاں سب سے اچھی زمینوں پر قبضہ کرنے کے لئے ، اور لوٹ کے مال کی خاطر بھی ، برابر ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتی تھیں۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج عام ہو چکا تھا۔

ان قبیلوں اور چھوٹی جاتیوں کا دستور یہ تھا :

(۱) مستقل اقتدار ایک کاؤنسل (bulê) کے ہاتھ میں تھا جس میں شروع میں غالباً گنوں کے سردار ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب آگے چل کر ان کی تعداد بہت بڑھ گئی تو یہ کاؤنسل گنے چنے سرداروں میں سے بننے لگی۔ اس سے امرا کی ایک جماعت کو بڑھنے اور تقویت پانے کا موقع ملا۔ دایونی‌سیئس صاف لکھتا ہے کہ سورمائی عہد کی کاؤنسل امرا (kratistoi) پر مشتمل تھی۔ اہم سوالوں پر کاؤنسل کا فیصلہ آخری سمجھا جاتا تھا۔ ایسکیلس کے یہاں تھیبیز کی کاؤنسل نے ایک فیصلہ کیا جس پر عمل کرنا ضروری تھا۔ وہ فیصلہ یہ تھا کہ ایتیوکلیز کی تجہیز و تکفین شان‌وشوکت سے کی‌جائے اور پولینیئس کی لاش کتوں کے آگے ڈال دی‌جائے *۔ آگے چل کر جب ریاست وجود میں آئی تو اسی کاؤنسل کو سینیٹ بنا دیا گیا۔

(۲) عوامی اسمبلی (agora)۔ ایروکواس لوگوں میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مرد عورت سب کاؤنسل کے اجلاس کے باہر چاروں طرف دائرہ بنا کر کھڑے ہوجاتے تھے اور بحث میں باقاعدہ حصہ لیتے اور فیصلوں پر اثرانداز ہوتے تھے۔ ہومر کے زمانے کے یونانیوں میں یہ چیز جس کو ، اگر ہم قدیم جرمن قانونی اصطلاح کا استعمال کریں تو ام‌اشٹانڈ (Umstand) ** کہہ سکتے ہیں، ایک مکمل عوامی اسمبلی بن چکی تھی۔ قدیم زمانے کے جرمنوں میں بھی یہی ہوا تھا۔ اہم مسائل طے کرنے کے لئے کاؤنسل اس اسمبلی کا اجلاس بلاتی تھی جس میں ہر مرد کو بولنے کا حق تھا۔ فیصلہ ہاتھ اٹھا کر (جیسا کہ ایسکیلس نے

---

* ایسکیلس ”تھیبیز کے خلاف سات اشخاص“۔ (ایڈیٹر)

** ام‌اشٹانڈ کے معنی ہیں چاروں طرف کھڑے ہونےوالے لوگ۔ (ایڈیٹر)

”ملتجی“ میں لکھا ہے) یا زبانی اعلان کے ذریعے بھی کیا جاتا تھا۔ اسمبلی ہی تمام اختیارات کی مالک تھی۔ اس کے اوپر کوئی نہیں تھا۔ شومان نے اپنی کتاب ”یونان کے قدیم آثار“ * میں لکھا ہے کہ

”جب کبھی کسی ایسے مسئلے پر بحث ہوتی جس کو عمل میں لانے کےلئے عوام کے تعاون کی ضرورت پڑے تو ہومر کہیں بھولے سے بھی یہ نہیں کہتا کہ لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف مجبور کیا جاتا تھا۔“

اس زمانے میں جبکہ قبیلے کا ہر بالغ شخص ایک جنگجو سپاہی تھا کوئی ایسا ریاستی اقتدار نہیں تھا جو عوام سے الگ ہو اور جس کو اس کے خلاف کھڑا کیا جا سکتا ہو۔ قدیم جمہوریت اپنے شباب پر تھی اور کاؤنسل اور بیسیلیئس کے اختیارات اور ان کی حیثیت کا اندازہ لگانے میں اس بات کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔

(۳) فوجی سالار (basileus)۔ اس سوال پر مارکس نے لکھا ہے کہ ”یورپ کے فلسفی جو خود زیادہ‌تر بادشاہوں کے پیدائشی خادم ہیں، بیسیلیئس کو آج کل کے مفہوم میں بادشاہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یانکی (امریکی) جمہوریت پسند مارگن اس پر اعتراض کرتا ہے۔ بڑے طنز لیکن بڑی سچائی کے ساتھ چاپلوسی گلیڈسٹن اور اس کی کتاب ”شباب عالم“ ** کے بارے میں مارگن کہتا ہے:

”مسٹر گلیڈسٹن نے اپنے پڑھنےوالوں کے سامنے سورمائی عہد کے یونانی سرداروں کو بادشاہ اور شاہزادہ بنا کر پیش کیا اور ان میں شریف‌زادوں کی خصوصیتوں کا بھی اضافہ کردیا ہے۔ لیکن گلیڈسٹن صاحب کو یہ ماننے پر مجبور ہونا پڑا کہ یونانیوں میں اگرچہ جیٹھائی (یعنی بڑے لڑکے کے حقدار ہونے) کا رواج یا قاعدہ

---

* Schoemann G. F., «Griechische Alterthümer», Bd. I, Berlin, 1855, S. 27. (ایڈیٹر)

** Gladstone W. E., «Juventus Mundi. The Gods and Men of the Heroic Age», Chap. II, London, 1869. (ایڈیٹر)

خاصی حد تک تو ضرور ہے لیکن بہت اچھی طرح واضح نہیں ہے ۔ ،، *

سچ تو یہ ہے کہ سسٹر گلیڈسٹن نے خود بھی یہ بات محسوس کی ہوگی کہ بڑے لڑکے کے حقدار ہونے کا یہ اتفاقی نظام اگر خاصی حد تک واضح ہے مگر بہت اچھی طرح واضح نہیں ہے تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہوا ۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جہاں تک عہدوں کے موروثی ہونے کا تعلق ہے ، ایروکواس اور دوسرے انڈین قبیلوں میں سرداروں کے عہدوں کا کیا حال تھا ۔ چونکہ تمام عہدہ‌دار زیادہ‌تر گن کے اندر سے ہی چنے جاتے تھے، اس لئے اس حد تک یہ عہدے گن کے اندر پشتینی یا موروثی ہوتے تھے ۔ رفتہ رفتہ یہ قاعدہ ہو گیا کہ کوئی جگہ خالی ہوتی تو وہ اس شخص کو ملتی تھی جو گن کے حساب سے پرانے عہدہ دار کا سب سے قریبی رشتہ‌دار ہوتا تھا یعنی وہ عہدہ پرانے عہدہ‌دار کے بھائی کو یا بہن کے لڑکے کو ملتا تھا ۔ یہ قاعدہ اسی وقت توڑا جاتا تھا جب ایسا کرنے کی کوئی مناسب وجہ ہوتی ۔ یونان میں چونکہ پدری حق قائم تھا اس لئے بیسیلیئس کا عہدہ زیادہ تر پرانے بیسیلیئس کے لڑکے کو یا اس کے متعدد لڑکوں میں سے کسی ایک کو ملتا تھا ۔ لیکن اس بات سے صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ عام طور پر باپ کی جگہ اس کے کسی لڑکے کو چنتے تھے ۔ اس سے یہ ہرگز نہیں ثابت ہوتا کہ عام انتخاب کے بغیر ہی باپ کا عہدہ بیٹے کو قانوناً مل جاتا تھا ۔ یہاں ہمیں ایروکواس لوگوں میں اور یونانیوں میں گنوں کے اندر شرفا اور امرا کے مخصوص خاندانوں کی پہلی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔ اور یونانیوں میں تو یہ مستقبل کی موروثی سرداری یا بادشاہت کی پہلی جھلک تھی ۔ اس لئے ہمیں یہ مان کر چلنا چاہئے کہ یونانیوں میں بیسیلیئس کو یا تو عوام چنتے تھے یا کم سے کم عوام کی تسلیم کردہ جماعت — کاؤنسل یا اگورا — کی منظوری لی جاتی تھی جیسا کہ رومی ،، بادشاہ ،، (rex) کے سلسلے میں ہوتا تھا ۔

---

* ملاحظہ ہو ،، مارکس اور اینگلس کی دستاویزات ،، جلد ۹ ، صفحہ ۱۴۳ ۔ (ایڈیٹر)

'' ایلیڈ ،، میں سورماؤں کا حکمران اگاممنون ، یونانیوں کے سب سے بڑے بادشاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسی وفاقی فوج کے سب سے بڑے سپہسالار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے جو ایک شہر کا محاصرہ کئے ہوئے ہے ۔ اور جب یونانی لوگ آپس میں جھگڑنے لگتے ہیں ، تب اوڈیسیئس اس مشہور ٹکڑے میں اس کی اسی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے : بہت سے فوجی سالاروں کا ہونا اچھا نہیں ہے ۔ ہمارا ایک ہی سپہسالار ہونا چاہئے ، وغیرہ (بعد میں اس میں وہ حصہ بھی جوڑ دیا گیا جس میں عصائے شاہی کا ذکر ہے) * ۔ '' یہاں اوڈیسیئس اس بات پر لکچر نہیں دے رہا ہے کہ حکومت کس طرح کی ہونی چاہئے بلکہ اس بات کا مطالبہ کر رہا ہے کہ میدان جنگ میں سب سے بڑے سپہسالار کی ہدایتوں پر عمل کرنا چاہئے ۔ ٹرائے کے سامنے یونانی محض ایک فوج کی شکل میں آتے ہیں ۔ لیکن ان کی مجلس (agora) کی کارروائی کافی جمہوری ڈھنگ سے ہوتی ہے : جب اکیلیس تحفوں یعنی جنگ کے مال غنیمت کے بٹوارے کا ذکر کرتا ہے تو وہ کبھی بھی آگاممنون یا کسی دوسرے بیسیلیئس کے ذریعے نہیں بلکہ ہمیشہ ''ایکینوں کے بیٹوں ،، یعنی عوام کے ذریعے اس کو تقسیم کراتا ہے ۔ اگر کسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ '' زیوس کی اولاد ،، ہے یا '' زیوس نے اس کو پالا پوسا ،، ہے تو اس سے کوئی خاص بات ثابت نہیں ہوتی کیونکہ ہر گن کسی نہ کسی دیوتا کی اولاد ہوتا ہے اور قبائلی سردار کا گن کسی '' ممتاز ،، دیوتا کی اولاد ہوتا ہے ۔ چنانچہ اس شخص کا گن زیوس کی نسل سے ہے ۔ یہاں تک کہ سوروں کی دیکھ بھال کرنےوالے ایمویئس اور دوسرے غلام بھی '' دیوتاؤں کی نسل ،، سے (theioi یا dioi) مانے جاتے ہیں ۔ اس کا ذکر ہمیں '' اوڈیسی ،، تک میں ملتا ہے اور اس لئے یہ '' ایلیڈ ،، سے بہت بعد کے زمانے کی چیز ہے ۔ اسی طرح ہم '' اوڈیسی ،، میں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سولیوس نامی نقیب کو اور دیمودوکس نام کے گانےوالے نابینا شاعر کو بھی heros (ہیروس) یعنی سورما کہا گیا ہے ۔ مختصر یہ کہ یونانی مصنفین ہومر کی

---

* ہومر '' ایلیڈ ،، گیت دوم ۔ (ایڈیٹر)

نام نہاد بادشاہت کےلئے جس لفظ basileia کو استعمال کرتے ہیں (کیونکہ فوجی رہنمائی ہی اس کی خصوصیت حاصل ہے) ، وہ بیسیلیا کاؤنسل اور عوامی اسمبلی کے ساتھ مل کر محض ایک فوجی جمہوریت ہوتی ہے ، اور کچھ نہیں ۔ ،، (مارکس) *

فوجی ذمہداریوں کے علاوہ بیسیلیئس کو کچھ پروہتی اور کچھ عدالتی ذمہداریاں بھی ادا کرنی پڑتی تھیں ۔ عدالتی ذمہداریاں بہت صاف نہیں تھیں ۔ لیکن پروہت کا کام وہ اپنے قبیلے کے یا متعدد قبیلوں کے وفاق کے سب سے اعلی نمائندے کی حیثیت سے انجام دیتا تھا ۔ اس کی نظم و نسق کی ذمہداریوں کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ہے ۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسیلیئس اپنے عہدے کی بدولت کاؤنسل کا ممبر ہوتا تھا ۔ علم نحو کے قاعدے کی رو سے ،، بیسیلیئس ،، کا ترجمہ جرمن لفظ «König» بالکل صحیح ہے کیونکہ لفظ «König» (Kuning) ، لفظ Kuni یا Künne سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں گن کا سردار ۔ لیکن قدیم یونانی بیسیلیئس کو لفظ «König» (بادشاہ) کے موجودہ مفہوم سے کوئی نسبت نہیں ۔ تھیوسیڈیڈیز تو قدیم basileia کو صاف صاف patrikê کہتا ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ گن سے نکلا ہے ۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ بیسیلیا کی مخصوص اور اس لئے محدود ذمہداریاں ہوتی تھیں ۔ اور ارسطو کا کہنا ہے کہ سورمائی عہد میں بیسیلیا آزاد شہریوں کی رہنمائی کرتا تھا اور بیسیلیئس فوجی سالار ، قاضی اور بڑا پروہت ہوا کرتا تھا ۔ مختصر یہ کہ بعد کے زمانے میں حکومت کا جو مطلب ہو گیا ، ویسی کوئی طاقت بیسیلیئس کے ہاتھ میں نہیں تھی * * ۔

---

* ملاحظہ ہو ،، مارکس اور اینگلس کی دستاویزات ،، جلد ۹ ، صفحات ۱۴۵ — ۱۴۴ ۔ (ایڈیٹر)

* * یونانی بیسیلیئس کی طرح ایزتک لوگوں کے فوجی سالار کو بھی غلط ڈھنگ سے موجودہ مفہوم کے مطابق بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے ۔

اسپین والوں نے شروع میں چیزوں کو غلط سمجھا اور ان کے متعلق مبالغہآرائی سے کام لیا اور بعد میں تو وہ جان بوجھ کر چیزوں کو

اس طرح سورمائی عہد کے یونانی سماجی دستور میں جہاں ہم ایک طرف یہ پاتے ہیں کہ پرانا گن نظام اب بھی اتنے ہی زور و شور سے جاری ہے ، وہاں ساتھ ہی ہمیں اس کے زوال کی ابتدا بھی دکھائی دینے لگتی ہے ۔ اس عہد میں پدری حق مانا جانے لگا ہے اور باپ کی وراثت اس کے بچوں کو ملنے لگی ہے جس سے خاندان کے اندر دولت جمع کرنے کا رجحان بڑھتا ہے اور گن کے مقابلے میں خاندان کی طاقت بڑھتی ہے ۔ کچھ لوگوں کے پاس کم اور کچھ کے پاس زیادہ دولت ہو جانے کا سماج کے دستور پر اثر پڑتا ہے اور پہلی بار موروثی شرفا اور بادشاہت کی داغ بیل پڑتی ہے ۔ غلامی کی ابتدا ہوتی ہے ، جو پہلے جنگ کے قیدیوں تک محدود تھی لیکن جو قبیلے کے اندر اور خود اپنے گن کے اندر کے لوگوں کو غلام بنانے کا راستہ صاف کرنے لگی تھی ۔ پرانے زمانے میں مختلف قبیلوں میں جنگ ہوا کرتی تھی ، اب اس کی جگہ مویشیوں ، غلاموں اور دولت کو لوٹنے کے لئے زمین اور پانی کے راستے حملے کئے جانے لگے ۔ روزی حاصل کرنے کا یہ ایک باقاعدہ ذریعہ بن گیا ۔ مختصر یہ کہ دھن دولت کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھا جانے لگتا ہے اور دولت کی اس جبری لوٹ کو جائز قرار دینے کے لئے پرانے گن سماج کے اداروں اور رواجوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے ۔ اب صرف ایک چیز کی کمی تھی : کوئی ایسا

توڑ مروڑ کر پیش کرنے لگے ۔ تاریخی نقطۂ نظر سے مارگن نے ہی سب سے پہلے اسپینیوں کی رپورٹوں کا تنقیدی جائزہ لیا ۔ اس نے بتایا کہ میکسیکو کے باشندے بربریت کے درمیانی دور میں تھے ۔ لیکن وہ نیومیکسیکو کے پوئبلو انڈینوں کے مقابلے میں زیادہ اونچی سطح پر تھے ۔ اور ان کا دستور ، جہاں تک مسخ شدہ رپورٹوں سے قیاس کیا جا سکتا ہے ، مجموعی طور پر کچھ اس طرح کا تھا : تین قبیلوں کا ایک وفاق تھا جس نے اور متعدد قبیلوں کو اپنا باجگذار بنا لیا تھا ، وفاق کی حکومت ایک وفاقی کاؤنسل اور ایک وفاقی فوجی سالار کے ہاتھ میں تھی ۔ اسی وفاقی فوجی سالار کو اسپین والوں نے ”شہنشاہ“ بنا رکھا تھا ۔

ادارہ نہیں تھا جو نہ صرف افراد کی نئی حاصل کی ہوئی ذاتی ملکیت کو گن کے نظام کی کمیونسٹی روایات سے بچا سکے ، جو نہ صرف ذاتی ملکیت کو ، جو کہ پہلے زیادہ قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھی جاتی تھی، قابل احترام قرار دے اور اس حرمت اور تقدس کو انسانی سماج کا اعلی ترین مقصد قرار دے ، بلکہ جو ملکیت حاصل کرنے کے اور دولت میں برابر تیزی سے اضافہ کرتے رہنے کے نت‌نئے ابھرنےوالے طریقوں پر قبول عام کی مہر بھی لگادے ، جو نہ صرف سماج میں نئی پیدا ہونےوالی طبقاتی تقسیم کو مستقل بنا دے بلکہ ملکیت‌والے طبقوں کے ہاتھوں ملکیت‌سے محروم طبقوں کے استحصال (exploitation) کے حق کو اور محروم طبقوں پر ملکیت‌والے طبقوں کی حکومت کو پائدار بھی بنائے ۔

اور یہ ادارہ بھی آپہنچا ۔ ریاست (state) ایجاد ہوگئی ۔

۵

ایتھنز میں ریاست کا ظہور

ریاست کا ارتقا کیونکر ہوا ، نئے اداروں کے قائم ہونے کی وجہ سے کیونکر گن دستور کے کچھ ادارے بدل گئے اور کچھ مٹ گئے اور آخر میں کس طرح سارے پرانے اداروں کی جگہ پر صحیح معنی میں سرکاری حکام آ گئے اور دوسری طرف '' ہتھیار بند عوام ،، کی جگہ ، جو خود اپنے گنوں ، فریٹریوں اور قبیلوں کے ذریعے اپنی حفاظت کیا کرتے تھے ، ہتھیاربند '' سرکاری طاقت ،، قائم ہوئی جو ان حکام کے اشاروں پر چلا کرتی تھی اور اسی باعث جس سے عوام کے خلاف بھی کام لیا جا سکتا تھا — یہ تمام باتیں خاص کر اپنے ابتدائی دور میں جتنی صفائی کے ساتھ ایتھنز میں دیکھی جا سکتی ہیں ، اتنی صفائی کے ساتھ اور کہیں نہیں دیکھی جا سکتیں ۔ یہ تبدیلیاں کیسے ہوئیں ، اس کو بحیثیت مجموعی مارگن بتا چکا ہے ۔ ان کی تہہ میں کون سی اقتصادی حقیقت کام کر رہی تھی ، یہ خود مجھے اضافہ کرنا پڑا ہے ۔

سورسائی عہد میں ایتھنزوالوں کے چار قبیلے اٹیکا کے الگ الگ حصوں میں بسے ہوئے تھے ۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن بارہ فریٹریوں کو لے کر یہ چار قبیلے بنے تھے ، وہ بھی کیکروپس کے بارہ شہروں میں الگ الگ رہتی تھیں ۔ سبھی جگہ وہی سورسائی عہد کا دستور قائم تھا : عوامی اسمبلی ، عوامی کاؤنسل اور بیسیلئیں ۔ اس

قدیم زمانے میں ، جہاں تک لکھی ہوئی تاریخ ہمیں لے جاتی ہے ، ہم دیکھتے ہیں کہ زمین لوگوں میں بانٹی جا چکی ہے اور وہ لوگوں کی ذاتی ملکیت بن گئی ہے ۔ اور یہ بات اس سے مطابقت رکھتی ہے کہ اس زمانے میں ، بربریت کے آخری دور کے ختم ہوتے ہوتے جنس تبادلہ کی پیداوار اور اس کی تجارت نسبتاً ترقی کر چکی تھی ۔ اناج کے علاوہ شراب بنانے کے لئے انگور اور تیل نکالنے کے لئے تلہن کی بھی کھیتی ہونے لگی تھی ۔ بحیرۂ ایجین کے راستے جو تجارت ہوتی تھی وہ فوئینیشین لوگوں کے ہاتھوں سے نکل کر زیادہ سے زیادہ اٹیکا کے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ رہی تھی ۔ زمین کی خرید و فروخت اور کھیتی اور دستکاری ، تجارت اور جہاز رانی کے درمیان برابر تقسیم محنت کے بڑھتے رہنے کی وجہ سے گنوں ، فریٹریوں اور قبیلوں کے ممبر جلدی ہی آپس میں گھلنے ملنے لگے ۔ جن ضلعوں میں پہلے ایک فریٹری یا قبیلے کے لوگ رہا کرتے تھے، وہاں اب نئے لوگ پہنچ گئے جو اسی ملک کے باشندے ہوتے ہوئے بھی ان قبیلوں یا فریٹریوں کے ممبر نہیں تھے اور اس لئے جو خود اپنی بود و باش کی جگہوں میں اجنبی تھے ۔ وجہ یہ تھی کہ امن کے زمانے میں ہر فریٹری اور ہر قبیلہ خود اپنے معاملوں کا انتظام کرتا تھا اور ایتھنز میں بیٹھنے والی عوامی کاؤنسل یا بیسیلیئس سے کوئی مشورہ نہیں لیتا تھا ۔ لیکن ظاہر ہے کہ کسی فریٹری یا قبیلے کے علاقے میں رہنےوالے وہ لوگ جو ان دونوں میں سے کسی کے ممبر نہ ہوں، نظم و نسق میں حصہ نہیں لے سکتے تھے ۔

اس سے گن دستور کے مختلف اداروں کے باقاعدہ کام میں خلل پڑنے لگا ۔ اور سورمائی عہد میں ہی اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی کہ کسی طرح اس گڑبڑ کو دور کیا جائے ۔ چنانچہ ایک نیا دستور بنایا گیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے تھیسیئس نے تیار کیا تھا ۔ اس تبدیلی کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ایتھنز میں ایک مرکزی ادارۂ نظم و نسق قائم کیا گیا ۔ مطلب یہ کہ کچھ ایسے معاملے جن کا انتظام ابھی تک قبیلے خود آزادی کے ساتھ کرتے تھے، اب سب قبیلوں کے اجتماعی یا مشترک معاملے قرار دئے گئے اور انہیں ایتھنز کی عام کاؤنسل کے سپرد کر دیا گیا ۔ امریکہ کے انڈین ترقی کی جس منزل تک

پہنچے تھے ، ایتھنز کے باشندے اس سے ایک قدم آگے بڑھ گئے : پڑوسی قبیلوں کے سادہ وفاق کے بدلے اب سارے قبیلے آگے بڑھ کر ایک جاتی کے روپ میں گھل مل گئے ۔ اس سے ایتھنز کے عام قانون کا ایک پورا نظام تیار ہو گیا جو قبیلوں اور گنوں کے قانونی رواجوں سے زیادہ اونچی حیثیت رکھتا تھا ۔ اس نظام سے ایتھنز کے سبھی شہریوں کو شہری کی حیثیت سے بعض حقوق اور بعض مزید قانونی تحفظات حاصل ہو گئے تھے جو اس علاقے میں کام آسکتے تھے جو ان کے اپنے قبیلے کا نہیں تھا ۔ لیکن گن دستور کی جڑ کھودنے کی طرف یہ پہلا قدم تھا کیونکہ بعد میں اسی کی بنیاد پر ایسے لوگوں کو بھی شہری بنا لیا گیا جن کو اٹیکا کے کسی بھی قبیلے سے تعلق نہیں تھا اور جو ایتھنز کے گن دستور کے دائرے سے بالکل باہر تھے اور باہر ہی رہے ۔ تھیسیئس کی طرف ایک اور بات منسوب کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس نے تمام لوگوں کو گن ، فریٹری اور قبیلے کے فرق کو بھلا کر ، تین طبقوں میں تقسیم کر دیا : یوپیٹریڈیز یعنی امرا اور شرفا کا طبقہ ، جیوموروئی یعنی زمین کی کاشت کرنےوالے لوگ اور ڈیمی‌ارجی یعنی دستکار ۔ سرکاری عہدہ‌دار بننے کا حق صرف امرا اور شرفا کو دیا گیا تھا ۔ یہ صحیح ہے کہ امرا اور شرفا کے لئے سرکاری عہدوں کو مخصوص کر دینے کے علاوہ اس نئی تقسیم کا اور کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ اس نے مختلف طبقوں کے درمیان کوئی اور قانونی امتیازات نہیں پیدا کئے ۔ لیکن اس کے باوجود یہ تقسیم بہت اہم ہے کیونکہ اس سے ہمیں ان نئے سماجی عناصر کا پتہ چلتا ہے جو اس دوران میں خاموشی کے ساتھ ابھر آئے تھے ۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گنوں میں عہدوں پر چند خاص خاندانوں کے لوگوں کے تقرر کا رواج بڑھ کر ان خاندانوں کا مخصوص حق بن چکا تھا اور اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا تھا ۔ اور یہ خاندان جو اپنی دولت کی وجہ سے کافی طاقتور ہو چکے تھے ، اپنے گنوں کے باہر ایک با اقتدار طبقے کی صورت میں متحد ہونے لگے تھے ۔ اور جو نئی ریاست جنم لے رہی تھی اس نے اقتدار کے اس غصب کو جائز قرار دیا ۔ پھر اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کاشتکار اور دستکار کے درمیان محنت کی تقسیم اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ اس نے گنوں اور

قبیلوں کی پرانی تقسیم کی برتری کو سماجی طور پر کمزور کر دیا تھا۔ اور آخر میں ، اس سے صاف طور پر یہ پتہ چلتا تھا کہ گن سماج اور ریاست میں ایک ایسا تضاد ہے جو کبھی حل نہیں ہو سکتا۔ ریاست قائم کرنے کی اس پہلی کوشش کا مطلب یہی تھا کہ گن کے ممبروں کو ایک اعلیٰ طبقے اور ایک ادنیٰ طبقے میں تقسیم کرکے گن کا شیرازہ منتشر کر دیا گیا اور ادنیٰ طبقے کو پھر کاشتکاروں اور دستکاروں کے دو الگ الگ طبقوں میں بانٹ کر انہیں ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کر دیا گیا۔

اس کے بعد سے سولون کے زمانے تک ایتھنز کی سیاسی تاریخ پوری طرح معلوم نہیں ہے۔ بیسیلیئس کا عہدہ رفتہ رفتہ بیکار ہو گیا۔ اور آرکون (مختار کل) جو شرفا میں سے چنے جاتے تھے ریاست کے صدر بن گئے۔ امرا اور شرفا کی حکومت برابر بڑھتی گئی حتی کہ ۶۰۰ قبل مسیح تک وہ ناقابل برداشت ہو گئی۔ عام لوگوں کی آزادی کا گلا گھونٹنے کے دو ذریعے تھے ، ایک زر یعنی روپیہ اور دوسرے سودخوری۔ شرفا زیادہ تر ایتھنز میں اور اس کے آس پاس رہتے تھے اور وہاں سمندری تجارت سے اور ضمنی کاروبار کے طور پر کبھی کبھار کی سمندری قزاقی سے دولت بٹور رہے تھے اور ساری نقد دولت اپنے ہاتھوں میں جمع کر رہے تھے۔ اس زمانے سے دیہی برادریوں کی قدیم روایتی زندگی کو جو فطری معیشت پر مبنی تھی ، زر کا بڑھتا ہوا نظام تیزاب کی طرح کھانے لگا۔ گن دستور زر کے نظام سے قطعی کوئی میل نہیں کھاتا۔ جیسے جیسے اٹیکا کے چھوٹے چھوٹے کسان اقتصادی حیثیت سے برباد ہوتے گئے ، ویسے ویسے گن دستور کے وہ بندھن بھی ڈھیلے پڑتے گئے جو پہلے ان کا تحفظ کرتے تھے۔ ایتھنز کے باشندوں نے اس زمانے تک رہن کا رواج بھی شروع کر دیا تھا (۱۳۳)۔ اور مہاجن کی ہنڈی اور رہن‌نامہ نہ تو گن کا احترام کرتے ہیں اور نہ فریٹری کا۔ پرانا گن دستور زر ، ادھار اور نقد قرض سے ناواقف تھا۔ اس لئے شرفا کی لگاتار بڑھتی ہوئی زر کی حکومت نے ایک نئے قانون کو جنم دیا جو قرضدار سے مہاجن کی حفاظت کرتا تھا اور روپے کے مالک کو چھوٹے کسان کے استحصال کی اجازت دیتا تھا۔ یہی نیا رواج تھا۔ اٹیکا کے دیہاتی علاقے میں رہن کی تختیوں کا جال بچھ گیا۔ ان پر لکھا ہوتا تھا کہ جس زمین

پر یہ تختی لگی ہے وہ اتنے روپئے کے لئے فلاں آدمی کے یہاں رہن رکھ دی گئی ہے۔ جن کھیتوں میں ایسی تختیاں نہیں تھیں ان میں سے زیادہ تر رہن کی میعاد ختم ہو جانے کی وجہ سے یا سود نہ ادا کر سکنے کی وجہ سے فروخت ہو چکے تھے اور سودخور شریف‌زادوں کی ملکیت بن چکے تھے۔ کسان کو اگر لگان دینے والے کاشتکار کی حیثیت سے رہنے دیا جاتا تو وہ اپنے کو بہت خوش قسمت سمجھتا تھا۔ وہ اپنی محنت کی پیداوار کے ایک چھٹے حصے پر خود گذارہ کرتا اور چھ میں پانچ حصے مالک کو لگان کے طور پر ادا کر دیتا تھا۔ یہی نہیں، جو زمین رہن رکھی گئی تھی، اس کی فروخت سے اگر مہاجن کا پورا روپیہ ادا نہیں ہوتا تھا یا اگر ایسا قرض ہوتا تھا جس کے بدلے میں کوئی چیز گروی نہیں رکھی گئی تھی تو قرضدار کو مہاجن کا روپیہ ادا کرنے کے لئے اپنے بچوں کو بدیس میں غلام بنا کر بیچنا پڑتا تھا۔ باپ اپنے ہاتھوں اپنی اولاد کو بیچ ڈالتا تھا۔ پدری حق اور یک‌زوجگی کا پہلا نتیجہ یہی نکلا۔ اور اگر خون چوسنے والا مہاجن اس سے بھی مطمئن نہیں ہوتا تھا تو وہ خود قرضدار کو غلام کی طرح بیچ سکتا تھا۔ ایتھنز کے لوگوں میں تمدن کی خوشگوار صبح کا آغاز ایسے ہی ہوا تھا۔

پہلے جب لوگوں کی زندگی کے حالات گن دستور کے مطابق تھے، تب اس طرح کا انقلاب ناممکن تھا۔ لیکن اب یہ انقلاب ہو گیا اور کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ اتنی بڑی تبدیلی کیسے ہو گئی۔ آئیے، کچھ دیر کے لئے پھر ایروکواس لوگوں کے بیچ لوٹ چلیں۔ جیسی حالت ایتھنز کے باشندوں میں آپ ہی آپ اور گویا بغیر کچھ کئے ہی، اور بلاشک ان کی خواہش کے خلاف پیدا ہو گئی ویسی حالت کا ہم ایروکواس لوگوں میں تصور تک نہیں کر سکتے۔ وہاں ذرائع زندگی کی پیدائش کا طریقہ جو سال بہ سال ایک سا ہی رہتا تھا اور جس میں کوئی بھی تبدیلی نہیں ہوتی تھی، ایسا تھا جس میں ایسی کشمکش کبھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی جسے گویا باہر سے سماج پر لادا گیا ہے۔ پیداوار کے اس طریقے میں امیر اور غریب کا اختلاف یا استحصال کرنے والوں اور کئے جانے والوں کا تضاد نمودار نہیں ہو سکتا تھا۔ ایروکواس لوگ ابھی فطرت کے مالک نہیں بن پائے تھے لیکن

فطرت نے ان کے لئے جو حد مقرر کر دی تھی ، اس کے اندر وہ اپنی پیداوار کے مالک تھے ۔ کبھی کبھی ان کے چھوٹے چھوٹے باغیچوں میں اچھی فصل نہیں ہوتی تھی ۔ کبھی کبھی ان کی جھیلوں اور ندیوں میں مچھلیاں اور ان کے جنگلوں میں شکار کے جانور اور پرندے ختم ہو جاتے تھے ۔ مگر ان باتوں کے علاوہ انہیں یہ معلوم رہتا تھا کہ ان کے روزی کمانے کے طریقے کا کیا پھل ہوگا ۔ اس کا پھل یہی ہو سکتا تھا کہ زندگی بسر کرنے کے وسیلے حاصل ہوں ، کبھی فراوانی کے ساتھ اور کبھی کم ۔ لیکن اس کا پھل یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ سماج میں بےساختہ افراتفری مچ جائے اور بڑی بڑی تبدیلیاں ہو جائیں ، گن دستور کا شیرازہ بکھر جائے ، گنوں اور قبیلوں کے ممبروں میں پھوٹ پڑ جائے اور وہ باہم دگر مخالف طبقوں میں بٹ کر آپس میں لڑنے لگیں ۔ پیداوار بہت محدود دائرے میں ہوتی تھی ، لیکن پیداوار کرنےوالوں کا اپنے پیدا کئے ہوئے مال پر قبضہ ہوتا تھا ۔ عہد بربریت کے طریقۂ پیداوار کی یہ ایک بڑی خوبی تھی جو تمدن کے آتے ہی ختم ہو گئی ۔ اور فطرت کی قوتوں پر انسان کو جو زبردست قدرت حاصل ہو گئی ہے اور انسانوں میں آج جو آزاد تعاون ممکن ہے ، اس کی بنیاد پر عہد بربریت کی پیداوار کی اس خصوصیت کو پھر سے حاصل کرنا ہی آنے والی نسلوں کا کام ہے ۔

یونانیوں میں ایسی حالت نہیں تھی ۔ جب مویشیوں کے ریوڑ اور عیش و آرام کے سامان کچھ افراد کی نجی ملکیت بن گئے تب افراد کےدرمیان چیزوں کا تبادلہ ہونے لگا اور پیداوار جنس تبادلہ یا بکاؤ مال بن گئی ۔ آگے چل کر جو سارا انقلاب ہوا اس کی جڑ میں یہی چیز تھی ۔ پیدا کرنےوالے چونکہ اب اپنی پیداوار کو خود خرچ نہیں کرتے تھے اور وہ تبادلے کے ذریعے ان کے ہاتھ سے نکل جاتی تھی ، اس‌لئے اپنی پیداوار پر خود ان کو کوئی اختیار نہیں رہ گیا تھا ۔ اب انہیں یہ پتہ نہیں رہتا تھا کہ ان کی پیداوار کا کیا ہوا اور اس بات کا امکان پیدا ہو گیا کہ پیداوار ایک روز اپنے پیدا کرنےوالوں کے خلاف استعمال کی جا سکے اور وہ ان کے استحصال اور ان پر ظلم کا ایک ہتھیار بن‌جائے ۔ لہذا جو سماج افراد کے درمیان ہونےوالے تبادلے کو

بند نہیں کرتا ، وہ بہت دنوں تک خود اپنی پیداوار کا مالک نہیں رہ سکتا اور اپنے پیداواری عمل کے سماجی نتیجوں پر قابو نہیں رکھ سکتا۔

ایتھنز کے باشندوں کو جلد ہی یہ پتہ چل گیا کہ انفرادی تبادلے کے شروع ہونے اور پیداوار کے جنس تبادلہ بن جانے کے بعد کتنی تیزی کے ساتھ پیداوار ہی خود پیدا کرنے والے پر اپنی حکومت قائم کر لیتی ہے۔ جنس تبادلہ کی پیداوار کے ساتھ ساتھ انفرادی کھیتی بھی شروع ہو گئی۔ لوگ الگ الگ اپنے فائدے کے لئے زمین جوتنے لگے۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد زمین پر انفرادی ملکیت قائم ہو گئی۔ پھر زر یا روپیہ یعنی وہ چیز آ گئی جس کا دوسری سبھی چیزوں کے ساتھ تبادلہ ہو سکتا تھا۔ لیکن جب انسانوں نے زر کو ایجاد کیا تب انہوں نے یہ ذرا بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ ایک نئی سماجی طاقت کو ، ایک ایسی عالمگیر طاقت کو وجود میں لا رہے ہیں جس کے سامنے پورے سماج کو جھکنا پڑے گا۔ یہ نئی طاقت اپنے پیدا کرنے والوں کی خواہش یا واقفیت کے بغیر اچانک پیدا ہو گئی تھی ، جس کے شباب کے پورے حیوانی کس بل ایتھنزوالوں کو جھیلنے پڑے۔

لیکن پھر کیا کیا جاتا ؟ پرانی گن تنظیم زر کی فاتحانہ آمد کو روکنے میں ناکام ثابت ہوتی تھی۔ یہی نہیں ، وہ اس قابل بھی نہیں تھی کہ زر ، مہاجن ، قرضدار اور قرضوں کی زبردستی وصولی جیسی چیزوں کو اپنے نظام میں جگہ دے سکے۔ لیکن نئی سماجی قوت وجود میں آچکی تھی اور نہ لوگوں کی پاک خواہشوں میں اور نہ ان کی پرانے ست یگ کو پھر سے لوٹا لانے کی تمناؤں میں اتنی طاقت تھی کہ وہ زر اور سود خوری کو سماج سے نکال باہر کر دیتیں۔ اس کے علاوہ گن دستور میں کتنی ہی چھوٹی موٹی دراریں بھی پڑ چکی تھیں۔ اٹیکا کے ہر کونے میں گنوں اور فریٹریوں کے ممبر آپس میں گھل مل رہے تھے۔ ایتھنز میں یہ بات خاص طور سے دیکھنے میں آرہی تھی اور پشت در پشت یہ چیز بڑھتی ہی جا رہی تھی حالانکہ ایتھنزوالوں کو اپنی زمین تو گن کے باہر بیچنے کی اجازت تھی مگر وہ اپنے رہائشی مکانات کو گن کے باہر نہیں بیچ سکتے تھے۔ صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ پیداوار کی مختلف شاخوں میں ، جیسے کھیتی ،

دستکاری اور مختلف پیشوں کے اندر متعدد قسم کے ہنر ، تجارت ، جہاز رانی وغیرہ میں محنت کی تقسیم نے اور بھی ترقی کی۔ اب لوگ اپنے اپنے پیشوں کے مطابق ، پہلے کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ واضح گروہوں میں بٹ گئے تھے اور ہر گروہ کے کچھ ایسے نئے مشترک مفاد پیدا ہو گئے تھے جن کے لئے گن میں یا فریٹری میں کوئی گنجائش نہیں تھی اور اس لئے ان کی دیکھ بھال کرنے کے لئے نئے عہدہداروں کو مقرر کرنا ضروری تھا۔ غلاموں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اور اس ابتدائی حالت میں بھی وہ ایتھنز کے آزاد شہریوں سے تعداد میں کہیں زیادہ ہونگے۔ گن دستور شروع میں غلامی کے رواج سے ناواقف تھا اور اس لئے وہ کوئی ایسی تدبیر نہیں جانتا تھا جس کے ذریعے غلاموں کی اس کثیر تعداد کو دبا کر رکھا جا سکے۔ اور آخری بات یہ ہے کہ تجارت کی کشش سے بہت سے اجنبی ایتھنز میں آکر بس گئے تھے کیونکہ وہاں دھن دولت کمانا آسان تھا۔ اور پرانے دستور کے مطابق ان اجنبیوں کو نہ تو کوئی حق حاصل تھا اور نہ قانون کسی طرح ان کی حفاظت کرتا تھا۔ باوجود اس کے کہ ان کے ساتھ پرانی روایتی رواداری برتی جاتی تھی پھر بھی وہ عام لوگوں کے درمیان ایک پریشان کن اور اجنبی عنصر بنے ہوئے تھے۔

مختصر یہ کہ گن دستور کا خاتمہ قریب تھا۔ سماج روز بہ روز اس کی حدود سے آگے نکلا جا رہا تھا۔ اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے جو نہایت تکلیفدہ برائیاں پیدا ہو رہی تھیں ، ان کو دور یا کم کر سکے۔ لیکن اسی دوران میں ، خاموشی کے ساتھ ریاست کا ظہور ہو چکا تھا۔ پہلے شہر اور دیہات کے درمیان اور پھر شہری صنعت‌وحرفت کی مختلف شاخوں کے درمیان محنت کی تقسیم ہو جانے سے جو نئے گروہ بن گئے تھے ، انھوں نے اپنے مفاد کی حفاظت کرنے کے لئے نئے ادارے قائم کر لئے تھے۔ طرح طرح کے سرکاری عہدے قائم ہو گئے تھے۔ اور اسکے علاوہ نوخیز ریاست کو سب سے زیادہ ایک فوج کی ضرورت تھی جو سمندر میں جہازرانی کرنےوالے ایتھنز کے باشندوں کے لئے شروع میں ایسی بحری فوج ہی ہو سکتی تھی جو کبھی کبھی ہونے والی چھوٹی موٹی لڑائیوں کے اور تجارتی

جہازوں کی حفاظت کرنے کے کام آسکے۔ سولون سے پہلے کسی غیرمتعین زمانے میں چھوٹے چھوٹے علاقائی ضلع بنا دئے گئے تھے جنہیں نوکریری کہا جاتا تھا۔ ہر قبیلے میں بارہ نوکریری ہوتے تھے اور ہر نوکریری کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایک جنگی جہاز کو سازوساماں اور سپاہیوں سے لیس کرے اور اس کے علاوہ وہ دو گھوڑ سواروں کا بند و بست کرے۔ اس انتظام سے گن دستور پر دو طرح کی چوٹ پڑتی تھی۔ ایک تو اس سے ایک ایسی پبلک طاقت پیدا ہو گئی تھی جو اب تمام ہتھیاربند عوام کی مرادف نہیں رہی تھی۔ دوسرے، امور عامہ کے لئے عوام کو پہلی بار خون کے رشتوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ علاقے کے مطابق، بود و باش کی مشترک جگہ یعنی ایک ہی جگہ بسے ہوئے ہونے کی بنیاد پر، الگ الگ بانٹ دیا گیا تھا۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اس کا کیا مطلب تھا۔

عوام جن کا استحصال کیا جاتا تھا، انہیں چونکہ گن دستور سے کوئی مدد نہیں مل پاتی تھی اس لئے اب وہ صرف نئی ابھرنے والی ریاست سے ہی کچھ امید کر سکتے تھے۔ اور ریاست نے سولون کے دستور کی شکل میں ان کی مدد کی اور ساتھ ہی اس کے ذریعے سے پرانے دستور کی اہمیت گھٹا کر اپنا پلہ اور بھی بھاری کر لیا۔ ہمیں یہاں اس سے تعلق نہیں کہ سولون کی ۹۴ ۵ قبل مسیح کی اصلاحات کس طرح ظہور میں آئی تھیں۔ مگر اس نے ملکیت پر دست درازی کر کے ان انقلابوں کا سلسلہ شروع کر دیا جو سیاسی کہلاتے ہیں۔ ابھی تک جتنے بھی انقلاب ہوئے ہیں، ان سب کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرح کی ملکیت کی دوسری طرح کی ملکیت سے حفاظت کریں۔ اور ایک طرح کی ملکیت کی حفاظت وہ دوسری طرح کی ملکیت پر حملہ کئے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ فرانس کے انقلاب عظیم میں بورژوا ملکیت کو بچانے کے لئے جاگیردارانہ ملکیت کو قربان کر دیا گیا۔ سولون کے انقلاب میں قرضداروں کی ملکیت کو فائدہ پہونچانے کے لئے مہاجنوں کی ملکیت کو نقصان پہونچانا پڑا۔ قرضوں کو سیدھے سیدھے منسوخ کر دیا گیا۔ مفصل واقفیت ہمیں نہیں ہے لیکن سولون نے اپنی نظموں میں بڑے فخر کے ساتھ کہا ہے کہ اس نے رہن نامے کی تختیاں کھیتوں سے ہٹوا دیں اور

ان سب لوگوں کو اپنے وطن لوٹ جانے کا موقع دیا ہے جو قرض کی بدولت گھر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے یا جو غیرملکوں میں بیچ دئے گئے تھے۔ یہ بات ملکیت کے اختیارات پر کھلے عام چوٹ کئے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ جو سیاسی انقلاب کہے جاتے ہیں، پہلے سے لے کر آخری تک، ان سب کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرح کی ملکیت کی حفاظت کرنے کے لئے دوسری طرح کی ملکیت کو ضبط کریں — جس کو چوری کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اس لئے یہ ایک ناقابل انکار صداقت ہے کہ پچیس سو برس سے ذاتی ملکیت کی حفاظت کرنے کے لئے ملکیت کے حقوق اور اختیاروں کو روندا جا رہا ہے۔

لیکن اب اس بات کی بھی تدبیر کرنی تھی کہ ایتھنز کے آزاد شہریوں کو دوبارہ غلام نہ بنایا جا سکے۔ شروع میں اس کے لئے کچھ عام ڈھنگ کے قدم اٹھائے گئے۔ مثال کے لئے ایسے اقرار ناموں پر روک لگا دی گئی جن میں خود قرضدار کو رہن یا گروی رکھ دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک حد طے کر دی گئی جس سے زیادہ زمین کسی کے پاس نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ امرا میں کسانوں کی زمین پر قبضہ کرنے کی ہوس پر کسی حد تک تو پابندی لگائی جائے۔ اس کے بعد دستوری ترمیمیں (Verfassung) کی گئیں جن میں ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم یہ ہیں:

کاؤنسل کے ممبروں کی تعداد بڑھا کر چار سو کر دی گئی۔ ہر قبیلے سے سو سو ممبر کاؤنسل میں رہے۔ چنانچہ اس معاملے میں قبیلے ہی کو بنیاد مان لیا گیا۔ لیکن پرانے دستور کی یہی ایک بات تھی جسے نئی ریاست کے دستور میں قائم رکھا گیا تھا۔ باقی باتوں میں سولون نے شہریوں کو ان کی زمین اور اسکی پیداوار کی مقدار کی بنیاد پر چار طبقوں میں بانٹ دیا تھا۔ پہلے تین طبقوں میں وہ لوگ رکھے گئے تھے جن کی زمین سے کم سے کم پانچ سو، تین سو اور ڈیڑھ سو میدمنی (medimni) اناج پیدا ہوتا تھا (ایک میدمنی تقریباً ۵۱ لٹر کے برابر ہوتا ہے)۔ جن لوگوں کے پاس اس سے بھی کم زمین تھی یا بالکل نہیں تھی، انہیں چوتھے طبقے میں رکھا گیا تھا۔ سرکاری عہدوں پر صرف پہلے تین طبقوں کے لوگوں کو ہی مقرر کیا جا سکتا تھا۔ سب

سے اونچے عہدے پہلے طبقے کے لوگوں کو ملتے تھے۔ چوتھے طبقے کو صرف عوامی اسمبلی میں بولنے اور ووٹ دینے کا حق تھا۔ لیکن تمام عہدہدار اسی اسمبلی میں چنے جاتے تھے، اسی کے سامنے وہ اپنے کاموں کے لئے جواب‌دہ تھے، سارے قانون بھی یہی اسمبلی بناتی تھی اور اس اسمبلی میں اکثریت چوتھے طبقے کے لوگوں کی ہی تھی۔ شرفا کے طبقے کے مخصوص اختیارات کو کسی حد تک دولت کے اختیارات کی شکل میں دوبارہ قائم کر دیا گیا تھا لیکن فیصلہ کن طاقت عوام کے ہاتھوں میں رہی۔ فوج کو نئے سرے سے منظم کرنے میں بھی انہیں چار طبقوں کو بنیاد بنایا گیا۔ پہلے دو طبقوں سے سوار فوج کے لوگ لئے جاتے تھے۔ تیسرے طبقے کو زرہ بند پیدل فوج کا کام کرنا پڑتا تھا۔ اور چوتھے طبقے کو یا تو معمولی پیدل فوج کا کام کرنا پڑتا تھا جس کے پاس زرہ بکتر نہیں ہوتے تھے یا انہیں سمندری فوج میں بھرتی کر دیا جاتا تھا۔ چوتھے طبقے کے لوگوں کو شاید اس کام کی اجرت بھی دی جاتی تھی۔

اس طرح دستور میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہو گیا تھا اور وہ عنصر تھا — ذاتی ملکیت۔ شہریوں کے حقوق اور فرائض زمین کی ملکیت کی بنیاد پر طے کئے گئے اور جیسے جیسے ملکیت والے طبقوں کا اثر بڑھتا گیا، ویسے ویسے پرانے، یک‌جدی خون کے رشتوں (سگوتر) کی بنیاد پر بنے ہوئے گروہ پس‌منظر میں پڑ گئے۔ گن دستور کو ایک اور شکست ہوئی۔

لیکن ملکیت کے مطابق سیاسی حقوق کی درجہ‌بندی ریاست کے لئے کوئی لازمی چیز نہیں تھی۔ ریاستوں کی دستوری تاریخ میں اس کی جو بھی اہمیت ہو، لیکن بہت سی ریاستیں اور ان میں بھی سب سے زیادہ ترقی یافتہ ریاستیں اس قسم کی درجہ بندی کے بغیر ہی کام چلاتی تھیں۔ ایتھنز میں بھی اس کی اہمیت عارضی تھی۔ ارسطائدیز کے زمانے سے تمام عہدے سبھی طرح کے شہریوں کو ملنے لگے تھے۔

اگلے ۸۰ برسوں میں ایتھنز کے سماج نے وہ راستہ اختیار کر لیا جس پر چل کر آئندہ کئی صدیوں تک اس کا ارتقا ہوتا رہا۔ سولون سے پہلے کے زمانے میں سودخور جس طرح زمین پر قبضہ کر لیا کرتے

تھے ، اس پر روک لگائی گئی ، اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ لوگوں کے پاس بہت زیادہ زمین اکٹھا ہونے سے روکی گئی ۔ تجارت اور دستکاری اور طرح طرح کے فائدہ‌مند ہنر اور فن اہم پیشے بن گئے جن کی بنیاد غلاموں کی محنت تھی اور جو زیادہ سے زیادہ بڑے پیمانے پر منظم کئے جا رہے تھے ۔ سماج میں تعلیم اور روشن خیالی کو ترقی ہوئی ۔ خود اپنے شہری بھائیوں کا پرانے بہیمانہ طریقے سے استحصال کرنے کے بجائے ، ایتھنز کے باشندے زیادہ تر اپنے غلاموں کا اور اپنے غیرملکی گاہکوں کا استحصال کرنے لگے ۔ منقولہ جائداد ، یعنی وہ دولت جو زر نقد ، غلام اور جہاز کی شکل میں تھی ، برابر بڑھتی گئی ۔ لیکن پہلے زمانے میں ، باوجود اس کی تمام حدود اور خامیوں کے ، اگر دولت محض زمین خریدنے کا ایک ذریعہ تھی ، تو اب دولت جمع کرنا خود ایک مقصد بن گیا ۔ ایک طرف تو اس سے نیا ، دولت‌مند ، صنعتی اور تجارتی طبقہ ، شرفا کے طبقے کی پرانی طاقت کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے لگا تھا اور دوسری طرف پرانے گن دستور کی آخری بنیاد بھی ختم ہو گئی ۔ اس طرح پرانے گن ، فریٹریاں اور قبیلے جن کے ممبر سارے اٹیکا میں بکھرے ہوئے تھے اور آپس میں گھل مل گئے تھے ، سیاسی اداروں کی حیثیت سے بالکل بےکار ہو گئے ۔ ایتھنز کے بہت سے شہری کسی بھی گن کے ممبر نہیں تھے ۔ وہ بدیسوں سے آئے ہوئے لوگ تھے جو شہری تو بن گئے تھے مگر ان پرانے اداروں میں شریک نہیں ہو پائے تھے جو یک‌جدی قرابت (سگوتری) کی بنیاد پر بنے تھے ۔ اس کے علاوہ غیرملکوں سے آئے ہوئے ایسے لوگوں کی تعداد بھی برابر بڑھتی جا رہی تھی جنہیں صرف سرپرستی حاصل تھی (۱۳۴) ۔

اس دوران میں مختلف پارٹیوں کی جدوجہد جاری رہی ۔ شرفا کا طبقہ اپنے مخصوص اختیارات کو پھر سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ اور کچھ دنوں کے لئے اس کا غلبہ قائم بھی ہوا ۔ لیکن (۵۰۹ ق ۔ م ۔ میں) کلائستھینز کے انقلاب نے انہیں اکھاڑ پھینکا ، اور ان کے ساتھ ساتھ گن دستور کے آخری بچے کھچے آثار بھی مٹ گئے ۔

کلائستھینز نے اپنے نئے دستور میں گنوں اور فریٹریوں کی بنیاد پر بنے ہوئے پرانے چار قبیلوں کا کوئی خیال نہیں رکھا ۔ ان کی جگہ

ایک بالکل نئی تنظیم نے لے لی جس میں شہریوں کو صرف ان کی بود و باش کی جگہ کی بنیاد پر بانٹا گیا تھا ، جیسا کہ پہلے نوکریریوں کے ذریعے کرنے کی کوشش کی گئی تھی ۔ اب فیصلہ کن بات یہ نہیں تھی کہ کوئی شخص کس یک‌جدی (سگوتر) گروہ کا رکن ہے بلکہ فیصلہ کن بات یہ تھی کہ وہ کس علاقے کا رہنےوالا ہے ۔ اب لوگوں کو نہیں بلکہ علاقوں کو تقسیم کیا گیا ۔ سیاسی اعتبار سے اب لوگوں کی اہمیت صرف یہ تھی کہ وہ کسی علاقے سے وابستہ تھے ۔

پورا اٹیکا ایک سو خودحکومتی قصبات یا بلدوں میں بانٹ دیا گیا ۔ انہیں دیم کہا جاتا تھا ۔ ہر دیم کے شہری (دیموت) اپنا ایک مکھیا (دیمارک) ، ایک خزانچی اور چھوٹے چھوٹے معاملوں کو طے کرنے کے لئے تیس پنچ منتخب کرتے تھے ۔ ہر دیم کے شہریوں کا اپنا الگ مندر اور دیوتا یا ہیرو (heros) ہوتا تھا ، جس کے پجاریوں کو چنا جاتا تھا ۔ دیم میں اقتدار اعلی دیموتوں کی اسمبلی کے ہاتھ میں ہوتا تھا ۔ مارگن نے صحیح کہا ہے کہ یہ امریکہ کے خودحکومتی بلدی نظم و نسق (”Local self Government“) کی ہی دوسری شکل تھی ۔ موجودہ ریاست اپنے ارتقا کی آخری منزل پر پہنچ کر اسی اکائی پر ختم ہو جاتی ہے جس کے ساتھ ایتھنز میں ریاست کا آغاز ہوا تھا ۔

ان دس اکائیوں (دیموں) کو ملا کر ایک قبیلہ بنتا تھا ۔ مگر یہ قبیلہ پرانے گن دستور کے مطابق بنے ہوئے قبیلے (Geschlechtsstamm) سے بالکل مختلف تھا اور مقامی قبیلہ (Ortsstamm) کہلاتا تھا ۔ یہ مقامی قبیلہ اپنی حکومت آپ چلانےوالا ایک سیاسی گروہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک فوجی گروہ بھی تھا ۔ وہ ایک فیلارک * یعنی قبیلے کا سردار چنتا تھا جو سوار فوج کا کمانڈر ہوتا تھا ، ایک ٹیکسیارک چنتا تھا جو پیدل فوج کا کمانڈر ہوتا اور ایک اسٹریٹی‌جوس چنتا تھا جو اس پوری فوج کا ، جو اس قبیلے کے علاقے میں بھرتی کی جاتی تھی ، کمانڈر ہوتا تھا ۔ اس کے علاوہ ہر قبیلہ پانچ جنگی جہاز ، ان کو چلانےوالے

---

* فیلارک — قدیم یونانی لفظ ”فیلا“ سے بنا ہے یعنی قبیلہ ۔ (ایڈیٹر)

جہازی سپاہی اور کمانڈر مہیا کرتا تھا۔ ہر قبیلے کو ایک اٹیکی دیوتا یعنی ہیروس دے دیا گیا تھا جس کے نام سے قبیلہ جانا جاتا تھا اور جو اس قبیلے کی حفاظت کرتا تھا۔ اور آخری بات یہ کہ یہ مقامی قبیلہ ایتھنز کی کاؤنسل کے لئے پچاس ممبر چنتا تھا۔

کل ملا کر جو چیز بنی، وہ تھی ایتھنز کی ریاست۔ اس کی حکومت پانچ سو آدمیوں کی ایک کاؤنسل چلاتی تھی جس کو دس قبیلے چنتے تھے۔ حکومت کا مکمل اختیار اس سے بھی اوپر عوامی اسمبلی کو تھا جس میں ایتھنز کا ہر شہری شریک ہو سکتا اور ووٹ دے سکتا تھا۔ حکومت کے مختلف شعبوں اور عدالتوں کا کام آرکون اور دوسرے عہدہ‌دار کیا کرتے تھے۔ ایتھنز میں ایسا کوئی عہدہ‌دار نہیں تھا جو اعلیٰ‌ترین انتظامیہ اقتدار کا مالک ہو۔

اس نئے دستور کے ذریعے اور بہت سے زیراثر لوگوں (Schutzverwandter) کو جن میں سے کچھ باہر سے آئے ہوئے تھے اور کچھ ایسے غلام تھے جنہیں آزاد کر دیا گیا تھا، شہریوں میں شامل کرکے گن دستور کے اداروں کو امور عامہ کے دائرے سے ختم کر دیا گیا۔ وہ اب نجی غیر سرکاری ادارے اور مذہبی جماعتیں بن کر رہ گئے۔ لیکن ان کا اخلاقی اثر، قدیم گن دستور کے زمانے کے روایتی خیالات اور تصورات، بہت دنوں تک زندہ رہے اور رفتہ رفتہ بہت دنوں میں مٹے۔ ریاست کے ایک بعد کے ادارے میں یہ بات اچھی طرح ظاہر ہوئی۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ریاست کی ایک ضروری خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک ایسا اقتدار عامہ ہے جو عام لوگوں سے الگ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ایتھنز میں صرف ایک عوامی فوج اور ایک جہازی بیڑا تھا جن کے لئے براہ راست عوام میں سے ہی لوگوں کو بھرتی کیا جاتا تھا اور عوام ہی ان کو ہتھیاروں اور ساز و سامان سے لیس کرتے تھے۔ یہی فوجیں دشمنوں سے ملک کی حفاظت کرتی تھیں اور غلاموں کو دبائے رکھتی تھیں۔ اس زمانے تک غلام آبادی کی اکثریت بن چکے تھے۔ شہریوں کے لئے شروع میں اس اقتدار عامہ کا وجود محض پولیس کی شکل میں تھا۔ پولیس اتنی ہی پرانی چیز ہے جتنی پرانی ریاست۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارھویں صدی کے بھولے بھالے فرانسیسی لوگ متمدن

قوموں کا نہیں بلکہ پولیس کے ذریعہ منظم قوموں (nations policées) کا ذکر کرتے تھے۔ اس طرح اپنی ریاست قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ایتھنز کے باشندوں نے اپنی پولیس بھی بنا ڈالی جس کو تیر کمان سے لیس پیدل اور سوار سپاہیوں کا دستہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ جنوبی جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کی زبان میں کہا جائے تو ایتھنزوالوں نے اپنی لینڈجاگر (Landjäger) بنا ڈالی تھی۔ اس پولیس کے سپاہی سب غلاموں میں سے تھے۔ ایتھنز کے آزاد شہری پولیس کے کام کو اتنا نیچا سمجھتے تھے کہ ایک ہتھیاربند غلام کے ہاتھوں تو گرفتار ہونا انہیں پسند تھا مگر یہ پسند نہیں تھا کہ خود اس نفرت‌انگیز کام کو کریں۔ یہ قدیم گن‌والی ذہنیت کا ہی اظہار تھا۔ پولیس کے بغیر ریاست قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن ریاست کی عمر ابھی بہت تھوڑی تھی اور اس کی اتنی اخلاقی ساکھ نہیں تھی کہ ایک ایسے پیشے کو یعنی پولیس کے کام کو جسے قدیم گن‌والے لوگ حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے، عزت کا کام بنا سکتی۔

اس طرح ریاست کا ڈھانچہ اور اس کے نمایاں نقوش مکمل ہو چکے تھے۔ وہ ایتھنز کے باشندوں کی نئی سماجی حالت میں کتنی مناسب اور موزوں چیز تھی یہ اس بات سے ظاہر ہے کہ اس کے قائم ہونے کے بعد دولت، تجارت اور صنعت و حرفت کو بڑی تیزی سے ترقی ہوئی۔ اب جس طبقاتی تضاد پر سماجی اور سیاسی اداروں کی بنیاد تھی، وہ شرفا اور عام لوگوں کا تضاد نہیں تھا بلکہ غلاموں اور آزاد شہریوں کا، محکوموں اور شہریوں کا تضاد تھا۔ جب ایتھنز اپنی دولت اور خوش‌حالی کے عروج پر تھا، تب اس کے آزاد شہریوں کی کل تعداد جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، تقریباً ۹۰۰۰۰ تھی، غلام عورتوں اور مردوں کی تعداد ۳۶۰۰۰۰ تھی اور زیراثر لوگوں کی تعداد جس میں غیرملکوں سے آئے ہوئے لوگ اور آزاد کئے ہوئے غلام دونوں شامل تھے ۴۵۰۰۰ تھی۔ اس طرح ہر بالغ مرد شہری پر کم سے کم اٹھارہ غلام اور دو سے زیادہ زیراثر لوگ تھے۔ غلاموں کی اتنی بڑی تعداد کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بہت سے لوگ کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ وہاں بڑے بڑے کمروں میں بہت سے غلاموں کو

ایک جگہ جمع ہو کر اوورسیر یا ناظر کی نگرانی میں کام کرنا پڑتا تھا۔ تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ چند آدمیوں کے ہاتھوں میں زیادہ سے زیادہ دولت جمع ہوتی گئی۔ زیادہ‌تر آزاد شہری غریبی اور افلاس کے گڑھے میں گر گئے۔ ان کے سامنے دو ہی راستے تھے : یا تو دستکاری کا کام شروع کریں اور اس طرح غلاموں کی محنت کا مقابلہ کریں جو کہ آزاد شہریوں کی شان کے خلاف سمجھا جاتا تھا اور جس میں کامیابی کی امید بھی بہت کم تھی ، اور یا تباہ ہو کر دیوالیہ ہو جائیں۔ اس زمانے میں جیسے حالات تھے ، ان میں تباہ ہونے والی ہی بات ہوئی۔ اور چونکہ ان کی بڑی تعداد تھی اس لئے ان کے دیوالیہ بننے کے ساتھ ساتھ ایتھنز کی پوری ریاست برباد ہو گئی۔ ایتھنز کے زوال کی وجہ جمہوریت نہیں تھی جیسا کہ یورپ کے اسکول ماسٹر جو بادشاہوں کے تلوے چاٹتے ہیں ، ہمیں بتایا کرتے ہیں۔ اس کا زوال غلامی کی وجہ سے ہوا جس کی بدولت آزاد شہریوں میں محنت بری چیز سمجھی جانے لگی۔

ایتھنز کے لوگوں میں ریاست کا ظہور جس طرح ہوا وہ عام طور پر ریاست کے بننے کی ایک ٹھیٹ مثال ہے کیونکہ اس کا ظہور وہاں ، ایک طرف تو خالص شکل میں ہوا جس میں بیرونی یا اندرونی تشدد نے کبھی دخل اندازی نہیں کی (پیسیستراتس کے غصب کا زمانہ بہت تھوڑے دنوں رہا اور اس کے ختم ہونے کے بعد اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا) اور دوسرے وہ ریاست کی ایک نہایت ترقی‌یافتہ شکل ، جمہوری ریپبلک کا نمونہ ہے جو براہ راست گن سماج سے نکلی تھی۔ اور آخری بات یہ کہ ہم اس کی تمام ضروری تفصیلات سے واقف ہیں۔

٦

روم میں گن اور ریاست

روما کے قائم ہونے کے بارے میں جو روایت چلی آرہی ہے اس کے مطابق پہلی بستی متعدد لاطینی گنوں نے بسائی تھی (روایت ہے کہ ان کی تعداد سو تھی) جو مل کر ایک قبیلہ بن گئے تھے۔ اس کے بعد ایک سیبیلین قبیلہ وہاں آکر رہنے لگا۔ اس میں بھی گویا ایک سو گن تھے۔ آخر میں مختلف قسم کے لوگوں کا ایک تیسرا قبیلہ بھی آکر ان لوگوں میں شامل ہو گیا اور اس میں بھی سو گن تھے۔ اس پورے قصے پر ایک نظر ڈالتے ہی یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہاں گن کے سوا شاید ہی کوئی چیز فطری ارتقا کی پیداوار مانی جا سکتی ہے۔ اور گن بھی اکثر ایک ہی مادری گن کی شاخیں ہوتے تھے اور وہ مادری گن اس وقت بھی اپنی پرانی جگہ پر بسا ہوا تھا۔ قبیلوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بناوٹی ڈھنگ سے بنائے گئے ہیں۔ پھر بھی زیادہ تر ان میں ایسے عنصر شامل ہوتے تھے جو ایک دوسرے کے رشتہ‌دار ہوتے تھے اور ان کو پرانے زمانے کے قبیلوں کے نمونے پر بنایا گیا تھا جو بناوٹی ڈھنگ سے نہیں بلکہ قدرتی طور پر بڑھ کر بنے تھے۔ بلکہ یہ ناممکن نہیں ہے کہ ان تینوں قبیلوں میں سے ہر ایک کے مرکز کا کام کسی پرانے اصلی قبیلے نے کیا ہو۔ قبیلے اور گن کے درمیان کی کڑی فریٹری تھی جس میں دس گن ہوتے تھے اور وہ یہاں ”کیوریا“ کہلاتی تھی چنانچہ ان کی کل تعداد تیس تھی۔

اسے سب مانتے ھیں کہ روما کے باشندوں کا گن اور یونانیوں کا گن ایک ھی چیز تھی۔ اگر یونانیوں کا گن اسی سماجی اکائی کا سلسلہ تھا جس کی ابتدائی شکل ھمیں امریکہ کے ریڈ انڈینوں میں دکھائی دیتی ھے تو ظاھر ھے کہ رومی گن کے بارے میں یہی بات صادق آتی ھے۔ اس لئے ھم اس کے بیان میں اور بھی اختصار سے کام لے سکتے ھیں۔

شہر روم کے کم سے کم سب سے ابتدائی زمانے میں رومی گن کا مندرجۂ ذیل دستور تھا :

۱۔ ایک دوسرے کی ملکیت وراثت میں پانے کا حق گن کے ممبروں کو تھا۔ ملکیت گن کے اندر ھی رھتی تھی۔ یونانی گن کی طرح رومی گن میں بھی چونکہ پدری حق قائم ھو چکا تھا ، اس لئے عورتوں کی نسل کے لوگ اس حق سے محروم کر دئے گئے تھے۔ بارہ جدول والے قانون کے مطابق (۱۳۵) ، اور جہاں تک ھمیں معلوم ھے روما کا سب سے پرانا لکھا ھوا قانون یہی ھے ، جب کوئی شخص مرتا تھا تو اس کی جائداد پر سب سے پہلے اس کی اپنی اولاد کا حق ھوتا تھا۔ اگر کسی شخص کی اپنی اولاد نہیں ھوتی تو جائداد اگناتیوں کو (یعنی باپ کی طرف کے مرد رشتہ‌داروں کو) ملتی تھی۔ اور اگر اگناتی بھی نہ ھوں تو جائداد پر مرنے والے کے گن کے لوگوں کا حق ھوتا تھا۔ ھر حالت میں جائداد گن کے اندر رھتی تھی۔ یہاں ھم دیکھتے ھیں کہ دھن دولت کے بڑھ جانے اور یک‌زوجگی کا رواج ھو جانے کی وجہ سے گن دستور کے عمل میں رفتہ رفتہ کچھ نئے قانون قاعدے داخل ھو گئے تھے۔ پہلے مرنےوالے کی جائداد پر گن کے سبھی ممبروں کا یکساں حق ھوتا تھا ، پھر عملاً یہ حق اگناتیوں تک ھی محدود کر دیا گیا — یہ شاید بہت دن پہلے کی بات ھے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ھے، بعد میں یہ حق مرنےوالے کی اولاد اور آخر الذکر کی مرد اولاد تک ھی محدود ھو گیا۔ لیکن ظاھر ھے کہ بارہ جدول‌والے قانون میں یہ بات الٹے سلسلے سے دی گئی ھے۔

۲۔ ھر گن کا ایک مشترک قبرستان ھوتا تھا۔ جب کلوڈیا نامی شرفا کا (پیٹریشین) ایک گن ریگیل سے روم میں آبسا تو اس کو شہر میں زمین کا ایک قطعہ اور ایک مشترک قبرستان ملا۔ آگسٹس کے

زمانے میں بھی جب ٹیوٹوبرگ کے جنگل میں وارس مارا گیا تو اس کے سر کو روم میں لاکر جینٹلیٹیئس ٹیومولس (gentilitius tumulus)* میں دفن کر دیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے گن (کوئنک ٹیلیا گن) کے پاس اس زمانے میں بھی اپنا الگ قبرستان تھا۔

۳۔ گن کے لوگ مل کر مذہبی تیوہار اور رسمیں منایا کرتے تھے۔ یہ سیکرا جینٹلیٹیا (sacra gentilitia) کہلاتی تھیں اور کافی مشہور تھیں۔

۴۔ گن کے ممبر گن کے اندر شادی نہیں کر سکتے تھے۔ روم میں اس پابندی نے کبھی باقاعدہ لکھے ہوئے قانون کا درجہ حاصل نہیں کیا مگر ایک رواج کے طور پر لوگ اسے مانتے رہے۔ روم کے بےشمار شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے نام ہمیں معلوم ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس میں شوہر اور بیوی دونوں کے گن کا نام ایک ہو۔ وراثت کے قانون سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ شادی ہو جانے پر عورت اگناتیوں کے حق سے محروم ہو جاتی تھی، اپنے گن سے الگ ہو جاتی تھی اور اس کا یا اس کے بچوں کا اس کے باپ اور باپ کے بھائیوں کی جائداد پر کوئی حق نہیں ہوتا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے باپ کی جائداد باپ کے گن کے باہر چلی جاتی۔ ظاہر ہے کہ اس قاعدے کا کوئی مطلب اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ہم یہ مان لیں کہ عورت کو خود اپنے گن کے کسی ممبر سے شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

۵۔ زمین گن کی مشترکہ ملکیت تھی۔ قدیم زمانے میں ہمیشہ یہی قاعدہ تھا۔ پھر قبیلے کی زمین پہلی بار تقسیم کی گئی۔ لاطینی قبیلوں میں ہم پاتے ہیں کہ زمین کسی حد تک قبیلے کی ملکیت تھی، کسی حد تک گن کی ملکیت تھی اور کسی حد تک الگ الگ کنبوں کی۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ایک کنبہ یا گھرانے کا مطلب ایک خاندان نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے رومولس نے الگ الگ افراد کو ایک ہیکٹر (دو "جگیرا") فی کس کے حساب سے

---

* گن کا ٹیلہ۔ (ایڈیٹر)

زمین بانٹی تھی۔ لیکن اس کے بعد بھی ہم پاتے ہیں کہ کچھ زمین گن کے پاس رہ گئی۔ اور ریاستی زمین کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ روما کی ریپبلک کی ساری اندرونی تاریخ اسی ریاستی زمین کے محور پر گھومتی رہی ہے۔

۶۔ گنوں کے ممبروں کا فرض ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کی مدد کریں اور کسی کا کوئی نقصان ہو جانے پر اس کی تلافی کی کوشش کریں۔ لکھی ہوئی تاریخ میں اس قاعدے کے کچھ بچے بچائے اثرات ہی ملتے ہیں۔ رومی ریاست نے شروع ہی سے اتنی اعلیٰ طاقت کا اظہار کیا تھا کہ نقصانوں کی تلافی کی ذمہ‌داری اسی کے اوپر آپڑی تھی۔ جب ایپیئس کلوڈیئس گرفتار ہو گیا تھا تو اس کے پورے گن نے حتی کہ اس کے ذاتی دشمنوں نے بھی، غم کے آنسو بہائے تھے۔ دوسری پیونک جنگ (۲۱۶) کے موقع پر مختلف گن اپنے ممبروں کو، جو قید کر لئے گئے تھے، تاوان دے کر رہا کرانے کےلئے ایک ہو گئے تھے[۵]۔ لیکن سینیٹ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔

۷۔ گن کے ممبروں کو اختیار تھا کہ وہ گن کا نام استعمال کریں۔ اس قاعدے پر شہنشاہوں کے وقت تک عمل ہوتا رہا۔ جو غلام آزاد کر دئے جاتے تھے، ان کو اپنے سابق مالکوں کے گن کا نام اختیار کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن انہیں گن کے ممبروں کے اختیارات نہیں ملتے تھے۔

۸۔ گن کو اختیار تھا کہ اجنبیوں کو اپنا ممبر بنا لے۔ یہ انہیں کسی خاندان کا ممبر بنا کر کیا جاسکتا تھا (ریڈ انڈینوں میں بھی یہی رواج تھا)۔ خاندان کا ممبر بن جانے پر انہیں گن کی ممبری بھی مل جاتی تھی۔

۹۔ سرداروں کو چننے اور برطرف کرنے کے اختیار کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن روم کے ابتدائی زمانے میں منتخب بادشاہ سے لے کر نیچے تک کے سبھی عہدے انتخاب یا تقرر کے ذریعے پر کئے جاتے تھے اور چونکہ مختلف ”کیوریا“ اپنے پروہتوں اور پجاریوں کو بھی چنا کرتی تھیں، اس لئے ہمارے لئے یہ مان لینا مناسب ہو گا کہ گنوں کے سرداروں یا پرنسیپیوں (principes) کو بھی اسی طرح مقرر کیا جاتا

تھا ، خواہ انہیں ایک ہی خاندان کے لوگوں میں سے چننے کا قاعدہ پوری طرح کیوں نہ مانا جاتا رہا ہو ۔

یہ تھے رومی گن کے اختیارات ۔ ایک پدری حق والی مکمل تبدیلی کو چھوڑ کر یہ ہوبہو وہی تصویر ہے جو ایروکواس گن کے حقوق اور فرائض کے بارے میں ہمیں ملی تھی ۔ یہاں بھی '' ایروکواس ہمیں صاف دکھائی پڑتا ہے ،، * ۔

روم کے گن نظام کے بارے میں ہمارے زمانے کے سب سے زیادہ مستند اور باوثوق مورخوں میں بھی کس طرح کی غلط فہمیاں اور الجھنیں پھیلی ہوئی ہیں ، اس کی ایک مثال یہ ہے : رپبلک اور آگسٹس کے عہد کے شخصی ناموں کے بارے میں مومسن نے جو مقالہ لکھا ہے ('' رومی تحقیقات ،، ۔ برلن ۱۸۶۴ ء ۔ جلد ۱ ۔ **) ، اس میں وہ کہتا ہے :

'' گن کا نام نہ صرف گن کے سبھی مرد ممبر استعمال کرتے ہیں ، جن میں وہ اجنبی بھی شامل ہیں جو گن کے ممبر بنا لئے گئے ہیں یا جو گن کی پناہ میں رہتے ہیں ، بلکہ عورتیں بھی اس کو استعمال کرتی ہیں ۔ ہاں ، صرف غلاموں کو گن کا نام استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی ... قبیلہ (Stamm ، جیسا کہ مومسن نے gens کا ترجمہ کیا ہے) ... ایک ایسا گروہ ہوتا ہے جس کے ممبروں کو ایک ہی مورث اعلی کی نسل سے مانا جاتا ہے اور ایک ہی رسم و رواج ، ایک قبرستان اور وراثت کے ایک ہی سے قاعدے اسے متحد کئے رہتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مشترک مورث اعلی واقعی کوئی شخص ہو یا اسے محض فرض کر لیا گیا ہو ، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مشترک مورث اعلی کو زبردستی گھڑ لیا گیا ہو ۔ انفرادی طور پر سب آزاد افراد کو اور اس لئے

---

* ملاحظہ ہو '' مارکس اور اینگلس کی دستاویزات ،، جلد ۹ ، صفحہ ۱۳۴ ۔ (ایڈیٹر)

** Th. Mommsen. «Römische Forschungen», Aufl.2, Bd. I, Berlin, 1864. (ایڈیٹر)

عورتوں کو بھی ، گن کے ممبروں کی حیثیت سے اپنا نام درج کرانا پڑتا تھا ۔ لیکن کسی شادی شدہ عورت کے گن کا نام طے کرنے میں کچھ مشکل ہوتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ جب تک یہ قاعدہ تھا کہ عورتیں اپنے گن کے ممبروں کے سوا اور کسی سے شادی نہیں کر سکتی تھیں ، تب تک ان کے گن کا نام طے کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی ۔ اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ایک لمبے عرصے تک عورتوں کے لئے گن کے باہر شادی کرنا ، اپنے گن کے اندر شادی کرنے کے مقابلے میں بہت دشوار ہوتا تھا ۔ چھٹی صدی تک بھی یہ ” گنٹیس انپٹیو “ (gentis enuptio) یا گن سے باہر شادی کرنے کا حق بعض خاص اشخاص کو مخصوص ذاتی حق یا انعام کے طور پر دیا جاتا تھا ... لیکن ابتدائی زمانے میں جب کبھی عورتوں کا اپنے قبیلے کے باہر بیاہ ہوتا ہوگا تب انہیں اپنے شوہر کے قبیلے میں شامل کر دیا جاتا ہوگا ۔ اس سے زیادہ یقین کے ساتھ اور کوئی بات نہیں کہی جا سکتی کہ قدیم مذہبی شادی کے ذریعے سے عورت پوری طرح سے اپنے شوہر کی قانونی اور مذہبی رسوم کی برادری میں شامل ہو جاتی تھی اور خود اپنی ایسی برادری کو چھوڑ دیتی تھی ۔ یہ کون نہیں جانتا کہ شادی شدہ عورت نہ تو اپنے گن کے رشتہ‌داروں کی جائداد وراثت میں پا سکتی ہے اور نہ اپنی جائداد وراثت میں ان کے لئے چھوڑ سکتی ہے ۔ جہاں تک وراثت کا سوال ہے وہ اپنے شوہر ، اپنی اولاد اور شوہر کے گن کے رشتہ‌داروں کے گروہ میں شامل ہو جاتی ہے ۔ اور اگر اس کا شوہر اسے اپنی اولاد کی مانند قبول کر لے اور اپنے خاندان میں شامل کر لے ، تب وہ اس کے گن سے کیسے الگ رہ سکتی ہے ؟ “
(صفحات ۱۱ — ۸)

اس طرح مومسن کا کہنا ہے کہ رومی عورتوں کو جو کسی ایک خاص گن کی رکن تھیں شروع میں صرف اپنے گن کے اندر ہی شادی کرنے کی آزادی تھی ۔ مطلب یہ کہ مومسن کے خیال کے مطابق رومی گن گوت باہر شادی کرنےوالے (exogamous) نہیں بلکہ گوت اندر

شادی کرنےوالے (endogamous) تھے۔ یہ رائے جو کہ تمام دوسری جاتیوں کے تجربے کے خلاف جاتی ہے، اگر بالکل نہیں تو بڑی حد تک لیوی کی محض ایک عبارت پر مبنی ہے جس کی صحت کے بارے میں ابھی کافی اختلاف ہے۔ لیوی کی تاریخ (جلد ۳۹، باب ۱۹) کی اس عبارت میں کہا گیا ہے کہ روم کے قائم ہونے کے ۵۶۸ ویں برس میں یعنی ۱۸۶ ق۔ م۔ میں سینیٹ نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ

«uti Feceniae Hispalae datio, deminutio, gentis enuptio, tutoris optio item esset quasi ei vir testamento dedisset; utigue ei ingenuo nubere liceret, neu quid ei qui eam duxisset, ob id fraudi ignominiaeve esset» ''فیسینیا ہسپلا کو اپنی جائداد چاہے جسے دے دینے کا، اسے کم کرنے کا، گن کے باہر شادی کرنے کا اور اپنا محافظ چننے کا اسی طرح حق ہوگا جس طرح اس حالت میں ہوتا اگر اس کا (متوفی) شوہر وصیت کرکے اسے یہ تمام اختیار دے گیا ہوتا۔ اسے کسی آزاد مرد کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور جو مرد اس سے شادی کرے گا، اس کے لئے یہ کوئی غلط بات یا ذلت کی بات نہیں سمجھی جائےگی۔ ''

اس میں شک نہیں کہ فیسینیا، جس کو غلامی سے آزاد کیا گیا تھا، اسے یہاں گن سے باہر شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ شوہر کو حق دیا گیا کہ وصیت کرکے اپنی بیوی کو یہ اجازت دے کہ اس کے مرنے پر وہ گن کے باہر شادی کرے۔ لیکن سوال ہے کہ کس گن کے باہر ؟

اگر ہر عورت کو اپنے گن کے اندر شادی کرنی پڑتی تھی، جیسا کہ مومسن مان کر چلتا ہے تو وہ شادی کےبعد بھی اسی گن میں رہتی تھی۔ لیکن ایک تو ابھی یہی ثابت کرنا باقی ہے کہ گن صرف اپنے اندر شادی کرنے کی اجازت دیتا تھا۔ دوسرے اگر عورت کو اپنے گن کےاندر شادی کرنی پڑتی تھی تو مرد کےلئے بھی یہی ضروری تھا ورنہ اسے کوئی عورت ملتی ہی نہیں۔ تب اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وصیت کےذریعے مرد اپنی بیوی کو ایسا حق دے سکتا تھا جو خود

اسے بھی حاصل نہیں تھا ۔ قانونی نقطۂ نظر سے یہ ایک بالکل مہمل بات ہے ۔ مورگن بھی یہ محسوس کرتا ہے اور اسی لئے یہ اٹکل لگاتا ہے :

"بہت ممکن ہے کہ گن کے باہر شادی کرنے کے لئے نہ صرف ذی اقتدار شخص کی بلکہ گن کے سبھی ممبروں کی منظوری لینا ضروری ہو" (صفحہ ۱۰۰ ، حاشیہ) ۔

ایک تو یہاں مورگن نے ایک بہت بڑی بات یونہی فرض کرلی ہے۔ دوسرے ، مذکورۂ بالا عبارت میں جو بات صاف لکھی ہے ، اس کی اس سے تردید ہوتی ہے ۔ فیسینیا کو یہ اختیار اس کے شوہر کے بجائے سینیٹ دے رہی ہے ۔ فیسینیا کا شوہر اس کو جو اختیار دے سکتا تھا ، سینیٹ اسے نہ اس سے کم دے رہی ہے اور نہ زیادہ ۔ لیکن سینیٹ جو کچھ دے رہی ہے وہ ایک مکمل اختیار ہے ، جس پر کوئی پابندی نہیں ہے ، تاکہ اگر فیسینیا اس اختیار کو استعمال کرے تو اس کے نئے شوہر کو کوئی پریشانی نہ اٹھانی پڑے ۔ بلکہ سینیٹ موجودہ اور آئندہ قونصلوں اور پریٹروں کو یہ ہدایت بھی دیتی ہے کہ انہیں اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے کہ اس اختیار سے کام لینے کی وجہ سے فیسینیا کو کوئی تکلیف نہ ہو ۔ اس لئے مورگن نے جو بات فرض کی ہے وہ بالکل غلط معلوم ہوتی ہے ۔

پھر مان لیجئے کہ کوئی عورت کسی دوسرے گن کے آدمی سے شادی کر لیتی ہے ، لیکن رہتی اپنے گن میں ہی ہے ۔ مذکورۂ بالا واقعے کے مطابق ایسی صورت میں اس کے شوہر کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کو گن کے باہر شادی کرنے کی اجازت دے دے ۔ مطلب یہ کہ شوہر کو ایک ایسے گن کے معاملے میں دخل اندازی کرنے کا اختیار ہوگا جس کا وہ خود ممبر نہیں ہے ۔ یہ بات اتنی نامعقول ہے کہ اس کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ۔

ایسی حالت میں ہمارے سامنے یہ مان کر چلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ اپنی پہلی شادی کے ذریعے عورت نے دوسرے گن کے مرد سے بیاہ کیا تھا اور ایسا کرنے پر وہ فوراً اپنے شوہر کے گن کی ممبر ہو گئی ۔ خود مورگن بھی مانتا ہے کہ ایسی صورت میں

یہی ہوتا تھا۔ اور یہ مانتے ہی گتھی اپنے آپ سلجھ جاتی ہے۔ عورت کو اس کی شادی نے اپنے گن سے علحدہ کر دیا ہے اور وہ اپنے شوہر کے گن میں شامل ہو گئی ہے۔ اس نئے گن میں اس کی ایک مخصوص حیثیت ہو گئی ہے۔ وہ گن کی ممبر ہے مگر گن کے باقی لوگوں سے اس کا خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ جس طریقے سے وہ گن کی ممبر بنائی گئی ہے، اس کی روشنی میں اس پر یہ روک نہیں لگائی جا سکتی کہ وہ اپنے اس نئے گن کے اندر شادی نہ کرے کیونکہ وہ تو شادی کرکے ہی اس گن میں شامل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ وہ گن کی ایک شادی شدہ ممبر سمجھی جاتی ہے اور اپنے شوہر کے مرنے پر اس کی جائداد کا ایک حصہ پانے کی حقدار ہوتی ہے یعنی اس جائداد کو گن کے ایک ساتھی ممبر کی جائداد کہا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ قدرتی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ جائداد کو گن کے باہر نہ جانے دینے کی غرض سے عورت کے لئے یہ لازمی قرار دیا جائے کہ وہ اپنے پہلے شوہر کے گن کے کسی آدمی سے ہی شادی کرے اور دوسرے کسی گن کے آدمی سے شادی کرنے کا ارادہ نہ کرے؟ لیکن اگر اس قاعدے سے کسی کو مستثنی کرنا ہے تو اس کی اجازت دینے کا حق اس آدمی سے یعنی عورت کے پہلے شوہر سے زیادہ اور کس کو ہوگا جو اپنی جائداد اس کے لئے چھوڑے جا رہا ہے؟ جس وقت وہ اپنی جائداد کا ایک حصہ اپنی بیوی کے نام وصیت کرتا ہے اور ساتھ ہی اسے اس بات کی اجازت دے دیتا ہے کہ وہ چاہے تو شادی کے ذریعے یا شادی کے نتیجے کے طور پر یہ جائداد کسی اور گن میں منتقل کر دے، تو اس وقت تک وہی اس جائداد کا مالک تھا، یعنی وہ حقیقتاً صرف اپنی جائداد کی وصیت کر رہا تھا۔ جہاں تک عورت کا اپنے شوہر کے گن کے ساتھ تعلق کا معاملہ ہے، اسے گن میں لانے والا اس کا شوہر تھا جو اپنی مرضی سے شادی کرکے اسے اپنے گن میں لے آیا تھا۔ چنانچہ یہ بات بھی بالکل قدرتی معلوم ہوتی ہے کہ عورت کو نئی شادی کرکے اس گن کو چھوڑ دینے کی اجازت دینےوالا شخص اس کا شوہر ہی ہو سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ جوں ہی ہم رومی لوگوں کے گن کے بارے میں یہ عجیب خیال ترک کر دیتے ہیں کہ وہ اندر

شادی کرنےوالا گن تھا اور جوں ھی ھم مارگن کی طرح یہ مان لیتے ھیں کہ وہ باھر شادی کرنےوالا گن تھا ، ویسے ھی یہ سارا معاملہ بہت سیدھا اور صاف معلوم ھونے لگتا ھے ۔

آخر میں ، ایک اور بھی رائے ھے جس کے حامیوں کی تعداد شاید سب سے زیادہ ھے ۔ اس رائے کے ماننےوالوں کا کہنا ھے کہ لیوی کے مذکورۂ بالا اقتباس کا مطلب صرف یہ ھے کہ

”جو لڑکیاں غلامی سے آزاد کی جاتی ھیں (libertae) وہ بغیر خاص اجازت (e gente enubere) کے ، گن کے باھر شادی نہیں کر سکتیں اور نہ کوئی ایسا قدم اٹھا سکتی ھیں جس کا خاندانی حقوق کے خفیف‌ترین نقصان (capitis deminutio minima) سے تعلق ھونے کے باعث لڑکی (liberta) گن سے علحدہ ھو جائے“ (لانگے ، ”رومی آثار قدیمہ“ ، برلن ، ۱۸۵۶ ء ، حصہ ۱ ، صفحہ ۱۹۵ * ۔ اس کتاب میں ھشکے کا ذکر کرتے ھوئے لیوی کے مذکورۂ بالا اقتباس پر رائےزنی کی گئی ھے) ۔

اگر یہ مفروضہ صحیح ھے تو لیوی کے اقتباس سے روم کی آزاد عورتوں کے بارے میں تو کچھ بھی نہیں معلوم ھوتا اور تب یہ ماننے کی اور بھی کم بنیاد رہ جاتی ھے کہ روم کی آزاد عورتوں کو صرف اپنے گن کے اندر شادی کرنی پڑتی تھی ۔

انپٹیو گنٹیس (enuptio gentis — گن کے باھر شادی) کا فقرہ صرف اسی ایک عبارت میں استعمال ھوا ھے ۔ روم کے سارے ادب میں اور کہیں یہ لفظ نہیں ملتے ۔ لفظ اینوبرے (enubere) جس کا مطلب باھر شادی کرنا ھوتا ھے ، لیوی کی کتاب میں ھی تین مرتبہ ملتا ھے لیکن کہیں بھی اس کا استعمال گن کے سلسلے میں نہیں کیا گیا ھے ۔

---

* Lange L., «Römische Alterthümer», Bd. I, Berlin, 1856. S. 195.
(ایڈیٹر)

یہ بے بنیاد خیال کہ روم کی عورتوں کو صرف اپنے گن کے اندر شادی کرنے کی اجازت تھی ، محض اس ایک عبارت پر ٹکا ہوا ہے ۔ لیکن اس خیال میں ذرا بھی جان نہیں کیونکہ یا تو اس عبارت میں آزاد کی ہوئی غلام عورتوں کی مخصوص پابندیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ایسی صورت میں اس سے ان عورتوں کے بارے میں کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا جو آزاد پیدا ہوئی تھیں (ingenuae) ۔ اور یا وہ عبارت ان عورتوں پر بھی لاگو ہوتی ہے جو آزاد پیدا ہوئی تھیں اور ایسی حالت میں اس سے یہ زیادہ ثابت ہوتا ہے کہ گن کے باہر عورتوں کے شادی کرنے کا قاعدہ تھا اور شادی ہونے پر انہیں ان کے شوہروں کے گن میں شامل کر لیا جاتا تھا ۔ اس لئے یہ اقتباس مومسن کی رائے کے خلاف مارگن کی رائے کو تقویت پہونچاتا ہے ۔

روم کے قائم ہونے کے تین سو برس بعد بھی گن کے بندھن اتنے مضبوط تھے کہ فےبین نامی ایک پتریشین (شرفا کے) گن نے سینیٹ سے اجازت لے کر پڑوس کے ویئی نامی شہر پر اکیلے ہی چڑھائی کر دی تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ تین سو چھہ فےبین چڑھائی کرنے نکلے تھے اور راستے میں چھپے ہوئے دشمن نے ان کا صفایا کر دیا ۔ صرف ایک لڑکا زندہ بچا جس نے گن کو آگے چلایا ۔

جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں ، دس گن مل کر ایک فریٹری بنتی تھی جو روم میں کیوریا کہلاتی تھی اور اسے یونانی فریٹری سے زیادہ اہم ذمہ‌داریاں ادا کرنی ہوتی تھیں ۔ ہر کیوریا کے الگ مذہبی رسم و رواج ، تبرکات اور پروہت پجاری ہوتے تھے ۔ یہ پروہت مل کر روم کی ایک پروہت منڈلی بناتے تھے ۔ دس کیوریا مل کر ایک قبیلہ بنتا تھا جو کہ شروع میں دوسرے لاطینی قبیلوں کی طرح ، شاید خود اپنا سردار چنا کرتا تھا ۔ یہ سردار جنگ میں قبیلے کی رہنمائی کرتا تھا اور ساتھ ہی بڑے پروہت کا بھی کام کرتا تھا ۔ تین قبیلے مل کر رومی جاتی پوپولس رومینس (populus romanus) کہلاتے تھے ۔

اس طرح رومی جاتی میں صرف وہی لوگ شامل ہو سکتے تھے جو کسی گن کے اور اس لئے کسی کیوریا اور قبیلے کے ممبر تھے ۔ ان لوگوں کا پہلا دستور حسب‌ذیل تھا : امور عامہ کا انتظام سینیٹ کے

ہاتھ میں تھا۔ سینیٹ کے ممبر ، جیسا کہ نیبور نے سب سے پہلے صحیح بتایا تھا ، تین سو گنوں کے سردار ہوتے تھے۔ گنوں کے سرداروں کی حیثیت سے وہ باپ یا پاتریس (patres) کہلاتے تھے اور ان سب کا بحیثیت ایک جماعت کے سینیٹ نام تھا (جس کا مطلب ہے بزرگوں کی جماعت ، کیونکہ سینکس (senex) کا مطلب ہے بوڑھا) ۔ یہاں بھی چونکہ ہر گن کے سردار کو عام طور پر ایک مخصوص خاندان میں سے چننے کا رواج تھا اس لئے ان سے پہلا موروثی شرفا کا طبقہ پیدا ہوا۔ یہ خاندان اپنے کو پتریشین کہتے تھے اور دعوی کرتے تھے کہ سینیٹ کا ممبر ہونے اور ریاست کے مختلف عہدوں پر مقرر ہونے کا حق صرف انہیں کو ہے۔ کچھ دنوں بعد عوام نے ان کے اس دعوے کو مان لیا اور وہ ایک اصلی حق بن گیا۔ پرانی روایت کے مطابق یہ بات اس طرح کہی جاتی ہے کہ پہلی بار جو لوگ سینیٹ کے ممبر چنے گئے تھے ان کو اور ان کی آئندہ نسلوں کو رومولس نے پتریشین (شرفا کے) طبقے کا مرتبہ اور اس کے کچھ مخصوص حق عطا کئے۔ ایتھنز کی بولے (bulê) کی مانند رومی سینیٹ کو بھی بہت سے معاملوں میں فیصلہ کر دینے کا اختیار تھا۔ اور زیادہ اہم معاملوں میں ، مثلاً کوئی نیا قانون بنانے کا سوال اٹھنے پر ، ابتدائی بحث سینیٹ میں ہوتی تھی اور فیصلہ عوامی اسمبلی میں کیا جاتا تھا جو کہ comitia curiata (کیوریاؤں کی اسمبلی) کہلاتی تھی۔ اسمبلی میں لوگ اپنی اپنی کیوریا کے ممبروں کے ساتھ بیٹھتے تھے اور ہر کیوریا میں شاید ایک ایک گن کے لوگ ساتھ بیٹھتے تھے اور سوالوں پر فیصلہ کرتے وقت تیسوں کیوریاؤں میں سے ہر ایک کا ایک ووٹ ہوتا تھا۔ کیوریاؤں کی یہ اسمبلی قانون منظور یا رد کرتی تھی ، تمام اونچے عہدہ داروں کو چنتی تھی جن میں rex (نام‌نہاد بادشاہ) بھی ہوتا تھا ، جنگ کا اعلان کرتی تھی (لیکن صلح سینیٹ کرتی تھی) اور ایک عدالت عالیہ کی حیثیت سے ، فریقین کی اپیل پر ، ان تمام مقدمات کو ، جن میں رومی شہریوں کو موت کی سزا مل سکتی تھی ، فیصل کرتی تھی۔ آخر میں سینیٹ اور عوامی اسمبلی کے ساتھ ساتھ rex ہوتا تھا جسے ٹھیک یونانی بیسیلیئس کی مانند سمجھنا چاہئے اور جو اس طرح کا مطلق العنان بادشاہ کبھی نہیں تھا جیسا کہ

مومسن نے اسے بنا دیا ہے * ۔ ریکس فوجی سالار کا، بڑے پروہت کا اور کچھ عدالتوں میں صدراعلی کا کام کرتا تھا ۔ اس پر کوئی دیوانی کی ذمہ‌داری نہیں تھی ۔ فوجی سالار کی حیثیت سے ڈسپلن قائم رکھنے کے اختیارات اور عدالتوں کے صدر کی حیثیت سے سزا دینے کے اختیار کے علاوہ اس کو شہریوں کی زندگی، ان کی آزادی اور ان کی جائداد پر کوئی اختیار نہیں تھا ۔ ریکس کا عہدہ موروثی نہیں تھا ۔ اس کے برعکس شروع میں اس کا انتخاب ہوا کرتا تھا ۔ شاید اس کا پیش‌رو عہدہ‌دار اسے نامزد کرتا تھا اور کیوریاؤں کی اسمبلی اسے منتخب کرتی تھی اور ایک دوسرے اجلاس میں اسے باقاعدہ گدی پر بٹھایا جاتا تھا ۔ اسے گدی سے ہٹایا بھی جا سکتا تھا اور یہ بات ٹارکوئی‌نیئس سوپربس کے انجام سے ثابت ہے ۔

سورمائی عہد کے یونانیوں کی طرح، نام نہاد بادشاہوں کے زمانے کے رومی لوگ بھی ایک فوجی جمہوریت میں رہتے تھے جو گنوں، فریٹریوں اور قبیلوں پر مبنی تھی اور انہی سے اس کی نشوونما ہوئی تھی ۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ کیوریا اور قبیلے ایک حد تک بناوٹی ڈھنگ سے قائم کئے

---

* لاطینی زبان کا لفظ rex، کیلٹک آئرش زبان کے righ (قبیلے کا سردار) اور گوتھک زبان کے reiks سے ملتا جلتا ہے ۔ جرمن زبان کے لفظ Fürst (انگریزی زبان کا first اور ڈینش کا förste) کی طرح اس لفظ کا بھی شروع میں یہی مطلب تھا — گن یا قبیلے کا سردار ۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ چوتھی صدی تک گوتھ لوگوں کے پاس بعد کے زمانے کے بادشاہ کے لئے یعنی پوری جاتی کے فوجی سالار کے لئے ایک خاص لفظ ہو گیا تھا ۔ وہ لفظ تھا : thiudans ۔ بائبل کے الفیلا کے ترجمے میں آردشیر اور ہیرود کو کبھی reiks نہیں کہا گیا ہے بلکہ ان کو ہر جگہ thiudans کے لقب سے یاد کیا گیا ہے ۔ اور شہنشاہ ٹائی‌بیرئس کی مملکت کو reiki نہیں کہا گیا ہے بلکہ تھیوڈی‌ناسس (thiudinassus) کہا گیا ہے ۔ گوتھک تھیوڈانس یا بادشاہ کے نام میں، جیسا کہ ہم اکثر غلط ترجمہ کرتے ہیں، دو نام ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور یہ دو نام ہیں تھیوڈیرائکس، تھیوڈوریک یعنی ڈائٹریک ۔

گئے تھے لیکن انہیں اس سماج کے اصلی اور قدرتی نمونوں کے مطابق بنایا گیا تھا جس سماج سے وہ پیدا ہوئے تھے اور جو ان کے قائم ہونے کے وقت بھی چاروں طرف سے ان کو گھیرے ہوئے تھا۔ اور حالانکہ اس زمانے تک پتریشین شرفا کے طبقے کا ، جس کی نشوونما قدرتی طور پر ہو گئی تھی ، کافی زور ہو گیا تھا اور حالانکہ ریکس لوگ اپنے اختیارات کا دائرہ بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے ، پھر بھی اس سے دستور کی ابتدائی اور بنیادی شکل نہیں بدلتی۔ اور اہمیت اسی کی ہے۔

اسی دوران میں شہر روم اور رومی علاقے کی آبادی بڑھ گئی۔ فتوحات کے ذریعے یہ علاقہ پھیل گیا۔ اس میں نئے اور زیادہ‌تر لاطینی علاقے قبضہ کرکے ملا لئے گئے۔ کچھ تو ان علاقوں کے لوگوں کی وجہ سے آبادی بڑھی اور کچھ یہ بھی ہوا کہ باہر کے لوگ رومی علاقے میں آکر بس گئے۔ یہ ساری نئی رعایا (فی الحال ہم clients ، یعنی سرپرستی میں بسنے والے آزاد باشندوں کے سوال سے بحث نہیں کر رہے ہیں) پرانے گنوں ، کیوریاؤں اور قبیلوں کے باہر تھی اور اس لئے populus romanus کا یعنی رومی لوگوں کا حصہ نہیں تھی۔ یہ لوگ انفرادی طور پر آزاد تھے۔ وہ زمین کے مالک ہو سکتے تھے۔ انہیں ٹیکس دینا اور فوج میں کام کرنا پڑتا تھا۔ لیکن انہیں کوئی عہدہ نہیں مل سکتا تھا اور نہ وہ کیوریاؤں کی اسمبلی میں حصہ لے سکتے تھے اور نہ فتح کی ہوئی ریاستی زمین کے بٹوارے میں انہیں کوئی حصہ مل سکتا تھا۔ یہ عام لوگ (پلےبین) تھے جو تمام سیاسی اختیارات اور حقوق سے محروم تھے۔ چونکہ ان کی تعداد برابر بڑھتی جا رہی تھی ، وہ فوجی تربیت پا چکے تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی تھے ، اس لئے وہ اس قدیم populus کے لئے ایک خطرہ بن گئے جس نے اب اپنے دروازوں کو بالکل بند کر دیا تھا تاکہ اس کی تعداد میں کوئی اضافہ نہ ہو سکے۔ اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ populus اور پلےبین لوگوں کے درمیان زمین کا بٹوارہ بڑی حد تک برابر برابر ہوا تھا اگرچہ تجارتی اور صنعتی دولت ، جو ابھی بہت کافی نہیں ہوئی تھی ، زیادہ‌تر پلےبین لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔

رومی تاریخ کی تمام تر افسانوی سی ابتدا بالکل تاریکی میں لپٹی

ہوئی ہے ۔ بعد کے جن مصنفوں کی کتابوں سے ہمیں روم کی تاریخ کا مواد ملتا ہے ، انہوں نے قانون کی تعلیم پائی تھی اور انہوں نے معقولیت پرستی اور عملیت کے نظرئیے کے مطابق اس کا مطلب نکالنے کی کوشش کر کے اس تاریکی کو اور گہرا کر دیا ہے ۔ اس لئے یقین کے ساتھ یہ کہنا ناممکن ہے کہ پرانے گن دستور کو جس انقلاب نے ختم کیا وہ کب ، کیوں اور کیسے ہوا تھا ۔ اس سلسلے میں یقین کے ساتھ ہم صرف ایک بات کہہ سکتے ہیں اور وہ یہ کہ اس انقلاب کی تہہ میں پلے‌بین اور populus کی کشمکش کام کر رہی تھی ۔

نیا دستور ریکس سرویئس ٹولیئس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ۔ وہ یونانی دستوروں اور خاص کر سولون کے دستور کے نمونے پر بنایا گیا تھا ۔ اس نے ایک نئی عوامی اسمبلی قائم کی جس میں populus اور پلے‌بین دونوں طرح کے لوگوں کو بغیر کسی فرق کے صرف اس بنیاد پر حصہ لینے یا نہ لینے کی اجازت دی جاتی تھی کہ انہوں نے فوجی خدمت انجام دی ہے یا نہیں ۔ آبادی کے تمام مردوں کو ، جن سے فوجی خدمت لی جا سکتی تھی ، دولت کے مطابق چھ طبقوں میں بانٹ دیا گیا تھا ۔ پہلے پانچ طبقوں کے لئے سلسلہ‌وار کم سے کم حسب ذیل قیمت کی جائداد ہونی ضروری تھی : پہلا طبقہ ایک لاکھ اسسے ، دوسرا طبقہ ۷۵ ہزار اسسے ، تیسرا طبقہ ۵۰ ہزار اسسے ، چوتھا طبقہ ۲۵ ہزار اسسے ، پانچواں طبقہ ۱۱ ہزار اسسے ۔ دیورو دے لہ مال کے اندازے کے مطابق یہ تقریباً ۱۴ ہزار ، ۱۰۵۰۰ ، ۷۰۰۰ ، ۳۶۰۰ اور ۱۵۷۰ مارک کے برابر ہوتے ہیں ۔ چھٹا طبقہ پرولتاریوں کا تھا جن کے پاس اس سے بھی کم تھا اور جنہیں فوجی خدمت اور ٹیکسوں سے بری کر دیا گیا تھا ۔ سنٹوریاؤں کی نئی اسمبلی (comitia centuriata) میں شہریوں کو فوجی سپاہیوں کی طرح سو سو کی ٹکڑیوں میں (اسی کو سنٹوریا کہتے تھے) صف بند ہوکر بیٹھنا پڑتا تھا اور ہر سنٹوریا کا ایک ووٹ ہوتا تھا ۔ پہلا طبقہ ۸۰ سنٹوریا بھیجتا تھا ، دوسرا طبقہ ۲۲ ، تیسرا طبقہ ۲۰ ، چوتھا طبقہ ۲۲ ، پانچواں طبقہ ۳۰ اور چھٹا طبقہ بھی رسم ادائگی کے طور پر ایک سنٹوریا بھیجا کرتا تھا ۔ اس کے علاوہ گھوڑ سواروں کی ۱۸ سنٹوریائیں ہوتی تھیں جن میں سب سے زیادہ دولتمند لوگ ہی لئے جاتے

تھے ۔ کل ملا کر ۱۹۳ سنٹوریائیں ہوتی تھیں ۔ اکثریت حاصل کرنے کے لئے ۹۷ ووٹ ضروری ہوتے تھے ۔ مگر گھوڑ سواروں اور پہلے طبقے کو ہی ملا کر ۹۸ ووٹ ہو جاتے تھے اور اس طرح نئی عوامی اسمبلی میں ان کی اکثریت تھی ۔ جب گھوڑ سواروں اور پہلے طبقے کے لوگوں میں اختلاف نہیں ہوتا تھا تو وہ دوسروں سے پوچھتے تک نہیں تھے اور خود فیصلہ کر ڈالتے تھے ۔ اور یہ فیصلے سب کو ماننے پڑتے تھے ۔

اب پرانی کیوریاؤں کی اسمبلی کے سبھی سیاسی اختیارات (محض نام کے لئے کچھ اختیارات کو چھوڑ کر باقی سب) سنٹوریاؤں کی اس نئی اسمبلی کو مل گئے ۔ اور تب، جیسا کہ ایتھنز میں ہوا تھا ، کیوریاؤں اور گنوں کی حیثیت محض لوگوں کے نجی اور مذہبی اداروں کی رہ گئی اور اس حیثیت سے وہ بہت دنوں تک گھسٹتے ہوئے زندہ رہے حالانکہ کیوریاؤں کی اسمبلی کو لوگ جلد ہی بھول گئے ۔ تین پرانے قبیلوں کو بھی جو گن پر مبنی تھے ، ریاست سے الگ کرنے کے لئے چار علاقائی قبیلے بنائے گئے ۔ ہر قبیلہ شہر کے ایک چوتھائی حصے میں رہتا تھا اور اسے کچھ سیاسی اختیارات حاصل تھے ۔

اس طرح روم میں بھی خون کے ذاتی رشتوں کی بنیاد پر جو پرانا سماجی نظام قائم تھا ، وہ نام نہاد بادشاہت کے ختم ہونے سے پہلے ہی ، برباد کر دیا گیا اور اس کی جگہ علاقوں کی تقسیم اور دولت کے فرق کی بنیاد پر ایک نیا دستور ، صحیح معنی میں ایک ریاستی دستور قائم ہوا ۔ یہاں اقتدار عامہ ان شہریوں کے ہاتھ میں تھا جن سے فوجی خدمت لی جاتی تھی اور اس کا رخ صرف غلاموں کے خلاف نہیں تھا بلکہ پرولتاری کہلانے والے لوگوں کے خلاف بھی تھا جنہیں فوجی خدمت سے الگ رکھا گیا تھا اور جن کو ہتھیار رکھنے کا حق نہیں تھا ۔

جب آخری رومی ریکس ٹارکوئی نیئس سوپربس کو ، جو طاقت غصب کر کے سچ مچ بادشاہ بن گیا تھا ، ملک بدر کر دیا گیا اور ایک ریکس کی جگہ پر دو برابر اختیار رکھنے والے فوجی کمانڈر (قونصل) مقرر کئے گئے (جیسا کہ ایروکواس لوگوں میں بھی ہوتا تھا) ، تو نئے دستور نے مزید ترقی ہی کی ۔ اسی دستور کے دائرے کے اندر رومی ریپبلک کی تاریخ کا پہیہ گھومتا رہا ہے ۔ اسی کے اندر عہدوں اور

ریاستی زمین کے حصے کے لئے پتریشین اور پلےبین لوگوں کی تمام جد و جہد ہوتی رہی ہے ۔ اور آخر میں اسی کے اندر پتریشین شرفا زمین اور نقد روپئے کے ان بڑے بڑے مالکوں کے طبقے میں گھل مل گئے جنہوں نے فوجی خدمت سے برباد ہونےوالے کسانوں کی ساری زمین رفتہ رفتہ اپنے قبضے میں کر لی تھی اور اس طرح زمین کے بڑےبڑے رقبے حاصل کرکے غلاموں کی مدد سے کھیتی کرنے لگے تھے ، جنہوں نے اٹلی کو ویران کر دیا اور اس طرح نہ صرف شہنشاہوں کی حکومت کے لئے بلکہ ان کے جانشین بربری جرمنوں کے لئے بھی راستہ صاف کر دیا ۔

۷

کیلٹ اور جرمن لوگوں میں گن

جگہ کی کمی کی وجہ سے ہم گن نظام کے ان اداروں کا تذکرہ نہیں کر سکتے جو موجودہ زمانے کے بھانت بھانت کے وحشی اور بربری لوگوں میں آج بھی کم‌وبیش خالص صورت میں پائے جاتے ہیں اور نہ ہم ایشیا کی متمدن قوموں کی قدیم تاریخ میں ان اداروں کے آثار کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ یہ ادارے یا ان کے آثار ہر جگہ ملتے ہیں۔ کچھ مثالیں کافی ہونگی۔ جس وقت گن کو پہچانا بھی نہیں گیا تھا، اس وقت اس کا تذکرہ اس آدمی نے کیا اور اس کے بنیادی خدوخال صحیح طور پر بتائے جس نے اس کو غلط ڈھنگ سے سمجھنے کےلئے سب سے زیادہ زحمت اٹھائی تھی۔ ہماری مراد میکلینن سے ہے جس نے کالمیک، چرکس، سامویڈ (Samojeden) * میں اور ہندستان کی تین جاتیوں — وارلی، ماگر اور منی‌پوریوں میں گن نظام پایا تھا اور اس کے بارے میں لکھا تھا۔ حال میں میکسم کوالیفسکی نے اس کی تصویر کشی کی ہے۔ اسے پشاو، خیوسور، سوانیوں اور قفقاز کے اور متعدد قبیلوں میں اس کا سراغ ملا ہے۔ کیلٹ اور جرمن لوگوں میں بھی گن ہوتے تھے اور یہاں ہم اسی کے بارے میں چند مختصر باتوں تک اپنے آپ کو محدود رکھیں‌گے۔

قدیم‌ترین کیلٹی قوانین جو ہم تک پہونچے ہیں، آج بھی

---

* آجکل انھیں نینسی کہتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

گن کی زندگی کی بھرپور تصویر کشی کرتے ھیں ۔ آئرلینڈ میں جہاں انگریزوں نے زبردستی گن نظام کو برباد کر ڈالا ، وہ آج بھی کم سے کم نیم شعوری طور پر لوگوں کے ذھن میں زندہ ھے ۔ اسکاٹلینڈ میں وہ گذشتہ صدی کے وسط تک پوری توانائی کے ساتھ پایا جاتا تھا اور وھاں بھی اسے صرف انگریزوں کے ھتھیاروں ، قانونوں اور عدالتوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے ھیں ۔

ویلز کے پرانے قانون انگریزوں کی فتح سے (۱۳۷) کئی صدی پہلے لکھے گئے تھے ۔ وہ گیارھویں صدی تک تیار ھو چکے تھے ۔ ان سے پتہ چلتا ھے کہ کہیں کہیں پورے گاؤں کے گاؤں مل کر کھیتی کرتے تھے حالانکہ اس زمانے تک یہ چیز ایک پرانے عام رواج کے باقی‌ماندہ اثر کے طور پر ھی کہیں کہیں رہ گئی تھی اور مستثنی حیثیت رکھتی تھی ۔ ھر خاندان کے پاس پانچ ایکڑ زمین خود جوتنے کے لئے ھوتی تھی اور ایک ٹکڑا دوسرے خاندانوں کے ساتھ مل کر جوتنے کے لئے ھوتا تھا ۔ اس ٹکڑے کی پیداوار سب میں بٹ جاتی تھی ۔ آئرلینڈ اور اسکاٹلینڈ کی اتنی ملتی جلتی مثالوں کی بنیاد پر اگر ویلز کی ان دیہی برادریوں کا جائزہ لیا جائے تو اس بات میں ذرہ برابر شبہ کی گنجائش نہیں رھےگی کہ وہ یا تو گن کی نمائندہ ھیں یا گن کی شاخیں — خواہ ویلز کے قوانین کی پھر سے چھان بین کرنے پر ، جو میں اس موقع پر وقت کی تنگی کی وجہ سے نہیں کر سکتا ، (میرے نوٹ ۱۸۶۹ء کے ھیں) (۱۳۸) اس کا کوئی براہ‌راست ثبوت ملے یا نہ ملے ۔ لیکن ویلز اور آئرلینڈ کے مواد سے جس بات کا براہ راست ثبوت مل جاتا ھے وہ یہ کہ گیارھویں صدی تک کیلٹ لوگوں میں جوڑا خاندان کی جگہ یک‌زوجگی کا خاندان پوری طرح قائم نہیں ھوا تھا ۔ ویلز میں شادی ھونے کے بعد جب تک سات برس کی مدت پوری نہ ھو جائے ، شادی کا رشتہ اٹوٹ نہیں سمجھا جاتا تھا یا یوں کہا جائے کہ سات برس تک شادی کو کسی وقت بھی نوٹس دے کر منقطع کیا جا سکتا تھا ۔ سات برس پورے ھونے میں اگر صرف تین راتوں کی کمی ھوتی تھی تب بھی شادی شدہ جوڑا الگ ھو سکتا تھا ۔ ایسا ھونے پر جوڑے کی جائداد دونوں میں بانٹ دی جاتی تھی ۔ عورت پوری جائداد اور ملکیت کے دو حصے کرتی ۔ مرد ایک حصہ چن لیتا

تھا ۔ فرنیچر بانٹنے کے کچھ بہت ھی عجیب طریقے تھے ۔ اگر مرد شادی کا رشتہ توڑتا تو اسے عورت کا جہیز اور کچھ اور چیزیں واپس کر دینی پڑتی تھیں ۔ اگر عورت الگ ھونا چاھتی تھی تو اسے کم ملتا تھا ۔ بچوں میں سے دو مرد کو ملتے تھے ۔ ایک منجھلا بچہ عورت کو ملتا تھا ۔ اگر عورت طلاق کے بعد پھر شادی کرتی تھی اور اس کا پہلا شوھر اسے واپس لے جانے کے لئے پہنچ جاتا تھا تو عورت کو، چاھے اس کا ایک پیر نئے شوھر کے بستر میں ھی کیوں نہ ھو ، لوٹ جانا پڑتا تھا ۔ لیکن اگر عورت مرد سات سال تک ساتھ رہ چکتے تھے تو انہیں شادی کی رسم پوری ھوئے بغیر ھی شوھر اور بیوی سمجھا جاتا تھا ۔ شادی سے پہلے لڑکیوں کے کنواری رھنے کے بارے میں کوئی خاص سختی نہیں برتی جاتی تھی اور نہ اس کی کوئی ضرورت سمجھی جاتی تھی ۔ اس معاملے سے تعلق رکھنےوالے قاعدے بہت ھی ھلکے قسم کے ھیں اور بورژوا اخلاق کے بالکل الٹ ھیں ۔ اگر کوئی عورت کسی غیر مرد کے ساتھ ھمبستری کرتی تو اس کے شوھر کو اسے پیٹنے کا حق ھوتا تھا — جن تین صورتوں میں بیوی کو پیٹنے پر بھی شوھر کو سزا کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا ، یہ ان میں سے ایک وجہ تھی ۔ لیکن بیوی کو پیٹنے کےبعد شوھر اور کسی قسم کے ھرجانے کا مطالبہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ

"کسی قصور کا یا تو کفارہ لیا جا سکتا ھے یا بدلہ ، لیکن دونوں نہیں لئے جا سکتے" ۔ (۱۳۹)

بہتیری وجہیں تھیں جن سے مرد کو عورت طلاق دے سکتی تھی اور ایسا کرنے پر بھی جائداد وغیرہ پر اس کے حق کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا ۔ مرد کے منہ سے بدبو آنا بھی طلاق دینے کی ایک کافی وجہ سمجھی جاتی تھی ۔ قوانین میں معاوضے کی اس رقم کی بہت نمایاں جگہ تو تھی جو قبیلے کے سردار یا بادشاہ کو پہلی رات کے حق کے بدلے میں دینی پڑتی تھی (اس حق کو گوبر مرچ (gobr merch) کہتے تھے ، جس سے ازمنۂ وسطی کا لفظ مارچیتا (marcheta) بنا ۔ فرانسیسی میں یہ مارکیت (marquette) ھے) ۔ عورتوں کو عوامی اسمبلیوں میں ووٹ

دینے کا حق تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر ہم ان باتوں پر بھی غور کریں کہ آئرلینڈ میں بھی اسی طرح کی حالت پائی جاتی تھی — وقتی شادیوں کا وہاں بھی کافی رواج تھا، اور طلاق کی صورت میں عورت کو بہت ہی واضح اختیارات اور خاص سہولتیں ملتی تھیں، یہاں تک کہ اسے گھریلو کاموں کا بھی معاوضہ ملتا تھا، متعدد بیویوں کے ساتھ ایک ''بڑی بیوی'' بھی ہوتی تھی اور کسی متوفی شخص کی جائداد بانٹتے وقت اس کے جائز اور ناجائز بچوں میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا — اگر ہم ان تمام باتوں کو دھیان میں رکھیں تو ہمارے سامنے جوڑا بیاہ کی ایک ایسی تصویر آتی ہے جس کے مقابلے میں شادی کی وہ صورت زیادہ سخت معلوم ہوتی ہے جس کا رواج شمالی امریکہ میں تھا۔ لیکن سیزر کے زمانے میں جو لوگ گروہوار شادی کی حالت میں تھے، وہ اگر گیارھویں صدی میں جوڑا بیاہ کی حالت میں ہی تھے، تو ان کے لئے وہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔

آئرلینڈ کے گن (اسے وہ سپت (sept) کہتے تھے اور قبیلے کو کلائن (clainne) کہتے تھے جو انگریزی کے لفظ کلان (clan) کے مشابہ ہے) کے وجود کا ثبوت اور اس کا حال نہ صرف قانون کی پرانی کتابوں میں ملتا ہے بلکہ اس کی تصدیق سترھویں صدی کے ان انگریز ماہرین قانون نے بھی کی ہے جو آئرلینڈ کے قبیلوں کی زمین کو انگلینڈ کے بادشاہ کی جاگیر بنانے کے لئے وہاں بھیجے گئے تھے۔ اس زمانے تک زمین کلان یا گن کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھی، سوا ان جگہوں کے جہاں قبیلے کے سردار نے زمین کو اپنی ذاتی جاگیر بنا لیا تھا۔ جب گن کا کوئی ممبر مر جاتا تھا اور اس کی وجہ سے کوئی گھرانہ ٹوٹ جاتا تھا تو گن کا سردار (انگریز ماہرین قانون اسے کاپٹ کوگنےشیونس — «caput cognationis» کہتے تھے) گن کی ساری زمین کو باقی گھرانوں میں نئے سرے سے بانٹ دیتا تھا۔ یہ تقسیم بحیثیت مجموعی انہی اصولوں کے مطابق ہوتی تھی جو جرمنوں میں پائے جاتے ہیں۔ آئرلینڈ میں آج بھی ایسے گاؤں ملتے ہیں جہاں زمین پر مشترکہ حق ہے۔ اسے رونڈیل (rundale) کہتے ہیں۔ چالیس یا پچاس سال پہلے ایسے گاؤں کی تعداد بہت بڑی تھی۔ جس زمین پر کبھی گن کا مشترکہ حق تھا اسے انگریز فاتحوں نے

چھین لیا ۔ ہر کسان کو جو اب انفرادی طور پر کھیتی کرتا تھا ، اپنے کھیت کے لئے لگان دینا پڑتا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود گاؤں کے سارے کسان اپنی کھیتی کی اور چراگاہوں کی تمام زمینوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے ہیں اور پھر زمین کی زرخیزی اور عام حالت کا خیال رکھتے ہوئے ، اسے قطعات میں یا جیسا کہ وہ موزیل ندی کے علاقے میں کہلاتی ہے ، گیوانوں (Gewanne) میں بانٹ لیا جاتا ہے ۔ اور گاؤں کے ہر کسان کو ہر گیوانے (قطعہ) میں حصہ ملتا ہے ۔ بنجر زمین اور چراگاہ کا استعمال ساجھے میں ہوتا ہے ۔ صرف پچاس سال پہلے کی بات ہے کہ وقتاً فوقتاً ، کبھی کبھی ہر سال ، گاؤں کی زمین کا نئے سرے سے بٹوارہ ہو جاتا تھا ۔ ایسے کسی رونڈیل (rundale) گاؤں کا نقشہ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ موزیل ندی کے علاقے یا ہوخ‌والڈ میں کاشتکار گھرانوں کی کسی جرمن بستی (Gehöferschaft) کا نقشہ ہے ۔ ”پارٹیوں“ (factions) کی صورت میں بھی گن زندہ ہیں ۔ کبھی کبھی آئرلینڈ کے کسان ایسی پارٹیاں بناتے پائے جاتے ہیں جو بالکل مہمل اور بے تکے فرق پر مبنی معلوم ہوتی ہیں اور انگریزوں کی سمجھ میں بالکل نہیں آتیں ۔ ان پارٹیوں کا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ایک کھیل کھیلنے کے لئے جمع ہوں جو بہت مقبول ہے اور جس میں نہایت اطمینان اور سنجیدگی کے ساتھ ایک دوسرے کی خوب مرمت کی جاتی ہے ۔ حقیقت میں ان پارٹیوں کے ذریعے پرانے گنوں کو بناوٹی ڈھنگ سے دوبارہ زندہ کیا جاتا ہے جو اب برباد ہو چکے ہیں ، اور گن کا جو احساس انہیں وراثت میں ملا ہے اسے اپنے عجیب ڈھنگ سے ظاہر کرتے ہیں ۔ اتفاق سے بعض علاقوں میں چند گنوں کے ممبر آج بھی اسی جگہ پر رہتے ہیں جو ان کی پرانی جگہ ہے ۔ مثال کے لئے اس صدی کی چوتھی دہائی تک سونا گھن سرزمین کے زیادہ‌تر باشندوں میں صرف چار خاندانی نام پائے جاتے تھے ۔ مطلب یہ کہ اس ضلع کے تمام لوگ چار گنوں یا قبیلوں کی اولاد تھے ۔ *

---

* آئرلینڈ میں میں نے کچھ دن گذارے (۱۸۴۰) تو ایک بار پھر مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اس ملک کی دیہاتی آبادی آج بھی کس

اسکاٹلینڈ میں گن سماج کا زوال ۱۷۴۵ء کی بغاوت کے کچلے جانے کے بعد سے شروع ہوا (۱۴۱) - اسکاٹلینڈ کے جرگے (کلان) کی اس سماج میں کیا جگہ تھی، وہ اس سلسلے کی کونسی کڑی تھا، ان باتوں کی چھان‌بین ابھی باقی ہے - لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس نظام کی کڑی تھا ضرور - اسکاٹلینڈ کی پہاڑیوں میں جرگہ کیا چیز تھی، اس کی زندہ تصویر ہمیں والٹر اسکاٹ کے ناولوں میں ملتی ہے - مارگن کے لفظوں میں یہ:

حد تک گن کے زمانے کے خیالات اور تصورات سے لپٹی ہوئی ہے - زمیندار کو جس سے لگان پر زمین لے کر کسان کھیتی کرتا ہے، وہ اپنے جرگے کا ایسا سردار سمجھتا ہے جو سب کے فائدے کےلئے کھیتی کی دیکھ بھال کرتا ہے، جسے کسانوں سے لگان کی شکل میں خراج لینے کا حق ہے، پر ساتھ ہی جس کا یہ فرض بھی ہے کہ ضرورت پڑنے پر کسان کی مدد کرے - اسی طرح ہر کھاتے پیتے آدمی کا فرض سمجھا جاتا ہے کہ جب بھی اس کے غریب پڑوسی مصیبت میں ہوں تو وہ ان کی مدد کرے - یہ مدد خیرات نہیں ہے - جرگے کے غریب ممبروں کا حق ہے کہ جرگے کے دولتمند لوگ یا جرگے کا سردار ان کی مدد کرے - اسی وجہ سے اقتصادات اور قانون کے پنڈت اکثر یہ شکایت کرتے سنے جاتے ہیں کہ آئرلینڈ کے کسانوں کے دماغ میں بورژوا ملکیت کے جدید خیالات کو جمانا ناممکن ہے - آئرلینڈ کے باشندوں کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ ایسی بھی کوئی ملکیت ہو سکتی ہے جس میں محض اختیارات اور حقوق ہوں اور ذمہ‌داری کوئی نہ ہو - کوئی حیرت نہیں کہ گن سماج کے ایسے بھولے بھالے خیالات کو لئے ہوئے آئرلینڈ کے باشندے جب اچانک انگلینڈ یا امریکہ کے بڑے شہروں میں، ایسی آبادی میں پہنچ جاتے ہیں جس کے اخلاق اور قانون کے معیاری اصول بالکل مختلف ہوتے ہیں تو اخلاق اور انصاف دونوں کے بارے میں ان کے خیالات گڈمڈ ہوجاتے ہیں، انہیں اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا اور اکثر ان کی ایک بڑی تعداد بددلی اور پست‌ہمتی کا شکار ہو جاتی ہے۔ (۱۸۹۱ء کے ایڈیشن کےلئے نوٹ از اینگلس -)

''تنظیم اور سرگرمی کے اعتبار سے گن کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے اور اس بات کا غیرمعمولی ثبوت ہے کہ گن کی زندگی کا اپنے ممبروں پر کتنا اختیار ہوتا ہے ... خاندانی جھگڑے ہوتے ہیں ، خون کا بدلہ خون سے لیا جاتا ہے ، ان کی جائے رہائش وہی ہوتی ہے جو پہلے ان کے گنوں کی تھی ، زمین کا جوتنا بونا مشترک طور پر ہوتا ہے ، جرگے کے لوگوں میں سردار کےلئے اور آپس میں ایک دوسرے کے لئے بڑی وفاداری ہوتی ہے ۔ یہ گن سماج کی عام اور مستقل خصوصیتیں تھیں جو ان میں بھی پائی جاتی ہیں ۔ نسل مردوں سے چلتی ہے یعنی صرف مردوں کے بچے جرگے کے ممبر مانے جاتے تھے اور عورتوں کے بچے اپنے اپنے باپ کے جرگے کے ممبر سمجھے جاتے تھے ۔ '' (۱۴۲)

پکٹ لوگوں کا شاہی خاندان اس بات کا ثبوت ہے کہ اسکاٹلینڈ میں پہلے مادری حق قائم تھا ۔ بیڈے کی روایت کے مطابق اس شاہی خاندان میں عورتوں کی اولاد کو گدی ملتی تھی ۔ ہمیں پونالوان خاندان کے آثار بھی ملتے ہیں جو اسکاٹس اور ویلز کے لوگوں میں عہد وسطی تک قائم تھا ۔ اس کا اثر پہلی رات کے حق کی صورت میں باقی تھا یعنی جرگے کا سردار یا بادشاہ پہلے زمانے کے مشترک شوہروں کے آخری نمائندے کی حیثیت سے ہر نئی دلہن کے ساتھ پہلی رات ہمبستر ہونے کا مطالبہ کر سکتا تھا اور اس کو کچھ معاوضہ ادا کرکے ہی اس کے اس دعوے سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا تھا ۔

* * *

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہجرت یا نقل وطن کے زمانے تک جرمن لوگ گنوں میں منظم تھے ۔ ہمارے عہد (یعنی عیسوی سن) سے کئی سو سال پہلے ہی یہ لوگ ڈنیوب ، رائن اور وسٹولا دریاؤں اور شمالی سمندروں کے درمیانی علاقے میں آ کر بسے ہونگے ۔ سمبری اور تیوتونی لوگوں کی ہجرت کا سلسلہ زوروں پر تھا ، اور سوئیوی لوگوں کو سیزر کے زمانے تک کوئی مستقل جائے رہائش نہیں ملی تھی ۔

سیزر نے صاف کہا ہے کہ ان لوگوں میں گنوں کے ممبر اور خون کے رشتہ‌دار ساتھ ساتھ رہتے تھے (gentibus cognationibusque) اور جب جولیا گن (gens Julia) کے ایک رومی کی زبان سے gentibus کا لفظ نکلتا ہے تو اس کا ایک مخصوص مطلب ہوتا ہے جس کو کسی طرح توڑا مروڑا نہیں جا سکتا۔ یہ بات سبھی جرمنوں کے لئے سچ ہے۔ یہاں تک کہ مفتوحہ رومی صوبوں میں بھی جرمن لوگ گنوں کے مطابق بسے ہوئے تھے۔ ''المانی قانون،، سے یہ بات ثابت ہے کہ دریائے ڈنیوب کے جنوب کے مفتوحہ علاقے میں جرمن لوگ گنوں (genealogiae) کے مطابق جا کر بسے تھے (۱۴۳)۔ یہاں genealogia لفظ کا استعمال ٹھیک اسی معنی میں ہوتا ہے جس معنی میں بعد میں Mark یا Dorfgenos-senschaft* کا استعمال ہوا۔ حال میں کوالیفسکی نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ genealogiae بڑی بڑی گھریلو برادریاں تھیں جن میں زمین بٹی ہوئی تھی اور جن سے بعد میں چل کر دیہی برادریاں بنیں۔ یہی بات fara کے بارے میں بھی سچ ہو سکتی ہے۔ برگنڈی یا لینگوبارڈ لوگ یعنی ایک گوتھ اور ایک ہرمی‌نونی یا شمالی جرمن قبیلہ اس لفظ fara کو اگر ٹھیک اس چیز کے لئے نہیں تو لگ بھگ اسی چیز کے لئے استعمال کرتا تھا جس کے لئے ''المانی قانون،، کی کتاب میں genealogia کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ چیز اصل میں گن تھی یا گھریلو برادری، اس کے بارے میں ابھی اور چھان‌بین کرنے کی ضرورت ہے۔

تحریری شہادتوں سے یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ سبھی جرمن گن کے لئے ایک ہی لفظ استعمال کرتے تھے یا نہیں، اور اگر کرتے تھے تو وہ لفظ کیا تھا۔ علم نحو کی رو سے یونانی genos اور لاطینی gens، گوتھی زبان کا kuni اور وسطی شمالی جرمن زبان کا künne — سب متشابہ الفاظ ہیں اور یہ سب ایک ہی معنی میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور چونکہ یونانی زبان کا لفظ gyne، سلاف لفظ žena، گوتھی لفظ qvino اور قدیم نارس زبان کا kona یا kuna — عورت کے یہ مختلف نام ایک ہی مادے سے نکلے ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا رہا ہوگا

---

* دیہی برادری۔ (ایڈیٹر)

جب ان تمام لوگوں میں مادری حق قائم تھا ۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا لینگوبارڈ اور برگنڈی لوگوں میں fára کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا جس کے بارے میں گریم کا کہنا ہے کہ وہ ایک فرضی مادہ fisan سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں : پیدا کرنا ۔ میری رائے میں لفظ fara کا تعلق faran یا fahren سے جوڑنا چاہئے ۔ یہ ایک مفرد مادہ ہے جس کا مطلب گھومنا یا جاترا کرنا ہے ۔ تب faran کا مطلب ہوگا خانہ بدوش ، آوارہ گرد لوگوں کا ایک مخصوص گروہ جس میں ، یہ کہنے کی ضرورت نہیں ، کہ سبھی ایک دوسرے کے رشتہ‌دار ہوتے تھے ۔ یہ لوگ ایک عرصے تک پہلے مشرق کی طرف اور پھر مغرب کی طرف گھومتے رہے اور اسی خانہ‌بدوشی کے زمانے میں رفتہ رفتہ یہ لفظ خود گن سماج کے لئے استعمال ہونے لگا ۔ اس کے علاوہ گوتھی لفظ sibja ، اینگلو سیکسن لفظ sib ، قدیم شمالی جرمن کا لفظ sippia ، sippa یا جرمن Sippe ہے* ۔ قدیم نارس میں صرف صیغۂ جمع کا لفظ sifjar استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں رشتہ‌دار ۔ صیغۂواحد کا لفظ Sif ، ایک دیوی کا نام ہے ۔ آخر میں ” ہلدے‌براند کے گیت “ میں (۴۴) اس کا ایک اور استعمال ملتا ہے ۔ اس میں ہلدے‌براند ہادوبراند سے پوچھتا ہے کہ

” جاتی کے لوگوں میں تیرا باپ کون ہے ... یعنی تیرا گھرانا کون‌سا ہے ؟ “ («eddo huêlîhhes *cnuosles* du sîs»)

اگر گن کے لئے سبھی جرمن ایک ہی لفظ استعمال کرتے تھے تو بہت ممکن ہے کہ یہ لفظ گوتھی زبان کا kuni جیسا ہو کیونکہ نہ صرف گوتھی کی قرابت‌دار دوسری زبانوں میں اس سے ملتا جلتا لفظ استعمال ہوتا ہے بلکہ kuning یا König لفظ بھی جس کا مطلب شروع میں گن یا قبیلہ کا سردار تھا ، اسی لفظ سے نکلا ہے ۔ Sibja یا Sippe کی طرف دھیان دینے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ۔ کم سے کم قدیم نارس میں sifjar کا مطلب صرف خون کی قرابت‌داری نہیں ہوتا بلکہ اس کے دائرے میں وہ لوگ بھی آتے ہیں جن سے شادی کے ذریعے رشتہ‌داری قائم ہوتی

---

* قرابت‌دار ۔ (ایڈیٹر)

ہے ۔ اس لئے اس لفظ میں کم سے کم دو گنوں کے لوگ شامل ہیں ۔ مطلب یہ کہ sif کا لفظ گن کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا ۔

میکسیکو کے باشندوں اور یونانیوں کی طرح جرمنوں میں بھی گھوڑسواروں اور پیدل سپاہیوں کے گاؤدم مثلث شکل کے دستے لڑائی میں گن کے لحاظ سے صف‌بند ہوتے تھے ۔ جب تاسیت کہتا ہے کہ خاندانوں اور رشتہ‌داروں کے اعتبار سے صف‌بندی ہوتی تھی تو وہ اس غیرواضح لفظ کو اس لئے استعمال کرتا ہے کہ روم میں بہت عرصے سے گن کوئی زندہ ادارہ نہیں رہا تھا ۔

تاسیت کی وہ عبارت فیصلہ کن اہمیت رکھتی ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ ماں کا بھائی اپنے بھانجے کو اپنا بیٹا سمجھتا ہے اور کچھ لوگوں کی تو یہ رائے ہے کہ ماموں اور بھانجے کا خون کا رشتہ باپ اور بیٹے کے رشتے سے زیادہ مقدس اور قریبی ہے ، چنانچہ جب یرغمال (یعنی ضمانت کے طور پر دشمن کے حوالہ کرنے) کے لئے کسی شخص کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو جس آدمی کو اس طرح پابند کرنا مقصود ہوتا ہے ، اس کے بیٹے کے مقابلے میں اس کے بھانجے کو ترجیح دی جاتی ہے ۔ یہ مادری حق کی اور اسی لئے ابتدائی گن کی ایک زندہ نشانی ہے ۔ اور اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے گویا وہ جرمنوں کی کوئی امتیازی خصوصیت ہے * ۔ اگر ایسے کسی گن کا کوئی ممبر اپنے کسی وعدے

---

* ماموں اور بھانجے کے رشتے کا گہرا تعلق اور اس کی خصوصیت جو بہت سے لوگوں میں مادری حق کی ایک نشانی کے طور پر باقی ہے ، یونانیوں میں صرف سورمائی عہد کی دیومالا میں پائی جاتی ہے ۔ دیودورس کی جلد ۴ ، صفحہ ۳۴ میں میلیاگیر اپنی ماں آلتھیا کے بھائیوں ، تھیستیئس کے بیٹوں کو مار ڈالتا ہے ۔ آلتھیا اس قتل کو اتنا سنگین جرم سمجھتی ہے کہ قاتل کو جو خود اس کا بیٹا ہے ، سراپ دے ڈالتی ہے اور دعا کرتی ہے کہ وہ مر جائے ۔ لکھا ہے کہ ” دیوتاؤں نے اس کی دعا سن لی اور میلیاگیر کی زندگی کو ختم کر دیا “ ۔ اسی مصنف کے قول کے مطابق (دیودورس ، جلد ۴ ، صفحات ۴۳ و ۴۴) جب ہرقلیس کی رہنمائی میں ارگوناٹ کا گروہ تھریشیا (Thracia) میں اترا تو اس نے

کی ضمانت کے طور پر اپنے سگے بیٹے کو دے دیتا تھا اور پھر وعدہ پورا نہیں کرتا تھا اور بیٹے کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا تو یہ صرف باپ کا اپنا معاملہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اگر کسی آدمی کی بہن کے بیٹے کی قربانی ہو جاتی تو یہ گن کے نہایت مقدس قانون کی خلاف‌ورزی سمجھی جاتی تھی۔ ماموں سب سے قریبی رشتہ‌دار ہوتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ اس کا فرض تھا کہ وہ لڑکے یا نوجوان کی حفاظت کرتا۔ اسے چاہئے تھا کہ یا تو ضمانت میں وہ اس لڑکے (یعنی اپنے بھانجے) کو نہ دیتا یا اپنا وعدہ پورا کرتا۔ اگر جرمنوں میں گن تنظیم کا کوئی اور ثبوت نہ بھی ملتا تو صرف یہ عبارت ہی اس کی کافی شہادت تھی۔

پرانے نارس گیت ”وولوسپا“ («Völuspâ») — یعنی وہ گیت جس میں دیوتاؤں کی آخری گھڑی اور قیامت یعنی دنیا کی تباہی کا ذکر کیا گیا ہے — اس کا ایک ٹکڑا اس سے بھی زیادہ فیصلہ کن ہے چوں کہ وہ آٹھ سو برس بعد کی چیز ہے۔ اس حصے میں جسے ”غیب‌داں عورت کا کشف“ کہا گیا ہے اور جس میں جیسا کہ بینگ اور بگے نے اب ثابت کردیا ہے عیسائیت سے عناصر بھی ملے ہوئے ہیں، بتایا گیا ہے کہ قیامت سے پہلے عام فسق‌وفجور اور برائی اور بداخلاقی کا ایک زمانہ آئے گا۔ اس زمانے کا حال بیان کرتے ہوئے ایک جگہ کہا گیا ہے :

«Broedhr munu berjask ok at bönum verdask, munu *systrungar* sifjum spilla».

”بھائی بھائی ایک دوسرے سے جنگ کریں‌گے اور ایک

دیکھا کہ قینیئس نے پہلی بیوی کلیوپیٹرا بوریئڈ سے قطع تعلق کر لیا ہے اور اپنی دوسری بیوی کے کہنے میں آکر ان دونوں بیٹوں کے ساتھ جو کلیوپیٹرا کے بطن سے تھے، نہایت شرمناک برتاؤ کر رہا ہے۔ لیکن ارگوناٹ کے گروہ میں بھی کچھ بوریئڈ خاندان کے لوگ تھے جو کلیوپیٹرا کے بھائی ہوتے تھے اور اس طرح ان مصیبت‌زدہ لڑکوں کے ماموں تھے۔ ماموؤں نے فوراً اپنے بھانجوں کی مدد کی، انہیں قید سے چھٹکارا دلایا اور ان کو قید میں رکھنے والے پہرہ‌داروں کو مار ڈالا۔ (نوٹ از اینگلس۔)

دوسرے کا خون بہائیں گے اور بہنوں کی اولاد خون کی قرابت‌داری کے تعلق کو توڑے گی۔ ،،

ماں کی بہن کے بیٹے کے لئے systrungr کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور شاعر کی نظر میں خون کے ایسے رشتے کو منقطع کرنا بھائیوں کے آپس کے خون خرابے کے مقابلے میں زیادہ بڑا جرم ہے۔ یہ انتہا systrungar لفظ پر پہنچ کر آتی ہے جس میں ماں کی طرف کے خون کے رشتے پر زور دیا گیا ہے۔ اگر اس جگہ پر لفظ syskina-börn یعنی بھائی اور بہن کی اولاد، یا syskina-synir یعنی بھائیوں اور بہنوں کے بیٹے استعمال کیا جاتا تو پہلے کے مقابلے میں دوسری سطر چڑھتے ہوئے سروں میں نہیں ہوتی بلکہ اس کا سر بہت دھیما ہو جاتا۔ چنانچہ وائیکنگ کے زمانے میں بھی جبکہ «Völuspâ» گیت بنایا گیا تھا، اسکینڈی‌نیویا میں مادری حق کی یاد مٹی نہیں تھی۔

لیکن تاسیت کے زمانے میں کم سے کم ان جرمنوں میں جن سے وہ زیادہ واقف تھا، مادری حق کی جگہ پدری حق قائم ہو چکا تھا یعنی باپ کے حقدار اس کے بچے ہوتے تھے اور بچوں کے نہ ہونے پر بھائی اور چچا اور ماموں ہوتے تھے۔ ماموں کو وارث بنانا بھی مذکورۂ بالا رسم و رواج کا ہی نتیجہ ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک جرمنوں میں پدری حق کو قائم ہوئے بہت دن نہیں ہوئے تھے۔ عہد وسطی کے اواخر تک بھی ہمیں مادری حق کے آثار ملتے ہیں۔ اس دور میں خاص کر زرعی غلاموں میں کسی کے باپ کا پتہ لگانا کافی مشکل کام تھا۔ اور اس لئے اگر کوئی جاگیردار کسی بھاگے ہوئے زرعی غلام کو شہر سے واپس بلوانے کا مطالبہ کرتا تھا تو مثال کے طور پر آگسبرگ، بازل اور کیزرسلائٹرن جیسے شہروں میں اس کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ وہ زرعی غلام کی محض ماں کی طرف کے چھ سب سے قریبی خون کے رشتہ‌داروں کی حلفیہ گواہی سے یہ ثابت کرے کہ وہ اس کا زرعی غلام تھا۔ (ماورر۔ ”شہری دستور“۔ جلد ۱، صفحہ ۳۸۱ *۔)

---

* Maurer G.L., «Geschichte der Städteverfassung in Deutschland», Bd. I. Erlangen, 1869. (ایڈیٹر)

مادری حق کی ایک اور نشانی تھی جو کہ اس وقت تک مٹنے لگی تھی اور جو روم کے باشندوں کے نقطۂ نظر سے سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی ، وہ یہ کہ جرمن لوگ عورتوں کی بڑی عزت کرتے تھے ۔ جرمنوں سے اگر کسی وعدے کو پورا کرانا ہوتا تھا تو اس کا سب سے اچھا طریقہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ شریف خاندانوں کی لڑکیوں کو ضمانت کے طور پر رکھ لیا جائے ۔ جنگ کے وقت جرمنوں کی ہمت اور کسی چیز سے اس قدر جوش میں نہیں آتی تھی جتنی اس خوفناک خیال سے کہ اگر انہیں شکست ہوئی تو دشمن ان کی بہو بیٹیوں کو پکڑ کر لے جائیں گے اور اپنی باندیاں بنا لیں گے ۔ جرمن لوگ عورت کو مقدس مانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس میں مستقبل کو دیکھ لینے کی طاقت موجود ہے ۔ چنانچہ وہ سب سے اہم معاملوں میں عورتوں کی صلاح پر عمل کرتے تھے ۔ لپے ندی کے کنارے رہنے والے بروکترنین قبیلے کی پجارن ویلیدا بتاوین قبیلے کی اس پوری بغاوت کی روح رواں تھی جس کی بدولت جرمنوں اور بلجینوں نے سوی‌لئس کی رہنمائی میں گال علاقے میں رومی حکومت کی بنیاد ہلا ڈالی تھی (۱۴۵) ۔ معلوم ہوتا ہے کہ گھر کے اندر عورتوں کی مطلق العنان حکومت تھی ۔ تاسیت کہتا ہے کہ عورتوں کو ، بوڑھوں اور بچوں کے ساتھ سارا کام کرنا پڑتا تھا کیونکہ مرد شکار کرنے جاتے تھے ، شراب پیتے تھے اور آوارہ گردی کرتے تھے ۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتا کہ کھیت کون جوتتا تھا اور چونکہ یہ اس نے صاف صاف کہا ہے کہ غلاموں کو صرف خراج ادا کرنا پڑتا تھا اور ان سے زبردستی کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ کھیتی کا تھوڑا بہت جو کام ہوتا تھا اسے بالغ مردوں کی بڑی تعداد ہی کرتی تھی ۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے شادی کی شکل جوڑا بیاہ کی تھی جو رفتہ رفتہ یک زوجگی میں بدلتی جا رہی تھی ۔ ابھی سختی کے ساتھ یک‌زوجگی پر عمل نہیں ہوتا تھا کیونکہ شرفا کے لئے کئی بیویوں کی اجازت تھی ۔ بحیثیت مجموعی (کیلٹ لوگوں کے بر خلاف) جرمن لوگ لڑکیوں کی پاک دامنی پر زور دیتے تھے ۔ تاسیت اس بات کا بڑے جوش کے ساتھ ذکر کرتا ہے کہ جرمنوں میں شادی کا رشتہ اٹوٹ سمجھا جاتا تھا ۔ وہ بتاتا

ہے کہ طلاق کی اجازت صرف اسی صورت میں ملتی تھی جب عورت نے کسی اور مرد کے ساتھ ہمبستری کی ہو ۔ لیکن تاسیت کی رپورٹ میں کئی خامیاں ہیں ۔ اور اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ نیک چلنی کی مثال سامنے رکھ کر وہ بدچلن رومیوں کو اخلاق کا سبق پڑھانے کی کوشش کرتا ہے ۔ اتنی بات تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جرمن اپنے جنگلوں میں بھلے ہی نیک چلنی اور اخلاق کی بلندی اور پاکیزگی کا نمونہ رہے ہوں لیکن باہری دنیا کا ذرا سا تعلق ہی انہیں دوسرے اوسط یورپینوں کی سطح پر کھینچ لانے کے لئے کافی تھا ۔ رومی زندگی کے تیز بھنور میں پڑکر جرمنوں کی اخلاقی پاکیزگی جرمن زبان سے بھی زیادہ تیزی سے مٹ گئی اور اس کا کوئی نشان بھی باقی نہیں بچا ۔ اس کے لئے تورس کے گریگری کی کتاب کو پڑھنا کافی ہوگا ۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جرمنی کے قدیم جنگلوں میں وہ لطافت اور نزاکت بھری عیاشی ممکن ہی نہیں تھی جو روم میں ہوتی تھی ۔ اس لئے اس معاملے میں بھی جرمن لوگ رومیوں پر فوقیت رکھتے تھے لیکن اس کے لئے ان کی طرف یہ بات منسوب کرنے کی ضرورت نہیں کہ نفسانی خواہشیں انہیں چھو نہیں گئی تھیں اور وہ تقوی اور پرہیزگاری کا نمونہ تھے کیونکہ بحیثیت مجموعی کوئی قوم بھی کبھی ایسی نہیں رہی ۔

گن نظام سے ہر شخص پر یہ فرض عائد ہوا کہ وہ اپنے باپ اور رشتہ‌داروں کے دشمنوں کو اپنا دشمن مانے اور ان کے دوستوں کو اپنا دوست ۔ اسی سے ”ویرگلڈ“ کا رواج ہوا جس میں کسی کو قتل یا زخمی کرنے کی پاداش میں جرمانہ ادا کرنے سے کام چل جاتا تھا اور خونی انتقام کی ضرورت نہیں پڑتی تھی ۔ ایک پشت پہلے ”ویرگلڈ“ کو ایک ایسا رواج مانا جاتا تھا جو خاص طور پر جرمنوں میں پایا جاتا ہے ۔ لیکن اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خونی انتقام کی یہ زیادہ ہلکی صورت سینکڑوں جاتیوں میں پائی جاتی ہے اور وہ گن نظام سے پیدا ہوئی ہے ۔ مثال کے لئے مہمان نوازی کی طرح یہ رواج بھی امریکہ کے انڈینوں میں پایا جاتا ہے ۔ جرمنوں میں مہمان نوازی کا جو حال تاسیت نے بیان کیا ہے (”جرمنی“ ۔ باب ۲۱) وہ چھوٹی موٹی باتوں میں بھی تقریباً وہی ہے جو مارگن نے اپنے امریکی انڈینوں کے بارے میں بیان کیا ہے ۔

ایک زمانے میں اس بات پر بڑی گرم بحث چھڑی ہوئی تھی جو کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی کہ تاسیت کے وقت تک جرمنوں نے کھیتی کی زمین کا آخری طور پر بٹوارہ کر ڈالا تھا یا نہیں ، اور اس سوال سے متعلق تاسیت نے جو کچھ لکھا ہے اس کا کیا مطلب لگایا جائے ۔ اب یہ بحث پرانی ہو چکی ۔ اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تقریباً سبھی قوموں میں شروع میں پورا گن اور بعد میں قدیم کمیونسٹی خاندانی برادریاں مل کر کھیتی کرتی تھیں اور سیزر نے اس وقت تک سوئیوی لوگوں میں یہ رواج پایا تھا ۔ بعد میں زمین تقسیم کرنے کا رواج ہوا ۔ اور تھوڑے تھوڑے دنوں بعد الگ الگ خاندانوں میں زمین کو نئے سرے سے بانٹ دیا جاتا تھا ۔ جرمنی کے کچھ حصوں میں تو کھیتی کی زمین کو ایک مقررہ میعاد کے بعد پھر سے بانٹ دینے کا یہ رواج آج تک پایا جاتا ہے ۔ یہ سب ثابت ہو جانے کے بعد اب اس بحث میں اور سر کھپانے کی ضرورت نہیں رہتی ۔ سیزر کے زمانے سے تاسیت کے زمانے تک کے ڈیڑھ سو برس کے عرصے میں اگر جرمن لوگ اجتماعی کھیتی سے — سیزر نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ سوئیوی لوگوں میں زمین کا بٹوارہ یا انفرادی کھیتی نہیں ہوتی تھی — آگے بڑھ کر ہر سال زمین کو پھر سے بانٹنے اور انفرادی طریقے سے کھیتی کرنے لگے تھے تو ماننا پڑے گا کہ انہوں نے کافی ترقی کی تھی ۔ اتنے کم عرصے میں اور بغیر کسی بیرونی مداخلت کے اس حالت سے آگے بڑھ کر زمین کی مکمل طور پر نجی ملکیت کی منزل پر پہنچ جانا بالکل ناممکن تھا ۔ لہذا میں تاسیت کے لفظوں کا صرف یہی مطلب لگاتا ہوں جو اس نے لکھا ہے اور اس نے لکھا یہ ہے : جرمن لوگ ہر سال کھیتی کی زمین کو بدل دیتے ہیں (یا پھر سے بانٹ لیتے ہیں) اور ایسا کرنے کے دوران میں کافی اجتماعی زمین بچ جاتی ہے ۔ کھیتی اور زمین کی ملکیت کی یہ حالت جرمنوں کے اس زمانے کے گن دستور سے بالکل میل کھاتی ہے ۔

مذکورۂ بالا پیراگراف کو میں نے بغیر کسی تبدیلی کے اسی طرح چھوڑ دیا ہے جس طرح وہ اس کتاب کے پرانے ایڈیشنوں میں چھپا ہے ۔ لیکن اس دوران میں سوال کا ایک اور پہلو سامنے آ گیا ہے ۔

کوالیفسکی نے یہ ثابت کر دیا ہے (دیکھئے اس کتاب کا صفحہ ۴۴ *) کہ پدری اقتداروالی گھریلو برادری ، مادری حق‌والے کمیونسٹی خاندان اور موجودہ زمانے کے الگ الگ رہنےوالے خاندان کو ملانےوالی ایک درمیانی کڑی تھی اور اس حیثیت سے اگر یہ ہر جگہ نہیں پائی‌جاتی تو بھی اس کا بہت وسیع رواج تھا۔ جب سے یہ ثابت ہوا ہے تب سے بحث اس بات پر نہیں رہی کہ زمین سب کی مشترکہ ملکیت تھی یا نہیں ، جس پر ماورر اور وئیز میں اب تک مباحثہ ہو رہا تھا ، بلکہ اب سوال یہ ہے کہ مشترکہ ملکیت کی کیا شکل تھی۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ سیزر کے زمانے میں سوئیوی لوگوں میں زمین کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھی بلکہ سب لوگ مل کر ساجھے کی کھیتی کرتے تھے۔ ان لوگوں کی اقتصادی اکائی کیا تھی ، گن ، گھریلو برادری یا خون کے رشتوں پر مبنی کوئی درمیانی کمیونسٹی گروہ ، یا زمین کے مختلف مقامی حالات کے مطابق یہ تینوں ہی شکلیں پائی جاتی تھیں — ان سوالوں پر ابھی بہت دنوں تک بحث چلتی رہےگی۔ کوالیفسکی کا کہنا ہے کہ تاسیت نے جن حالات کا ذکر کیا ہے وہ مارک یا دیہی برادری پر دلالت نہیں کرتے بلکہ گھریلو برادری پر دلالت کرتے ہیں جو بہت آگے چل کر آبادی کے بڑھ جانے کی وجہ سے دیہی برادری میں بدل گئی۔

اس لئے کہا جاتا ہے کہ رومیوں کے زمانے میں جس علاقے میں جرمن بسے ہوئے تھے اور بعد میں جس علاقے کو انہوں نے رومیوں سے چھینا ، وہاں جرمنوں کی بستیاں گاؤں کی شکل میں نہیں تھیں بلکہ بڑی بڑی خاندانی برادریوں کی شکل میں تھیں جن میں کئی پشت کے لوگ رہتے تھے ، جو زمین کے ایک کافی بڑے علاقے پر کھیتی کرتے تھے اور ارد گرد کی صحرائی زمین کو اپنے پڑوسیوں کے ساتھ مل کر مشترکہ مارک کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ بات صحیح مان لی جائے تو کھیتی کی زمین کو بدلنے کے بارے میں تاسیت میں جو عبارت ہے ، اس کا زرعی مفہوم نکالنا ہوگا یعنی ہر گھریلو برادری ہر سال نئی

---

* اینگلس نے جس صفحے کی طرف اشارہ کیا ہے وہ چوتھے جرمن ایڈیشن کا ہے۔ دیکھئے اسی جلد کے صفحات ۲۴۲ — ۲۴۱۔ (ایڈیٹر)

زمین پر کھیتی کرتی تھی اور پچھلے سال کی جوتی ہوئی زمین کو ہل چلا کر خالی چھوڑ دیتی تھی یا اسے بالکل کام میں نہ لاتی تھی ۔ چونکہ آبادی بہت کم تھی اس لئے صحرائی زمین کی کوئی کمی نہ تھی اور اس لئے زمین کے لئے کسی کو جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ کئی صدیوں کے بعد جب گھرانے کے ممبروں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ پیداوار کی اس وقت جو حالت تھی اس میں مل کر کھیتی کرنا ناممکن ہو گیا ، تب کہیں ان گھریلو برادریوں کا شیرازہ منتشر ہوا ۔ پہلے جو ساجھے کے کھیت اور چراگاہیں تھیں ، انہیں ان الگ الگ گھرانوں میں جو اس وقت تک بن چکے تھے ، مروجہ طریقے کے مطابق بانٹ دیا گیا ۔ شروع میں یہ بٹوارہ ایک مقررہ وقفے کے بعد بار بار ہوتا تھا ، پھر یہ ایک بار ہمیشہ کے لئے ہو گیا لیکن جنگل ، چراگاہ ، ندی نالے اور تالاب سبھی کی مشترکہ ملکیت رہے ۔

جہاں تک روس کا تعلق ہے ، ارتقا کا یہ سلسلہ یہاں بھی تاریخی طور پر پوری طرح ثابت معلوم ہوتا ہے ۔ جہاں تک جرمنی اور پھر ان ملکوں کا تعلق ہے جن میں جرمن لوگ رہتے تھے ، اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاسیت کے زمانے میں بھی دیہی برادری کا وجود ماننے کے پرانے خیال کے مقابلے میں یہ خیال بنیادی مواد کی زیادہ اچھی توجیہ کرتا ہے اور مشکلات کو زیادہ آسانی سے حل کرتا ہے ۔ جرمنوں کی سب سے پرانی دستاویزوں کو — مثال کے طور پر Codex Laureshamensis (۱۴۶) کو — دیہی مارک برادری کے مقابلے میں گھریلو برادری کی بنیاد پر زیادہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے ۔ دوسری طرف اس خیال سے نئی دشواریاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جنہیں حل کرنا ضروری ہے ۔ یہ معاملہ مزید چھان بین کے بعد ہی طے ہو سکے گا ۔ لیکن میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ بہت ممکن ہے کہ جرمنی، اسکینڈی‌نیویا اور انگلینڈ میں گھریلو برادری ایک درمیانی منزل بھی رہی ہو ۔

جہاں سیزر کے زمانے میں جرمنوں نے ابھی حال میں کسی حد تک بستی بنا کر مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور کسی حد تک وہ مستقل سکونت اختیار کرنے کے لئے مناسب جگہ کی تلاش میں تھے ،

وہاں تاسیت کے زمانے میں انہیں بستیوں میں جم کر رہتے ہوئے ایک پوری صدی گذر چکی تھی۔ اس سے ذرائع زندگی کی پیدائش میں جو ترقی ہوئی، اسے کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ لکڑی کے لٹھوں سے بنے ہوئے مکانوں میں رہتے تھے۔ ان کے لباس ابھی تک ابتدائی جنگلیوں کے سے تھے۔ وہ موٹے اونی لبادے اور جانوروں کی کھالیں پہنتے تھے۔ عورتیں اور شرفا زیرجامہ کے طور پر سن کے بنے ہوئے کپڑے استعمال کرتے تھے۔ ان لوگوں کی غذا تھی دودھ، گوشت، جنگلی پھل اور جیسا کہ پلینی نے بتایا ہے، جئی کا دلیا (جو کہ آج بھی آئرلینڈ اور اسکاٹلینڈ میں کیلٹ لوگوں کی قومی غذا ہے)۔ ان کی دولت گائے بیل تھی۔ مگر ان کی نسل اچھی نہیں تھی اور جانور چھوٹے چھوٹے، بےڈھنگے، بےڈول اور بغیر سینگوں کے ہوتے تھے۔ ان کے گھوڑے چھوٹے چھوٹے ٹٹوؤں جیسے ہوتے تھے جو تیز نہیں دوڑ سکتے تھے۔ سکے کا بہت کم استعمال ہوتا تھا اور وہ بھی بہت تھوڑی تعداد میں۔ صرف رومی سکہ ہی چلتا تھا۔ جرمن لوگ سونے یا چاندی کے سامان نہیں بناتے تھے اور نہ وہ ان دھاتوں کو کوئی اہمیت دیتے تھے۔ لوہے کی بہت کمی تھی اور کم سے کم رائن اور ڈنیوب دریاؤں کے کنارے رہنےوالے لوگ اپنی ضرورت کا سارا لوہا باہر سے منگواتے تھے اور خود زمین سے نہیں نکالتے تھے۔ رونک رسم الخط (جو یونانی اور لاطینی حروف کی نقل کر کے لکھا جاتا تھا) صرف ایک خفیہ اشارتی ابجد کے طور پر محض مذہبی جادو ٹونے کے کام آتا تھا۔ انسانوں کی قربانی کرنے کی رسم ابھی تک جاری تھی۔ مختصر یہ کہ اس زمانے میں جرمنوں نے بربریت کے درمیانی دور سے نکل کر آخری دور میں حال ہی میں قدم رکھا تھا۔ جن جرمن قبیلوں سے روم کے باشندوں کا براہ راست تعلق قائم ہو گیا تھا اور اس لئے جو آسانی سے رومںوالوں کی صنعتی پیداوار حاصل کر سکتے تھے، وہ دھات یا کپڑے کی خود اپنی صنعتیں نہیں قائم کر پائے تھے۔ لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ بحیرۂ بالٹک کے ساحل پر رہنےوالے شمال مشرقی قبیلوں نے یہ صنعتیں قائم کر لی تھیں۔ شلیزوگ کے دلدلی علاقے میں زرہ بکتر کے جو ٹکڑے ملتے ہیں — لوہے کی لمبی تلوار، بکتر، چاندی کا خود وغیرہ

جو چیزیں دوسری صدی کے آخر کے رومی سکوں کے ساتھ ملی ہیں ، اور لوگوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے سے جرمنوں کے بنائے ہوئے دھات کے سامان جو چاروں طرف پھیل گئے ہیں ، وہ سب ایک مخصوص قسم کی عمدہ کاریگری کے نمونے پیش کرتے ہیں اور یہی بات ان چیزوں پر بھی صادق آتی ہے جو رومی چیزوں کے نمونے پر بنائی گئی تھیں - مگر جب جرمن لوگ ترک‌وطن کرکے متمدن رومن ایمپائر (سلطنت) میں آ بسے تو انگلینڈ کے سوا باقی سب جگہ ان کی اپنی صنعتیں ختم ہو گئیں - ان صنعتوں کی ابتدا اور ان کی نشو و نما کس قدر سلیقے سے اور یکساں طور پر ہوئی تھی اس کا ایک اچھا ثبوت ہے کانسے کا بنا ہوا بروچ - برگنڈی میں ، رومانیا میں اور آزف سمندر کے ساحل پر جو نمونے ملے ہیں ، وہ دیکھنے میں ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا وہ بھی برطانیہ اور سویڈن کے کارخانوں میں بنائے گئے ہوں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بھی جرمن کاریگری کی پیداوار ہیں -

ان لوگوں کا دستور بھی بربریت کے آخری دور کے حسب حال تھا - تاسیت کی روایت کے مطابق سرداروں (principes) کی ایک کاؤنسل ہوتی تھی جو کم اہمیت کے معاملوں کو طے کر دیتی تھی اور زیادہ اہم سوالوں کو عوامی اسمبلی کے سامنے فیصلے کے لئے پیش کر دیتی تھی - بربریت کے ابتدائی دور میں کم سے کم ان لوگوں میں جن کی ہمیں واقفیت ہے ، یعنی امریکہ کے انڈینوں میں ، عوامی اسمبلی صرف گن میں ہوتی تھی - اس زمانے تک قبیلے میں یا قبیلوں کے وفاق میں عوامی اسمبلی کا رواج نہیں شروع ہوا تھا - ایروکواس لوگوں کی طرح جرمنوں میں بھی کاؤنسل میں بیٹھنے والے سردار (principes) ابھی تک زمانۂ جنگ کے سرداروں (duces) سے صاف طور پر ممیز کئے جا سکتے تھے - اول الذکر کو اپنے قبیلے کے لوگوں سے تحفے کے طور پر مویشی ، غلہ وغیرہ ملنے لگا تھا اور وہ ابھی سے ، ایک حد تک ، اسی پر گذارا کرنے لگے تھے - امریکہ کی طرح یہاں بھی یہ لوگ ایک ہی خاندان سے چنے جاتے تھے - یونان اور روم کی طرح یہاں بھی پدری حق قائم ہو جانے کی وجہ سے رفتہ رفتہ یہ تبدیلی ہوئی کہ جن عہدوں کے لئے پہلے انتخاب ہوا کرتا تھا ، وہ اب موروثی بن گئے - اس طرح ہر

گن میں شرفا کا ایک خاندان پیدا ہو گیا۔ اس قدیم ، نام نہاد قبائلی شرفا کے طبقے کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے نقل وطن یا ہجرت کے دوران میں یا اس کے تھوڑے ہی دنوں کے اندر ختم ہو گیا۔ فوجی قائد یا رہنما محض اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر چنے جاتے تھے۔ اس میں یہ خیال نہیں کیا جاتا تھا کہ ان کی پیدائشی حیثیت کیا ہے۔ ان کو اختیار بہت کم تھا اور اپنی بات منوانے کے لئے خود کام کر کے مثال پیش کرنی ہوتی تھی۔ جیسا کہ تاسیت نے صاف لکھا ہے فوج کے اندر ڈسپلن قائم رکھنے کا اصلی اختیار پجاریوں کے ہاتھ میں تھا۔ اصلی اقتدار عوامی اسمبلی کے ہاتھ میں تھا۔ بادشاہ یا قبائلی سردار صدارت کرتا تھا۔ فیصلہ عوام کرتے تھے — زیرلب بڑبڑانے کا مطلب ہوتا تھا ’’ نہیں ،، اور زور سے نعرے لگانے اور ہتھیار کھڑ کھڑانے کا مطلب ہوتا تھا ’’ ہاں ،،۔ عوامی اسمبلی عدالت کا کام بھی کرتی تھی۔ اس کے سامنے شکایتیں پیش ہوتی تھیں اور ان کا فیصلہ کیا جاتا تھا اور سزائے موت تک دی جاتی تھی۔ موت کی سزا صرف بزدلی ، غداری اور غیرفطری اخلاقی برائیوں کے لئے دی جاتی تھی۔ گن اور دوسری شاخیں بھی مقدموں کی شنوائی کرتی تھیں۔ ان کا سردار صدارت کرتا تھا۔ جرمنوں کی سبھی ابتدائی عدالتوں کی طرح یہاں بھی صدر کا کام صرف عدالت کی کارروائی کو چلانا اور جرح کرنا تھا۔ جرمنوں میں ہر جگہ اور ہمیشہ یہی رواج تھا کہ کسی جرم کی سزا پورا سماج دیتا تھا۔

سیزر کے زمانے سے قبیلوں کے وفاق بننے لگے۔ ان میں سے بعضوں میں بادشاہ بھی ہونے لگے تھے۔ یونانیوں اور رومیوں کی طرح ان لوگوں میں بھی سب سے بڑا سپہ سالار جلد ہی مطلق العنان حکمراں بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ کبھی کبھی ان کے حوصلے پورے ہو جاتے تھے۔ اس طرح جو لوگ اقتدار حکومت غصب کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے وہ اپنی مطلق العنان حکومت نہیں قائم کر پاتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ گن دستور کی بندشوں کو توڑنے لگے۔ جن غلاموں کو آزاد کر دیا جاتا تھا ، ان کی گن دستور میں حیثیت عام طور پر نیچی ہوتی تھی کیونکہ وہ کسی گن کے ممبر نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن نئے بادشاہوں کی مہربانی سے یہ لوگ اکثر اونچے عہدے ، دولت اور اعزاز حاصل

کرتے تھے ۔ رومن ایمپائر کی فتوحات کے بعد ، ان فوجی رہنماؤں کے سلسلے میں جو بڑے بڑے ملکوں کے بادشاہ بن گئے تھے، یہی بات ہوئی ۔ فرینک لوگوں میں بادشاہ کے غلاموں اور آزاد کئے ہوئے لوگوں کا شروع میں دربار میں اور بعد میں پوری ریاست میں بڑا دبدبہ تھا ۔ نئے امرا اور شرفا کی ایک بڑی تعداد انہیں کی اولاد میں تھی ۔

بادشاہت کے ارتقا میں ایک ادارے سے بہت مدد ملی اور وہ ادارہ تھا افراد کی اپنی اپنی فوج ۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح امریکی انڈینوں میں گنوں کے ساتھ ساتھ اپنے طور پر جنگ چلانے کے لئے نجی جماعتیں بنائی جانے لگی تھیں ۔ جرمنوں میں ان نجی جماعتوں نے مستقل حیثیت اختیار کر لی ۔ اگر کوئی سپہ سالار شہرت حاصل کر لیتا تو لوٹ کے مال کے شوق میں جنگجو نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اس کے گرد جمع ہو جاتی ۔ یہ لوگ ذاتی طور پر اس سے وفاداری کا عہد کرتے تھے اور وہ سپہ سالار ان سے ۔ وہ انہیں کھانا دیتا تھا ، تحفے تحائف دیتا تھا اور ایک درجہ بدرجہ کے اصول پر ان کی تنظیم کرتا تھا ۔ ایک باڈی گارڈ یا محافظ دستہ ، چھوٹی موٹی لڑائیوں میں حصہ لینے کے لئے اور فوری طور پر میدان میں اتر آنے کے لئے ایک ٹکڑی اور بڑی لڑائیوں کے لئے فوجی افسروں کا تربیت‌یافتہ جتھہ ہوتا تھا ۔ یہ نجی فوجیں اگرچہ کافی کمزور ہوتی تھیں اور بعد میں یہ بات ثابت بھی ہو گئی ، مثال کے لئے اٹلی میں اوڈوآکر کے تحت بھی ان کی کمزوری ثابت ہو گئی ، لیکن پھر بھی انہوں نے قدیم عوامی آزادیوں کے لئے گھن کے کیڑے کا کام کیا اور لوگوں کی ہجرت یا نقل وطن کے دوران میں اور اس کے بعد بھی انہوں نے یہی کام پورا کیا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو بادشاہت کے ارتقا کے لئے انہوں نے مناسب زمین تیار کی اور دوسرے جیسا کہ تاسیت نے کہا ہے ، ان فوجوں کو بنائے رکھنے کے لئے انہیں ہمیشہ لڑائی اور لوٹ مار کی مہموں میں مصروف رکھنا ضروری تھا ۔ لوٹنا ان کا اصلی مقصد بن گیا ۔ اگر فوجی سردار کو اپنے آس پاس کے علاقے میں اس کی کوئی گنجائش نہیں دکھائی دیتی تھی تو وہ اپنی فوجوں کو لے کر دوسرے ملکوں پر چڑھائی کر دیتا جہاں جنگ کرنے اور لوٹ کا مال حاصل کرنے کی

گنجائش ہوتی۔ جرمن امدادی فوجیں جو رومی جھنڈے کے نیچے خود جرمنوں سے بھی بڑی تعداد میں لڑتی تھیں، ایسے ہی نجی دستوں اور ٹکڑیوں سے بنی تھیں۔ یہی وہ پہلا بیج تھا جس سے آگے چل کر لینڈس کنخت* نظام کی پیدائش ہوئی جو جرمنوں کے لئے کلنک اور لعنت ثابت ہوا۔ رومی سامراج کی فتح کے بعد بادشاہوں کے یہ نجی فوجی بھی غلاموں اور روم کے درباریوں کی طرح بعد کے زمانے کے شرفا کا حصہ بن گئے۔

غرضکہ عام طور پر جرمن قبیلوں نے بھی مل کر جاتیوں کی شکل اختیار کی اور ان کا وہی دستور تھا جو سورمائی عہد کے یونانیوں میں اور رومیوں میں نام نہاد بادشاہوں کے زمانے میں پایا جاتا تھا — یعنی ان میں بھی اسی طرح کی عوامی اسمبلی، گن سرداروں کی کاؤنسل اور فوجی کمانڈر ہوا کرتے تھے جو سچ مچ کے بادشاہ بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ یہ ایک نہایت ترقی‌یافتہ دستور تھا جو کسی گن سماج میں قائم ہو سکتا تھا۔ وہ بربریت کے آخری دور کا معیاری دستور تھا۔ جیسے ہی سماج ان حدود کے باہر نکل گیا جن کے لئے وہ دستور موزوں تھا، ویسے ہی گن نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ گن نظام ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ ریاست نے لے لی۔

---

* لینڈس کنخت (Landsknecht) — تنخواہ‌دار سپاہی۔ (ایڈیٹر)

۸

جرمن لوگوں میں ریاست کا آغاز

تاسیت کا کہنا ہے کہ جرمن لوگوں کی تعداد بہت بڑی تھی۔ الگ الگ جرمن جاتیوں کی تعداد کا کم و بیش اندازہ سیزر نے دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اوسی پیتن اور تینکتیرن لوگوں کی تعداد عورتوں اور بچوں کو ملا کر ایک لاکھ اسی ہزار تھی۔ یہ لوگ دریائے رائن کے بائیں کنارے پر آ بسے تھے۔ اسی طرح ہر جاتی میں تقریباً ایک لاکھ آدمی ہوتے تھے*۔ ایروکواس لوگ اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی تعداد میں اس سے کہیں کم تھے۔ ان کی تعداد جب بیس ہزار بھی نہیں تھی تو وہ بڑی جھیلوں سے لے کر اوھیو اور پوٹومک تک کے پورے ملک میں لوگوں کے لئے ایک دہشت کی چیز

---

* دیودورس نے گال علاقے کے کیلٹ لوگوں کے بارے میں جو بات لکھی ہے، اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس نے لکھا ہے: ”گال علاقے میں غیرمساوی قوت رکھنےوالی کئی جاتیاں رہتی ہیں۔ سب سے بڑی جاتی کی تعداد دو لاکھ اور سب سے چھوٹی کی پچاس ہزار ہے۔“ (Diodorus Siculus، پانچواں باب، صفحہ ۲۵۔) اس سے سوا لاکھ کا اوسط نکلتا ہے۔ چونکہ کئی گال جاتیاں زیادہ ترقی کر چکی تھیں، اس لئے ان کی تعداد جرمنوں سے زیادہ رہی ہوگی۔

بنے ہوئے تھے۔ اگر ہم رائن علاقے کی الگ الگ جاتیوں کو جن کے بارے میں رپورٹوں کی بدولت ہماری واقفیت زیادہ ہے، نقشے پر جمع کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں سے ہر جاتی اوسطاً پروشیا کے ایک موجودہ انتظامی ضلع کے برابر یعنی دس ہزار مربع کلومیٹر یا ۱۸۲ جغرافیائی مربع میل کے علاقے میں بسی ہوئی تھی۔ لیکن روم والے جس کو * Germania Magna کہتے تھے، اس کی سرحد دریائے وسٹولا تک پہنچتی تھی، اس کا رقبہ کم و بیش پانچ لاکھ مربع کلومیٹر تھا۔ اگر ایک جاتی کے لئے اوسطاً ایک لاکھ کا حساب رکھا جائے تو Germania Magna کی کل آبادی ۵۰ لاکھ ہو جاتی ہے جو بربریت کی جاتیوں کے ایک گروہ کے لئے ذرا بڑی تعداد ہے، حالانکہ فی مربع کلومیٹر دس آدمی یا ایک جغرافیائی مربع میل کے لئے ۵۵۰ کی آبادی آج کل کی حالت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ لیکن اس تعداد میں اس زمانے کے تمام جرمن شامل نہیں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ گوتھ نسل کی جرمن جاتیاں، یعنی باستارنین، پیوکینین اور دوسری جاتیاں کارپے تھین پہاڑوں کے کنارے کنارے دریائے ڈنیوب کے دھانے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان لوگوں کی تعداد اتنی بڑی تھی کہ پلینی نے انہیں جرمنوں کا پانچواں بنیادی قبیلہ کہا تھا۔ ۱۸۰ ق۔ م۔ میں یہ لوگ مقدونیہ کے بادشاہ پرسیئس کے تنخواہ‌دار سپاہیوں کا کام کرنے لگے تھے اور آگسٹس کے عہد حکومت کے شروع میں وہ ایڈریانوپل کے پاس تک بڑھ آئے تھے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ ان کی تعداد صرف دس لاکھ تھی تو سن عیسوی کے شروع میں جرمنوں کی کل تعداد ساٹھ لاکھ سے کم نہیں رہی ہوگی۔

جرمنی میں بس جانے کے بعد آبادی نہایت تیزی سے بڑھی ہوگی۔ اوپر جس صنعتی ترقی کا ذکر ہوا ہے وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ شلیزوگ کے دلدل میں جو چیزیں ملی ہیں وہ تیسری صدی کی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ان کے ساتھ جو رومن سکے برآمد ہوئے ہیں، وہ اسی زمانے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تیسری صدی تک بحیرۂ بالٹک کے ساحلوں پر دھات اور کپڑے کی صنعت کافی ترقی کر

---

* Germania Magna یعنی عظیم تر یا زیادہ بڑا جرمنی۔ (ایڈیٹر)

چکی تھی ، سلطنت روم کے ساتھ کافی تجارت ہوتی تھی اور دولتمند طبقہ نہایت عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ تمام باتیں بتاتی ہیں کہ آبادی پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی تھی۔ لیکن اسی زمانے میں جرمنوں نے دریائے رائن ، رومن سرحدی فصیل اور دریائے ڈنیوب تک کی پوری سرحد پر ، بحر شمالی سے بحیرۂاسود تک عام دھاوا بول دیا۔ یہ اس بات کا براہ‌راست ثبوت ہے کہ برابر بڑھتی ہوئی آبادی اپنے علاقوں سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کشمکش کے تین سو برس کے عرصے میں گوتھا لوگوں کی اصلی جماعت (اسکینڈی‌نیویا کے گوتھ لوگوں اور برگنڈیوں کو چھوڑ کر) جنوب مشرق کی طرف بڑھ گئی اور اس حملے کے مورچے کا یہی بایاں بازو بنا۔ شمالی جرمن لوگ (ہرمی‌نونی) اس مورچے کے وسط میں اوپری ڈنیوب تک بڑھ آئے اور استی‌وونی لوگ جو اس زمانے میں فرینک کہلانے لگے ، دریائے رائن کے کنارے کنارے اس مورچے کے دائیں حصے میں بڑھ آئے۔ برطانیہ کو فتح کرنے کا کام انگیوونی لوگوں کے حصے میں آیا۔ پانچویں صدی کے آخر میں روم کی کمزور و ناتواں اور بے یار و مددگار سلطنت کے دروازے جرمن حملہ‌آوروں کے لئے کھلے ہوئے تھے۔

اس سے پہلے کے ابواب میں ہم قدیم یونانی اور رومی تمدن کے گہوارے کے پاس کھڑے تھے۔ اب ہم اس کی قبر کے پاس کھڑے ہیں۔ کئی صدیوں سے بحیرۂ روم کے تمام ملکوں پر روم کی عالمگیر طاقت کا رندا چل‌چل کر ان کی تمام امتیازی خصوصیات مٹاتا جا رہا تھا۔ ان چند جگہوں کو چھوڑ کر جہاں یونانی زبان نے اس کا مقابلہ کیا ، تمام قومی زبانیں ایک خراب اور بگڑی ہوئی لاطینی سے مغلوب ہو کر پیچھے ہٹ گئیں۔ قومیتوں کا کوئی امتیاز اور فرق باقی نہیں رہا۔ نہ کوئی گال تھا ، نہ ایبیرین ، نہ لیگورین تھا اور نہ ناریکن (۱۴۷) — سب رومن ہو گئے تھے۔ رومی نظم و نسق اور رومی قانون نے ہر جگہ خون کے رشتوں یا سگوتری کی پرانی جماعتوں کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا ، اور مقامی اور قومی خود اختیاری کے آخری آثار کو بھی مٹا دیا تھا۔ نوساختہ اور نوایجاد رومنیت اس نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ کسی قومیت کا نہیں بلکہ قومیت نہ ہونے

کا اظہار تھا۔ نئی قوموں کی تعمیر کے عناصر ہر جگہ موجود تھے۔ مختلف صوبوں کی لاطینی بولیوں کا فرق روز بروز بڑھتا گیا۔ جن قدرتی سرحدوں نے کسی زمانے میں اٹلی، گال، اسپین، افریقہ کو الگ الگ آزاد ملک بنایا تھا، وہ آج بھی موجود تھیں اور ان کا اثر بھی پڑ رہا تھا۔ پھر بھی کہیں کوئی ایسی قوت نہیں تھی جو ان عناصر کو ملا کر نئی قوموں کی تخلیق کرتی۔ ترقی کی صلاحیت کے کہیں کوئی آثار نہیں دکھائی دیتے تھے اور نہ مقابلے کی کہیں کوئی طاقت نظر آتی تھی۔ ایسی صورت میں تخلیقی قوت کی بھلا کیا گنجائش ہو سکتی تھی۔ اس وسیع علاقے کی کثیر انسانی آبادی کو ایک شیرازے میں باندھ رکھنے والی چیز ایک ہی تھی اور وہ تھی رومی ریاست اور وہی کچھ زمانہ گذرتے گذرتے ان کی بدترین دشمن اور ان پر ظلم ڈھانے والی بن گئی تھی۔ صوبوں نے روم کو برباد کر دیا تھا۔ روم خود بھی اور شہروں کی طرح ایک صوبائی شہر بن گیا۔ اسے کچھ مخصوص حقوق اب بھی حاصل تھے مگر اب وہ حکومت نہیں کرتا تھا، وہ اب ایک عالمگیر سلطنت کا مرکز نہیں تھا، وہ اب شہنشاہوں اور نائب شہنشاہوں کی راجدھانی بھی نہیں تھا کیونکہ وہ تو اب قسطنطنیہ، تریر اور میلان میں رہنے لگے تھے۔ رومی ریاست اب ایک بھاری بھر کم اور پیچیدہ مشین ہو گئی تھی جس کا واحد مقصد اپنی رعایا کا استحصال کرنا تھا۔ ریاست ان سے ٹیکس اور خدمتیں لیتی اور طرح طرح کے محصول وصولتی تھی جس کی وجہ سے لوگ روزبروز افلاس کے گڑھے میں دھنستے گئے۔ سلطنت کے پروکیوریٹر، ٹیکس وصولنےوالے افسر اور سپاہی عوام کے ساتھ جیسی زبردستی کرتے تھے، اس سے یہ دباؤ اور بوجھ اور بھی ناقابل برداشت ہو گیا۔ روم کی ریاست نے اپنا عالمگیر تسلط قائم کرکے یہ حالت کر رکھی تھی۔ اس کے قائم رہنے کا جواز یہ بتلایا جاتا تھا کہ ملک میں امن و امان قائم رکھنے اور ملک کو باہر کے بربریوں کے حملوں سے بچانے کے لئے اس کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کا نظم اور امن و امان بدترین بدنظمی اور بدامنی سے بھی بدتر تھا۔ اور جن بربر لوگوں سے ریاست اپنے شہریوں کو بچانے

کا دعوی کرتی تھی ، انھی کو شہریوں نے اپنا نجات دھندہ سمجھا اور ان کا خیر مقدم کیا۔

سماجی حالات بھی کم خراب نہیں تھے۔ ریپبلک کے آخری برسوں میں ھی رومی حکومت کی بنیاد مفتوحہ صوبوں کے بدترین استحصال پر تھی۔ شہنشاھوں نے اس استحصال کو ختم نہیں کیا بلکہ الٹے اسے منظم اور باقاعدہ کر دیا۔ جتنا زیادہ سلطنت کا زوال ھوتا گیا اتنا ھی زیادہ ٹیکس اور جبری خدمتیں بڑھتی گئیں اور سرکاری افسر اتنا ھی زیادہ بے شرمی کے ساتھ لوگوں کو لوٹنے اور ستانے لگے۔ تجارت اور صنعت سے رومیوں کو کبھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ تو پوری کی پوری قوموں پر حکم چلایا کرتے تھے۔ وہ صرف سود خوری میں اپنے پہلے اور بعد کے سبھی لوگوں سے بڑھے ھوئے تھے۔ تھوڑی بہت تجارت جو تھی اور جس نے کچھ دنوں تک کسی طرح اپنے آپ کو قائم رکھا تھا ، وہ سرکاری لوٹ کھسوٹ کی بدولت برباد ھو رھی تھی۔ جو کچھ بچ رھی تھی وہ سلطنت کے مشرقی یعنی یونانی حصے میں تھی لیکن وہ ھمارے موجودہ مطالعے کے دائرے سے باھر ھے۔ افلاس عام تھا۔ تجارت ، دستکاری ، فنون اور آبادی کا زوال ھو رھا تھا ، شہر انحطاط پذیر تھے ، زراعت میں بھی تنزل ھو رھا تھا اور وہ نیچے درجے پر پہنچ چکی تھی۔ رومیوں کے عالمگیر تسلط کا آخری نتیجہ یہی تھا۔

قدیم زمانے میں ھر جگہ پیداوار کی سب سے اھم اور فیصلہ کن شاخ زراعت تھی۔ اس کی اھمیت اب پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ اٹلی میں بڑی بڑی جاگیروں (latifundia) کو جو ریپبلک کے خاتمے کے زمانے سے تقریباً سارے علاقے پر چھائی ھوئی تھیں ، دو طرح سے استعمال کیا جاتا تھا — یا تو چراگاہ کے طور پر ، جس پر سے آبادی کو ھٹا کر بھیڑیں اور بیل پالے جانے لگے تھے جن کی دیکھ بھال کے لئے بہت تھوڑے سے غلاموں کی ضرورت تھی ، یا ایسی جاگیروں کے طور پر جن پر بہت سے غلاموں کی مدد سے بڑے پیمانے پر باغبانی کی جاتی تھی۔ ان کی پیداوار کچھ تو مالکوں کے اپنے عیش و آرام کی ضرورت پوری کرنے کے کام آتی تھی اور کچھ شہروں کے بازاروں میں فروخت کی جاتی تھی۔ بڑی بڑی چراگاھوں کو قائم رکھا گیا تھا اور کسی حد

تک بڑھایا بھی گیا تھا۔ لیکن دوسری قسم کی جاگیریں اور باغبانیاں مالکوں کے افلاس اور شہروں کے زوال کی بدولت تباہی کا شکار ہو گئیں۔ بڑی بڑی جاگیروں (لیٹی‌فنڈیا) کا یہ اقتصادی نظام جس کی بنیاد غلاموں کے کام پر تھی، اب نفع بخش نہیں رہا تھا۔ لیکن اس زمانے میں بڑے پیمانے پر کھیتی کا کام کرنے کی یہی ایک ممکن صورت تھی۔ چھوٹے پیمانے کی کھیتی ہی ایک بار پھر اس کی تنہا نفع‌بخش صورت رہ گئی۔ یکے بعد دیگرے بڑی بڑی کھیتیاں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دی گئیں اور انہیں موروثی اسامیوں کے ہاتھوں پٹے پر دے دیا گیا جو ایک مقررہ رقم ادا کرتے تھے یا partiarii کے سپرد کر دیا گیا جو اساسی نہیں بلکہ زراعت کے مینجر ہوا کرتے تھے اور جنہیں اپنے کام کے لئے چھ میں صرف ایک یا نو میں صرف ایک حصہ ملتا تھا۔ لیکن زیادہ‌تر یہ چھوٹے چھوٹے قطع کولونی (coloni) کو دئے جاتے تھے جو سالانہ ایک مقررہ رقم ادا کرتے تھے۔ وہ زمین سے وابستہ ہوتے تھے اور انہیں ان قطعات کے ساتھ ہی فروخت کیا جا سکتا تھا۔ یہ لوگ غلام نہیں تھے لیکن وہ آزاد بھی نہیں تھے۔ وہ آزاد شہریوں سے شادی بیاہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی آپس کی شادی، شادی نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ جیسا کہ غلاموں میں ہوتا تھا اس کی حیثیت محض داشتہ گیری (contubernium) کی تھی۔ وہ ازمنۂوسطی کے زرعی غلاموں کے پیش‌رو تھے۔

قدیم زمانے کا غلامی کا نظام متروک ہوگیا۔ اس غلامی کے نظام سے نہ تو دیہات کی بڑے پیمانے کی کھیتی میں قابل ذکر منافع ہوتا تھا اور نہ شہروں کے دستی صنعت و حرفت کے کارخانوں میں۔ اس کی پیداوار کےلئے کوئی بازار نہیں رہ گیا تھا۔ چھوٹے پیمانے کی زراعت یا دستکاری میں زیادہ غلاموں کی گنجائش نہیں تھی۔ اور سلطنت کی خوشحالی کے زمانے کی عظیم‌الشان پیداوار اب گھٹ کر چھوٹے پیمانے کی زراعت اور دستکاری کی صورت میں رہ گئی تھی۔ سماج میں غلاموں کی ضرورت صرف امیروں کے گھریلو کاموں اور عیش و آرام کے لئے تھی۔ لیکن غلامی کا دم توڑتا ہوا نظام اب بھی اتنا جاندار تھا کہ پیداوار کا تمام کام بظاہر غلاموں کا کام معلوم ہوتا تھا جو آزاد رومنوں کے شایان

شان نہیں تھا ۔ اور اب ہر شخص ایک آزاد رومن تھا ۔ ایک تو یہ وجہ تھی جس سے غیر ضروری طور پر غلاموں کی تعداد میں اضافہ ہوا ۔ اور یہ غلام چونکہ ایک بوجھ بن گئے تھے اس لئے انہیں آزاد کر دیا گیا ۔ دوسری طرف کولونی اور بھک منگے آزادوں کی تعداد بڑھی ۔ (ان بھک منگوں کی حیثیت وھی تھی جو امریکہ کی سابقہ غلام رکھنے والی ریاستوں میں افلاس‌زدہ سفیدفام لوگوں «poor whites» کی تھی) ۔ قدیم غلامی کے اس طرح رفتہ رفتہ مٹنے کا عمل عیسائیت کا مرھون منت نہیں ھے ۔ عیسائیت نے صدیوں تک سلطنت روم میں غلامی کے نظام کے مزے لوٹے اور بعد میں بھی غلاموں کی اس تجارت کو روکنے کےلئے کوئی قدم نہیں اٹھایا جو عیسائیوں کے ھاتھ میں تھی ۔ نہ تو شمال میں جرمنوں کی ، نہ بحیرۂروم میں وینیشیاوالوں کی تجارت کو اور نہ بعد کے زمانے میں حبشی غلاموں کی تجارت کو روکنے کےلئے کچھ کیا * ۔ غلام رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں تھا اور اس‌لئے یہ نظام مٹ گیا ۔ لیکن مرتی ھوئی غلامی نے اپنا زھریلا اثر چھوڑا جس کی وجہ سے پیداوار کا سارا کام آزاد مردوں کےلئے ذلت و رسوائی کا کام سمجھا جانے لگا ۔ رومیوں کی دنیا ایک اندھی گلی میں پھنس گئی : غلامی کا نظام اقتصادی حیثیت سے ناممکن ھوچکا تھا لیکن آزاد آدمیوں کے کام کرنے کو اخلاقی طور پر معیوب سمجھا جاتا تھا ۔ ان میں سے پہلی چیز اب سماجی پیداوار کی بنیادی شکل رہ نہیں سکتی تھی ، اور دوسری ابھی اس کی بنیادی شکل بن نہیں سکتی تھی ۔ ایسی صورت میں صرف ایک مکمل انقلاب ھی کچھ مدد کر سکتا تھا ۔

صوبوں میں بھی حالات اس سے کچھ بہتر نہیں تھے ۔ ھمارے پاس جو رپورٹیں ھیں وہ زیادہ‌تر گال کے متعلق ھیں ۔ کولونی کےساتھ چھوٹے چھوٹے آزاد کسان ابھی موجود تھے ۔ سرکاری افسروں ، ججوں اور

---

* کریمونا کے پادری لیوتپراند کا کہنا ھے کہ دسویں صدی میں ویردین کی یعنی مقدس جرمن شہنشاھیت (۱۴۸) کی سب سے اھم صنعت ھیجڑے یا خواجہ سرا تیار کرنا تھا ، جنہیں مور لوگوں کے حرم سرا کےلئے اسپین بھیج کر بہت نفع حاصل کیا جاتا تھا ۔

سودخوروں کے ظلم اور لوٹ کھسوٹ سے بچنے کےلئے اکثر وہ ذی اقتدار اور طاقتور لوگوں کی پناہ اور سرپرستی میں چلے جاتے تھے۔ اور ایسا وہ الگ الگ انفرادی طور پر نہیں بلکہ پورا کا پورا گروہ یا برادری یہی کرتی تھی۔ اور اس کا رواج اتنا بڑھا کہ چوتھی صدی میں شہنشاہوں کو اکثر یہ فرمان صادر کرنا پڑتا تھا کہ ایسا کرنے کی ممانعت ہے۔ جو لوگ پناہ قبول کرتے تھے انہیں اس سے کیا مدد ملتی تھی ؟ سرپرست کی شرط یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنی زمینوں کا حق ملکیت اس کے نام منتقل کردیں اور اس کے بدلے میں وہ انہیں زندگی بھر اس زمین پر کھیتی کرنے کا حق دیتا تھا۔ یہ چال مقدس کلیسا کو بھی یاد تھی اور نویں اور دسویں صدی میں اس نے خدا کی عظمت اور اپنی زمینداری دونوں کو بڑھانے کےلئے نہایت آزادی کے ساتھ اس سے کام لیا۔ لیکن اس زمانے میں یعنی ۴۷۵ء کے لگ‌بھگ مارسیلز کے پادری سالویانس نے اس لوٹ کی بڑی سختی سے مذمت کی۔ اس نے بتایا ہے کہ رومن افسروں اور بڑے زمینداروں کے مظالم اس حد تک ناقابل برداشت ہو چکے تھے کہ بہت سے ”رومن“ بھاگ کر ان ضلعوں میں چلے گئے جن پر بربریوں کا قبضہ تھا اور وہاں جو رومن شہری آبسے تھے وہ کسی چیز سے اتنا نہیں ڈرتے تھے جتنا دوبارہ رومن حکومت کی ماتحتی میں جانے سے۔ غریب ماں باپ اس زمانے میں اکثر اپنے بچوں کو غلام بنا کر بیچ دیا کرتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کو روکنے کے لئے ایک قانون بنایا گیا تھا۔

رومیوں کو خود ان کی ریاست سے آزاد کرنے کے معاوضے میں بربر جرمنوں نے ان کی زمین کا دو تہائی حصہ خود لے لیا اور اس کو آپس میں بانٹ لیا۔ یہ بٹوارہ گن نظام کے قاعدے کے مطابق کیا گیا۔ فاتحوں کی تعداد چونکہ نسبتاً کم تھی ، اس لئے بہت سی زمینوں کا بٹوارہ نہیں ہوا وہ کچھ تو پوری جاتی کی اور کچھ قبیلوں اور گنوں کی اجتماعی ملکیت رہیں۔ ہر گن میں کھیت اور چراگاہوں کو قرعہ ڈال کر مساوی حصوں میں مختلف انفرادی گھرانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اس زمانے میں بٹوارہ بار بار ہوتا تھا یا نہیں۔ لیکن بہر حال رومی صوبوں میں یہ رواج تھوڑے ہی دنوں میں بند ہو گیا۔ اور الگ الگ گھرانوں کو جو زمین دی گئی تھی وہ ان کی نجی

ملکیت ہو گئی جسے ایلودیم کہتے تھے۔ جنگل اور چراگاہ کا بٹوارہ نہیں کیا جاتا تھا۔ انہیں سب مل کر ساجھے میں استعمال کرتے تھے۔ اس کا استعمال اور تقسیم کی ہوئی زمین پر کھیتی کرنے کا طریقہ قدیم رواج اور پورے سماج کی رائے سے طے کیا جاتا تھا۔ کوئی گن اپنے گاؤں میں جتنے زیادہ دنوں تک رہ جاتا تھا اور زمانہ گذرنے پر جرمن اور رومن جتنا زیادہ آپس میں گھل‌مل جاتے تھے اتنا ہی زیادہ یک‌جدی رشتہ یا سگوتری کا ناتہ ، ایک جگہ رہنے کے تعلق کے مقابلے میں کمزور ہوکر پیچھے ہٹتا گیا۔ مارک کمیونٹی میں گن گم ہو گئے لیکن اس میں ممبروں کی ابتدائی یک‌جدی رشتہ داری کے کافی اثرات دکھائی دیتے تھے۔ غرضکہ کم سے کم ان ملکوں میں جہاں مارک کمیون کو قائم رکھا گیا تھا یعنی شمالی فرانس ، انگلینڈ ، جرمنی اور اسکینڈی‌نیویا میں گن دستور کو غیر محسوس طریقے پر علاقائی دستور میں بدل دیا گیا اور اس طرح وہ اس قابل ہو گیا کہ ریاست کے ساتھ میل کھا سکے۔ پھر بھی اس کی فطری جمہوریت باقی رہی جو کہ پورے گن نظام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ غرضکہ اس طرح بعد کے اس زمانے میں بھی جبکہ اسے زبردستی انحطاط کے گڑھے میں دھکیل دیا گیا تھا ، اس نے گن دستور کے ایک ٹکڑے کو بچائے رکھا اور اس طرح مظلوموں کے ہاتھ میں ایک ایسا حربہ چھوڑ دیا جو موجودہ زمانے میں بھی استعمال کے لئے تیار ہے۔

گن میں خون کے رشتوں کی اہمیت اتنی جلدی ختم ہو گئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ قبیلے میں اور پوری جاتی میں بھی سلطنت روم کو فتح کر لینے کے بعد وہ ادارے کمزور پڑ گئے جو خون کے رشتوں پر مبنی تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ محکوم لوگوں پر حکومت کرنا گن دستور سے میل نہیں کھاتا۔ یہاں یہ بات بہت بڑے پیمانے پر دکھائی پڑتی ہے۔ جرمن جاتیاں اب روسی صوبوں کی مالک تھیں۔ انہیں اپنی فتح کو منظم شکل دینی تھی۔ لیکن رومیوں کی کثیر آبادی کو وہ نہ تو اپنے گن کے اداروں میں شامل کر سکتے تھے اور نہ ان اداروں کی مدد سے ان پر حکومت کر سکتے تھے۔ رومیوں کے مقامی حکومتی ادارے شروع میں جرمنوں کی فتح کے بعد بھی کام کرتے رہے تھے۔

لیکن یہ ضروری تھا کہ ان کے اوپر کوئی ایسی تنظیم ہو جو رومی ریاست کی جگہ لے سکے۔ یہ دوسری ریاست ہی ہو سکتی تھی۔ اس لئے گن دستور کے اداروں کو ریاست کے اداروں میں بدلنا ضروری تھا اور حالات کے دباؤ کی بدولت اسے بہت جلدی میں کرنا پڑا۔ لیکن فاتح جاتی کا پہلا نمائندہ ایک فوجی کمانڈر تھا۔ مفتوحہ علاقے کی اندرونی اور بیرونی حفاظت کا تقاضہ تھا کہ اس کے اختیارات کو بڑھایا جائے۔ فوجی قیادت کو بادشاہت میں بدلنے کا وقت آگیا تھا۔ یہ کر دیا گیا۔

فرینک لوگوں کی سلطنت کو لیجئے۔ یہاں نہ صرف رومی ریاست کا وسیع علاقہ فاتح سالین جاتی کو مل گیا تھا بلکہ زمین کے تمام ایسے بہت بڑے بڑے قطعات بھی، خاص کر بڑے بڑے جنگل جو بڑے یا چھوٹے حلقے (Gau) اور مارک برادریوں میں نہیں بانٹے گئے تھے، انہیں مل گئے تھے۔ ان پر ان کا مکمل قبضہ تھا۔ فرینک لوگوں کے بادشاہ نے جو ایک معمولی فوجی کمانڈر سے بڑھ کر سچ مچ کا بادشاہ بن گیا تھا، پہلا کام یہ کیا کہ عوام کی اس ملکیت کو شاہی جاگیر بنا دیا، اس زمین کو عام لوگوں سے چھین لیا اور اسے اپنے ذاتی خدمت گذاروں کو انعام یا جاگیر کے طور پر دے دیا۔ اس کے ذاتی خدمتگذاروں میں پہلے صرف اس کی نجی فوج کے سپاہی اور فوج کے باقی تمام نائب سالار ہوا کرتے تھے۔ بعد میں ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ان میں نہ صرف روم کے لوگ یعنی گال علاقے کے وہ باشندے شامل ہو گئے جو رومی بن گئے تھے اور بادشاہ کے لئے بہت ضروری ہو گئے تھے کیونکہ وہ لکھنے کا فن جانتے تھے، پڑھے لکھے تھے اور ملک کے قوانین کے ساتھ ساتھ رومی والوں کی بول چال کی زبان اور ادبی لاطینی سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ بلکہ ان میں ان کے علاوہ غلام، زرعی غلام اور غلامی سے آزاد کئے ہوئے لوگ بھی شامل ہو گئے۔ وہ بادشاہ کے درباری بن گئے تھے اور انہیں میں سے وہ اپنے پسندیدہ مصاحب چنا کرتا تھا۔ انہیں تمام لوگوں کو عوامی زمین کے قطعات دئے گئے — پہلے زیادہ تر عطیے کے طور پر اور بعد میں بینی فس (۱۳۹) کی صورت میں۔ شروع میں یہ زمینیں زیادہ تر بادشاہ کی زندگی بھر کے لئے دی جاتی تھیں۔ اور اس طرح عوام کی لوٹ پر شرفا کے ایک نئے طبقے کی بنیاد رکھی گئی۔

لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ دور دور تک پھیلی ہوئی سلطنت پر قدیم گن دستور کے مطابق حکومت نہیں کی جا سکتی تھی۔ سرداروں کی کاؤنسل ، اگر بہت پہلے متروک نہ بھی ہو گئی ہو ، تو اب منعقد نہیں کی جا سکتی تھی اور جلد ہی بادشاہ کے مستقل خدمتگذاروں اور مصاحبوں نے اس کی جگہ لے لی۔ قدیم عوامی اسمبلی کو بظاہر اب بھی قائم رکھا گیا مگر وہ زیادہ سے زیادہ فوج کے نائب کمانڈروں اور نئے ابھرتے ہوئے عمائدین کی مجلس بنتی گئی۔ جس طرح روم کے کسان رپبلک کے آخری دنوں میں برباد ہو گئے تھے اسی طرح متواتر خانہ جنگیوں اور غیر ملکی جنگوں میں پس کر خاص کر شارلی‌مین کے عہد میں ، زمین کے مالک آزاد کسان یعنی کثیر فرینک آبادی افلاس اور تنگدستی کا شکار ہو گئی۔ ابتدا میں پوری فوج انہیں کسانوں پر مشتمل تھی۔ فرانس کے علاقے کی فتح کے بعد بھی وہی اس کی ریڑھ کی ہڈی تھے۔ لیکن نویں صدی کی ابتدا میں وہ اس قدر افلاس‌زدہ ہو چکے تھے کہ بمشکل پانچ میں سے ایک اپنے لئے سامان جنگ فراہم کرسکتا تھا۔ پہلے کی سی فوج جس میں براہ راست بادشاہ کی طلب پر آزاد کسان آتے تھے ، اب نہیں رہی۔ اس کی جگہ ایک ایسی فوج نے لےلی جو نوخیز دولتمند جماعت کے تنخواہ‌دار خدمتگذاروں پر مشتمل تھی۔ ان میں ویلین بھی تھے جو ان کسانوں کی اولاد تھے جو پہلے بادشاہ کے سوا اور کسی کو اپنا آقا نہیں مانتے تھے اور اس سے بھی کچھ پہلے کسی کو اپنا آقا نہیں مانتے تھے ، بادشاہ کو بھی نہیں۔ شارلی‌مین کے جانشینوں کے عہد میں فرینک کسانوں کی بربادی مکمل ہو گئی۔ اس کی وجہ کچھ تو اندرونی جنگیں تھیں ، کچھ شاہی اقتدار کی کمزوری تھی اور اس کے ساتھ ساتھ دولتمندوں کا غاصبانہ رویہ تھا جن کی صف میں اب گاؤکاؤنٹ (Gaugrafen) (۱۰۰) بھی شامل ہو گئے تھے۔ یہ لوگ شارلی‌مین کے بنائے ہوئے تھے اور اپنے عہدے کو موروثی شکل دینا چاہتے تھے۔ اور آخر میں نارمنوں کے حملوں نے جو کمی تھی پوری کردی۔ شارلی‌مین کی موت کے پچاس برس بعد فرینک سلطنت نارمنوں کے قدموں پر اسی طرح لاچار پڑی تھی جس طرح چار سو برس پہلے رومی سلطنت فرینکوں کے قدموں میں پڑی تھی۔

فرینک سلطنت اس وقت صرف بیرونی حملہآوروں کے سامنے ھی بےبس نہیں تھی ۔ سماج کے اندرونی نظام یا سچ پوچھئے تو بدنظمی کا بھی یہی حال تھا ۔ آزاد فرینک کسانوں نے اپنے آپ کو اسی حالت میں پایا جس میں ان کے پہلے کے لوگ یعنی رومن کولونی تھے ۔ جنگ اور لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے برباد ھونے پر انہیں مجبوراً نئے دولتمند لوگوں یا کلیسا کی پناہ لینی پڑی کیونکہ شاھی اقتدار بہت کمزور تھا اور ان کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا ۔ انہیں اس پناہ اور حفاظت کی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی ۔ اپنے سے پہلے کے گال کسانوں کی مانند انہیں بھی اپنی زمین میں ملکیت کا حق اپنے سرپرستوں کو دے دینا پڑا اور انہیں یہ زمین مختلف اور متفرق صورتوں میں آسامی کی حیثیت سے جوتنے کے لئے واپس مل گئی ۔ لیکن ھمیشہ شرط یہ ھوتی تھی کہ وہ اپنے سرپرست کی خدمتگذاری کریں اور لگان ادا کریں ۔ ایک مرتبہ جب وہ اس طرح کی محتاجی کی حالت میں پڑ گئے تو رفتہ رفتہ ان کی ذاتی آزادی ختم ھو گئی ۔ چند پشت کے بعد ان میں سے زیادہ تر لوگ زرعی غلام بن گئے ۔ کتنی تیزی سے آزاد کسانوں کا زوال ھوا ، اس کا اندازہ ایبے سین ژرمین دی پرے کی زمین کے بارے میں ایرمینان کی تاریخ سے ھوتا ھے ۔ یہ جگہ اس زمانے میں پیرس کے قریب تھی ، اب اس کے اندر ھے ۔ شارلی‌مین کی زندگی میں بھی اس ایبے کی وسیع و عریض جاگیر پر جو آس پاس کے گاؤں میں دور تک پھیلی ھوئی تھی ، ۲۷۸۸ گھرانے آباد تھے ۔ یہ تقریباً سب کے سب فرینک گھرانے تھے مگر ان کے نام جرمن تھے ۔ ان میں سے ۲۰۸۰ کولونی تھے ، ۳۵ لیتی تھے ، ۲۲۰ غلام تھے اور صرف ۸ آزاد گھرانے تھے ! وہ رواج جس کی بدولت سرپرست نے کسانوں کی زمین اپنے نام منتقل کر لی تھی اور انہیں صرف زندگی بھر استعمال کرنے کا حق دیا تھا ، وہ رواج جسے سالویانس نے گناہ قرار دیا تھا اور اس کی مذمت کی تھی ، اب عام ھو گیا تھا اور کسانوں سے معاملہ کرنے میں کلیسا ھر جگہ اسی پر عمل کرتا تھا ۔ سامنتی غلامی اور خدمتگذاری کی شکل جس کا اب زیادہ سے زیادہ رواج ھوتا جا رھا تھا ، رومی انگارئے (angariae) (۱۵۱) یعنی ریاست کے لئے بیگار بھرنے کے نمونے سے اسی حد تک مشابہ تھی جس حد تک جرمن مارک کی خدمت کے

نمونے سے ، جس میں مارک کے ممبر پل اور سڑک بنانے اور اجتماعی مقصد کے دوسرے کاموں کے لئے محنت کرتے تھے ۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چار سو برس کے بعد آبادی کی کثیر تعداد اسی جگہ پہنچ گئی جہاں سے چلی تھی ۔

لیکن اس سے دو ہی باتیں ثابت ہوتی تھیں ۔ ایک تو یہ کہ سلطنت روم کے زوال کے زمانے میں سماج کی طبقہ بندی اور ملکیت کی تقسیم جس طرح ہوئی وہ اس وقت کی زراعت اور صنعت کی پیداوار کی حالت کے عین مطابق تھی اور اس لئے ناگزیر تھی ۔ دوسرے یہ کہ اگلے چار سو برس کے دوران میں پیداوار کی اس حالت میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی ، نہ تو اس میں کوئی انحطاط ہوا اور نہ ترقی ہوئی ۔ اور اس لئے اس کی بدولت ناگزیر طور پر ملکیت کی وہی تقسیم اور آبادی کی وہی طبقاتی درجہ‌بندی قائم ہوئی ۔ سلطنت روم کی آخری صدیوں میں دیہات پر شہر کا غلبہ ختم ہو چکا تھا ۔ اور جرمن حکومت کی ابتدائی صدیوں میں بھی یہ غلبہ دوبارہ قائم نہیں ہو سکا تھا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زراعت نہایت پس ماندہ حالت میں تھی اور یہی حال صنعت کا بھی تھا ۔ اس عام حالت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف بڑے بڑے حکمراں زمیندار ہوتے ہیں اور دوسری طرف ان کے ماتحت چھوٹے چھوٹے کسان ہوتے ہیں ۔ ایسے سماج میں نہ تو غلاموں کی محنت کے سہارے چلنے والی بڑی بڑی جاگیروں (latifundia) کی رومی معیشت کا قلم لگایا جا سکتا ہے اور نہ وہاں زرعی غلاموں کی محنت کے سہارے بڑے پیمانے کی نئی کھیتی کھڑی کی جا سکتی ہے ۔ اس بات کا سب سے اچھا ثبوت یہ ہے کہ شارلی‌مین نے اپنی مشہور شاہی جاگیروں پر بڑے پیمانے کی کھیتی کے جو تجربے کئے ، ان کا بعد میں کوئی نشان باقی نہیں رہا ۔ صرف خانقاہوں نے ان تجربوں کو جاری رکھا اور صرف انہیں کے لئے وہ نفع‌بخش ثابت ہوئے ۔ لیکن عیسائی مذہب کی یہ خانقاہیں غیر معمولی قسم کے سماجی ادارے تھے جن کی بنیاد رہبانیت اور تجرد پر رکھی گئی تھی ۔ وہ سماج کی عام نشوونما سے الگ غیرمعمولی کام کر سکتے تھے اور خود محض ایک مستثنی حیثیت رکھتے تھے ۔

پھر بھی ان چار سو برسوں میں کچھ ترقی ضرور ہوئی ۔ اس عہد کے

آخر میں اگرچہ ہمیں تقریباً وہی خاص طبقے دکھائی دیتے ہیں جو شروع میں دکھائی دئے تھے تب بھی اتنا ضرور ہوا تھا کہ یہ طبقے جن لوگوں سے مل کر بنے تھے وہ لوگ بدل گئے تھے۔ پرانی غلامی ختم ہو چکی تھی۔ وہ افلاس زدہ اور تنگدست آزاد شہری بھی نہیں رہے تھے جو کام کو غلامی کی علامت سمجھتے تھے اور اس سے نفرت کرتے تھے۔ روم کے کولونی اور نئے زرعی غلاموں کے درمیان آزاد فرینک کسان کھڑا تھا۔ مرنے‌والی رومنیت کی ''لاحاصل یادیں اور بے سود جھگڑے،، کب کے مر چکے تھے اور انہیں دفن کر دیا گیا تھا۔ نویں صدی کے سماجی طبقوں کی تشکیل کسی انحطاط پذیر تمدن کے دلدل میں نہیں بلکہ ایک نئے تمدن کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ نئی نسل کے لوگ کیا مالک اور کیا خدمت‌گار، دونوں ہی اپنے رومی پیش‌روؤں کے مقابلے میں مرد تھے۔ ان کے مقابلے میں یہ مردوں کی نسل تھی۔ طاقتور زمینداروں اور خدمت کرنے والے کسانوں کا تعلق رومیوں کے لئے قدیم دنیا کے زوال کی ایک صورت تھی جس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، لیکن نئی نسل والوں کے لئے یہی تعلق ایک نئے ارتقا کے آغاز کا نقطہ تھا۔ اس کے علاوہ اگرچہ یہ چار سو برس کا زمانہ بظاہر بے ثمر معلوم ہوتا ہے لیکن اس نے اپنے بعد ایک بڑی چیز چھوڑی ہے اور وہ چیز ہے: جدید قومیتیں یعنی تاریخ کے آنے والے زمانے کے لئے مغربی یورپ کی انسانیت کی نئی تشکیل اور نئی گروہ بندی۔ سچ پوچھئے تو جرمنوں نے یورپ میں نئی زندگی کی روح پھونک دی تھی اور یہی وجہ ہے کہ جرمن عہد میں ریاستوں کے ٹوٹنے کا یہ نتیجہ نہیں ہوا کہ نارس ساراسن غلامی قائم ہوئی بلکہ یہ ہوا کہ شاہی عطیوں اور سرپرستی (commendation) (۱۵۲) سے ترقی کرکے سامنتی یا جاگیرداری نظام قائم ہوا اور آبادی میں اتنا زبردست اضافہ ہوا کہ مشکل سے دو صدی کے بعد صلیبی جنگوں میں جتنی خونریزی ہوئی اس سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔

وہ کون سا جادو تھا جس کی مدد سے جرمنوں نے مرتے ہوئے یورپ میں زندگی کی نئی روح پھونک دی تھی؟ کیا یہ جرمن نسل کی کوئی پیدائشی باطنی قوت تھی جیسا کہ ہمارے متعصب قوم پرست مورخین کہتے

ہیں ؟ ہرگز نہیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جرمن ایک نہایت باصلاحیت آریائی قبیلے کے لوگ تھے جو خاص کر اس زمانے میں نہایت پرزور ترقی کے دور سے گذر رہے تھے ۔ یورپ کے ناتواں جسم میں جس چیز نے نئی جان ڈالی وہ جرمنوں کی مخصوص قومی خصوصیتیں نہیں تھیں بلکہ محض ان کی بربریت تھی ، ان کا گن دستور تھا ۔

ان کی ذاتی صلاحیت اور دلیری ، آزادی سے ان کی محبت ، ان کی جمہوریت پسندی جس کی وجہ سے وہ تمام امور عامہ کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھتے تھے — مختصر یہ کہ وہ سبھی خصوصیتیں جن کو رومنوالے کھو چکے تھے اور محض جن کی مدد سے ہی روم کی دنیا کے گارے سے نئی ریاستیں بنائی جا سکتی تھیں اور نئی قومیتوں کی تعمیر ہو سکتی تھی — یہ خصوصیتیں اگر بربریت کے آخری دور کی نمایاں خصوصیتیں ، اس کے گن دستور کا نتیجہ نہیں تھیں تو اور کیا تھیں ؟

اگر جرمنوں نے یک‌زوجگی کی قدیم صورت میں تبدیلی کی ، خاندان کے اندر مرد کی حکومت میں نرمی پیدا کی اور عورتوں کو زیادہ اونچا درجہ دیا جو قدیم کلاسیکی عہد میں اسے حاصل نہیں تھا تو یہ سب کرنے کی صلاحیت دراصل انہیں اپنی بربریت سے ، اپنے گن رسم‌ورواج سے اور مادری حق کے زمانے کے اثرات سے جو اس وقت بھی زندہ تھے ، ملی تھی ۔ ان کے علاوہ یہ صلاحیت انہیں اور کہاں سے مل سکتی تھی ؟

کم سے کم تین سب سے اہم ملکوں میں یعنی جرمنی ، شمالی فرانس اور انگلینڈ میں اگر وہ گن کے اصلی دستور کا ایک حصہ مارک برادریوں کی صورت میں قائم رکھنے میں اور سامنتی ریاست تک لے جانے میں کامیاب ہوئے ، اور اس طرح مظلوم طبقے یعنی کسانوں کو ازمنۂ وسطی کی زرعی غلامی کے سخت‌ترین حالات میں بھی مقامی شیرازہ بندی اور مقابلہ کرنے کے وہ ذرائع عطا کر سکے جو نہ تو قدیم زمانے کے غلاموں کو میسر تھے اور نہ موجودہ زمانے کے مزدور طبقے کو تیار ملے ہیں — تو یہ اگر ان کی بربریت ، ان کے گنوں میں بسنے کے خالص بربری طریقے کی بدولت نہیں تو اور کس چیز کی بدولت ہے ؟

اور آخر میں اگر وہ غلامی کی اس نسبتاً ہلکی شکل کو ترقی دے کر سبھی ملکوں میں رواج دے سکے ، جس کا خود ان کے وطن میں رواج

تھا اور جس نے خود سلطنت روم میں بھی غلامی کو رفتہ رفتہ ہٹا کر اس کی جگہ لی تھی ، اور جس نے جیسا کہ فورئے نے پہلی بار بتلایا تھا مظلوموں کو وہ اوزار دیا جس سے وہ بحیثیت ایک طبقے کے رفتہ رفتہ آزاد ہو سکیں — (fournit aux cultivateurs des moyens d'affranchissement — *collectif et progressif*) * — اور جو اسی لئے غلامی سے کہیں زیادہ بہتر تھا کیونکہ جہاں غلامی کے نظام میں غلام کو محض ایک فرد کی حیثیت سے آزادی مل سکتی تھی اور کوئی عبوری دور ممکن نہیں تھا (قدیم زمانے میں کامیاب انقلاب کے ذریعے کبھی غلامی کے نظام کو ختم نہیں کیا جا سکا)، وہاں ازمنۂ وسطی کے زرعی غلاموں نے رفتہ رفتہ ایک طبقے کی حیثیت سے اپنے کو آزاد کر لیا تھا — اگر جرمن یہ سب کر سکے تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ بربریت کی حالت میں تھے جس کی بدولت وہ قدیم زمانے کی عام محنت کی غلامی یا مشرقی ملکوں کی گھریلو غلامی ، دونوں میں سے کسی ایک شکل میں بھی مکمل غلامی کے نظام تک نہیں پہنچ پائے تھے ؟

جرمنوں نے روم کی دنیا کو جو کچھ دیا اس میں جو حصہ جاندار اور حیات بخش تھا ، وہ بربریت کا نتیجہ تھا ۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف بربری لوگوں میں ہی یہ طاقت ہو سکتی تھی کہ ایک ایسی دنیا کو جو ایک مرتے ہوئے تمدن کی آغوش میں تڑپ رہی تھی ، نئی حیات بخش سکیں ۔ اور اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں بربریت کی آخری اور اعلیٰ ترین منزل تھی جس میں جرمن لوگ قوموں کی ہجرت یا نقل وطن سے پہلے ہی پہونچ چکے تھے ۔ اس سے ہر بات صاف ہو جاتی ہے ۔

* کاشتکاروں کو یہ ذریعے مہیا کئے جاتے ہیں کہ وہ مل کر رفتہ رفتہ آزادی حاصل کریں ۔ (ایڈیٹر)

۹
بربریت اور تمدن

یونانی ، رومی اور جرمن ان تینوں بڑی مثالوں میں علحدہ علحدہ ہم گن سماج کے زوال کی تصویر دیکھ چکے ۔ اب ہم آخر میں ان عام اقتصادی حالات کا مطالعہ کریں گے جنہوں نے عہدبربریت کے آخری دور میں ہی گن سماج کی نیو ہلا ڈالی تھی اور جن کی بدولت تمدن کے عہد کے شروع ہوتے ہوتے گن نظام بالکل ختم ہو گیا ۔ اس کے مطالعے کے لئے مارکس کی کتاب ''سرمایہ،، اتنی ہی ضروری ہے جتنی مارگن کی کتاب ۔

گن عہد وحشت کے درمیانی دور میں پیدا ہوئے اور اس کے آخری دور میں انہوں نے مزید ترقی کی اور جہاں تک ہمارے موجودہ مواد سے اندازہ ہوتا ہے بربریت کے ابتدائی دور میں وہ اپنے عروج پر پہنچ گئے تھے ۔ لہذا اسی دور سے ہم اپنا مطالعہ شروع کریں گے ۔

اس دور میں ، جس کے لئے ہمارے پاس بس ایک امریکی انڈینوں کی مثال ہے ، ہم دیکھتے ہیں کہ گن نظام پوری طرح ترقی کر چکا تھا ۔ قبیلہ متعدد گنوں میں لیکن زیادہتر دو گنوں میں بٹا ہوا تھا ۔ آبادی کے بڑھنے پر یہ ابتدائی گن پھر کئی دختر گنوں میں تقسیم ہو گئے جن کے مقابلے میں مادر گن فریٹری کہے جانے لگے تھے ۔ خود قبیلہ ٹوٹ کر کئی قبیلوں میں بٹ گیا ، جن میں سے ہر ایک میں ہمیں

زیادہ‌تر وہی پرانے گن ملتے ہیں۔ کم سے کم بعض صورتوں میں قرابت‌دار قبیلے ایک وفاق میں متحد ہوتے تھے۔ یہ سادہ تنظیم ان سماجی حالات کے لئے بالکل کافی تھی جن میں اس کا جنم ہوا تھا۔ اس کی حیثیت ایک مخصوص فطری گروہ‌بندی سے زیادہ نہیں تھی۔ اس میں اتنی صلاحیت تھی کہ ان سبھی اندرونی جھگڑوں کو حل کر سکے جو اس طرح کے سماج میں اٹھ سکتے تھے۔ بیرونی معاملات میں جھگڑوں کا نبٹارا جنگ کے ذریعے کیا جاتا تھا جس کا انجام یہ تو ہو سکتا تھا کہ ایک قبیلہ بالکل برباد ہو جائے لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ غلامی کو قبول کر لے۔ گن نظام کی عظمت اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوری بھی یہی تھی کہ اس میں نہ کوئی حاکم ہوتا تھا اور نہ کوئی محکوم۔ اندرونی معاملات میں حقوق اور فرائض کا فرق نہیں پیدا ہوا تھا۔ انڈینوں کے سامنے کبھی یہ سوال ہی نہیں اٹھا کہ امور عامہ میں حصہ لینا، خونی انتقام لینا یا نقصانوں کی تلافی کرنا گن کے لوگوں کا حق ہے یا فرض۔ یہ بات ان کو اتنی ہی مہمل معلوم ہوتی جتنا یہ سوال کہ کھانا، پینا، سونا اور شکار کرنا حق ہے یا فرض۔ کوئی قبیلہ یا گن طبقوں میں نہیں بٹ سکتا تھا۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نظام کی اقتصادی بنیاد کیا تھی۔

آبادی بہت کم اور بکھری ہوئی تھی۔ وہ صرف قبیلوں کے رہنے کی جگہوں میں گنجان ہوتی تھی، جس کے چاروں طرف شکارگاہ ہوتی تھی اور اس کے آگے غیر مقبوضہ جنگل جو اسے دوسرے قبیلوں سے دور رکھتا تھا۔ محنت کی تقسیم محض ایک فطری چیز تھی۔ یہ تقسیم صرف مردوں اور عورتوں کے درمیان تھی۔ مرد لڑائی پر جاتے تھے، شکار کرتے تھے، مچھلی پکڑتے تھے، غذا کے لئے کچا مال لاتے تھے، اور ان کاموں کے لئے ضروری اوزار بناتے تھے۔ عورتیں گھر سنبھالتی تھیں، کھانا پکاتی تھیں اور کپڑا بنتی اور سیتی تھیں۔ مرد اور عورت دونوں اپنے اپنے کام کے شعبے میں آپ اپنے مالک تھے۔ جنگل میں مرد اور گھر میں عورت کا بول بالا تھا۔ مرد ہتھیاروں اور شکار کرنے اور مچھلی پکڑنے کے سامان کے مالک تھے اور عورت گھر کے سازو سامان اور برتنوں کی۔ گھرانا کمیونسٹی تھا جس میں کئی اور اکثر بہت سے

خاندان ہوا کرتے تھے *۔ جو کچھ مشترک طور پر کیا جاتا تھا اور جسے سب مل کر استعمال کرتے تھے وہ سب کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھی۔ گھر ، باغ ، لمبی کشتی سبھی مشترکہ ملکیت تھی۔ چنانچہ وہ ''کمائی ہوئی جائداد،، ہمیں یہیں اور صرف یہیں ملتی ہے جسے قانون اور اقتصادیات کے ماہروں نے غلط طور پر متمدن سماج کی طرف منسوب کر دیا ہے اور جو آخری جھوٹا قانونی حیلہ ہے جس پر جدید سرمایہ‌دارانہ ملکیت کی بنیاد اٹھائی گئی ہے۔

لیکن انسان ہر جگہ اس منزل میں نہیں رہا۔ ایشیا میں اسے ایسے جانور مل گئے جنہیں پالا جا سکتا تھا اور جن کی نسل بڑھائی جا سکتی تھی۔ جنگلی گائے بھینس کا شکار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن پلی ہوئی گائے سال میں ایک بار بچہ بھی دیتی تھی اور دودھ تو دیتی ہی تھی۔ کئی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قبیلوں مثلاً آریائی ، سامی اور شاید تورانی قبیلوں نے بھی جانوروں کو پالتو بنانا ، بعد میں ان کی نسل بڑھانا اور دیکھ بھال کرنا اپنا خاص کام بنا لیا۔ گلہ‌بان قبیلوں نے اپنے آپ کو بربری لوگوں کی عام آبادی سے الگ کر لیا۔ یہ محنت کی پہلی بڑی سماجی تقسیم تھی۔ یہ گلہ‌بان قبیلے غذا کا صرف زیادہ سامان ہی نہیں پیدا کرتے تھے بلکہ دوسرے بربری لوگوں کے مقابلے میں زیادہ مختلف النوع ذرائع زندگی تیار کرتے تھے۔ ان کے پاس دوسروں کے مقابلے میں صرف دودھ ، دودھ کی بنی ہوئی چیزیں اور گوشت ہی زیادہ مقدار میں نہیں تھا بلکہ کھال ، اون ، بکرے کے بال ، اون کے کتے اور بنے ہوئے کپڑے بھی تھے۔ کچے مال کی مقدار بڑھنے سے ان چیزوں کا استعمال عام ہونے لگا تھا۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ پہلی بار باقاعدگی کے ساتھ تبادلہ ہونے لگا۔ ابتدا میں چیزوں کا تبادلہ کبھی کبھار ہی ہو

---

* خاص کر امریکہ کے شمال مغربی ساحل پر یہی حالت تھی (دیکھئے بینکرافٹ) ۔ جزائر کوئین چارلٹ کے ہائیداس لوگوں میں تو یہ حالت تھی کہ بعض گھرانوں میں ایک چھت کے نیچے سات سو افراد تک اکٹھے رہتے تھے۔ نوتکا لوگوں میں پورے کے پورے قبیلے ایک چھت کے نیچے رہتے تھے۔

سکتا تھا۔ ہتھیاروں اور اوزاروں کے بنانے میں اگر کسی نے غیر معمولی مہارت دکھائی تو اس سے محنت کی ایک عارضی تقسیم قائم ہوئی ہوگی۔ چنانچہ عہدِحجرِجدید کے پتھر کے اوزار بنانے کے کئی کارخانوں کے نشان ملے ہیں جن کے بارے میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ ان کارخانوں میں جن کاریگروں نے مہارت پیدا کی وہ غالباً پورے سماج کے لئے کام کرتے تھے جیسا کہ ہندستان کے گن سماجوں میں مستقل قسم کے دستکار آج بھی کرتے ہیں۔ بہر حال اس منزل پر قبیلے کے اندر کے تبادلے کے سوا اور کسی طرح کا تبادلہ ممکن نہیں تھا اور وہ بھی ایک مستثنی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن گلہ‌بانی کرنےوالے قبیلے جب اچھی طرح قائم ہو گئے تو اس کے بعد ہمیں وہ سبھی حالات ملتے ہیں جن میں مختلف قبیلوں کے لوگوں میں چیزوں کا تبادلہ ہو سکتا تھا اور اس کو مزید ترقی ہو سکتی تھی اور یہ ایک باقاعدہ رواج کی حیثیت سے مستقل صورت اختیار کر سکتا تھا۔ ابتدا میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے اپنے اپنے گن سرداروں کے ذریعہ چیزوں کا تبادلہ کرتا تھا۔ لیکن جب جانوروں کے ریوڑ الگ الگ افراد کی ملکیت بننے لگے تو رفتہ رفتہ زیادہ‌تر تبادلہ افراد کے درمیان ہونے لگا حتی کہ آخر میں یہی تبادلے کی واحد صورت قرار پائی۔ گلہ‌بان قبیلے تبادلے میں اپنے ہمسایوں کو جو خاص چیز دیتے تھے وہ مویشی تھے۔ مویشی ہی وہ جنس بن گئے جن سے تمام دوسری جنسوں کی قدرو قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا اور لوگ ہر جگہ تمام دوسری چیزوں کے مقابلے میں اسے بڑے شوق سے قبول کرنے لگے۔ مختصر یہ کہ مویشی سے زر یا روپیہ کا کام لیا جانے لگا تھا اور اس دور میں اسی کو روپیہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ جنسوں کے تبادلے کی ابتدا میں ہی ایک جنس یعنی زر کی مانگ اتنے لازمی طور پر اور اتنی تیزی کے ساتھ پیدا ہو گئی۔

عہد بربریت کے ابتدائی دور کے ایشیائیوں کو غالباً باغبانی کا علم نہیں تھا لیکن اس کے درمیانی دور میں تو ضرور ہی وہ باغبانی کرنے لگے تھے۔ تاہم، تب اس کی حیثیت ایک پیشرو کی تھی جس نے کھیت بنا کر کھیتی کرنے کا راستہ صاف کیا۔ توران کے مرتفع خطوں میں جہاں لمبا اور سخت جاڑا پڑتا تھا، چارے کا انتظام کئے بغیر گلہ‌بانی

کی زندگی بسر کرنا ناممکن تھا ۔ اس لئے وہاں گھاس اگانا اور اناج پیدا کرنا بہت ضروری تھا ۔ بحیرۂ اسود کے شمال کے میدانوں پر بھی یہی بات صادق آتی ہے اور جب ایک بار مویشیوں کے لئے اناج پیدا کیا جانے لگا تو پھر وہ جلد ہی انسان کے کھانے کے کام بھی آنے لگا ۔ کھیتی کی زمین اس وقت تک قبیلے کی ملکیت تھی ۔ اور پہلے یہ گنوں کے سپرد کی جاتی تھی جو بعد میں اپنے طور پر اسی گھریلو برادریوں میں ان کے استعمال کے لئے بانٹ دیا کرتے تھے ۔ اور آخر میں یہ افراد کو دی جانے لگی تھی ۔ انہیں ملکیت کے بعض حقوق حاصل ہونگے مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں ۔

اس دور کے صنعتی کارناموں میں دو چیزیں خصوصیت کے ساتھ اہم ہیں ۔ ایک ہے کرگھا اور دوسرا ہے کچی دھاتوں کو پگھلا کر صاف کرنا اور آخری ، تیار شکل دینا ۔ تانبا ، ٹین اور ان کو ملا کر بنائے جانےوالے کانسے کی اہمیت سب سے زیادہ تھی ۔ کانسے سے بڑے کام کے اوزار اور ہتھیار بنتے تھے ، لیکن وہ پتھر کے اوزاروں کی جگہ نہیں لے سکتے تھے ۔ ان کی جگہ تو صرف لوہا لے سکتا تھا لیکن اس وقت تک لوہے کی پیداوار کا کسی کو علم نہیں تھا ۔ سونا اور چاندی زیور بنانے اور آرائش کے لئے استعمال ہونے لگے تھے اور اس وقت بھی ان کی قدرو قیمت تانبے اور کانسے سے زیادہ ہوگی ۔

جب مویشی پالنے ، کھیتی اور گھریلو دستکاری غرضکہ سبھی شاخوں میں پیداوار بڑھی تو انسان کی قوت محنت کو قائم رکھنے کے لئے جتنا پیدا کرنے کی ضرورت تھی ، وہ اس سے زیادہ پیدا کرنے لگی ۔ ساتھ ہی گن یا گھریلو برادری کے یا الگ الگ خاندان کے ہر ممبر کو روز جتنا کام کرنا پڑتا تھا ، اس میں بھی اضافہ ہو گیا ۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ کہیں سے اور استعداد محنت حاصل کی جائے ۔ وہ جنگ سے حاصل ہوئی ۔ جنگ میں جو لوگ پکڑے جاتے تھے اب ان کو غلام بنایا جانے لگا ۔ اس زمانے کے عام تاریخی حالات میں پہلی بڑی سماجی تقسیم محنت جو ہوئی وہ محنت کی زرخیزی کو بڑھا کر یعنی دولت میں اضافہ کرکے اور پیداوار کے دائرے کو بڑھا کر لازمی طور پر اپنے پیچھے پیچھے غلامی کو لے آئی ۔ محنت کی پہلی بڑی سماجی تقسیم

سے سماج کی پہلی بڑی تقسیم پیدا ہوئی۔ وہ دو طبقوں میں بٹ گیا — ایک طرف مالک تھے اور دوسری طرف غلام، ایک طرف استحصال کرنے والے اور دوسری طرف وہ جن کا استحصال کیا جاتا تھا۔

ہم یہ آج تک نہیں جان سکے ہیں کہ جانوروں کے ریوڑ اور جھنڈ کب اور کیونکر قبیلے یا گن کی مشترکہ ملکیت سے نکل کر الگ الگ خاندانوں کے سرداروں کی ملکیت بن گئے۔ لیکن بڑی حد تک یہ اسی دور میں ہوا ہوگا۔ مویشی کے گلوں اور دولت کے اور دوسرے نئے سامان کی بدولت خاندان میں ایک انقلاب نمودار ہوا۔ روزی حاصل کرنا ہمیشہ مرد کا کام ہوا کرتا تھا۔ وہی ذرائع زندگی پیدا کرتا تھا اور وہی ان کا مالک ہوتا تھا۔ روزی حاصل کرنے کا نیا ذریعہ مویشی کا گلہ تھا اور شروع میں ان کو پالتو بنانا اور پھر ان کی دیکھ بھال کرنا مرد کا کام تھا۔ اس لئے وہ مویشی کا مالک ہوتا تھا۔ اور اس کے بدلے میں جو چیزیں اور غلام حاصل ہوتے تھے ان کا مالک بھی وہی تھا۔ چنانچہ پیداوار سے جو کچھ فاضل پیدا ہوتا اور بچ رہتا تھا وہ سب مرد کے حصے میں آیا۔ عورت کا ان کے استعمال میں حصہ تھا مگر ان کی ملکیت میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ ''وحشی،، جنگجو اور شکاری گھر میں عورت کو فوقیت دے کر خود اپنی ثانوی حیثیت سے مطمئن تھے۔ لیکن ''زیادہ مہذب،، گلہ‌بان اپنی دولت کے سہارے آگے بڑھ آیا، خود بڑی حیثیت حاصل کر لی اور عورت کو دھکیل کر ثانوی حیثیت پر پہونچا دیا۔ اور بےچاری عورت شکایت کا ایک حرف تک زبان پر نہیں لا سکی۔ خاندان کے اندر محنت کی تقسیم سے مرد اور عورت کے درمیان جائداد کی تقسیم اور اس کا بٹوارہ ہوا تھا۔ اس تقسیم محنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، پھر بھی چونکہ خاندان کے باہر محنت کی تقسیم بدل چکی تھی اس لئے اس نے پہلے کے خاندانی تعلقات کو الٹ پلٹ کر دیا۔ وہی چیز جس نے پہلے عورت کو گھر کی مالکہ بنایا تھا — یعنی اس کا گھریلو کاموں تک محدود رہنا — وہی چیز گھر کے اندر مرد کے تسلط کی بنیاد بنی۔ روزی حاصل کرنے کے لئے مرد کے کام کے مقابلے میں عورت کے گھریلو کام کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ روزی حاصل کرنا ہی سب کچھ تھا۔ گھر کے کام کاج کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ یہیں پر ہمیں

یہ دکھائی دینے لگتا ہے کہ عورتوں کی آزادی اور مردوں کے ساتھ ان کی مساوات اس وقت تک ناممکن ہے اور ناممکن رہے گی جب تک عورتوں کو سماجی پیداوار کے کام سے الگ رکھ کر خانہ‌داری کے کام تک جو کہ نجی کام ہے ، محدود رکھا جائے گا۔ عورتوں کی آزادی اسی وقت ممکن ہوگی جب عورتیں ایک بڑے سماجی پیمانے پر پیداوار میں حصہ لے سکیں‌گی اور جب گھریلو کاموں پر انہیں بہت کم دھیان دینا پڑے‌گا۔ اور یہ اب محض بڑے پیمانے کی صنعت کی وجہ سے ممکن ہوا ہے جو نہ صرف یہ کہ عورتوں کے لئے بہت بڑی تعداد میں پیداوار کے کام میں حصہ لینے کی گنجائش پیدا کرتی ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اس پر زور دیتی ہے اور اس کے علاوہ نجی گھریلو کام کو بھی ایک عام صنعت بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

گھر کے اندر مرد کے واقعی تسلط نے اس کی مطلق العنانی کے راستے سے آخری رکاوٹ بھی دور کر دی۔ مادری حق کے خاتمے ، پدری حق کے رواج اور جوڑا خاندان سے یک‌زوجگی تک کی تدریجی تبدیلی نے اس مطلق العنانی پر مہر لگا دی اور اسے پائدار بنا دیا۔ پرانے گن سماج میں اس سے ایک دراڑ پڑ گئی۔ یک‌زوجگی کا خاندان ایک طاقت بن گیا اور گن کے خلاف ایک خطرہ بن کر اٹھ کھڑا ہوا۔

دوسرا قدم ہمیں بربریت کے آخری دور میں پہنچا دیتا ہے۔ یہ وہی دور ہے جس میں سبھی متمدن قومیں اپنے سورمائی عہد سے گذرتی ہیں — یہ لوہے کی تلوار کا ہی نہیں بلکہ لوہے کے ہل اور کلہاڑی کا بھی دور ہے۔ لوہا آدمی کا خادم بن گیا اور یہ تمام کچے مال میں سب سے اہم کچا مال ہے ، اور اگر آلو کو چھوڑ دیا جائے تو سب سے آخری بھی ، جس نے تاریخ میں ایک انقلابی خدمت انجام دی ہے۔ لوہے کی وجہ سے کھیت بنا کر بڑے پیمانے پر کھیتی کرنا اور جنگل کے بڑے بڑے قطعات کو کھیتی کے لئے صاف کرنا ممکن ہوا۔ اس نے کاریگر کے ہاتھوں میں ایسا اوزار دیا جس کی سختی اور تیزی کا مقابلہ نہ تو پتھر کر سکتا تھا اور نہ کوئی اور دھات جس کو لوگ اس وقت تک جانتے تھے۔ یہ سب بہت دھیرے دھیرے ہوا۔ سب سے پہلے جو لوہا تیار کیا جاتا تھا وہ اکثر تانبے سے بھی زیادہ نرم ہوتا تھا۔

مختصر یہ کہ آہستہ آہستہ پتھر کے ہتھیار رخصت ہو گئے۔ پتھر کی کلہاڑیاں صرف ''ہلدے براند کے گیت،، میں ہی نہیں بلکہ ۱۰۶۶ء میں ہیسٹینگز کی لڑائی میں (۱۵۳) بھی استعمال ہوئی تھیں۔ لیکن اب جو ترقی ہو رہی تھی اس کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔ اس میں رخنے کم ہی پڑتے تھے اور اس کی رفتار تیز تھی۔ قبیلے یا متعدد قبیلوں کے وفاق کا مرکزی مقام شہر بن گیا جس میں پتھر یا اینٹوں کے بنے ہوئے مکان ہوتے تھے اور جو چاروں طرف سے میناروں اور چھجوں اور پتھر کی فصیلوں سے گھرے ہوتے تھے جن میں گولی چلانے کے لئے سوراخ بنے ہوتے تھے۔ یہ شہر جہاں ایک طرف فن تعمیر کی تیز ترقی کی گواہی دے رہے تھے وہاں دوسری طرف وہ اس بات کی علامت تھے کہ خطرہ بڑھ گیا ہے اور حفاظت کی ضرورت پیدا ہو گئی ہے۔ دولت میں تیزی سے اضافہ ہوا لیکن یہ الگ الگ افراد کی دولت تھی۔ کپڑا بننے کے فن، دھات کے کام اور دوسری دستکاریوں سے، جن میں سے ہر ایک میں اب مخصوص مہارت کی ضرورت تھی، انواع و اقسام کا سامان نہایت فنکارانہ خوبصورتی سے تیار ہوتا تھا۔ کھیتی سے اب نہ صرف اناج، پھلیاں اور پھل ملتے تھے بلکہ تیل اور شراب بھی ملتی تھی کیونکہ اب تیل نکالنے اور شراب بنانے کا فن لوگ سیکھ گئے تھے۔ اب کوئی ایک فرد اتنے مختلف قسم کے کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اب دوسری بڑی تقسیم محنت ہوئی اور دستکاری کھیتی سے الگ ہوئی۔ پیداوار میں لگاتار اضافہ ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ محنت کی پیداواری قوت میں بھی جو ترقی ہو رہی تھی اس نے انسانی قوت محنت کی قدر و قیمت بڑھا دی۔ غلامی جو اس سے پہلے کی منزل میں محض نوزائیدہ شکل میں اور بس کہیں کہیں پائی جاتی تھی اب سماجی نظام کا ایک ضروری حصہ بن گئی تھی۔ غلام اب محض مددگار نہیں رہ گئے تھے بلکہ اب انہیں بیسیوں کی تعداد میں کھیتی اور کارخانوں میں کام کرنے کے لئے ہانکا جانے لگا تھا۔ کھیتی اور دستکاری، ان دو بڑی شاخوں میں پیداوار کے بٹ جانے سے تبادلے کے لئے پیداوار کی ابتدا ہوئی۔ فروخت کرنے کے لئے مال پیدا کیا جانے لگا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف اپنے علاقے کے اندر، نہ صرف مختلف قبیلوں کے علاقوں کی سرحد پر بلکہ سمندر پار

کر کے بھی تجارت کی جانے لگی۔ ان سب چیزوں کا ارتقا ابھی بہت کم ہوا تھا۔ عالمگیر زر کے لئے سونے چاندی کو ترجیح دی جانے لگی تھی لیکن ابھی تک سکہ نہیں ڈھالا گیا تھا اور تبادلہ محض وزن کے اعتبار سے ہوتا تھا۔

آزاد اور غلام کے ساتھ دولتمند اور مفلس کے ایک اور فرق کا اضافہ ہوا۔ محنت کی نئی تقسیم کے ساتھ ایک اور تقسیم بھی ہوئی : سماج طبقوں میں بٹ گیا۔ پرانی کمیونسٹی گھریلو برادریاں جہاں کہیں باقی رہ گئی تھیں ، وہ مختلف خاندانوں کے سرداروں کی دولت کے فرق کی وجہ سے ٹوٹ گئیں۔ اور اس کے ساتھ سماج کے لئے زمین کی مشترکہ کھیتی کا خاتمہ ہو گیا۔ کھیتی کی زمین استعمال کے لئے مختلف خاندانوں کو دی جانے لگی۔ پہلے یہ زمین ایک محدود عرصے کے لئے دی جاتی تھی اور بعد میں ہمیشہ کے لئے۔ مکمل نجی ملکیت تک کا تغیر رفتہ رفتہ اور جوڑا بیاہ سے یک زوجگی تک کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ عمل میں آیا۔ انفرادی خاندان سماج کی اقتصادی اکائی بننے لگا۔

آبادی پہلے سے زیادہ گنجان ہو گئی۔ اس کی وجہ سے ضروری ہوا کہ اندرونی اور بیرونی کاموں کے لئے لوگوں میں اور زیادہ قریبی اتحاد ہو۔ ہر جگہ قرابت‌دار قبیلوں کا وفاق بنانا ضروری ہو گیا۔ اور اس کے بعد جلد ہی یہ قبیلے آپس میں گھل مل گئے اور اس طرح الگ الگ قبیلوں کے علاقے مل کر ایک قومیت کا علاقہ بن گیا۔ جاتی کا فوجی کمانڈر — rex, basileus, thiudans — ایک ضروری اور مستقل عہدہ‌دار بن گیا۔ جہاں کہیں عوامی اسمبلی نہیں تھی اسے قائم کیا گیا۔ گن سماج کی نشو و نما ایک فوجی جمہوریت کی شکل میں ہوئی تھی اور فوجی کمانڈر ، کاؤنسل اور عوامی اسمبلی اسی فوجی جمہوریت کے مختلف ادارے تھے۔ یہ فوجی جمہوریت تھی کیونکہ جنگ اور جنگ کی تیاری اور اس کا انتظام اب لوگوں کی زندگی کا ایک باقاعدہ اور مستقل کام بن گیا تھا۔ اپنے پڑوسیوں کی دولت دیکھ کر لوگوں کے دل میں لالچ پیدا ہونے لگا تھا کیونکہ دولت حاصل کرنے کو وہ زندگی کا سب سے اہم مقصد سمجھنے لگے تھے۔ وہ بربری لوگ تھے۔ ان کی نظر میں محنت کر کے کچھ پیدا کرنے سے زیادہ آسان لوٹ مار کرنا تھا اور وہ زیادہ قابل

عزتِ کام بھی تھا۔ پہلے جنگ محض اس لئے کی جاتی تھی کہ حملے کا انتقام لینا ہوتا تھا یا اپنے علاقے کو جو ناکافی ہو چلا تھا، بڑھانا تھا۔ اب جنگ کا مقصد محض لوٹ مار کرنا تھا۔ اور یہ ایک باقاعدہ پیشہ بن گیا۔ نئے قلعہ بند شہروں کے چاروں طرف بڑی بڑی فصیلیں یونہی بے مطلب نہیں کھڑی کی گئی تھیں۔ ان کے گرد خندقیں منہ پھاڑے کھڑی تھیں جن میں گن دستور دفن ہو گیا۔ اور ان کے مینار تمدن کی بلندیوں تک پہنچ گئے تھے۔ اندرونی معاملات میں بھی اسی طرح کی تبدیلی ہوئی۔ لوٹ مار کی جنگوں نے سپہ سالار اعظم کی طاقت بھی بڑھائی اور اس کے نائب سپہ سالاروں کی بھی۔ جانشینوں کو ایک ہی خاندان سے منتخب کرنے کا قاعدہ رفتہ رفتہ موروثی جانشینی کا قاعدہ بن گیا۔ یہ تبدیلی خصوصیت کے ساتھ پدری حق قائم ہونے کے بعد ہوئی۔ شروع میں لوگ اسے برداشت کر لیتے تھے۔ بعد میں ہر مرنے والے کا وارث اس کی جانشینی کا دعوے دار ہونے لگا۔ اور آخر میں اس نے زبردستی یہ حق غصب کر لیا۔ اس طرح موروثی بادشاہی اور موروثی شرفا کے طبقے کی بنیاد پڑی۔ یوں رفتہ رفتہ گن دستور کے اداروں کی جڑیں جو عوام کے اندر، گن، فریٹری اور قبیلے میں پھیلی ہوئی تھیں، کاٹ دی گئیں اور پورے گن نظام میں ایسی تبدیلی ہوئی کہ وہ بالکل اپنی پہلی شکل سے برعکس چیز بن گیا۔ وہ قبیلوں کی ایک تنظیم تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ آزادی کے ساتھ اپنے معاملوں کا انتظام کر سکے لیکن اب وہ ایک ایسی تنظیم بن گیا جس کا مقصد اپنے پڑوسیوں کو لوٹنا اور ان پر ظلم کرنا تھا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ گن کے ادارے جن کا مقصد عوام کی رائے پر عمل کرنا تھا اب خود اپنے لوگوں پر حکومت اور ظلم کرنے کے ادارے بن گئے۔ یہ کبھی نہ ہوتا اگر دولت کے لالچ نے گن کے ممبروں کو امیر اور غریب میں نہ بانٹا ہوتا، اگر ”گن کے اندر ملکیت کے فرق نے گن کے ممبروں میں مفاد کے اتحاد کو باہمی تضاد میں نہ بدل دیا ہوتا،، (مارکس) *، اور اگر غلامی کی

---

* ملاحظہ ہو ”مارکس اور اینگلس کی دستاویزات،، جلد ۹ صفحات ۱۵۴ — ۱۵۳۔ (ایڈیٹر)

نشوونما نے ذریعۂ معاش حاصل کرنے کی خاطر محنت کرنے کو ایک غلامانہ اور لوٹمار کرنے سے بھی زیادہ شرمناک کام نہ بنا دیا ہوتا۔

* * *

اس کے بعد ہم تمدن کے دروازے پر آپہنچتے ہیں۔ تقسیم محنت کی مزید ترقی سے اس دور کی ابتدا ہوتی ہے۔ بربریت کے ابتدائی دور میں انسان اپنی فوری ضرورتیں پوری کرنے کےلئے مال پیدا کرتا تھا۔ تبادلہ کبھی کبھار ہوتا تھا ، جب اتفاق سے کوئی چیز فاضل بچ رہی ہو۔ بربریت کے درمیانی دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ گلہبان قوموں کو مویشی کی صورت میں ایک ایسی ملکیت مل گئی تھی جس میں کافی بڑے بڑے ریوڑ اور جھنڈ ہوتے تھے اور ان کے پاس اپنی ضرورتوں سے زیادہ فاضل مال برابر رہا کرتا تھا۔ اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ گلہ بان لوگوں میں اور پچھڑے ہوئے قبیلوں میں جن کے پاس ریوڑ نہیں تھے ، ایک طرح کی تقسیم محنت ہوئی جس کی وجہ سے پیداوار کی دو مختلف حالتیں ساتھ ساتھ قائم ہو گئیں۔ اس سے مستقل اور باقاعدہ تبادلے کے لئے موافق حالات پیدا ہو گئے۔ بربریت کے آخری دور میں زراعت اور دستکاری میں مزید تقسیم محنت قائم ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اجناس کا برابر بڑھتا ہوا حصہ خصوصیت کے ساتھ تبادلے کے لئے پیدا کیا جانے لگا حتی کہ الگ الگ مال پیدا کرنے والوں میں تبادلہ اتنا بڑھ گیا کہ سماج کے لئے ایک نہایت ضروری چیز بن گیا۔ محنت کی ان تمام تقسیموں کو تمدن نے مستحکم کیا اور آگے بڑھایا۔ خاص کر اس نے شہر اور دیہات کے فرق کو اور گہرا کر دیا (یہ تو قدیم زمانے کی طرح دیہات پر شہر کا اقتصادی غلبہ تھا یا ازمنۂ وسطی کی طرح شہر پر دیہات کا غلبہ تھا) اور ایک تیسری تقسیم محنت کا اضافہ ہوا جو تمدن کے عہد کی خصوصیت ہے اور فیصلہ کن اہمیت رکھتی ہے — اس نے ایک ایسے طبقے کو جنم دیا جو عمل پیداوار میں قطعی کوئی حصہ نہیں لیتا اور محض پیداوار کا تبادلہ کیا کرتا ہے — یہ تاجروں کا طبقہ ہے۔ اس سے پہلے جتنے ادھورے طور پر بنے ہوئے طبقے پائے جاتے ہیں ،

ان سب کا تعلق محض پیداوار سے تھا۔ پیداوار میں لگے ہوئے لوگوں کو یہ نا مکمل سی طبقاتی ساخت مینیجروں اور کام کرنے والوں، یا بڑے پیمانے پر پیدا کرنے والوں اور چھوٹے پیمانے پر پیدا کرنے والوں میں بانٹا کرتی تھیں۔ لیکن اب پہلی مرتبہ ایک ایسا طبقہ نمودار ہوا جو پیداوار میں کوئی حصہ نہیں لیتا تھا مگر اس کے باوجود اس نے بحیثیت مجموعی پیداوار کے سارے انتظام کو اپنے قبضے میں کر لیا اور پیدا کرنے والوں کو اقتصادی طور پر اپنی حکمرانی میں لے لیا۔ یہ ایسا طبقہ ہے جو دو قسم کا مال پیدا کرنےوالوں کے درمیان کی ایک ضروری اور لازمی کڑی بن جاتا ہے اور دونوں کا استحصال کرتا ہے۔ پیدا کرنےوالوں کو تبادلے کی پریشانی اور اس کے خطروں سے بچانے کے بہانے، ان کے مال کے لئے دور دور کے ملکوں میں منڈی تلاش کرنے کے بہانے اور اس طرح سماج کا سب سے کارآمد طبقہ ہونے کا دعوی کر کے، طفیلیوں کا ایک طبقہ سامنے آتا ہے۔ یہ سچ مچ سماجی کاسہ لیسوں کا گروہ ہے جو حقیقت میں نہایت معمولی خدمتوں کے عوض ملک کے اندر اور باہر کی پیداوار کا سب سے اچھا حصہ دودھ کی بالائی کی طرح خود نکال لیتا ہے، تیزی سے کثیر دولت کا مالک بن بیٹھتا ہے اور اسی کی مناسبت سے سماجی اثر پیدا کرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے تمدن کے عہد میں اسے نت‌نئے اعزاز ملتے رہتے ہیں اور پیداوار پر اس کی گرفت زیادہ سخت ہوتی جاتی ہے حتی کہ آخر میں وہ خود بھی اپنی ایک چیز پیدا کرتا ہے — سیعادی تجارتی بحران۔

ہم ترقی کے جس دور کی بات کر رہے ہیں اس میں تاجر طبقے کو جو ابھی نوعمر تھا، اس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ مستقبل کے بطن میں اس کے لئے کتنی بڑی بڑی چیزیں پوشیدہ ہیں۔ لیکن اس نے اپنی تشکیل کر لی اور اپنے آپ کو ناگزیر بنا دیا۔ اسی قدر کافی تھا۔ مگر اس کے ساتھ فلزاتی زر، دھات کے ڈھالے ہوئے سکے کا استعمال شروع ہوا۔ یہ ایک نیا حربہ تھا جس کی مدد سے پیدا کرنےوالے پر اور اس کی پیداوار پر پیدا نہ کرنے والے کی حکومت ہو سکے۔ سب اجناس کی ایک جنس جو اپنے اندر تمام اجناس کو چھپائے رکھتی ہے، ظاہر ہو چکی تھی۔ وہ ایک جادو کی پڑیا تھی جو جب چاہے اپنی

پسندیدہ چیزوں میں سے کسی چیز کا روپ دھارن کر سکتی تھی ۔ وہ جس کے قبضے میں ہوتی اس کا پیداوار کی دنیا پر قبضہ ہوتا ۔ اور وہ سب سے زیادہ کس کے قبضے میں تھی ؟ تاجروں کے ۔ ان کے ہاتھوں میں روپیے کی پوجا کا دھرم محفوظ تھا ۔ اس نے یہ بات صاف کر دی کہ سبھی اجناس کو اور اس لئے سبھی اجناس کے پیدا کرنے والوں کو زر کے سامنے خاک پر سر رکھنا ہوگا ۔ اس نے یہ عملاً ثابت کر دیا کہ دولت کی دوسری سبھی شکلیں دولت کے اس اوتار یعنی زر کے سامنے محض پرچھائیاں ہیں ۔ زر کی طاقت نے اپنی نوجوانی کے اس دور میں جس بھونڈے پن اور تشدد کا مظاہرہ کیا ویسا کبھی اور نہیں کیا ۔ زر کے بدلے میں اجناس کی فروخت کے بعد زر کو قرض دینے کا رواج ہوا اور اس کے ساتھ سود خوری شروع ہوئی ۔ اور قدیم ایتھنز اور روما کے قانون نے قرض‌دار کو جس بےرحمی کے ساتھ ہاتھ پیر باندھ کر سود خوار مہاجن کے سامنے ڈال دیا اس کی مثال بعد کے زمانے میں بھی کبھی نہیں ملتی ۔ ان دونوں جگہوں کے قانون اپنے آپ نمودار ہوئے تھے وہ عام قانون تھا جس کی تہہ میں اقتصادی قوت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی ۔

اجناس اور غلاموں کی دولت اور زر کی دولت کے علاوہ دولت کی ایک اور شکل پیدا ہوئی — زمین کی دولت ۔ شروع میں زمین کے قطعات گن یا قبیلے کی طرف سے افراد کو استعمال کے لئے دئے جاتے تھے ۔ مگر اب ان پر ان افراد کا حق اتنی مضبوطی سے قائم ہو چکا تھا کہ زمین کے وہ ٹکڑے ان کی موروثی ملکیت بن گئے ۔ اس سے پہلے وہ جس چیز کی سب سے زیادہ کوشش کر رہے تھے ، وہ یہ تھی کہ زمین کے اس ٹکڑے پر گن سماج کا دعوی ختم ہو جائے ، اس دعوے سے زمین کو چھٹکارا مل جائے ۔ یہ دعوی ان کے پیروں کی زنجیر بن گیا تھا ۔ انہیں اس زنجیر سے چھٹکارا مل گیا ، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں نئی زمینی جائداد سے بھی چھٹکارا ملا ۔ کیونکہ زمین کی پوری اور آزادانہ ملکیت کا مطلب صرف یہی نہیں تھا کہ بلا روک ٹوک اور بلا کسی پابندی کے قبضہ قائم ہو گیا ہے بلکہ یہ بھی تھا کہ اسے اپنے پاس سے الگ کیا جا سکتا ہے ۔ جب تک زمین گن کی ملکیت تھی ایسا کرنا ممکن

نہیں تھا ۔ لیکن جب زمین کے نئے مالک نے گن اور قبیلے کے دعوے کی زنجیر کو توڑ دیا تو اس نے وہ رشتہ بھی توڑ دیا جو آج تک اسے زمین سے اٹوٹ طریقے سے وابستہ کئے ہوئے تھا ۔ اور یہ بات زر نے صاف کر دی کہ اس کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے ۔ زر بھی اسی وقت زمین میں نجی ملکیت کے ساتھ ساتھ نمودار ہوا تھا ۔ زمین اب ایک جنس تبادلہ بن گئی جسے فروخت کیا جا سکتا تھا اور رہن رکھا جا سکتا تھا ۔ زمین پر نجی ملکیت کو قائم ہوئے مشکل سے کچھ دن گذرے ہونگے کہ رہن اور گروی رکھنے کا رواج ہو گیا (دیکھئے ایتھنز کی مثال) ۔ جس طرح یک زوجگی کے پیچھے پیچھے ہیتائرازم اور عصمت‌فروشی لگی رہی اسی طرح اب زمین کی ملکیت کے پیچھے رہن رکھنے کا رواج لگ گیا ۔ تم زمین کی ملکیت چاہتے تھے ، آزاد ، مکمل اور منتقلی کے قابل ملکیت — تو لو ، یہ رہی ایسی ملکیت — ” تمہیں اس کی خواہش تھی ، جارج دینڈن ! “ *

تجارت کی توسیع ، سکہ کا چلن ، سود خوری ، زمین پر نجی ملکیت اور رہن کا رواج — ان سب چیزوں کے ساتھ ایک طرف ایک چھوٹے سے طبقے کے ہاتھ میں دولت کا اجتماع اور ارتکاز ہوتا رہا اور دوسری طرف عام لوگوں کا افلاس بڑھتا گیا اور گداگروں اور مفلسوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ۔ دولتمندوں کا یہ نیا طبقہ شرفا جس حد تک شروع سے ہی پرانے قبائلی شرفا سے مختلف تھا اس حد تک اس نے آخرالذکر کو ہمیشہ کےلئے پیچھے دھکیل دیا (ایتھنز میں ، روم میں ، جرمنوں میں) ۔ اور اس طرح دولت کی بنیاد پر آزاد لوگوں کے مختلف طبقوں میں بٹ‌جانے کے ساتھ ان غلاموں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا ** جن کی جبری

---

* مولیئر کے ڈرامے ” جارج دینڈن “ سے ۔ (ایڈیٹر)

** ایتھنز میں غلاموں کی تعداد جاننے کےلئے دیکھئے اس کتاب کا صفحہ ۱۱۷ (دیکھئے اسی اردو ایڈیشن کا صفحہ ۳۲۸ ۔ ایڈیٹر) ۔ کورنتھ شہر کے عروج کے زمانے میں وہاں غلاموں کی تعداد ۴۶۰۰۰۰ اور ایجنہ میں ۴۷۰۰۰۰ تھی ۔ دونوں شہروں میں غلاموں کی تعداد آزاد شہریوں کی تعداد کے مقابلے میں دس گنا زیادہ تھی ۔

محنت کی بنیاد پر سارے سماج کا اوپری ڈھانچہ کھڑا کیا گیا تھا ۔ یونان میں خاص طور پر ایسا ہوا تھا ۔

آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ اس سماجی انقلاب کی بدولت گن نظام کا کیا حشر ہوا ۔ وہ ان نئے عناصر کے مقابلے میں بالکل بےبس تھا جو اس کی مدد کے بغیر ہی پیدا ہو گئے تھے ۔ اس کا وجود اس بات پر منحصر تھا کہ گن یا یوں کہنا چاہئے کہ قبیلے کے سبھی ممبر ایک علاقے میں ساتھ ساتھ رہیں اور کوئی دوسرا اس علاقے میں نہ رہے ۔ لیکن یہ حالت تو بہت دن پہلے ختم ہوچکی تھی ۔ گن اور قبیلے ہر جگہ مخلوط ہو گئے تھے ، ہر جگہ آزاد شہریوں کے ساتھ ساتھ غلام ، زیر اثر لوگ اور غیرملکی لوگ رہنے لگے تھے ۔ بربریت کے درمیانی دور کے آخر میں ہی لوگوں نے ایک جگہ جم کر رہنا شروع کر دیا تھا مگر تجارت کے دباؤ ، لوگوں کے پیشوں کے بدلتے رہنے اور زمین کی ملکیت میں تبدیلی ہوتے رہنے کی وجہ سے انہیں باربار اپنا وطن بدلنا پڑا ۔ اب گن تنظیم کے ممبروں کے لئے ممکن نہیں تھا کہ اپنے اجتماعی معاملوں کو نبٹانے کے لئے ایک جگہ جمع ہو سکیں ۔ اب صرف نہایت کم اہمیت کے معاملے ، مثال کے لئے مذہبی تقریبیں وغیرہ ہی مل کر انجام دی جاتی تھیں اور وہ بھی بے دلی سے ۔ گن سماج کے ادارے جن ضرورتوں اور مفاد کی دیکھ بھال کے لئے بنائے گئے تھے اور جن کی دیکھ بھال کرنے کی صلاحیت ان میں تھی ، ان کے علاوہ اب کچھ نئی ضرورتیں اور نئے مفاد سامنے آ گئے تھے ۔ لوگ جن حالات میں روزی کماتے تھے ، ان میں انقلاب آ گیا تھا اور اس کی بدولت سماج کا ڈھانچہ بدل گیا تھا ۔ نئی ضرورتیں اور نئے مفاد انہیں تبدیلیوں سے پیدا ہوئے تھے ۔ قدیم گن نظام کے لئے وہ نہ صرف اجنبی تھے بلکہ اس کے راستے میں ہر طرح کی رکاوٹ پیدا کر رہے تھے ۔ محنت کی تقسیم سے دستکاروں کی جو نئی جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں ، ان کے مفاد کے لئے اور دیہات کے مقابلے میں شہروں کی مخصوص ضرورتوں کے لئے نئے اداروں کی ضرورت تھی ۔ لیکن ان میں سے ہر گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل تھا جو مختلف گنوں ، فریٹریوں اور قبیلوں سے آئے تھے ۔ ان میں غیر ملکی لوگ بھی شامل تھے ۔ اس لئے لازم تھا کہ یہ نئے ادارے گن دستور کے باہر بنیں ،

وہ اس کے متوازی ہوں اور اس کا مطلب ہے کہ اس کے خلاف ہوں۔ اور پھر ہر گن تنظیم میں مفادوں کے ٹکراؤ کا اثر اس وقت محسوس ہوا اور اسی وقت وہ اپنی انتہا کو پہنچا جب ایک ہی گن اور ایک ہی قبیلے میں امیر اور غریب، سودخوار اور مقروض دونوں طرح کے لوگ جمع ہو گئے۔ پھر ان کے علاوہ نئے باشندوں کی کثیر تعداد تھی جو گن کی تنظیموں کے لئے بالکل اجنبی تھے، وہ لوگ ملک کے اندر ایک طاقت بن گئے تھے جیسا کہ روم میں ہوا۔ اور ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انہیں رفتہ رفتہ یک جدی گنوں اور قبیلوں میں ضم بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عام لوگوں کی اس کثیر تعداد کے لئے گن کی تنظیمیں کچھ تھوڑے سے لوگوں کی اپنی مخصوص تنظیمیں تھیں جن کو خاص حقوق حاصل تھے، یعنی جو چیز ابتدا میں فطری طور پر قائم ہونےوالی جمہوریت تھی وہ بدل کر شرفا کی ایک نہایت نفرت انگیز جماعت بن گئی۔ پھر آخری بات یہ کہ گن دستور نے ایک ایسے سماج میں جنم لیا تھا جس میں اندرونی تضاد نہیں تھا۔ وہ صرف ایک ایسے ہی سماج کے لئے موزوں تھا۔ رائے عامہ کے سوا اس کے پاس جبر کرنے کی کوئی طاقت نہیں تھی۔ لیکن اب ایک ایسا سماج جنم لے چکا تھا جو اپنے وجود کی تمام اقتصادی حالتوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر آزاد شہریوں اور غلاموں میں، استحصال کرنےوالے امیروں اور استحصال کئے جانےوالے غریبوں میں بٹ چکا تھا۔ یہ سماج نہ صرف ان تضادوں کو سلجھانے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا بلکہ ان کو روز بروز اور آگے بڑھا رہا تھا۔ ایسا سماج یا تو اس حالت میں زندہ رہ سکتا تھا کہ یہ طبقے ایک دوسرے کے خلاف مسلسل کھلم کھلا جد و جہد کرتے رہیں یا ایک تیسری طاقت کی حکمرانی ہو جو بظاہر ان برسر پیکار طبقوں کے اوپر کھڑی ہو، ان کی کھلی کشمکش کو کچل دیتی ہو اور زیادہ سے زیادہ اقتصادی میدان میں اور یوں کہئے کہ قانونی شکل میں طبقاتی کشمکش ہونے دیتی ہو۔ گن دستور کی افادیت کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ محنت کی تقسیم اور اس کے نتیجے یعنی مختلف طبقوں میں سماج کی تقسیم نے اس کے پرخچے اڑا دئے۔ اس کی جگہ ریاست نے لی۔

* * *

گن دستور کے کھنڈر پر ریاست کی تعمیر تین خاص شکلوں میں ہوئی ۔ اوپر ہم نے تینوں کا الگ الگ ذکر کیا ہے ۔ ایتھنز اس کی سب سے خالص اور سب سے ٹکسالی (کلاسیکل) شکل ہے ۔ یہاں ریاست براہ راست اور بڑی حد تک ان طبقاتی تضادوں سے پیدا ہوئی جو گن سماج میں ابھر رہے تھے ۔ روم میں گن سماج شرفا کا ایک مخصوص طبقہ بن گیا جو عوام کی کثیر تعداد کے درمیان کھڑا تھا ۔ عوام اس سے باہر تھے ۔ ان کے حقوق کچھ نہیں تھے ۔ صرف فرائض ہی فرائض تھے ۔ عوام (پلے‌بین) کی فتح نے پرانے گن دستور کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس کے کھنڈروں پر ریاست کی عمارت کھڑی کی جس میں گن کے شرفا اور عوام (پلے‌بین) دونوں ہی تھوڑے دنوں میں جذب ہو گئے ۔ اور آخر میں سلطنت روم کے جرمن فاتحوں میں ریاست کا ظہور غیر ملکوں کے بڑے بڑے علاقوں کی فتح کا براہ راست نتیجہ تھا ۔ گن دستور کے پاس ان علاقوں پر حکومت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا ۔ لیکن ان علاقوں کو فتح کرنے میں وہاں کے قدیم باشندوں کے ساتھ کسی گمبھیر کشمکش کی ضرورت نہیں پڑی تھی اور نہ زیادہ آگے بڑھی ہوئی تقسیم محنت کی ضرورت محسوس ہوئی تھی ، فاتح اور مفتوح دونوں اقتصادی نشو و نما کی ایک ہی سطح پر تھے ، چنانچہ سماج کی اقتصادی بنیاد وہی رہی جو پہلے تھی ۔ لہذا ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ گن دستور ذرا بدلی ہوئی علاقائی شکل میں کئی صدیوں تک قائم رہا ۔ یہ مارک دستور کی شکل تھی ، بعد کے برسوں کے شرفا اور اعلی نسب کے (پتریشین) خاندانوں کی شکل میں ، یہاں تک کہ کسان خاندانوں کی شکل میں بھی ، جیسے دتمارشن * میں ، وہ کچھ عرصے کے لئے نہایت کمزور طریقے سے نئی زندگی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوا ۔

---

* نیبور پہلا مورخ تھا جو گن نوعیت کے بارے میں کم و بیش صحیح رائے قائم کر سکا تھا ۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے دتمارشن (۱۵۴) خاندانوں کے بارے میں واقفیت تھی حالانکہ میکانکی طریقے سے ان کی نقل کرنے کی وجہ سے اس نے کئی غلطیاں بھی کر ڈالیں ۔

اس لئے ریاست کوئی ایسی طاقت یا اقتدار نہیں ہے جو سماج پر اوپر سے مسلط کی گئی ہو ۔ اور نہ وہ '' اخلاقی عین کی حقیقت ،، ہے اور نہ '' عقل کا عکس اور اس کی حقیقی صورت ،، ہے ، جیسا کہ ہیگل کہتا ہے (۱۰۰) ۔ بلکہ یہ تو سماج کی نشوونما کی ایک خاص منزل پر سماج کی پیداوار ہے ۔ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ سماج ایک ایسے اندرونی تضاد میں پھنس گیا ہے جو حل نہیں ہو سکتا اور وہ ایسی مخالفتوں اور دشمنیوں میں الجھ گیا ہے جن کو ختم کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے ۔ لیکن یہ مخالفتیں، یہ متضاد اقتصادی مفاد رکھنےوالے طبقے اپنی بےنتیجہ کشمکش میں ایک دوسرے کو اور پورے سماج کو برباد نہ کر ڈالیں ، اس کےلئے ایک ایسی طاقت کی ضرورت پڑی جو بظاہر دیکھنے میں سماج کے اوپر کھڑی ہو ، جو اس کشمکش کو کم کرے اور اسے '' امن وامان ،، کے دائرے میں محدود رکھے اور یہی طاقت جو سماج سے پیدا ہوئی مگر سماج کے اوپر مسلط ہو گئی اور روز بروز اپنے آپ کو اس سے الگ کرتی رہی ہے — یہ ہے ریاست ۔

قدیم گن تنظیم کے برعکس ریاست اپنی رعایا کو علاقے کے اعتبار سے بانٹتی ہے ۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں پرانی گن جماعتیں ، جو خون کے رشتوں کی بنیاد پر بنی تھیں اور جن کی شیرازہ بندی اسی سے ہوئی تھی ، ناکافی ہوچکی تھیں ۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ مان کر چلتی تھیں کہ ان کے ممبر ایک علاقے سے وابستہ ہیں اور دراصل یہ وابستگی بہت دن پہلے ختم ہو چکی تھی ۔ علاقہ اپنی جگہ پر قائم رہا لیکن لوگ نقل مقام کرنے لگے تھے ۔ اس لئے بٹوارے کے لئے علاقے کو نئی بنیاد بنایا گیا اور شہریوں کو اجازت دی گئی کہ جہاں وہ بسے ہوئے ہوں وہیں اپنے حقوق اور فرائض انجام دیں ، چاہے وہ کسی بھی گن یا قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں ۔ مقام کے اعتبار سے شہریوں کی یہ تنظیم تمام ریاستوں کی مشترک خصوصیت ہے ۔ اسی لئے ہمیں یہ قدرتی معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن ہم دیکھ آئے ہیں کہ گن کے اعتبار سے شہریوں کی پرانی تنظیم کو ہٹا کر اس کی جگہ لینے میں

اس کو ایتھنز اور روم میں کتنی طویل اور سخت جدو جہد کرنی پڑی تھی۔

دوسری چیز اقتدار عامہ کا قیام ہے۔ یہ اب براہ راست پوری آبادی پر منطبق نہیں ہوتا جو ایک مسلح قوت کی شکل میں منظم ہوتی تھی۔ یہ خاص اقتدار عامہ اس لئے ضروری ہے کہ طبقات کی تقسیم کے بعد آبادی کی کوئی ایسی ہتھیاربند تنظیم ممکن نہیں رہی جو آپ ہی آپ عمل کر سکے۔ اب غلام بھی آبادی کا ایک حصہ تھے۔ ۳۶۰۰۰۰ غلاموں کے مقابلے میں ایتھنز کے ۹۰۰۰۰ شہری محض ایک ایسا طبقہ تھے جس کو خاص حقوق اور رعایتیں حاصل تھیں۔ شرفا اور امرا کا اقتدار عامہ جو غلاموں کے خلاف تھا اور انہیں دبا کر رکھتا تھا، ایتھنز کی جمہوریت کی عوامی فوج تھی۔ لیکن شہریوں کو بھی دبائے رکھنے کے لئے جلد ہی ایک ژاندارمی (سیاسی پولیس) کی ضرورت پڑی جیسا کہ ہم اوپر بتا آئے ہیں۔ یہ اقتدار عامہ ہر ریاست میں موجود ہے۔ اس کا مطلب صرف ہتھیاربند لوگ ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے مادی لوازمات بھی ہیں، قیدخانہ اور جبر کے ہر قسم کے ادارے بھی ہیں جو گن سماج کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ جن سماجوں میں طبقاتی تضاد ابھی تک پوری طرح نہیں ابھرے ہیں اور جو جگہیں دوسروں سے الگ تھلگ ایک طرف کو پڑی ہیں، ان میں ابھی تک یہ اقتدار عامہ بہت چھوٹا اور گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بعض بعض زمانوں میں اور بعض بعض علاقوں میں یہی صورت حال تھی۔ لیکن جیسے جیسے کسی ریاست میں طبقاتی تضاد زور پکڑتے جاتے ہیں اور جیسے جیسے آس پاس کی ریاستیں رقبے اور آبادی میں بڑھتی جاتی ہیں، ویسے ہی ویسے یہ اقتدار عامہ اور مضبوط ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہمارے اپنے زمانے کے یورپ کو دیکھنا کافی ہوگا، جہاں طبقاتی جدوجہد اور فتوحات کی رقابت اور مقابلے نے اقتدار عامہ کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ پورے سماج اور خود ریاست کے لئے ایک خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

اس اقتدار عامہ کو قائم رکھنے کے لئے شہریوں سے پیسہ وصولنا یعنی ٹیکس لینا ضروری ہو گیا۔ گن سماج میں ٹیکس کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔ لیکن آج کون ہے جو اس سے نا واقف ہو۔

جیسے جیسے تمدن ترقی کرتا جاتا ہے یہ ٹیکس ناکافی ہوتے جاتے ہیں۔ تب ریاست مستقبل کے ٹیکسوں کی ہنڈی پر روپیہ لینا، یعنی روپیہ ادھار لینا، سرکاری قرض لینا شروع کرتی ہے۔ بوڑھا یورپ ان قرضوں کے بارے میں بھی ایک پوری داستان سنا سکتا ہے۔

حکومت کے افسر یا عہدہدار لوگ جن کے قبضے میں اقتدار عامہ ہوتا ہے اور جنہیں ٹیکس عائد کرنے کا اختیار ہوتا ہے، اب سماج کے اوپر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گن دستور کے عہدہداروں کی عزت لوگ بلا کسی جبر و اکراہ کے اپنے آپ کرتے تھے۔ وہ عزت اگر حکومت کے ان افسروں کو حاصل بھی ہوتی تب بھی وہ اس سے مطمئن نہ ہوتے۔ وہ ایک ایسی طاقت کے کل پرزے تھے جو سماج کے لئے اجنبی اور اس سے الگ ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس لئے یہ ضروری تھا کہ خاص قانون بنا کر لوگوں کو ان کا احترام کرنے پر مجبور کیا جائے۔ ان قانونوں کے ذریعے سرکاری افسروں کو ایک خاص تقدس اور احترام عطا کیا جاتا ہے۔ گن سماج کے تمام عہدہداروں کو ملا کر بھی جتنا اختیار حاصل نہیں تھا، اس سے زیادہ ''اختیار،، ایک متمدن ریاست کے ادنی ترین پولیس افسر کو ہوتا ہے۔ لیکن گن سماج کے چھوٹے سے چھوٹے سردار کو بلا کسی دباؤ اور بغیر کسی بحث و تکرار کے جو عزت نصیب تھی، اس پر تمدن کے عہد کے سب سے طاقتور بادشاہ اور مدبر بھی رشک کر سکتے ہیں۔ ایک تو سماج کے درمیان، اس کے بیچ میں کھڑا تھا، دوسرا مجبور ہے کہ ایک ایسی چیز کی نمائندگی کا دعوی کرے جو سماج کے باہر اور اس کے اوپر ہے۔

چونکہ ریاست طبقاتی تضاد کو دبائے رکھنے کی ضرورت سے پیدا ہوئی لیکن اسی کے ساتھ وہ ان طبقوں کی کشمکش کے دوران پیدا ہوئی، اس لئے وہ عام طور پر سب سے زیادہ طاقتور، اقتصادی طور پر سب سے زیادہ ذیاقتدار طبقے کی ریاست ہوتی ہے۔ یہ طبقہ ریاست کے ذریعے سے سیاسی طور پر بھی سب سے زیادہ ذیاقتدار طبقہ بن جاتا ہے اور اس طرح مظلوم طبقے کو دبائے رکھنے اور اس کا استحصال کرنے کے نئے ذرائع حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ عہدقدیم کی ریاست سب سے بڑھ کر غلاموں کے مالکوں کی ریاست تھی جس کا مقصد غلاموں کو دبائے رکھنا تھا۔ اسی

طرح سامنتی ریاست امرا اور شرفا کا آلۂ کار تھی جس کا مقصد زرعی غلام کسانوں اور زرخرید حلقہ بگوشوں کو دبائے رکھنا تھا۔ اور جدید نمائندہ ریاست سرمایے کے ہاتھوں اجرتی محنت کے استحصال کا حربہ ہے۔ لیکن مستثنی طور پر ایسے بھی دور آتے ہیں جبکہ لڑنے والے طبقوں میں قریب قریب ایسا توازن قائم ہو جاتا ہے کہ ریاست بظاہر ایک پنچ کی حیثیت سے کچھ دیر کے لئے اور کسی حد تک دونوں سے آزاد ہو جاتی ہے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی خودسر بادشاہتوں کا یہی حال تھا۔ وہ شرفا اور بورژوازی میں توازن قائم کئے ہوئے تھیں۔ پہلی اور اس سے بھی زیادہ دوسری فرانسیسی سلطنت کی بوناپارٹزم کا بھی یہی حال تھا۔ وہ کبھی بورژوازی کے خلاف پرولتاریہ کو اور کبھی پرولتاریہ کے خلاف بورژوازی کو بڑھاوا دیتے رہتے تھے۔ اس کی تازہ‌ترین مثال جس میں حاکم اور محکوم دونوں یکساں مضحکہ‌خیز معلوم ہوتے ہیں ، بسمارک قوم کی نئی جرمن سلطنت ہے۔ یہاں سرمایہ‌داروں اور مزدوروں میں ایک دوسرے کے خلاف توازن قائم کیا جاتا ہے اور پروشیا کے افلاس‌زدہ تنگ نظر یونکروں (زمینداروں) کے فائدے کے لئے دونوں کو یکساں طور پر دھوکا دیا جاتا ہے۔

تاریخ میں ابھی تک جتنی ریاستیں ہوئی ہیں ، ان میں زیادہ‌تر شہریوں کو ان کی دولت کے مطابق کم یا زیادہ حقوق دئے جاتے ہیں۔ اس سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ریاست ملکیت والے طبقوں کی ایک تنظیم ہے جو محروم ملکیت طبقے سے ان کی حفاظت کرنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ ایتھنز اور روم میں ایسا ہی تھا جہاں شہریوں کی طبقہ‌بندی ملکیت کے مطابق کی گئی تھی۔ ازمنۂ وسطی کی سامنتی ریاست میں بھی یہی حال تھا۔ وہاں جس کے پاس جتنی زمین ہوتی تھی ، اس کے ہاتھ میں اتنی ہی سیاسی طاقت ہوتی تھی۔ اور جدید نمائندہ ریاست میں انتخاب میں حصہ لینے کے لئے شہریوں کو جو شرطیں پوری کرنی پڑتی ہیں ، ان میں بھی یہ بات صاف دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ملکیت کے فرق کو سیاسی حیثیت دی جائے۔ بلکہ اس کے بر عکس یہ تو ریاست‌کی نشو و نما کی نیچی سطح پر ہونے کی علامت ہے۔ ریاست کی اعلی ترین شکل یعنی جمہوری ریپبلک

جو سماج کے موجودہ حالات میں روز بروز ایک لازمی ضرورت ہوتی جا رہی ہے اور جو ریاست کی وہ تنہا صورت ہے جس میں پرولتاریہ اور بورژوا طبقے کی آخری فیصلہ کن جدوجہد ہو سکتی ہے — وہ جمہوری ریپبلک سرکاری طور پر ملکیت کے فرق کو نہیں مانتی۔ اس میں دولت بالواسطہ طریقے سے مگر اور بھی زیادہ کارگر ڈھنگ سے اپنا اثر ڈالتی ہے۔ ایک تو دولت سے سرکاری عہدہداروں کو سیدھے سیدھے رشوت دی جاتی ہے — اس کی ٹھیک مثال امریکہ ہے — دوسرے، حکومت اور اسٹاک اکسچینج میں گٹھ بندھن ہو جاتا ہے۔ جتنا ریاست کا سرکاری قرضہ بڑھتا جاتا ہے، اور جتنا زیادہ سرمایہدار کمپنیاں اسٹاک اکسچینج کو اپنا مرکز بنا کر نہ صرف وسائل نقل و حمل کو بلکہ پیداوار کو بھی اپنے ہاتھوں میں جمع کرتی جاتی ہیں، اتنی ہی زیادہ آسانی سے یہ گٹھ بندھن ہو جاتا ہے۔ تازہترین فرانسیسی ریپبلک اور امریکہ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اور اپنے نیک اور شریف سوئٹزرلینڈ نے بھی اس شعبے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن حکومت اور اسٹاک اکسچینج میں اس طرح کا دوستانہ تعلق قائم کرنے کے لئے جمہوری ریپبلک ضروری نہیں ہے۔ اس کے ثبوت میں انگلینڈ اور نئی جرمن سلطنت کی مثال دی جا سکتی ہے، جہاں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ عام رائے دھندگی سے کس کا درجہ زیادہ اونچا اٹھا ہے، بسمارک کا یا بلائخرودر کا۔ اور آخری بات یہ کہ دولتمند طبقہ براہراست عام رائے دھندگی کے ذریعے سے حکومت کرتا ہے۔ جب تک کہ مظلوم طبقہ جو آج کل مزدور طبقہ ہے، اتنا پختہ نہیں ہو جاتا کہ اپنے آپ کو آزاد کر لے، تب تک اس کا بڑا حصہ صرف موجودہ سماجی نظام کو ہی ایک ممکن نظام سمجھتا رہے گا اور اس لئے سیاسی طور پر سرمایہدار طبقے کی دم، اس کا سب سے انتہائی بائیں بازووالا حصہ بنا رہے گا۔ لیکن جس حد تک یہ طبقہ خود اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لائق بنتا جاتا ہے، اسی حد تک وہ اپنے کو خود اپنی پارٹی کی شکل میں منظم کرتا ہے اور سرمایہداروں کے نہیں بلکہ خود اپنے نمائندے چنتا ہے۔ چنانچہ عام رائے دھند گی مزدور طبقے کی پختگی کی علامت ہے، اس کی کسوٹی ہے۔ موجودہ ریاست میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور نہ کچھ ہو سکتی ہے۔ لیکن اتنا کافی

ہے ۔ جس دن عام رائے دھند گی کا تھرمامیٹر بتلائے گا کہ مزدوروں میں ابال آنےوالا ہے ، اس دن مزدور اور سرمایہدار دونوں کو معلوم ہو جائےگا کہ انہیں کیا کرنا ہے ۔

غرضکہ ریاست ازل سے نہیں چلی آرہی ہے ۔ ایسے بھی سماج ہوئے ہیں جنہوں نے ریاست کے بغیر اپنا کام چلایا اور ان میں ریاست اور ریاستی اقتدار کا تصور بھی نہیں پایا جاتا تھا ۔ اقتصادی نشوو نما کی ایک خاص منزل پر سماج لازمی طور پر طبقوں میں بٹ گیا اور اس تقسیم کی وجہ سے ریاست کا وجود ضروری ہو گیا ۔ اب ہم تیزی سے پیداوار کی نشوو نما کی اس منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں جس میں ان طبقوں کا زندہ رہنا نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں رہےگا بلکہ پیداوار کے راستے میں ایک رکاوٹ بن جائے گا ۔ تب وہ اتنے ہی لازمی طور پر مٹ جائیں گے جتنے لازمی طور پر وہ پہلے کے ایک دور میں پیدا ہوئے تھے ۔ ان کے مٹنے کے ساتھ ساتھ ریاست بھی لازمی طور پر مٹ جائےگی ۔ جو سماج مال پیدا کرنےوالوں کے آزاد اور مساوی تعاون کی بنیاد پر پیداوار کو منظم کرےگا وہ سماج ریاست کی پوری مشین کو اٹھاکر وہاں رکھ دےگا جہاں تب اس کا رکھا جانا زیب دےگا ، یعنی وہ ریاست کو ہاتھ کے چرخے اور کانسے کی کلہاڑی کی طرح آثارقدیمہ کے عجائب گھر میں رکھ آئے گا ۔

* * *

اس طرح مذکورۂبالا تجزیہ بتلاتا ہے کہ تمدن سماج کے ارتقا کی وہ منزل ہے جس میں محنت کی تقسیم ، اس کی بدولت افراد کے درمیان ہونےوالا تبادلہ اور ان دونوں چیزوں کو ملانےوالی جنس تبادلہ کی پیداوار اپنے ارتقا کی آخری حد پر پہنچ جاتی ہے اور اب تک کے پورے سماج میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے ۔

سماج کے تمام سابقہ دوروں میں عمل پیداوار بنیادی طور پر اجتماعی تھا اور اسی طرح استعمال کے سامان کو چھوٹی یا بڑی قدیم کمیونسٹی برادریوں میں سیدھے سیدھے بانٹ لیا جاتا تھا ۔ یہ ساجھے کی پیداوار نہایت ہی محدود دائرے کے اندر ہوتی ہوگی لیکن ساتھ ہی اس میں

پیدا کرنےوالے لوگ اپنے عمل پیداوار اور پیداوار دونوں کے مالک ہوتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی پیداوار کا کیا ہوتا ہے۔ وہ اسے خود خرچ کرتے تھے۔ وہ کبھی ان کے ہاتھوں سے دور نہیں جاتی تھی۔ جب تک اس بنیاد پر پیداوار جاری رہی تب تک وہ پیدا کرنے والوں کے قابو سے باہر نہیں نکل پائی اور ان کے خلاف ویسی عجیب اور بھوت پریت جیسی قوتوں کو نہیں کھڑا کر سکی جیسا کہ تمدن کے عہد میں باقاعدہ اور لازماً نمودار ہوتی رہتی ہیں۔

لیکن رفتہ رفتہ پیداوار کے اس عمل میں محنت کی تقسیم گھس آئی۔ اس نے پیداوار اور تصرف کی اجتماعی نوعیت کی جڑ کھود ڈالی۔ اس نے افراد کے تصرف کو عام قاعدہ بنا دیا اور اس طرح افراد کے درمیان تبادلے کو جنم دیا۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ یہ کیسے ہوا۔ رفتہ رفتہ جنس تبادلہ کی پیداوار غالب شکل بن گئی۔

جب جنس تبادلہ کی پیداوار کا رواج ہوا یعنی جب پیداوار اپنے استعمال کے لئے نہیں بلکہ تبادلے کے لئے کی جانے لگی تو لازماً پیداوار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہونے لگی۔ تبادلے کے دوران پیدا کرنےوالا اپنی پیداوار سے الگ ہو جاتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کا کیا ہوا۔ جیسے ہی زر اور اس کے ساتھ سودا گر مختلف مال پیدا کرنے والوں کے بیچ میں ایک درمیانی آدمی کی حیثیت سے گھس آتے ہیں، تبادلے کا عمل اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے، پیداوار کے مال کا حشر اور زیادہ غیریقینی ہو جاتا ہے۔ تاجروں کی تعداد بہت ہوتی ہے اور ان میں سے کسی کو نہیں معلوم ہوتا کہ دوسرا کیا کر رہا ہے۔ اجناس صرف ایک آدمی سے دوسرے آدمی کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ایک منڈی سے دوسری منڈی میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اب پیدا کرنےوالوں کا اپنی زندگی کے لئے ضروری چیزوں کی کل پیداوار پر کوئی قابو نہیں رہ گیا ہے اور تاجروں کو اس پر قابو حاصل نہیں ہوا ہے۔ مال اور پیداوار اتفاقات کے ہاتھ میں کھلونا بن جاتے ہیں۔

لیکن اتفاقات باہمی تعلق کا محض ایک سرا ہیں۔ اس کا دوسرا سرا ضرورت کہلاتا ہے۔ فطرت میں جہاں اتفاقات کی بھی حکمرانی معلوم ہوتی ہے، ہم بہت پہلے دکھا چکے ہیں کہ ہر مخصوص شعبے میں

ان اتفاقات کے پیچھے ایک ضرورت (جبر) اور باقاعدگی عمل پیرا ہوتی ہے ۔ جو چیز فطرت کے لئے صحیح ہے وہ سماج کے لئے بھی صحیح ہے ۔ کسی سماجی عمل یا سماجی اعمال کے کسی سلسلے پر انسان کا ذی شعور طریقے سے قابو رکھنا جتنا زیادہ مشکل ہوتا جاتا ہے ، جتنا زیادہ یہ اعمال انسان کی قدرت سے باہر نکلتے جاتے ہیں ، اتنا ہی زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان اعمال پر محض اتفاقات کی حکمرانی ہے اور اتنا ہی زیادہ ان کے مخصوص اور بنیادی قوانین اتفاقات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا فطری ضرورت کی بدولت ہی ایسا ہوتا ہے ۔ جنس تبادلہ کی پیداوار اور تبادلے میں جن اتفاقات کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے ، وہ بھی ایسے ہی قانونوں کے ماتحت ہیں ۔ الگ الگ مال پیدا کرنےوالوں اور تبادلہ کرنے والوں کو یہ قوانین نہایت عجیب اور شروع میں اجنبی اور پراسرار قوت کی طرح بھی معلوم ہوتے ہیں جن کی اصلیت کا پتہ لگانے کے لئے بڑی محنت کے ساتھ کھوج اور چھان بین کرنا ضروری ہوتا ہے ۔ جنس تبادلہ کی پیداوار کے اقتصادی قانون ، پیداوار کی اس شکل کی نشو و نما کے ہر دور میں کسی قدر بدل جاتے ہیں ۔ لیکن بحیثیت مجموعی تمدن کے پورے عہد میں ان قوانین کا غلبہ رہتا ہے ۔ آج بھی پیدا کرنے والے پر پیداوار حاوی ہے ۔ آج بھی سماج کی کل پیداوار کسی ایسے منصوبے کے مطابق طے نہیں ہوتی جسے سب نے مل کر سوچ سمجھ کر تیار کیا ہو بلکہ اندھے قوانین کے ذریعے طے ہوتی ہے جو فطرت کی قوتوں کی طرح کام کرتے ہیں اور آخر میں میعادی تجارتی بحرانوں کے طوفانوں کی شکل میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں ۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح پیداوار کی نشو و نما کے ایک نسبتاً ابتدائی دور میں ہی انسانی قوت محنت اس قابل ہو گئی تھی کہ پیدا کرنےوالے کی ضروریات زندگی کے لئے جتنا کافی تھا ، اس سے کہیں زیادہ پیدا کر سکے ۔ اور کس طرح دراصل اسی دور میں پہلی تقسیم محنت اور افراد کے درمیان تبادلہ شروع ہونے لگتا ہے ۔ اور پھر اس بڑی ”حقیقت“ کا انکشاف ہوتے بھی بہت دیر نہیں لگی کہ انسان بھی ایک جنس تبادلہ ہو سکتا ہے اور انسان کو غلام بنا کر انسانی طاقت کا تبادلہ کیا جا سکتا ہے اور اس سے کام لیا جا سکتا ہے ۔ انسان نے

ابھی تبادلہ کرنا شروع ھی کیا تھا کہ اس کا بھی تبادلہ کیا جانے لگا۔ آدمی نے چاھا ھو یا نہ چاھا ھو مگر ھوا یہی کہ جو فعال تھا وہ دوسروں کے ھاتھ کا کھلونا بن گیا۔

غلامی کےساتھ ساتھ، جو تمدن کے عہد میں اپنی نشوونما کی انتہا کو پہنچ جاتی ھے، استحصال کرنےوالوں اور استحصال کئے جانےوالوں میں سماج کی پہلی بڑی تقسیم ھوئی۔ تمدن کے پورے دور میں یہ تقسیم جاری رھی ھے۔ غلامی استحصال کی پہلی شکل تھی، جو قدیم زمانے کی خصوصیت تھی۔ اس کے بعد ازمنۂ وسطی میں زرعی غلامی اور موجودہ زمانے میں اجرتی محنت آئی۔ غلامی کی یہ تین بڑی شکلیں ھیں جو تمدن کے تین بڑے ادوار کی خصوصیتیں رھی ھیں۔ غلامی ھر عہد میں رھی ھے، پہلے علانیہ اور پھر بعد میں پوشیدہ طور پر۔

تمدن کا عہد جنس تبادلہ کی پیداوار کی جس حالت سے شروع ھوا اس کی اقتصادی خصوصیتیں یہ تھیں: (۱) دھات کے بنے ھوئے سکے استعمال ھونے لگے تھے اور اس لئے زر کی شکل میں سرمائے کا، سود اور سودخوری کا رواج بھی ھو چکا تھا۔ (۲) پیدا کرنےوالوں کے بیچ میں تاجر درمیانی آدمی کا کام کرنے لگے تھے۔ (۳) زمین پر افراد کی نجی ملکیت قائم ھو گئی تھی اور رھن کا رواج ھو چکا تھا۔ (۴) پیداوار کی مروجہ شکل غلاموں کی محنت تھی۔ تمدن کے عہد سے مطابقت رکھنےوالی خاندان کی شکل جو اس عہد میں یقینی طور پر مروجہ شکل بن چکی تھی، یک‌زوجگی ھے جس میں عورت پر مرد کا غلبہ ھوتا ھے اور الگ الگ ھر خاندان سماج کی اقتصادی اکائی ھوتا ھے۔ متمدن سماج کو باندھ کر رکھنےوالی قوت ریاست ھے، جو ھر نمائندہ عہد میں محض حکمراں طبقے کی ریاست ھوتی ھے اور جو بنیادی طور پر ھمیشہ مظلوم اور استحصال کئے جانےوالے طبقے کو دبا کر رکھنےوالی مشین کا کام کرتی ھے۔ تمدن کی دوسری خصوصیتیں یہ ھیں: سماجی محنت کی پوری تقسیم کی بنیاد کے طور پر شہر اور دیہات میں مستقل تضاد قائم ھوجاتا ھے۔ دوسری طرف وصیت‌ناموں کا رواج ھوجاتا ھے جس کے ذریعے جائداد کا مالک اپنی موت کے بعد بھی اپنی جائداد کو جسے چاھے دے سکتا ھے۔ یہ رواج جس نے قدیم گن دستور پر براہ راست کاری

ضرب لگائی ، سولون کے زمانے تک ایتھنز میں نہیں پایا جاتا تھا ۔ روم میں بہت شروع میں ہی اس کا رواج ہو گیا تھا لیکن ہم ٹھیک ٹھیک نہیں کہہ سکتے کہ کب * ۔ جرمنوں میں وصیت کو پادریوں نے رواج دیا تاکہ بھولے بھالے خوش عقیدہ جرمن بلا کسی دشواری کے اپنی جائداد کلیسا کو دے جائیں ۔

اس دستور کو اپنی بنیاد بنا کر تمدن نے ایسے ایسے کارنامے انجام دئے ہیں جنہیں گن سماج ہرگز انجام نہیں دے سکتا تھا ۔ لیکن ایسا کرنے میں تمدن نے انسان کی اسفل ترین جبلتوں اور جذبات کو اکسا کر ان سے کام لیا اور اس کی تمام دوسری صلاحیتوں کو دبا کر ان جذبات کو بڑھایا ۔ تمدن کے روز اول سے آج تک ننگی حرص و ہوس اس کی روح رواں رہی ہے ۔ دولت ، زیادہ دولت ، اور زیادہ دولت — یہی اس کا واحد اور خاص نصب‌العین رہا ہے ۔ مگر وہ بھی سماج کی دولت نہیں بلکہ ذلیل و حقیر فرد کی دولت ۔ اگر اس نصب العین کو پورا کرنے کی کوشش کے دوران میں سائنس نے زیادہ سے زیادہ ترقی کی اور فن کے انتہائی

---

* لاسال کی کتاب ''اکتسابی حقوق کا نظام'' کے دوسرے حصے میں اس رائے سے بحث کی گئی ہے کہ روم کا وصیت‌نامہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا خود روم ۔ وہ لکھتا ہے کہ روم کی تاریخ میں ''ایسا کوئی زمانہ نہیں رہا جب وصیت‌نامے نہ رہے ہوں'' ، بلکہ وصیت‌نامے ماقبل رومی زمانے میں مردوں کی پرستش کا نتیجہ ہیں ۔ پرانے مکتب کے پکے ہیگل‌والوں کی طرح لاسال نے رومن قانون کی دفعات کی بنیاد ، رومیوں کے سماجی حالات کو نہیں بنایا بلکہ ارادے کے ''نظری تصور'' کو قرار دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس غیرتاریخی خیال کا حامی بن گیا ۔ لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ اسی کتاب میں اسی نظری تصور کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ رومی وراثت کے نظام میں جائداد کا منتقل ہونا ایک ثانوی حیثیت کی چیز ہے ۔ لاسال نہ صرف رومی قانون‌سازوں کی خوش‌فہمیوں پر عقیدہ رکھتا ہے اور خاص کر پہلے کے زمانے کے ماہرین قانون کی خوش فہمیوں پر ، بلکہ اس معاملے میں وہ ان سے بھی آگے نکل جاتا ہے ۔

عروج کے دور بھی باربار آتے رہے تو اس کی وجہ یہی تھی کہ دولت بٹورنے میں آج جو زبردست کامیابی حاصل ہوئی ہے ، وہ سائنس اور فن کی ان کامیابیوں کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتی تھی۔

چونکہ تمدن کی بنیاد ایک طبقے کے ہاتھوں دوسرے کا استحصال ہے، اس لئے اس کی ساری نشوونما ایک مسلسل تضاد کے دائرے سے ہو کر گذرتی ہے۔ پیداوار میں ترقی کا جو بھی قدم اٹھتا ہے وہ مظلوم طبقے یعنی بہت بڑی اکثریت کی حالت کو اور بدتر بنا دیتا ہے۔ ایک کےلئے جو نعمت ہے ، وہ لازمی طور پر دوسرے کےلئے لعنت ہے۔ کسی ایک طبقے کو جب بھی آزادی ملتی ہے تو وہ کسی دوسرے طبقے کے لئے نئی غلامی کی زنجیر بن‌جاتی ہے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال ہمیں مشینوں کے استعمال میں ملتی ہے ، جس کے نتیجوں سے آج سبھی لوگ واقف ہیں۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ، بربری لوگوں میں حقوق اور فرائض میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن تمدن نے ایک طبقے کو تقریباً سارے حقوق دے کر اور دوسرے طبقے پر تقریباً ساری ذمہ‌داریوں کا بوجھ لاد کر ، حقوق اور فرائض کے فرق اور ان کے تضاد کو اتنا واضح کردیا ہے کہ جاہل سے جاہل آدمی بھی انہیں سمجھ سکتا ہے۔

لیکن ایسا ہونا نہیں چاہئے۔ جو چیز حکمراں طبقے کے لئے اچھی ہے ، اسے پورے سماج کےلئے اچھا ہونا چاہئے جس کے ساتھ حکمراں طبقہ اپنایت جتاتا ہے۔ لہذا جیسے جیسے تمدن کی ترقی ہوتی ہے ، ویسے ویسے اسے ان برائیوں پر جنہیں وہ لازمی طور پر پیدا کرتا ہے ، محبت کا پردہ ڈالنا پڑتا ہے ، انہیں جھوٹی آرائشوں سے چھپانا پڑتا ہے یا پھر ان کے وجود سے ہی انکار کر دینا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسے رسمی منافقت اختیار کرنی پڑتی ہے جو کہ سماج کی قدیم شکلوں میں اور یہاں تک کہ تمدن کی ابتدائی حالتوں میں بھی موجود نہیں تھی ، اور آخر میں اس اعلان پر تان ٹوٹتی ہے کہ استحصالی طبقہ مظلوم طبقے کا استحصال محض اور پورے طور پر خود اسی طبقے کی بھلائی کےلئے کرتا ہے ، اور اگر مظلوم طبقہ اس صداقت کو نہیں سمجھ پاتا اور یہاں

تک کہ بغاوت پر بھی کمربستہ ہوجاتا ہے تو وہ اپنے محسنوں یعنی استحصال کرنےوالوں سے نہایت احسان فراموشی کرتا ہے *۔

اور اب میں آخر میں تمدن پر مارگن کی فیصلہ کن رائے پیش کرتا ہوں :

" تمدن کےآنے کے بعد سے ملکیت کو اتنا زبردست فروغ ہوا ہے ، اس نے اتنی بھانت کی شکلیں اختیار کی ہیں، اس کے استعمال میں اتنا اضافہ ہوا ہے ، اور اس کے مالکوں کے حق میں اس کا انتظام اتنی عقلمندی سے کیا گیا ہے کہ لوگوں کے لئے یہ ایک ایسی طاقت بن گئی ہے جس کو قابو میں رکھنا ناممکن ہے ۔ انسانی ذہن خود اپنی تخلیق کے سامنے حیرت‌زدہ کھڑا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود ایسا وقت ضرور آئے گا جب انسان کی عقل ملکیت پر قابو پائےگی ، اسے اپنے بس میں لانے میں کامیاب ہوگی اور جس ملکیت کی ریاست حفاظت کرتی ہے ، اس کے ساتھ اس کے تعلق کو متعین اور مالکوں کے فرائض اور ان کے حقوق کی حدود کو واضح کر دےگی ۔ سماج کے مفاد فرد کے مفاد سے بالاتر ہیں اور دونوں میں صحیح تعلق اور ہم‌آہنگی قائم کرنی چاہئے ۔ اگر ماضی کی طرح مستقبل میں بھی ترقی کے قانون کو جاری و ساری رہنا ہے تو انسانیت کا آخری نصب‌العین محض ملکیت بٹورنا نہیں ہو سکتا ۔ تمدن کے شروع ہونے سے لے کر اب تک جو زمانہ گذرا ہے ، وہ انسان

* شروع میں میرا ارادہ تھا کہ تمدن کی جو شاندار تنقید فورئے کی تصنیفات میں بکھری پڑی ہے ، اسے میں مارگن کی اور اپنی تنقید کے ساتھ ساتھ پیش کروں ۔ لیکن بدقسمتی سے میں اس کےلئے وقت نہیں نکال سکتا ۔ میں صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ فورئے اسی وقت سے یک‌زوجگی اور زمین کی ملکیت کو تمدن کی اصلی خصوصیت مانتا تھا اور اس نے تمدن کو غریبوں کےخلاف امیروں کی جنگ سے تعبیر کیا ہے ۔ اس کے علاوہ اس کی تصنیفوں میں اس حقیقت کو بھی گہرائی کےساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اس طرح کے سبھی نامکمل سماجوں میں جن میں باہمی متضاد مفادوں کی بدولت پھوٹ پڑ چکی ہے ، الگ الگ خاندان (les familles incohérentes) اقتصادی اکائی ہوتے ہیں ۔

کے پورے ماضی کا محض ایک ٹکڑا ہے اور جو زمانہ آئندہ آنےوالا ہے ، اس کا بھی محض ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے ۔ جس سماج کا مقصد و منتہا ملکیت بٹورنا ہو ، اس کا انجام یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا شیرازہ منتشر ہو جائے کیونکہ اس سماج کے اندر خود تخریب کے عناصر پوشیدہ ہیں ۔ تجربہ ، عقلمندی اور علم سماج کی جس اعلی سطح کی طرف برابر اشارہ کر رہے ہیں ، وہ ایسی سطح ہوگی کہ حکومت میں جمہوریت ہو ، سماج میں بھائی‌چارہ ہو ، حقوق اور منصب میں برابری ہو اور تعلیم عام ہو ۔ اس سماج میں قدیم گنوں کی آزادی ، مساوات اور بھائی‌چارے کو زیادہ اعلی شکل میں دوبارہ زندہ کیا جائےگا ،، (مارگن ، ،، قدیم سماج ،، صفحہ ۵۵۲) * ۔

اس کتاب کو اینگلس نے مارچ — ۲۶ مئی ۱۸۸۴ ء میں لکھا تھا ۔ سب سے پہلے ایک علحدہ کتاب کے طور پر یہ ۱۸۸۴ ء میں زیورخ سے شائع ہوئی تھی ۔

اصل کے مطابق ترجمہ ۔

* مزید ملاحظہ ہو ،، مارکس اور اینگلس کی دستاویزات ،، جلد ۹ ، صفحات ۵۷ — ۵۶ ۔ (ایڈیٹر)

تشریحی نوٹ

۱ - یہ مضمون شروع میں اس خیال سے لکھا گیا تھا کہ ایک مفصل اور بڑی تصنیف پر تعارف کا کام دے گا۔ تصنیف زیرقلم کا عنوان تھا ''غلامی میں رکھنے کی تین بنیادی شکلیں''۔ لیکن جب اس خیال کے عملی جامہ پہننے کی نوبت نہ آئی تو آخر مجبوراً اینگلس نے اس تعارف یا دیباچے کا عنوان یوں کر دیا ''بن‌مانس سے آدمی تک پہنچنے میں محنت نے کیاخدمت انجام دی''۔ اس مضمون میں اینگلس نے بتایا ہے کہ انسان کی جسمانی ساخت کو اور انسانی سماج کو ایک خاص طرز پر ڈھالنے میں محنت نے، اوزاروں کی ایجاد نے کیا فیصلہ کن رول انجام دیا ہے۔ اینگلس یہاں یہ دکھاتا ہے کہ مدتوں تک کا تاریخی عمل اس نسل کو جو بن‌مانسوں سے مشابہ تھی، کیوں‌کر اس سے بالکل مختلف ہستی — یعنی انسان کو وجود میں لے آیا۔ صفحہ ۷

۲ - ملاحظہ ہو چارلس ڈارون کی کتاب «The Descent of Man and Sele-ction in Relation to Sex» (''آدمی کا توارث اور صنفی انتخاب'') جو لندن میں ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ صفحہ ۷

۳ - یہاں مراد ہے ۱۸۷۳ء کے عالمی معاشی بحران سے - جرمنی میں اس کی ابتدا مئی ۱۸۷۳ء میں ایک ہولناک سنکٹ سے ہوئی اور بحران کا اثر ۱۸۸۰ء کے قریب تک چلتا رہا - صفحہ ۲۵

۴ - «Rheinische Zeitung für Politik, Handel und Gewerbe» (''سیاست، تجارت اور صنعت کا رائنشے اخبار ،،) — یہ ایک روزنامہ تھا جو کولون کے مقام سے پہلی جنوری ۱۸۴۲ء سے ۳۱ مارچ ۱۸۴۳ء تک نکلتا رہا - اپریل ۱۸۴۲ء سے مارکس بھی اس اخبار میں کام کرنے لگا اور اسی سال اکتوبر سے اس کا ایڈیٹر ہو گیا - صفحہ ۲۶

۵ - «Kölnische Zeitung» (''کولون کا اخبار ،،) — جرمن روزنامہ جو ۱۸۰۲ء سے شہر کولون سے شائع ہوا کرتا تھا - ۱۸۴۸ء — ۱۸۴۹ء کے دور انقلاب میں اور اس کے بعد رجعت‌پرستی کے دنوں میں پروشیا کی لبرل بورژوازی کی سیاسی خدمت بجالانے لگا - ۱۹ ویں صدی کی آخری تہائی میں اس کا تعلق نیشنل لبرل پارٹی سے رہا - صفحہ ۲۶

۶ - «Deutsch-Französische Jahrbücher» (''جرمن فرنچ سالنامہ،،) — کارل مارکس اور روگے کی ایڈیٹری میں یہ سالنامہ پیرس سے بزبان جرمن شائع ہونا طے پایا تھا مگر فروری ۱۸۴۴ء میں اس کا صرف پہلا شمارہ نکلا جس میں دوہرے شمارے شامل تھے - اسی میں مارکس اور اینگلس کی وہ تحریریں شائع ہوئیں جن میں ان دونوں اہل فکر کی بصیرت مادیت اور کمیونزم کے فلسفے کی طرف کوچ کرتی ہوئی نظر آتی ہے - سالنامے کے بند ہوجانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ بورژوا ریڈیکل روگے اور مارکس کے خیالات میں اصولی اختلاف ابھر آیا - صفحہ ۲۷

۷ - مارکس کو فرانس سے ملک بدر کرنے کا حکم ۱۶ جنوری ۱۸۴۵ء کو فرانسیسی حکومت نے پروشیائی حکومت کے دباؤ سے جاری کیا تھا - صفحہ ۲۸

۸ - جرمن ورکرز سوسائٹی بروسلز میں مارکس اور اینگلس نے اگست ۱۸۴۷ء کے آخر میں قائم کی۔ مقصد یہ تھا کہ بلجیم میں بسے ہوئے جرمن مزدوروں میں سیاسی روح پھونکی جائے اور سائنسی کمیونزم کی تعلیم عام کی جائے۔ ان دونوں رہنماؤں اور ان کے حامیوں کی ہدایت سے سوسائٹی کو ایسا قانونی مرکز بنایا گیا جس پر بلجیم میں رہنےوالے جرمن انقلابی پرولتاریہ کو یکجا کر لیا جائے۔ جو لوگ سوسائٹی میں خاص حیثیت رکھتے تھے وہ کمیونسٹ لیگ کے بروسلز حلقے میں داخل ہوگئے۔ فرانس میں فروری ۱۸۴۸ء کے بورژوا انقلاب کے فوراً بعد، جب بلجیم کی پولیس نے جرمن ورکرز سوسائٹی کے ممبروں کی گرفتاری اور جلاوطنی کے احکام جاری کئے تو سوسائٹی ختم ہو گئی۔ صفحہ ۲۸

۹ - «Deutshe-Brüsseler-Zeitung» (''جرمن بروسلز اخبار'') — یہ اخبار جسے بروسلز میں جرمن سیاسی پناہ گزینوں نے نکالا تھا، جنوری ۱۸۴۷ء سے فروری ۱۸۴۸ء تک نکلتا رہا۔ ستمبر ۱۸۴۷ء سے مارکس اور اینگلس نے بھی اس کے لئے مستقل کام کرنا شروع کر دیا اور اس کی پالیسی ان کے اثر میں آگئی، جس کی بدولت یہ اخبار کمیونسٹ لیگ کا ترجمان بن گیا۔ صفحہ ۲۹

۱۰ - «Neue Rheinische Zeitung. Organ der Demokratie» (''نیا رائنشے اخبار، جمہوریت کا ترجمان'') — کولون سے یہ روزنامہ مارکس کی ایڈیٹری میں پہلی جون ۱۸۴۸ء سے ۱۹ مئی ۱۸۴۹ء تک نکلتا رہا۔ ایڈیٹوریل بورڈ میں اینگلس بھی شامل تھے۔ صفحہ ۳۰

۱۱ - جون کی بغاوت — پیرس کے مزدوروں نے ۲۶ — ۲۳ جون ۱۸۴۸ء کو جانبازانہ شورش برپا کی تھی جسے فرانسیسی بورژوازی نے انتہائی بےرحمی سے کچل ڈالا۔ یہ بغاوت تاریخ میں بورژوازی اور پرولتاریہ کے درمیان پہلی عظیم‌الشان خانہ جنگی شمار ہوتی ہے۔ صفحہ ۳۰

۱۲ - «Kreuz-Zeitung» (''کراس گزٹ،، — عنوان پر صلیب کا نشان ہونے کی بدولت اس اخبار کا یہ نام پڑ گیا تھا -) اصل میں یہ جرمن روزنامہ تھا «Neue Preußische Zeitung» (''نیا پروشیائی اخبار،،) جو برلن سے نکلا اور جون ۱۸۴۸ ء سے ۱۹۳۹ ء تک نکلتا رہا - یہ اخبار شاہی حلقے اور پروشیائی یونکروں کے مخالفین انقلاب کا ترجمان تھا - صفحہ ۳۰.

۱۳ - «Neue Rheinische Zeitung. Politisch-ökonmische Revue» (''نیا رائنشے اخبار ، سیاسی معاشی جائزے،،) — کمیونسٹ لیگ کا نظریاتی ترجمان رسالہ جس کی داغ بیل مارکس اور اینگلس نے رکھی تھی - دسمبر ۱۸۴۹ ء سے نومبر ۱۸۵۰ ء تک شائع ہوا - رسالے کے صرف چھہ شمارے ہی نکلے - صفحہ ۳۰.

۱۴ - ہفتہ بھر تک گھمسان کی لڑائیوں کے بعد پہلی نومبر ۱۸۴۸ ء کو آسٹریا کی شاہی فوج نے ویانا کی عوامی شورش کچل ڈالی اور شہر ویانا پر قبضہ کر لیا -

نومبر — دسمبر ۱۸۴۸ ء میں پروشیا کی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور رجعت‌پرستی کے غلبے کا دور شروع ہو گیا - پہلی نومبر کو کھلے عام مخالفین انقلاب کی وزارت بنی - ۹ نومبر کو پروشیائی قومی اسمبلی برلن سے ہٹا کر دور افتادہ مقام برانڈن‌برگ لے جائی گئی ، اسمبلی کی اکثریت جو برلن میں اپنا اجلاس جاری رکھے ہوئے تھی ، ۱۰ نومبر کو فوج نے اسے منتشر کر دیا اور ۵ دسمبر کو اسمبلی توڑ کر ، مخالف‌انقلاب آئین نافذ کرکے حکومت کا تختہ الٹنے کا عمل پورا کر دیا گیا - صفحہ ۳۰.

۱۵ - یہاں ان عوامی شورشوں کی طرف اشارہ ہے جو مئی سے جولائی ۱۸۴۹ ء تک جرمنی میں برپا ہوتی رہیں اور ایمپائروالے آئین کی حمایت میں ہوئی تھیں - (یہ آئین فرینکفرٹ کی قومی اسمبلی نے ۲۸ مارچ ۱۸۴۹ ء کو پاس کیا تھا لیکن دوسری جرمن ریاستوں نے نامنظور کر دیا تھا) - یہ شورشیں آپ سے آپ ،

ہنگامی اور بے ربط طریقے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں ، جولائی ۱۸۴۹ ء کے وسط میں انھیں کچل کر ختم کر دیا گیا ۔ صفحہ ۳۰

۱۶ - ۱۳ جون ۱۸۴۹ ء کو پیرس میں چھوٹی بورژوازی کی پارٹی Montagne (مونٹین) نے ایک پرامن احتجاجی جلوس نکالا تھا کہ اٹلی پر فرانسیسی فوج بھیجے جانے کے خلاف مظاہرہ کیا جائے ۔ فوج نے اس جلوس کو منتشر کر دیا ۔ مونٹین پارٹی کے بہت سے لیڈر گرفتار ہوئے ، جلا وطن کئے گئے ، یا مجبوراً ترک وطن کر کے فرانس سے نکل گئے ۔ صفحہ ۳۱

۱۷ - کولون میں کمیونسٹوں کا مقدمہ (۴ اکتوبر سے ۱۲ نومبر ۱۸۵۲ ء تک چلا) — پروشیائی حکومت نے کمیونسٹ لیگ کے گیارہ ممبروں پر یہ مقدمہ اس نیت سے چلایا تھا کہ کمیونسٹوں پر الزام تھوپ کر بین‌اقوامی مزدور تحریک کو کچل دیا جائے ۔ اس مقدمے میں پروشیائی حکومت اور اس کے کارندوں نے ، پولیس نے ایک سے ایک تہمت تراشی ، جعلی دستاویزیں تیار کیں اور گرے ہوئے ہتھکنڈوں سے کام لیا ۔ زیر سماعت ۷ ملزموں کو تین سے چھ سال تک کی سزائے قید سنائی گئی ۔ مقدمے کی اس سازش کا ذکر اینگلس نے ” کمیونسٹ لیگ کی تاریخ پر “ اپنے مضمون میں کیا ہے (جو اسی جلد میں شامل ہے) اور مارکس اور اینگلس نے ” کولون میں کمیونسٹوں پر مقدمہ بے نقاب “ مقالہ لکھ کر اس سازش کا پردہ فاش کیا تھا ۔ صفحہ ۳۱

۱۸ - «New-York Daily Tribune» (” نیویارک ڈیلی ٹریبیون “) امریکہ کی ترقی‌پسند بورژوازی کا روزنامہ تھا ۔ ۱۸۴۱ ء سے ۱۹۲۴ ء تک نکلتا رہا ۔ مارکس اور اینگلس دونوں اگست ۱۸۵۱ ء سے مارچ ۱۸۶۲ ء تک اس کے لئے لکھتے رہے ۔ صفحہ ۳۱

۱۹ - امریکی خانہ‌جنگی جو ۱۸۶۱ ء سے چار سال تک جاری رہی ۔ شمال کی صنعتی ریاستوں اور جنوب کی غلام‌دار ریاستوں کے درمیان اس خوں ریز اور فیصلہ کن جنگ میں ، انگلینڈ کے مزدور طبقے نے

انگریز بورژوازی کی سیاست کے خلاف آواز بلند کی اور انگلینڈ کو اس جنگ میں دخل دینے سے روکا۔ انگریزی سیاست اس وقت یہ تھی کہ بڑی کاشت کاریوں اور غلاموں کا کاروبار کرنےوالی طاقتوں کی مدد کی جائے۔ صفحہ ۳۱

۲۰۔ اٹلی کی جنگ — ۱۸۵۹ء کی وہ جنگ جو فرانس اور پیےمونت نے آسٹریا کے خلاف چھیڑی تھی۔ نپولین سوم (لوئی بوناپارٹ) نے اٹلی کو آزادی دلوانے کے حیلے سے یہ جنگ شروع کی حالاں کہ اس کی غرض تھی علاقہ چھیننا اور فرانس میں اپنی حکومت کا پایہ مضبوط کرنا۔ مگر جب اٹلی میں قومی آزادی کی تحریک نے زور باندھا تو اس سے گھبرا کر اور اٹلی کے سیاسی افتراق کو برقرار رکھنے کی خاطر لوئی بوناپارٹ نے آسٹریا سے علاحدہ صلح نامہ کر لیا۔ جنگ کا حاصل یہ ہوا کہ فرانس نے سیوائے اور نیتس کے علاقے لےلئے۔ لمبارڈی کو ساردینا سے جوڑ دیا گیا اور وینس پر آسٹریا کی عملداری رہی۔ صفحہ ۳۲

۲۱۔ «Das Volk» (''عوام'') — جرمن زبان کا ہفتہوار اخبار جو لندن میں ۷ مئی سے ۲۰ اگست ۱۸۵۹ء تک نکلا۔ مارکس کا اس اخبار سے بہت نزدیکی واسطہ تھا؛ جولائی سے مارکس نے ہی حقیقت میں اس کی ایڈیٹری بھی کی۔ صفحہ ۳۲

۲۲۔ یہاں مراد ہے پیرس کے تویلری محل سے جس میں فرانس کا صدر نپولین سوم رہتا تھا۔ صفحہ ۳۲

۲۳۔ ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو عوام کی شورش اٹھی اور فرانس میں انقلاب ہو گیا جس نے نپولین سوم‌والی دوسری شہنشاہی کے خاتمے اور ملک کے ریپبلک ہونے کا اعلان کر دیا۔ عارضی حکومت قائم کردی گئی جسے قومی ڈیفنس کی حکومت کا نام دیا گیا تھا۔ اس حکومت میں اعتدال پسند ریپبلکنوں کے علاوہ شخصی بادشاہی کے حامی بھی داخل ہو گئے تھے۔ پیرس کا فوجی گورنر تروشیو اس حکومت کا سربراہ بنا جو تیئر کی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔

قومی ڈیفنس کی حکومت نے باہر کے دشمن سے ساز باز اور قوم‌فروشی کا راستہ اختیار کیا۔ صفحہ ۳۲

۲۴۔ ہیگ کانگرس — انٹرنیشنل ورکنگ‌مینز ایسوسی‌ایشن کی یہ کانگرس دوسری سے ساتویں ستمبر ۱۸۷۲ء تک ہیگ کے مقام پر ہوتی رہی۔ اس میں پندرہ قوموں کی پارٹیوں کی طرف سے کل ۶۵ ڈیلی گیٹ آئے تھے۔ کانگرس کی کارروائی مارکس اور اینگلس کی ہدایت پر چلتی رہی۔ مزدوروں کی تحریک میں چھوٹی حیثیت کی بورژوازی کی تنگ‌نظری جو مختلف روپ اختیار کرتی ہے، اس کے توڑ پر مارکس، اینگلس اور ان کے حامی برسوں سے کوششیں کر رہے تھے۔ ہیگ کانگرس میں یہ مقابلہ اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ انارکسٹوں (نراجیوں) کی پھوٹ ڈالنےوالی سرگرمیوں کی سخت گرفت کی گئی اور ان کے لیڈروں کو انٹرنیشنل سے نکال دیا گیا۔ ہیگ کانگرس کے فیصلوں نے ایسی بنیاد ڈال دی جس پر آگے چل کر مختلف ملکوں میں مزدور طبقے کی اپنی آزادانہ سیاسی پارٹیاں قائم ہو سکیں۔ صفحہ ۳۳

۲۵۔ ۱۸۷۱ء کا پیرس کمیون — ۲۸ مارچ سے ۲۸ مئی تک مزدور طبقے کی انقلابی حکومت۔ ۱۸ مارچ ۱۸۷۱ء کے پرولتاری انقلاب کو اور اس کے فوراً بعد پرولتاری ڈکٹیٹری کے دور کو عرف عام میں پیرس کمیون کہا جاتا ہے۔ مارکس کا مشہور مقالہ ”فرانس میں خانہ‌جنگی“ پیرس کمیون پر اور اس سے متعلق تمام واقعات پر تفصیلی روشنی ڈالتا ہے (اسی سلسلے کی جلد دوم میں ملاحظہ ہو)۔ صفحہ ۳۴

۲۶۔ اینگلس کی یہ کتاب ”یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم“ اس کی ایک اور تصنیف ”اینٹی ڈیورنگ“ کے ان تین بابوں کا مجموعہ ہے جو خاص کر اس نیت سے از سرنو لکھے گئے تھے کہ مزدوروں کے سامنے سلیس اور واضح انداز میں مارکسزم کا عالمی نقطۂ نظر پیش کر دیا جائے۔ اس کتاب میں اینگلس نے مارکسی نقطۂ نظر

کے تین اجزائے ترکیبی بیان کئے ھیں ۔ یہاں اینگلس نے دکھایا ھے کہ جدلیاتی مادیت اور تاریخی مادیت کا نظریہ کن راھوں سے گزر کر تیار ھوا اور کارل مارکس نے جو زبردست انکشاف کئے ، ایک تو تاریخ کا مادی تصور ، اور دوسرے قدرزائد (surplus value) کا نظریہ ، محض ان کی بدولت سوشلزم کے خیال کو علمی یا سائنسی بنیاد میسر آئی ۔ صفحہ ۴۲

۲۷ - ۲۲ مئی سے ۲۷ مئی ۱۸۷۵ ء تک کی گوتھا کانگرس میں جرمن مزدور تحریک کے دو الگ الگ رجحان مل کر ایک ھوگئے ۔ ایک رجحان کی نمائندگی سوشل ڈیموکریٹک ورکرز پارٹی کرتی تھی (یعنی آئزی‌ناخ‌والے) جس کے رھنما تھے آگسٹ بیبل اور ولہلم لیبکنیخت اور دوسرے میں فرڈیننڈ لاسال کے حامی جنرل جرمن ورکرز یونین‌والے تھے ۔ ان دونوں کے متحد ھوجانے پر جرمنی کی سوشلسٹ ورکرز پارٹی نام اختیار کیا گیا اور یوں جرمنی کے مزدور طبقے کے درمیان اختلاف کی دیوار ھٹا دی گئی ۔ گوتھا میں ھونےوالی اس کانگرس کےلئے اتحاد کی خاطر پروگرام کا جو خاکہ پہلے سے شائع کیا گیا تھا ، اس پر مارکس اور اینگلس نے کڑی تنقید کی تھی، تاھم تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ اسی کو متحدہ پارٹی کے پروگرام کے طور پر قبول کرلیا گیا ۔ صفحہ ۴۲

۲۸ - دو دھاتی اصول (Bimetallism) — مالیاتی معاملات میں دو دھاتوں کا سسٹم ، جس میں سونے اور چاندی دونوں دھاتوں کو ذریعہ مبادلہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے ۔ صفحہ ۴۳

۲۹ - ” فورواڑٹس “ («Vorwärts») یہ جرمنی کی سوشلسٹ ورکرز پارٹی کا مرکزی ترجمان تھا جو لائپزگ میں یکم اکتوبر ۱۸۷۶ ء سے ۲۷ اکتوبر ۱۸۷۸ ء تک نکلتا رھا ۔ اینگلس کی مذکورہ بالا تصنیف ” اینٹی ڈیورنگ “ اسی اخبار میں ۳ جنوری ۱۸۷۷ ء سے ۷ جولائی ۱۸۷۸ ء تک شائع ھوئی ۔ صفحہ ۴۴

۳۰ - ''مارک،، (The mark) — جرمنی کی قدیم دیہی برادری - اس عنوان کے تحت اینگلس نے '' یوٹوپیائی اور سائنسی سوشلزم،، کے پہلے جرمن اڈیشن کے ایک ضمیمے میں مختصراً جرمن کسانوں کی تاریخ بیان کی ہے جو زمانۂقدیم سے شروع ہوتی ہے - صفحہ ۴۴

۳۱ - اینگلس نے یہاں روسی عالم سماجیات ایم - ایم - کووالیفسکی کی تصنیف «Tableau des origines et de l'évelution de la famile et de la proprieté» (''خاندان اور ذاتی ملکیت کی ابتدا اور ان کا ارتقا،،) کی طرف اشارہ کیا ہے جو اسٹاک‌ہالم سے ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی تھی - اس کے علاوہ «Primitive law» جلد اول، «Gens» شائع شدہ ماسکو ۱۸۸۶ء کا حوالہ ہے - صفحہ ۴۵

۳۲ - فلسفۂلاادریت (Agnosticism) یونانی لفظ agnostos سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں لاعلمی، یا جسے عربوں نے لاادری کہا - یہ ایک عینی نظریہ ہے جس کا کہنا ہے کہ انسانی عقل اس درجہ محدود ہے کہ حواس خمسہ سے ماورا کسی چیز کے علم تک نہیں پہنچتی - لاادریت مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی: ایک قسم تو ان کی ہے جو موجودات عالم کا مادی موجود تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ نہیں مانتے کہ ہم ان کی حقیقت کی گہرائی میں اتر سکتے ہیں - دوسرے 'لاادریوں' کا کہنا ہے کہ ہم یہ صحیح طور پر جان ہی نہیں سکتے کہ ہمارے احساس کے ماورا عالم کا وجود ہے بھی یا نہیں — اس‌لئے کائنات کے مادی وجود سے ہم انکار کرتے ہیں - صفحہ ۴۶

۳۳ - علم کلام (Scholasticism) — قرون وسطی کا وہ مذہبی فلسفہ، جس نے انتہائی مجرد بحثوں اور مفروضوں سے سروکار رکھا اور زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے بالکل بےتعلق رہا - اس نام‌نہاد فلسفے نے منطقی الٹ‌پھیر سے کام لے کر کلیسائی عقیدوں کو گویا فلسفیانہ بنیاد مہیا کردی - صفحہ ۴۶

۳۴ - دینیات (Theology) یونانی لفظ کے لفظی معنی ہوں گے خدا سے متعلق علم - خود اس لفظ سے ہی ظاہر ہے کہ دینیات کا نظریہ مذہبی عقیدوں ، اخلاقیات اور عبادات کو ایک نظام یا '' فلسفیانہ ،، ربط دینے کی ذہنی کوشش کا نام ہے - صفحہ ۴۶

۳۵ - اسمیت (nominalism) — قرون وسطی کے فلسفے کا ایک رجحان جو یہ دعوا کرتا تھا کہ عام تصورات الگ الگ اشیا کے نام ہیں - حقیقت‌پرستی کے برخلاف فلسفۂ اسمیت نے اس بات سے انکار کیا کہ عالم موجودات کو اعیان ثابتہ کی ایک پرچھائیں قرار دیا جائے - اسمیت کا دعوا تھا کہ شے کا وجود مقدم ہے اور اس کے شعور و فہم کی حیثیت ثانوی ہے - اس طرح اسمیت کے ماننےوالوں نے قرون‌وسطی میں مادیت کے نظریے کے نقش اول کی جھلک دکھائی - صفحہ ۴۶

۳۶ - Homoiomeriae — مادے کے وہ چھوٹے سے چھوٹے ذرات یا جزو جن کے تقسیم ہوتے چلےجانے کی کوئی انتہا نہیں ہے - قدیم یونانی طبیعی فلسفی انکساغورث کا خیال تھا کہ ایسے ذرات ہی تمام موجودات کا اصل اصول ہیں اور انھی کے ترکیب پانے سے مختلف اجسام اور اشکال کا ظہور ہوتا ہے - صفحہ ۴۷

۳۷ - یہاں اشارہ ہے فلسفی لاک (J. Locke) کی تصنیف «An Essay concerning Human Understanding» (''علم انسانی پر ایک مقالہ،،) کی طرف - اشاعت اول ، لندن ، ۱۶۹۰ ء - صفحہ ۴۹

۳۸ - خدا پرستی (Theism) — خدائے واحد ، قادر مطلق‌وخالق کائنات کا عقیدہ - صفحہ ۴۹

۳۹ - محسوسیت (لاطینی لفظ sensualis (احساس) سے مشتق ہے اور sensualism کا فلسفہ کہلاتا ہے) — مطلب یہ کہ انسانی حواس سے جس چیز کا وجود ظاہر ہو ، اسی کا وجود یقینی ہے ، اور محض انسانی حواس ہی ایک ذریعہ علم‌وجز کا - ان سے ماورا کسی اور ذریعہ علم کا وجود نہیں ہے - صفحہ ۴۹

۳۰ - فلسفۂ الوھیت (Deism) — مذھبی اور فلسفیانہ عقیدہ ، جو خدا کو عالم موجودات کا حقیقی سرچشمہ مانتا ھے لیکن یہ تسلیم نہیں کرتا کہ فطرت اور معاشرے کے معاملات میں وہ دخل دیتا رھتا ھے - صفحہ ۳۹

۳۱ - لندن کی صنعتی نمائش عالمی پیمانے پر کاروبار کی پہلی نمائش تھی جو مئی سے اکتوبر ۱۸۵۱ ء تک ھوتی رھی - صفحہ ۵۰

۳۲ - بپٹسٹ (Baptists) — مسیحی مذھب کا ایک نہایت وسیع فرقہ جو یہ مانتا ھے کہ مذھب اختیار کرنا (بپٹسمہ لینا) شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد ھی مناسب ھے - یہ فرقہ پرانے عقیدوں کی بہت سی تاویلات اور پیچیدگیوں سے منکر ھے اور جماعت کے ھر ایک فرد کو اپنی سمجھ کے مطابق مقدس کتابوں کا مطلب نکالنے کا حق دیتا ھے - بپٹسٹ فرقے نے ۱۷ ویں صدی کے آغاز میں انگلینڈ اور امریکہ میں اپنے جماعت‌خانے قائم کئے -

نجات فوج (Salvation Army) — ایک رجعت پرست مذھبی خیراتی تنظیم جو ۱۸۶۵ ء میں انگلینڈ میں قائم ھوئی تھی ، ۱۸۸۰ ء میں اس کی ازسرنو تنظیم فوجی انداز پر ھوئی (اسی لئے آرمی نام پڑا) - بورژوازی نے اس جماعت کا ھاتھ بٹایا اور انگلینڈ کے باھر بہت سے ملکوں میں اس جماعت کا جال پھیل گیا جو خیراتی کاموں میں شرکت کرکے ، فلاح‌وبہبود کے ادارے قائم کرکے محنت کشوں کی توجہ سرمایہ‌داروں کی لوٹ کی طرف سے ھٹانے کی خدمت انجام دیتی ھے - صفحہ ۵۱

۳۳ - روحانیت (Spiritualism) لاطینی لفظ spiritus سے مشتق ھے - روحانیت‌پرستوں کا خیال ھے کہ روح کا وجود جسم پر منحصر نہیں اور روح عالم موجودات میں مقدم اور ماورا ھے - صفحہ ۵۵

۳۴ - فرقہ بندی یہاں یونانی لفظ Schism سے مشتق ھے یعنی رفض یا اختلاف - قرون‌وسطی میں مسیحی مذھب میں جو اختلافی عقیدے نکلے ان کے لئے عام طور سے یہ لفظ استعمال ھوتا ھے - صفحہ ۵۶

۴۵ - ''شاندار انقلاب،، سے مراد انگلستان میں ۱۶۸۸ ء کا انقلاب - انگریز بورژوا مورخین اسے یہی نام دیتے ہیں - حکومت کا تختہ الٹ کر جیمس دوم کو برطرف اور اسٹوارٹ شاہی خاندان کو بےدخل کیا گیا - اسی انقلاب نے آئینی بادشاہت قائم کی (۱۶۸۹ ء) - ولیم آف اورینج کو تخت‌وتاج ملا - یہ ایک طرح کا سمجھوتہ تھا جاگیردار اشرافیہ اور بڑی بورژوازی کے درمیان - صفحہ ۶۰

۴۶ - سفیدوسرخ گلاب کی جنگیں — ۱۴۵۵ ء سے ۱۴۸۵ ء تک انگلینڈ میں یارک اور لنکاسٹر شاہی خاندانوں کی جنگیں - ایک فریق کے پرچم پر سفید گلاب تھا ، دوسرے کے پرچم پر سرخ - یارک‌والوں کے طرفدار زیادہ ترقی یافتہ جنوبی حصہ ملک کے بڑے بڑے جاگیردار ، سردار اور شہری لوگ تھے ، لنکاسٹر کی پشت پر شمالی حصہ ملک کے اوپر کے شرفا تھے - ان مسلسل جنگوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرانے وقتوں کے صاحب جائداد خاندانوں کا بالکل صفایا ہوگیا اور تھیوڈروں کا ایک نیا خاندان ابھرا جس نے تاج و تخت پر قبضہ کرکے ملک میں مطلق‌العنان بادشاہی قائم کردی - صفحہ ۶۰

۴۷ - کارٹیزینزم (Cartesianism) — سترھویں صدی کے فرانسیسی فلسفی دیکارت کے خیالات - ان خیالات کے پیرو مادی نتائج نکالتے ہیں - صفحہ ۶۲

۴۸ - ''حقوق انسانی کا اعلان نامہ،، - فرانس کی آئین‌ساز اسمبلی نے اسے منظور کیا تھا اور نئے بورژوا نظام کے سیاسی اصولوں کے پیش‌نظر تیار کیا گیا تھا جسے انقلاب کے زمانے میں (۱۷۹۱ ء) فرانسیسی آئین میں شامل کر لیا گیا - اسی کی بنیاد پر جیکوبینوں نے ۱۷۹۳ء میں اپنا حقوق انسانی کا اعلان نامہ تیار کیا - بعد میں نیشنل کنونشن نے اسے فرانسیسی ریپبلک کے پہلے آئین کا بنیادی جز بنالیا - صفحہ ۶۳

۴۹ - یہاں اور آگے چل کر بھی اینگلس نے ضابطہ نپولین (Code Napoleon) کے جو حوالے دئے ہیں ان کا مقصد صرف ۱۸۰۴ء کے ضابطہ شہری (Code Civil) کی طرف نہیں بلکہ بورژوا قانونوں کے پورے نظام کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ یہ پانچ ضابطے تھے: ضابطہ شہری، دیوانی، کاروباری، فوجداری اور جرائم، جو نپولین بوناپارٹ کے زمانے ۱۸۱۰ء — ۱۸۰۴ء میں نافذ کئے گئے تھے۔ نپولین نے جرمنی کے جن مغربی اور جنوب مغربی حصوں پر قبضہ کیا تھا وہاں بھی انھی پر عملدرامد ہوتا تھا۔ بعد میں ۱۸۱۵ء میں جب یہ علاقہ پروشیا میں ملا لیا گیا تب بھی کچھ عرصے ان ضابطوں کا عمل دخل باقی رہا۔ صفحہ ۶۳

۵۰ - دہشت گردی — انقلابی جمہوری ڈکٹیٹری کا زمانہ، جون ۱۷۹۳ء سے جولائی ۱۷۹۴ء تک کے انقلابی دور میں جیکوبی اقتدار کی بدولت اس دور کو دہشت کا دوردورہ کہا جاتا ہے۔ صفحہ ۶۵

۵۱ - یہاں اشارہ ہے انگلستان میں اس تحریک کی طرف جو انتخابی حقوق کی اصلاح کےلئے چل رہی تھی۔ رائے عامہ کے دباؤ سے بالآخر دارالعوام نے ۱۸۳۱ء میں قانون پاس کردیا اور ۱۸۳۲ء میں دارالامرا نے اس کی منظوری دےدی۔ اصلاح کا مقصد تھا صاحب‌جائداد اور نقد رقم‌والوں کی سیاسی اجارہ‌داری توڑنا اور اصلاح کا قانون منظور ہونے سے پارلیمنٹ کے دروازے صنعتی بورژوازی پر کھل گئے۔ پرولتاریہ اور چھوٹی بورژوازی، جنھوں نے اصلاح کےلئے خاص کر زور لگایا تھا، لبرل بورژوازی نے انھیں فریب دےدیا اور وہی دونوں انتخابی حقوق سے محروم رہ گئے۔ صفحہ ۶۵

۵۲ - ۱۸۲۴ء میں رائےعامہ کے دباؤ سے انگلستان کی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا اور ٹریڈیونینوں پر پابندی منسوخ کردی گئی۔ صفحہ ۶۶

۵۳ - عوامی چارٹر (People's Charter) جس میں چارٹسٹوں کے مطالبے شامل تھے (چارٹسٹ کی تشریح ملاحظہ ہو نوٹ نمبر ۵۴ میں) ۸ مئی ۱۸۳۸ ء کو ایک مسودہ قانون کی صورت میں شائع ہوا تاکہ پارلیمنٹ کے سامنے بحث کے لئے رکھا جائے۔ مسودے میں چھہ دفعات تھیں: عام حق رائے دھندگی (۲۱ سال سے اوپر کے مرد باشندوں کے لئے)، پارلیمنٹ کے سالانہ انتخابات، پوشیدہ رائے دھندگی، مساوی حلقے، پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے صاحب جائداد ہونے کی شرط کا خاتمہ، اور پارلیمنٹ کے ممبروں کے لئے مقررہ تنخواہ۔ چارٹسٹوں نے پارلیمنٹ سے تین بار درخواستیں کیں لیکن ۱۸۳۹ ء، ۱۸۴۲ ء اور ۱۸۴۹ ء میں وہ برابر نامنظور کردی گئیں۔

اناج کے قوانین کی مخالف لیگ برطانوی صنعتی بورژوازی کی تنظیم تھی جو ۱۸۳۸ ء میں مانچسٹر کے مال مالکوں کوبڈین اور برائٹ نے بنائی تھی۔ لیگ کا مطالبہ تھا کہ تجارت کی پوری آزادی ہو۔ اس نے اناج کی درآمد پر سے ہر قسم کی پابندی اٹھوانے کی کوشش کی۔ مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کی اجرت گھٹائی جائے اور صاحب جائداد اشرافیہ کا معاشی اور سیاسی اقتدار کمزور ہو۔ ۱۸۴۶ ء میں جب اناج پر پابندی کے قانون منسوخ ہوئے تو لیگ کا وجود بھی ختم ہوگیا۔ صفحہ ۶۷

۵۴ - چارٹزم (Chartism) انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی مزدوروں کی ایک سیاسی تحریک جو معاشی زیادتیوں اور سیاسی دھاندلیوں کے خلاف ۱۸۳۱ ء سے ۱۸۵۵ ء کے درمیان چلتی رہی۔ تحریک کی اصل مانگ یہ تھی کہ عوامی حقوق تسلیم کئے جائیں جن میں سب کے لئے حق رائے دھندگی اور مزدوروں کے لئے اس حق کی کئی ضمانتیں شامل تھیں۔ لینن کے بقول چارٹزم ''پہلی وسیع اور صحیح معنی میں عوامی، سیاسی صورت میں پرولتاریہ کی انقلابی تحریک تھی''۔ صفحہ ۶۷

۵۵ - چارٹسٹوں نے ۱۰ اپریل ۱۸۴۸ء کو لندن میں ایک مظاہرے کا انتظام کیا تھا تاکہ جلوس کی شکل میں جا کر پارلیمنٹ کو اپنے مطالبوں کی یادداشت پیش کریں - انتظام کرنےوالوں کی ھچکچاھٹ اور تذبذب نے جلوس میں کھنڈت ڈال دی جس کی وجہ سے رجعت پرستوں کی ھمت بڑھ گئی اور انھوں نے مزدوروں اور چارٹسٹوں کے ساتھ سختی برتی - صفحہ ٦٧

۵٦ - ۲ دسمبر ۱۸۵۱ء کو فرانس میں انقلاب کے مخالف لوئی بوناپارٹ نے حکومت کا تختہ الٹ کر دوسری شہنشاھی قائم کردی - اس پر مارکس کا تفصیلی مضمون ملاحظہ ھو مارکس اور اینگلس کی منتخب تصانیف ، جلددوم میں - صفحہ ٦٧

۵۷ - ''برادر جوناتھن'' — ریاستہائے متحدہ امریکہ کو جس طرح اب ''چاچا سام'' کہا جاتا ھے اسی طرح پہلے اس کے لئے یہ نام تھا -

احیائے مذھب (Revivalism) — اٹھارویں صدی کی ایک تحریک جس نے مذھب کے گھٹتے ھوئے زور کے احیا کی کوشش کی - دو امریکی پرچارک موڈی اور سانکی اس کے منظم کرنے والے تھے - صفحہ ٦٧

۵۸ - ۱۸٦۷ء کے انگلینڈ میں عام مزدور تحریک کے دباؤ سے دوسری پارلیمنٹری اصلاح ھوئی - پہلی انٹرنیشنل کی جنرل کونسل نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا - اصلاح کا حاصل یہ ھوا کہ رائے دھندوں کی تعداد پہلے سے دوگنی ھوگئی - تعلیم یافتہ مزدوروں کے ایک حصے کو بھی رائے دینے کا حق مل گیا - صفحہ ۷۰

۵۹ - وھگ (Whigs) انگلینڈ کی مشہور سیاسی پارٹی جس کی بنیاد ۱٦۸۰ء کے عشرے میں رکھی گئی تھی - جو جاگیردار طبقہ سرمایہداری کی طرف آچلا تھا ، اس کے مفاد ، تجارتی کاروباری حلقے کے مفاد اور ساھوکاروں کے حقوق کی حمایت میں یہ پارٹی

بادشاهی اختیارات کو محدود کرنے کی حامی تھی - ۱۹ ویں صدی کے وسط تک یہ پارٹی کام کرتی رهی ، پھر بورژوازی کے دوسرے سیاسی گروهوں سے مل ملا کر برطانیہ کی لبرل پارٹی میں مدغم هو گئی - صفحہ ۱۷

۶۰ - ٹوری (Tory) یہ وهگ کے مقابل کی سیاسی پارٹی تھی جو سترهویں صدی کے آخر میں بنی - یہ پارٹی صاحب جائداد طبقے ، اوپر کے کلیسائی عہدہ داروں کی نمائندہ تھی جو جاگیردارانہ ماضی اور انگلستان کے پرانے چلن کی حامی تھی - ۱۹ ویں صدی کے وسط میں اس پارٹی کی بنیاد پر قدامت پسند (Conservative) پارٹی بن گئی جو آج بھی موجود ہے - صفحہ ۱۷

۶۱ - بورژوا نظریات کے ایک مدرسۂ فکر کے حامی جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں جرمنی میں نمودار هوا تھا - کتھیڈر سوشلسٹوں میں سے زیادہ تر پروفیسر تھے - وہ لوگ یونیورسٹی کے منبروں سے مارکس‌واد کی مخالفت کرتے تھے (اور اس لئے ان کا نام کتھیڈر سوشلسٹ پڑا - کتھیڈر کے معنی هیں منبر) - ان لوگوں کا دعوی تھا کہ بورژوا ریاست چند اصلاحات کے ذریعے طبقات کی آویزش ختم کر سکتی ہے اور سوشلزم کی بنیاد رکھ سکتی ہے - ان لوگوں کے پروگرام میں یہ شامل تھا کہ بیماری اور حادثے سے مزدوروں کا بیمہ لازمی اور فیکٹری قانون میں کچھ خاص گنجائشوں کا اضافہ هونا چاهئے - ان حضرات کی رائے میں اچھی طرح منظم ٹریڈ یونینیں هوں تو پھر سیاسی تحریک اور مزدور طبقے کی سیاسی پارٹی کی ضرورت نہیں رهتی - کتھیڈر سوشلزم ترمیم‌پسندی کا ایک سرچشمہ ثابت هوا - صفحہ ۱۷

۶۲ - رسوم پرستی (Ritualism) — چرچ آف انگلینڈ کی ایک شاخ جو ۱۸۳۰ء کے عشرے میں پھوٹی - یہ لوگ پرانے کیتھولک عقیدے اور اس کے رسوم کو جوں کا توں رائج کرنے کے حق میں تھے - اسی‌لئے یہ نام پڑ گیا - صفحہ ۲۷

۶۳ - لندن کے مشرقی حصے کی طرف اشارہ ہے جس میں پرولتاریوں اور غریبوں کے محلے تھے - صفحہ ۴۷

۶۴ - یہ خیال کہ زیادہ ترقی‌یافتہ سرمایہ‌دار ملکوں میں بیک‌وقت پرولتاری انقلابوں کا سلسلہ چلنے کا تو امکان ہے ، البتہ یہ ممکن نہیں کہ پرولتاری انقلاب کسی ایک ملک میں آکر رہ جائے ، اینگلس نے ۱۸۴۷ء میں قائم کیا تھا اور اس کی تصنیف '' کمیونزم کے اصول ،، میں بیان ہوا ہے - اجارہ دارانہ سرمایہ‌داری سے پہلے کے دور میں یہ قیاس درست تھا لیکن جب تاریخی حالات بدل گئے اور سرمایہ‌داری نے اجارہ داری میں قدم رکھدیا تو لینن نے اپنے دریافت کئے ہوئے اس اصول پر کہ سامراجی دور میں سرمایہ‌داری کا معاشی اور سیاسی اٹھان ناہموار ہوتا ہے ، یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اشتراکی انقلاب بیک وقت کئی ملکوں میں یا کسی ایک ملک میں کامیاب ہوسکتا ہے ، البتہ یہ ممکن نہیں کہ اشتراکی انقلاب بیک‌وقت سب ملکوں میں یا بہت سارے ملکوں میں پروان چڑھے - یہ نتیجہ سب سے پہلے لینن نے اپنے اس مضمون میں واضح کیا ہے جو ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا تھا '' یورپ کی ریاستہائے‌متحدہ کا نعرہ ،، - صفحہ ۵۷

۶۵ - سوشلسٹ دشمن ہنگامی قانون (The Anti - Socialist Law)جرمنی میں ۲۱ اکتوبر ۱۸۷۸ء کو بنا تھا - اس کے مطابق سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی تمام شاخیں ، عام مزدور انجمنیں ، مزدوروں کے اخبارات وغیرہ خلاف قانون قرار دئے گئے - اشتراکی خیال کی کتابوں رسالوں کو بحق سرکار ضبط کر لینے کا حکم ہوا اور سوشل ڈیموکریٹوں پر زیادتیاں کی گئیں - عام مزدور تحریک کے دباؤ سے یہ قانون پہلی اکتوبر ۱۸۹۰ء کو منسوخ کر دیا گیا - صفحہ ۷۷

۶۶ - روسو کی شہرہ آفاق تصنیف '' معاہدہ عمرانی ،، میں یہ نظریہ بیان ہوا ہے کہ ابتدائی سماج میں انسان قدرتی حالات میں مساوی حقوق کے ساتھ بسر کیا کرتے تھے - ذاتی ملکیت چل پڑنے اور

مادی نابرابری بڑھ جانے کی وجہ سے لوگ قدرتی کے بجائے شہری حالات میں بسر کرنے لگے اور ریاست قائم ہوئی جو ایک سماجی معاہدے پر مبنی تھی۔ لیکن جب آگے چل کر سیاسی نابرابری عام ہوتی گئی تو سماجی معاہدہ ٹوٹ گیا اور ایسا طبقہ ابھرا جسے پورے حقوق حاصل نہ تھے۔ یہ جو حالت اب ہو گئی ہے، اس سے تبھی نجات پائی جا سکتی ہے کہ بقول روسو کے، ایک معقول اسٹیٹ قائم ہو جس میں نئے سماجی معاہدے طے پائیں۔ صفحہ ۷۸

۶۷۔ اناباپٹسٹ (Anabaptists) — ان کا کہنا تھا کہ بپتسمہ شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد پھر سے ہونا چاہئے۔ صفحہ ۷۹

۶۸۔ یہاں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو سترھویں صدی میں انگریزی بورژوا انقلاب میں شہری اور دیہاتی مفلسوں کے حق کی نمائندگی کرتے تھے۔ وہ ''اصلی ہموار کرنےوالے،، (true levellers) یا ''کھودنےوالے،، (diggers) کہلاتے تھے۔ یہ لوگ زمین کی ذاتی ملکیت کے خلاف تھے اور قدیم زمانے کی قسم کے یکساں کمیونزم کے حامی تھے۔ ان کی جدوجہد کا مقصد یہ تھا کہ پنچائتی کاشتکاری کے ذریعے سب کی مشترکہ زمین کا نظام قائم ہو جائے۔ صفحہ ۷۹

۶۹۔ اینگلس کا اشارہ ہے یوٹوپیائی کمیونزم کے ممتاز نمائندوں کی تحریروں کی طرف: تھامس مور کی کتاب «Utopia» اور تھامس کمپانیلا کی کتاب «City of the Sun»۔ صفحہ ۷۹

۷۰۔ مجلس نظما (Directorate) — انقلاب فرانس کے زمانے ۹۹-۱۷۹۵ء میں اعلا انتظامیہ ادارہ جس میں پانچ ڈائرکٹر ہوتے تھے اور ہر سال کسی ایک کی جگہ دوسرے کو چنا جاتا تھا۔ اس ادارے نے بڑی بورژوازی کے مفاد کی تائید کی اور جمہوری طاقتوں پر مسلط کر دی۔ صفحہ ۸۱

۷۱ - اشارہ ہے فرانس کے بورژوا انقلاب (۱۸ ویں صدی کے آخری سال) کی طرف جس کا نعرہ تھا ''آزادی، مساوات، اخوت''۔ صفحہ ۸۱

۷۲ - نیولانارک (New Lanark) — اسکاٹ‌لینڈ کے شہر لانارک کے نزدیک روئی کاتنے کا کارخانہ جو ۱۷۸۴ء میں مزدوروں کی بستی کے ساتھ ساتھ بنایا گیا۔ صفحہ ۸۲

۷۳ - تیسرا طبقہ — جاگیرداری فرانس کے زمانے میں ان کم حیثیت لوگوں کو کہتے تھے جو ٹیکس ادا کرتے ہوں: کسان، بیوپاری، دستکار، بعد میں بورژوازی کا بھی اسی میں شمار ہوا۔ انقلاب فرانس کے شروع ہوتے وقت اس اصطلاح کی بڑی اہمیت ہوگئی کیونکہ بورژوازی نے عام لوگوں کو اس پر آمادہ کرکے اپنی طرف ملالیا کہ اب تک دو طبقے ہوئے ہیں، جاگیرداروں کا اور کلیسائی پیشواؤں کا۔ لیکن اب ان کے برخلاف تیسرا طبقہ بنائیں گے۔ صفحہ ۸۳

۷۴ - سو دن۔ جب نپولین بوناپارٹ جزیرہ ایلبا میں جلاوطنی سے فرار کرکے اچانک پیرس آپہنچا تو ۲۰ مارچ ۱۸۱۵ء سے ۲۲ جون ۱۸۱۵ء کا زمانہ اس کی عارضی حکومت کے سو دن کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔ پھر اسے آخری دست برداری پر مجبور ہونا پڑا۔ صفحہ ۸۶

۷۵ - واٹرلو (بلجیم) کی جنگ انگریزی محاورے میں آخری شکست کے ہم معنی ہے۔ اینگلو ڈچ فوجوں نے ویلنگٹن کی کمان میں اور پروشیائی فوج نے بلوخر کی کمان میں ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کو نپولین کو آخری شکست دی اور ۳ دن بعد اس کی دست برداری لکھوالی۔ صفحہ ۸۶

۷۶ - اکتوبر ۱۸۳۳ء میں لندن میں رابرٹ اووین کے زیر صدارت کوآپریٹیو سوسائٹیوں اور ٹریڈیونینوں کی ایک بڑی کانگرس منعقد ہوئی جس میں «The great national consolidated Trade

«Union of G. B. & Ireland» قائم ہوگئی۔ سرمایہ‌دارانہ ریاست اور بورژوا سماج کی شدید مخالفت نے سال بھر بعد اگست ۱۸۳۴ء میں یونین تڑوا دی۔ صفحہ۹۳

۷۷۔ اینگلس کی مراد ہے یہاں ان بازاروں سے (انھیں بازار ہی کہتے تھے) جو رابرٹ اووین کی حامی مزدور کوآپریےٹیو سوسائٹیوں نے انگلینڈ کے مختلف شہروں میں قائم کئے تھے اور جہاں محنت کی پیداوار کا منصفانہ تبادلہ کیا جاتا تھا۔ محنت کے ان بازاروں میں سکہ نہیں، محنت کے فی یونٹ حساب سے نوٹ چلا کرتے تھے اور نوٹوں کی ویلیو محنت کے گھنٹوں کے حساب سے مقرر تھی۔ تھوڑے دنوں چل کر یہ بازار ٹھپ ہوگئے۔ صفحہ ۹۳

۷۸۔ پرودھوں فلسفی کی کوشش سے ۴۹ — ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے زمانے میں ایک عوامی بینک فرانس میں قائم ہوا تھا تاکہ سکہ استعمال کئے بغیر تھوڑا بہت مال تیار کرنےوالے اس بینک کے ذریعے اپنے مالوں کا تبادلہ کر سکیں اور مزدوروں کو وہاں سے مفت قرضہ ملا کرے۔ ابھی بینک کھلے ہوئے (۳۱ جنوری ۱۸۴۹ء) دو مہینے گزرے ہوں‌گے کہ فیل ہوگیا اور اپریل کے شروع میں بند کردیا گیا۔ صفحہ ۹۳

۷۹۔ سائنس کے ارتقا کا عہد سکندری تیسری صدی قبل مسیح سے ساتویں صدی عیسوی تک کا زمانہ تھا۔ اس کا نام مصر کے شہر سکندریہ سے لیا گیا ہے جو اس زمانے میں بین‌اقوامی معاشی تعلقات اور بیوپار کے اہم‌ترین مرکزوں میں سے تھا۔ عہد سکندری میں ریاضی (اقلیدس اور آرشیمیدس)، جغرافیہ، علم ہیئت، علم تشریح بدن اور علم الاعضا وغیرہ میں بہت ترقی ہوئی۔ صفحہ ۹۶

۸۰۔ ان میں سب سے زیادہ اہم دریافتیں یہ ہیں: ۱۴۹۲ء میں کولمبس کا امریکہ دریافت کرنا، اور ۱۴۹۸ء میں پرتگال کے باشندے واسکو دی گاما کا ہندستان تک پہنچنے کا سمندری راستہ دریافت کرنا۔ صفحہ ۱۱۵

۸۱ - یہاں ان جنگوں کی طرف اشارہ ہے جو ۱۷ ویں صدی کے دوسرے نصف اور ۱۸ ویں صدی کے شروع میں چلتی رہیں - فرانس کی رہنمائی میں یورپی طاقتوں کی مخلوط طاقت (Coalition) ایک فریق تھی اور پہلے ہالینڈ ، پھر انگلینڈ کی رہنمائی میں ان طاقتوں کا کولیشن دوسرا فریق - ان مسلسل جنگوں کی تہہ میں خاص کر فرانس کے اشرافیہ اور بورژوازی کی یہ نیت کارفرما تھی کہ کسی صورت میں اپنی ملکی سرحدوں سے باہر اقتدار قائم کریں اور یورپ میں سیاسی اور اقتصادی غلبہ حاصل ہو جائے - اول تو ان جنگوں نے اور پھر اسپین میں تاج‌وتخت کی وراثت والی جنگ نے (جو ۱۷۰۱ ء سے ۱۷۱۴ ء تک چلی اور ان تجارتی جنگوں کے سلسلے کی آخری کڑی تھی) فرانس کی کمر توڑدی ، اقتصادی اور فوجی میدان میں وہ اپنی ساکھ کھو بیٹھا اور وسیع مقبوضہ علاقوں سے ہاتھ دھونے پڑے - صفحہ ۱۱۵

۸۲ - بحری تجارت (Seehandlung) کے نام سے پروشیا میں ۱۷۷۲ ء میں ایک شاہی بحری‌تجارت کی کمپنی قائم کی گئی تھی - اسے خاص قسم کے حقوق حکومت کی طرف سے حاصل تھے اور اس نے پروشیائی حکومت کو جی کھول کر قرضے دئے - صفحہ ۱۲۳

۸۳ - «Vorwärts» (''فورواڑٹس'') — پیرس سے ہفتے میں دوبار نکلنےوالا جرمن اخبار ، جس میں مارکس اور اینگلس بھی شریک تھے - جنوری سے دسمبر ۱۸۴۴ ء تک شائع ہوا - صفحہ ۱۳۷

۸۴ - انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی‌ایشن ، جسے پہلی انٹرنیشنل بھی کہتے ہیں ، عام پرولتاریوں کی پہلی بین‌اقوامی جماعت تھی جو ۱۸۶۴ ء سے ۱۸۷۶ ء تک مارکس اور اینگلس کی رہنمائی میں چلتی رہی - خاص خاص سرمایہ‌دار ملکوں کے ترقی‌یافتہ مزدوروں کے شعور میں اس انٹرنیشنل نے سائنسی سوشلزم کے خیالات جگائے - لینن کے بقول '' مزدوروں کی بین‌اقوامی تنظیم کی بنیاد ڈالی تاکہ سرمائے پر انقلابی یلغار کی تیاری کی جاسکے '' - صفحہ ۱۳۷

۸۵ - ''کمیونسٹ لیگ کی تاریخ پر،، — اینگلس نے یہ مضمون مارکس کے ایک پمفلٹ ''کولون میں کمیونسٹوں پر مقدمہ بےنقاب،، کے جرمن ایڈیشن ۱۸۸۵ء پر بطور دیباچہ لکھا تھا۔ ۱۸۴۹ء — ۱۸۵۲ء کے برسوں میں جب رجعت‌پرستی نے زور باندھا تھا، انقلاب کو کن تجربوں سے گزرنا پڑا، ان سے گہری واقفیت جرمنی کے مزدور طبقے کے لئے اس دور میں خاص طور سے ضروری تھی جب ''سوشلسٹ‌دشمن ہنگامی قانون،، (۱۸۷۸ء) کے بل پر اسے دبایا جا رہا تھا۔ اسی خیال سے اینگلس نے مارکس کا پمفلٹ دوبارہ شائع کرنا لازم سمجھا۔

جیسا کہ اس مضمون کے مطالعے سے ظاہر ہوگا ''کمیونسٹ لیگ کی تاریخ پر،، لکھ کر اینگلس نے بین‌اقوامی مزدور تحریک کے اٹھان میں پرولتاریوں کی اس پہلی انٹرنیشنل جماعت کا رول بھی وضاحت سے بیان کر دیا ہے اور اس کا مقام بھی۔ کمیونسٹ لیگ وہ پہلی انٹرنیشنل جماعت تھی جس نے سائنسی کمیونزم کا علم بلند کیا۔ پرولتاری پارٹی کو وجود میں لانے کے لئے کمیونسٹ لیگ ایک اہم مرحلے کا کام کر گئی، اور اس کی تاریخ کو بطور مثال پیش کرتے ہوئے اینگلس نے یہ جتایا ہے کہ طرح طرح کے تنگ دائرےوالے جن نظریوں نے رواج پا رکھا تھا، ان پر مارکسی نظرئے کو صرف اس صورت میں فتح حاصل ہوئی کہ بالکل شروع سے ہی یہ نظریہ پرولتاریہ کی عملی انقلابی جدوجہد کے تقاضوں کی بھرپور ترجمانی کرتا تھا اور اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صفحہ ۱۳۸

۸۶ - بابوازم (Babouvism) — یوٹوپیائی قسم کی مساویانہ کمیونزم کا ایک رجحان جس کی بنیاد ۱۸ ویں صدی کے آخر میں فرانسیسی انقلابی گراخ بابیوف نے ڈالی تھی۔ صفحہ ۱۳۹

۸۷ - Société des Saisons (موسمی سوسائٹی) — ریپبلکن سوشلسٹ خیالات کی خفیہ جماعت جو بلانکی اور باربے کی رہنمائی میں، پیرس میں ۱۸۳۷ء سے ۱۸۳۹ء تک سرگرم رہی۔

پیرس میں ۱۲ مئی ۱۸۳۹ ء کی شورش ، جس میں انقلابی مزدوروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ، اسی ”موسمی سوسائٹی“ کی تیاریوں کا نتیجہ تھی ۔ چوں کہ اس کی پشت پر عام آبادی نہیں تھی ، اس لئے حکومت کی فوج اور نیشنل گارڈ مل کر اسے منتشر کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔ صفحہ ۱۴۰

۸۸ - یہاں اشارہ ہے اس واقعے کی طرف جو جرمنی میں رجعت‌پرستی کے مقابلے پر جرمن ڈیموکریٹوں کو پیش آیا تھا اور فرینکفرٹ کی ناکام بغاوت کے نام سے مشہور ہے ۔ ہوا یہ کہ ۳ اپریل ۱۸۳۳ ء کو ریڈیکل لوگوں کے گروپ نے جرمن یونین کے مرکزی ادارے ، فرینکفرٹ آن مین کے یونین سیئم پر چڑھائی کرکے ملک میں سرکاری طاقت کو تہ و بالا کرنے کی کوشش کی اور چاہا کہ کل جرمن ریپبلک کا اعلان کر دیا جائے ۔ اس دھاوے کی تیاری اتنی کچی تھی کہ فوج نے اسے مسل ڈالا ۔ صفحہ ۱۴۰

۸۹ - یہ واقعہ فروری ۱۸۳۴ ء کا ہے جب اٹلی کے بورژوا جمہوریت‌پسند ، مشہور تاریخی شخصیت مازینی نے ۱۸۳۱ ء میں خود قائم کی ہوئی ”نوجوان اطالیہ“ نام کی پارٹی کے آدمی لے کر ، بھاگے ہوئے غیرملکی انقلابیوں کے دستے ساتھ ملا کر سوئٹزرلینڈ سے سیوائے پر ہلہ بول دیا ۔ مقصد یہ تھا کہ وہاں ایسی عام بغاوت اٹھ کھڑی ہو جو اٹلی کو ایک کر دے اور آزاد بورژوا ریپبلک کا اعلان ہوجائے ۔ پیے‌مونت کی فوج نے سیوائے پر بڑھنے‌والے دستے کو تتربتر کر دیا ۔ صفحہ ۱۴۰

۹۰ - ڈیماگوگ (Demagogue) — جرمنی میں ان لوگوں کا نام پڑ گیا تھا جو ۱۸۲۰ ء کے دہلے میں اٹھے تھے ۔ جرمن تعلیم‌یافتہ حلقوں کے یہ لوگ ملک میں پھیلی ہوئی مختلف ریاستوں کے رجعت‌پرست نظام کے برخلاف تحریک چلا کر یہ چاہتے تھے کہ جرمنی کو ملا کر ایک کر دیا جائے ۔ تحریک پر سخت

مظالم کئے گئے۔ جرمن حکومت نے ان ڈیماگوگوں کے ساتھ بڑی بےرحمی کا سلوک کیا۔ صفحہ ۱۴۰

۹۱ - یہاں اینگلس نے اس جماعت کی طرف اشارہ کیا ہے جو لندن میں قائم ہوئی تھی — ''جرمن مزدوروں کی تعلیمی انجمن''۔ اسے انصاف لیگ کے رہنماؤں شاپیر ، مول وغیرہ نے فروری ۱۸۴۰ء میں قائم کیا تھا۔ ۵۰ — ۱۸۴۹ء میں مارکس اور اینگلس نے اس سوسائٹی کی سرگرمیوں میں عملی حصہ لیا۔ ۱۷ ستمبر ۱۸۵۰ء کو ان دونوں اور ان کے کئی حامیوں نے سوسائٹی سے قطع تعلق کر لیا کیوں کہ اکثریت ویلیخ اور شاپیر کے اثر میں چلی گئی تھی اور تنگ دائرے کی مہم پسندی (جان جوکھم میں ڈالنے کا فتنہ) برپا کرنے پر تل گئی تھی۔ جب ۱۸۶۴ء میں انٹرنیشنل کی بنیاد ڈالی گئی تو یہ سوسائٹی انٹرنیشنل ورکنگ‌مینز ایسوسی‌ایشن کی لندن میں جرمن شاخ بن گئی۔ لندن میں تعلیمی انجمن کا وجود ۱۹۱۸ء تک قائم تھا جب انگریزی حکومت نے اسے بند کر دیا۔ صفحہ ۱۴۲

۹۲ - فرانس میں برپا ہونےوالا فروری ۱۸۴۸ء کا انقلاب مراد ہے۔ صفحہ ۱۴۸

۹۳ - «The Northern Star» (''شمالی ستارہ'') — انگریزی روزنامہ ، چارٹسٹوں کا ترجمان ، جس کی ابتدا ۱۸۳۷ء میں ہوئی تھی ، اور ۱۸۵۲ء تک چلا۔ شروع میں لیڈز سے نکلا اور نومبر ۱۸۴۴ء سے لندن میں نکلتا رہا۔ اس کا بانی اور ایڈیٹر ایف ، او ، کونار تھا، ایڈیٹوریل بورڈ میں جان ہارنی بھی رہا۔ اسی اخبار میں ۱۸۴۳ء سے ۱۸۵۰ء تک اینگلس کے مضامین بھی نکلے ہیں۔ صفحہ ۱۴۸

۹۴ - ڈیموکریٹک ایسوسی‌ایشن — بروسلز کے مقام پر ۱۸۴۷ء کے موسم خزاں میں اس کی بنیاد پڑی تھی۔ پرولتاری انقلابی اور خاص کر وہ جرمن انقلابی جو وطن چھوڑ کر یہاں جمع ہو گئے

تھے ، بورژوا اور پیٹی بورژوا جمہوریت‌پسند ، سب اس جماعت کے جھنڈے تلے سمٹ آئے تھے ۔ مارکس اور اینگلس نے اس جماعت کے بنانے میں سرگرم حصہ لیا ۔ ۱۵ نومبر ۱۸۴۷ ء کو مارکس ایسوسی‌ایشن کا نائب صدر چنا گیا ۔ بلجیم کا ڈیموکریٹ ژوتران اس کا صدر بنا ۔ مارکس کی بدولت بروسلز کی ڈیموکریٹک ایسوسی‌ایشن ایک ایسا بڑا مرکز بن گئی جس کے سائے میں انٹرنیشنل جمہوریت‌پسند تحریک نے فروغ پایا ۔ جب مارچ ۱۸۴۸ ء کے شروع میں مارکس کو بروسلز سے جبراً نکال دیا گیا اور حکومت نے ایسوسی‌ایشن کے خاص انقلابیوں کا ناطقہ بند کر دیا تو اس کی سرگرمیوں کا دائرہ بھی سکڑتا چلا گیا اور نوعیت کے لحاظ سے مقامی بن کر وہ ۱۸۴۹ ء میں عملاً ٹھنڈی پڑ گئی ۔ صفحہ ۱۴۸

۹۵ ۔ فرانسیسی اخبار «La Réforme» (الاصلاح) کے حامی ، جن میں چھوٹی بورژوازی کے ڈیموکریٹک ریپبلکن خیالات‌والے اور اسی طبقے کے اشتراکی شامل تھے ۔ اخبار اور اس کے حامی چاہتے تھے کہ ریپبلک قائم ہو ، جمہوری اور سماجی اصلاحیں کی جائیں ۔ اخبار پیرس میں ۱۸۴۳ ء سے ۱۸۵۰ ء تک نکلتا رہا ۔ صفحہ ۱۴۸

۹۶ ۔ «Der Volks-Tribun» (”عوامی ٹریبیون“) — جرمن زبان کا روزنامہ جسے ”سچے سوشلسٹ“ نام کے جرمن لوگ نیویارک سے شائع کیا کرتے تھے ۔ ۵ جنوری سے ۳۱ دسمبر ۱۸۴۶ ء تک نکلا ۔ صفحہ ۱۴۹

۹۷ ۔ ”جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی کے مطالبے“ — مارکس اور اینگلس نے ۲۱ سے ۲۹ مارچ ۱۸۴۸ ء کے درمیان لکھ کر تیار کئے تھے ۔ جرمن انقلاب اٹھانے کی تیاری میں یہ تحریر کمیونسٹ لیگ کا سیاسی پلیٹ‌فارم بن گئی ۔ لیگ کے جو ممبر اپنے وطن واپس جا رہے تھے ، ان کے ہاتھ میں ، مطالبوں کا شائع‌شدہ

پمفلٹ ایک سیاسی ہدایت‌نامہ کی حیثیت سے دیا گیا تھا۔ انقلابی ہنگاموں کے زمانے میں مارکس، اینگلس اور ان کے حامیوں نے پارٹی پروگرام کی اس دستاویز کو زیادہ سے زیادہ عام لوگوں تک پہنچانے کی کوشش جاری رکھی۔ صفحہ ۱۵۴

۹۸۔ یہاں حوالہ ہے جرمن مزدوروں کے کلب کا جو کمیونسٹ لیگ کی تحریک پر ۸؍۹ مارچ ۱۸۴۸ء کو پیرس میں قائم کیا گیا۔ مارکس نے اس کلب میں رہنمایانہ رول انجام دیا۔ اس کے قیام کا منشا یہ تھا کہ جرمن مزدور جو پیرس میں آباد ہیں، انھیں یکجا کیا جائے اور ان کے ذہن صاف کئے جائیں کہ بورژوا ڈیموکریٹک انقلاب میں پرولتاریہ کو کیا رخ اختیار کرنا چاہئے۔ صفحہ ۱۵۶

۹۹۔ مصنف کا اشارہ ہے کل جرمن قومی اسمبلی کے انتہائی بائیں بازووالوں کی طرف۔ انقلاب ۴۹—۱۸۴۸ء کے زمانے میں اسمبلی کا اجلاس فرینکفرٹ آن میئن پر ہو رہا تھا۔ اگرچہ وہ زیادہ تر چھوٹی بورژوازی کے مفاد میں تھی تاہم اسے جرمن مزدوروں کے بعض حصوں کی پشت‌پناہی بھی حاصل تھی۔ اسمبلی کے سامنے اصل کام یہ تھا کہ جرمنی جس سیاسی افتراق میں مبتلا ہے، اس کا خاتمہ کیا جائے اور پورے ملک کا ایک آئین بنا کر دے دیا جائے۔ لیکن انجام یہ نکلا کہ لبرل اکثریت کی بزدلی اور تذبذب کے باعث اسمبلی‌ملک کا اعلا اختیار اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے ڈری اور جرمن انقلاب کے کڑے سوالوں پر فیصلہ کن پوزیشن نہ لے سکی۔ ۳۰ مئی ۱۸۴۹ء کو وہ فرینکفرٹ سے اشٹوٹ‌گارٹ کے مقام پر منتقل ہو گئی اور ۱۸ جون کو فوج نے اسے منتشر کر دیا۔ صفحہ ۱۵۷

۱۰۰۔ مارکس کی تصنیف ''کولون میں کمیونسٹوں پر مقدمہ بے نقاب،، جب ۱۸۸۵ء میں شائع ہونے لگا تو اینگلس نے اس کے ساتھ کئی ضمیمے بڑھا دئے۔ انھی میں کمیونسٹ لیگ کے نام

مرکزی کمیٹی کے پیغام بھی شامل تھے، جو مارچ سے جون ۱۸۵۰ء تک جاری کئے گئے تھے۔ اینگلس نے خاص اسی ایڈیشن کے تعارف کے طور پر اپنا یہ مضمون ''کمیونسٹ لیگ کی تاریخ پر'' لکھا تھا۔ صفحہ ۱۵۹

۱۰۱ - Progressists — پروشیا کی بورژوا پارٹی ''پروگریسسٹ''، جون ۱۸۶۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس پارٹی کا اصل مطالبہ یہ تھا کہ پروشیا کی بالادستی کے ساتھ پورے جرمنی کو ملا کر ایک کیا جائے، پورے ملک کی ایک پارلیمنٹ طلب کی جائے، ایک مضبوط لبرل (آزاد خیال) وزارت بنے، جو پبلک کے نمائندہ ایوان کے سامنے جوابدہ ہو۔ ۱۸۶۶ء میں ''پروگریسسٹ'' پارٹی سے داہنے بازو کے لوگ کٹ کر نکل گئے، انھوں نے خود کو بسمارک کے حوالے کر دیا اور نیشنل لبرل پارٹی بنالی۔ جب سارا جرمنی ۱۸۷۱ء میں ملا کر ایک کیا جا چکا، تب بھی پروگریسسٹوں نے اپوزیشن کی حیثیت سے اپنا وجود قائم رکھا، مگر یہ محض زبانی جمع خرچ تھا۔ مزدور طبقے اور سوشلسٹ تحریک کے خوف سے ان لوگوں نے پروشیائی یونکروں کے اس غلبے سے میل کر لیا جس میں مطلق‌العنانی کا اقتدار بھی آدھوں آدھ شامل تھا۔ پروگریسسٹ پارٹی کا تکیہ تھا کاروباری بورژوازی پر، چھوٹے کارخانہ‌داروں پر، دستکاروں، کاریگروں پر — اور پارٹی کی سیاست کا ڈانواں‌ڈول رہنا بھی انھی عناصر کے کچےپن کی ترجمانی تھی۔ ۱۸۸۴ء میں یہ پروگریسسٹ جرمنی کی آزادخیال پارٹی میں بائیں بازو کے ان لوگوں سے مل کر ایک ہو گئے جو نیشنل لبرلوں سے کٹ گئے تھے۔ صفحہ ۱۶۳

۱۰۲ - علاحدہ لیگ (Sonderbund) مارکس اور اینگلس نے ویلیخ شاپیر کے علاحدگی پسند، ہنگامہ باز گروہ کو طنزیہ یہی نام دیا تھا جو ۱۸۴۰ء کے زمانے میں سوئٹزرلینڈ والے رجعت‌پرست کیتھولک

متحدہ مورچے کے نام سے مشابہت رکھتا ہے۔ ۱۵ ستمبر ۱۸۵۰ء کو جب کمیونسٹ لیگ میں پھوٹ پڑ گئی تو ویلیخ شاپیر کا یہ گروہ الگ تنظیم بنا بیٹھا اور اپنی مرکزی کمیٹی بھی مقرر کردی۔ اسی گروہ کی سرگرمیوں کے باعث پروشیا کی پولیس کو موقع مل گیا کہ کمیونسٹ لیگ کی غیرقانونی انجمنوں پر ہاتھ ڈالے اور لیگ کے نمایاں لیڈروں پر کولون شہر میں ۱۸۵۲ء میں مقدمہ چلانے کے تانے بانے جوڑ لے۔ صفحہ ۱۶۳

۱۰۳۔ ”خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز“، یہ کتاب مارکس‌ازم کی بنیادی تصنیفوں میں شمار ہوتی ہے۔ اینگلس نے اس تحریر میں علمی تجزیہ کرکے دکھایا ہے کہ انسان ترقی اور نشوونما کے کن کن مرحلوں سے گزر کر یہاں تک پہنچا، بالکل شروع کی سماجی حالت کیا تھی، اس کا ڈھانچہ پھیلتے پھیلتے کیونکر وہ ایسے طبقاتی سماج میں ڈھل گیا جس کی جڑ بنیاد ذاتی ملکیت پر ہے، طبقات میں بٹے ہوئے اس سماج کی کیا خاصیتیں اور خصوصیتیں ہیں، مختلف سماجی معاشی بناوٹوں میں خاندانی رشتوں نے کیا کیا رنگ اختیار کئے، ریاست کی شروعات کیسے ہوئی اور اس کی اصلیت کیا ہے، ان تمام مرحلوں کو وضاحت کے ساتھ پیش کر کے اینگلس نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ بےطبقہ کمیونسٹ سماج کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوتے ہی ریاست کا دم توڑ دینا تاریخ کی طرف سے مقدر ہو چکا ہے۔

یہ کتاب اینگلس نے ختم مارچ ۱۸۸۴ء سے ختم مئی تک کے دو مہینوں میں لکھ کر تمام کر دی تھی۔ مارکس کے انتقال کے بعد ان کے مسودوں کی چھان‌بین کرتے وقت اینگلس کو ترقی‌پسند امریکی عالم ل۔ ہنری مارگن کی تصنیف ”قدیم سماج“ کا تفصیلی خلاصہ ملا جسے مارکس نے ۸۱ — ۱۸۸۰ء میں ترتیب دیا تھا اور اس پر جابجا حاشیے اور تنقیدی نوٹ بڑھائے تھے۔ اس کے علاوہ مارکس نے دوسرے ذرائع اور تحقیقات سے بھی کام لیا تھا۔ اینگلس نے جب یہ خلاصہ پڑھا اور

دیکھ لیا کہ انسانی تاریخ کا جو مادی تصور ان دونوں نے قائم کیا تھا اور بالکل ابتدائی سماج کے متعلق جو نظریے بنائے تھے، ان کو مارگن کی تحقیقات سے تائید ملتی ہے تو اس نے ضروری سمجھا کہ خاص اس موضوع پر ایک تصنیف ہونی چاہئے، جس میں مارکس کے حاشیوں اور تنقیدوں سے پوری طرح مدد لی جائے اور خود مارگن کی کتاب میں جو علمی تحقیقی مسالہ موجود ہے، جو نتیجے نکالے گئے ہیں، ان میں سے بھی بعض کو کام میں لایا جائے۔ اینگلس کی نظر میں یہ کام ''ایک حدتک مارکس کی وصیت کی تعمیل،، کرنا تھا۔ اینگلس نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو یونان اور روم کی تاریخ پر، قدیم آئرلینڈ، قدیم جرمنوں وغیرہ کی تاریخ پر جتنی تحقیقات وہ خود کر چکا تھا، اس کا بےشمار مسالہ اور طرح طرح کے علمی نکات بھی اسی میں ملالئے (ملاحظہ ہو اینگلس کے مضامین ''مارکہ،،، ''قدیم جرمنوں کی تاریخ،، اور ''فرینک دور،،)۔

بالکل ابتدائی سماج کی تاریخ کے متعلق اینگلس کے پاس اتنا کچھ علمی سروسامان جمع ہو چکا تھا کہ ۱۸۹۰ء میں اس نے اپنی کتاب کے چوتھے ایڈیشن کو نئے اضافوں کے ساتھ شائع کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ اس عرصے میں نئی تحریریں بھی اس کی نظر سے گزریں، خاص کر روسی عالم کوالیفسکی کی علمی تحقیقات۔ تیاری کے دوران اینگلس نے پہلے ایڈیشن کی عبارت میں جا بجا ترمیمیں اور اضافے کر دئے، خاص کر خاندان‌والے باب میں بہت کچھ تازہ معلومات بھی بڑھا دیں۔

یہ چوتھا ایڈیشن اشٹوٹگارٹ سے ۱۸۹۱ء کے آخرمیں شائع ہوا اور اس کے بعد ترمیم و اضافے کی نوبت نہیں آئی۔
صفحہ ۱۶۶

۱۰۴ - «Contemporanul» (''معاصر،،) — اشتراکی خیالات کا ایک رسالہ جو رومانیائی زبان میں یاسی (Iasi) کے مقام سے ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۰ء تک نکلتا رہا۔ صفحہ ۱۷۱

۱۰۵ - ماگر نام کا قبیلہ تھا جو آجکل نیپال کے مغربی حصے میں آباد ایک جاتی ہے - صفحہ ۱۷۸

۱۰۶ - اینگلس نے ۱۸۸۸ء کے اگست ستمبر میں ریاست‌ہائے متحدہ امریکہ اور کناڈا کا سفر کیا تھا - صفحہ ۱۸۶

۱۰۷ - پوئبلو — شمالی امریکہ کے ریڈ انڈین قبیلوں کا مشترک نام جو نیومیکسیکو میں آباد ہیں (آجکل ریاست‌ہائے متحدہ امریکہ کے جنوب مغربی اور میکسیکو کے شمالی علاقے میں ان کی بستیاں ہیں) - تاریخی اور تہذیبی لحاظ سے ان میں مشترک خصوصیات موجود ہیں - ان کا یہ نام اسپینی زبان کے لفظ pueble (پوئبل) سے مشتق ہے، یعنی جاتی، بستی یا برادری - اسپینی فاتح جب ان کے علاقوں میں پہنچے تو دیکھا کہ ان قبیلوں کی آبادیوں میں کچھ اپنی خصوصیات ہیں: ان کے جماعت‌خانے پانچ پانچ، چھ چھ منزلوں کے مضبوط گڑھ ہیں، جن میں ہزار آدمی تک سما سکتے ہیں - یہیں سے ایک وضع کی ان تمام بستیوں کو بھی اسی نام سے پکارنے لگے - صفحہ ۱۹۳

۱۰۸ - نارمن — اسکنڈی‌نیویا کے قبیلوں کے نام جو شمالی یورپ میں آباد تھے - قرون وسطی کے شروع میں ناروے، سویڈن اور ڈچ والوں کے لئے یہی ایک نام لیا جاتا تھا -
وائیکنگ — اسکنڈی‌نیویا کے ان بحری قزاقوں اور ملاحوں کا مشہور لقب جو آٹھویں سے گیارھویں صدی کے وسط تک سمندر میں اور یورپ کے ساحلوں پر باقاعدہ حملے کر کے لوٹ مار کیا کرتے تھے - بحراوقیانوس پار کر کے انھوں نے امریکہ تک غارت گری جاری رکھی - صفحہ ۱۹۵

۱۰۹ - دراوڑ — جنوبی ہند کی قدیم نسلیں - آریوں کی آمد سے پہلے ہندستان کے اصل باشندے تھے -
گوڑا — مغربی بنگال کا ایک ہندستانی قبیلہ - صفحہ ۱۹۹

۱۱۰ - کیرے‌بین — یہ جنوبی امریکہ کے ریڈانڈین قبیلوں کا ایک جتھا جو شمالی اور وسطی برازیل کے علاقوں میں آباد تھے۔ وینزولا، گیانا اور کولمبیا سے ملے ہوئے علاقوں میں بھی ان کی آبادی تھی۔ صفحہ ۲۰۹

۱۱۱ - مارکس کا یہ خط ہم تک نہیں پہنچا۔ اینگلس نے ۱۱ اپریل ۱۸۸۴ء کو کاؤتسکی کے نام جو خط لکھا ہے وہاں اس کا ذکر ہے۔ صفحہ ۲۱۱

۱۱۲ - یہاں اشارہ ہے مشہور نغمہ‌نگار واگنر کے اوپیرا ''نی‌بیلونگ کا حلقہ،، کی طرف جو اس نے اسکنڈی‌نیویا کی داستان ''ایڈا،، اور جرمن داستان ''نی‌بیلونگ کا گیت،، کی بنیاد پر ترتیب دیا تھا۔ صفحہ ۲۱۱

۱۱۳ - ''ایڈا،، اور ''آگسدریکا،، — ان داستانوں، طلسمی افسانوں اور گیتوں کا مجموعہ جو اسکنڈی‌نیویاوالوں میں مقبول تھے۔ صفحہ ۲۱۱

۱۱۴ - اسکینڈی‌نیویا کی دیومالا میں دیوتاؤں کے دو گروہ بتائے جاتے ہیں: آسا اور وانا۔ ''اینگلینگ کی رزمیہ داستان،، («Saga of Inglings») ناروے کے شاہنامے کی کتاب اول (زمانہ قدیم سے ۱۲ ویں صدی تک)۔ آئس‌لینڈ کے شاعر اسنوری اسٹورلوسن کی تصنیف ہے۔ صفحہ ۲۱۱

۱۱۵ - یہاں ذکر ہے شادی بیاہ کے ان طبقوں یا گروہوں کا جن میں آسٹریلیا کے زیادہ‌تر قبیلے بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ کے مرد دوسری جاتی کے کسی خاص مقررہ گوت میں ہی شادی بیاہ کر سکتے تھے اور قبیلے میں اس قسم کے چار سے آٹھ تک گوت ہوا کرتے تھے۔ صفحہ ۲۱۷

۱۱۶ - Saturnalia — روم قدیم میں زحل (Saturn) دیوتا کا سالانہ میلہ جو کھیتوں کی کٹائی لوائی سے فرصت پانے کے بعد دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ میلے کے دنوں میں عورتوں مردوں کو سب طرح کی پوری آزادی ہوئی تھی۔ اسی لئے ''ساترنالی،،

لفظ کے معنی ہی ہوگئے رنگ رلیاں منانے کی پوری چھوٹ۔ صفحہ ۲۳۰

۱۱۷ - حوالے کے لئے ملاحظہ ہو مارگن کی کتاب «Ancient Society»۔ لندن ۱۸۷۷ء، صفحہ ۴۶۶ — ۴۶۵۔ اس کے علاوہ ''مارکس اور اینگلس کی دستاویزات''، جلد ۹۔ صفحہ ۲۳۰

۱۱۸ - مارگن کی اسی کتاب کا صفحہ ۴۷۰ اور دوسرے حوالے کا صفحہ ۳۱ - صفحہ ۲۳۱

۱۱۹ - یہاں روسی عالم کووالیفسکی کی تصنیف '' بالکل ابتدائی حقوق ''۔ حصہ اول۔ '' گن، قرابت‌داری ''۔ ماسکو، ۱۸۸۶ء کا حوالہ ہے جس نے روس میں خاندانی برادری کے سلسلے میں ارشانسکی (۱۸۷۵ء) اور ایفیمنکو (۱۸۷۸ء) کے جمع کئے ہوئے بیانات پر اپنے بیان کی بنیاد رکھی ہے۔ صفحہ ۲۳۳

۱۲۰ - یاروسلاف کے '' پراودا ''، کا مطلب ہے '' روسی پراودا ''، کی سب سے پرانی اشاعت کا پہلا حصہ۔ یہ روس قدیم کے قوانین کا مجموعہ ہے جس میں گیارھویں بارھویں صدی کے وہ روسی قانون جمع کئے گئے ہیں جو اس زمانے میں رواج عام میں تھے اور جن سے تب کی معاشی اور جماعتی زندگی کی ایک جھلک ملتی ہے۔

دال‌میشین قوانین — یہ قوانین کا مجموعہ جو ۱۵ ویں سے ۱۷ صدی تک پولیتز (دال‌میشیہ کے ایک علاقے) میں رائج تھا۔ یہ کتاب «Politz Statute» کے نام سے مشہور ہے۔ صفحہ ۲۳۳

۱۲۱ - Calpullis — جب اسپین‌والوں نے میکسیکو فتح کیا تو وہاں کے ریڈانڈینوں میں ایسی خاندانی برادریاں قائم تھیں۔ ایک مورث اعلا کی اولاد سے جو خاندانی برادری (calpulli) بنتی وہ زمین کے ایک حصے کی مشترکہ مالک ہوتی، مل کر محنت کرتی، نہ اس حق وراثت سے کسی کو بےدخل کیا جا سکتا تھا، نہ اس کی تقسیم کی جاتی تھی۔ صفحہ ۲۳۴

۱۲۲ - «Das Ausland» (''بدیس،،) — یہ ایک جرمن رسالہ تھا جس میں جغرافیہ، علم الاقوام، اور نیچرل سائنس کے مضامین نکلتے تھے۔ ۱۸۲۸ء سے ۱۸۹۳ء تک نکلتا رہا۔ ۱۸۷۳ء سے اشٹوٹگارٹ مقام اشاعت بن گیا۔ صفحہ ۲۴۴

۱۲۳ - ضابطہ دیوانی (Civil Code) دفعہ ۲۳۰ کی طرف اشارہ ہے۔ (دیکھئے نوٹ نمبر ۴۹۔) صفحہ ۲۴۷

۱۲۴ - اسپارٹیاٹیز (Spartiates) — قدیم اسپارٹا کے پورے شہری حقوق رکھنےوالے۔

ایلوٹ (Ilots) — قدیم اسپارٹا کے وہ شہری، جنھیں حقوق حاصل نہ تھے۔ یہ زمین سے وابستہ تھے اور زمین کے مالک اسپارٹیاٹیزوں کو آمدنی کا ایک مقررہ حصہ دینے کے پابند۔ صفحہ ۲۵۰

۱۲۵ - اریسطوفینس ''عورتیں فیسموفوری کے تیوہار میں،،۔ صفحہ ۲۵۰

۱۲۶ - ہائروڈیول — یونان قدیم اور اس کے ماتحت علاقوں میں مندروں کی خدمت پر مامور رہنےوالے غلام اور کنیزیں۔ اکثر مقامات پر، خاص کر مشرق قریب کے شہروں میں اور کورنتھ میں یہ کنیزیں دیوداسی بن کر عام استعمال کے لئے وقف ہو جاتی تھیں۔ صفحہ ۲۵۳

۱۲۷ - ٹائفالی — جرمن قبیلہ جو گوتھا کی نسل سے تھا، تیسری صدی کے قریب بحراسود کے شمالی علاقوں میں بس گیا تھا، بعد میں چوتھی صدی کے نصف آخر میں ہن حملہآوروں نے اسے وہاں سے نکال دیا۔

ہیرولی — جرمن قبیلہ جو عیسوی صدی شروع ہوتے وقت اسکنڈی‌نیویا کے جزیرہ نما میں آباد تھا۔ تیسری صدی اس کا ایک حصہ بحراسود کے شمالی علاقوں میں بس گیا جہاں سے ہن حملہآوروں نے اسے بے دخل کیا۔ صفحہ ۲۵۸

۱۲۸ - ''گدرون'' — ۱۳ ویں صدی کی جرمن رزمیہ نظم - صفحہ ۲۶۹

۱۲۹ - یہاں ۲۱ — ۱۵۱۹ ء کی ان جنگوں کی طرف اشارہ ہے جب اسپینی حملہ‌آوروں نے میکسیکو فتح کیا - صفحہ ۲۸۷

۱۳۰ - L. H. Morgan. «Ancient Society», London, 1877, p. 115. صفحہ ۲۸۹

۱۳۱ - ''غیرجانب‌دار قوم'' (Neutral nations) — ۱۷ ویں صدی میں ایری جھیل کے شمالی ساحل پر آباد، کئی ریڈ انڈین قبیلوں نے، جو ایراکواس لوگوں کے قرابت‌دار تھے، مل کر ایک جنگی اتحاد قائم کیا تھا - فرانسیسی آبادکاروں نے اس اتحاد کو یہ نام اس لئے دیا کہ جب تک ہرون اور ایراکواس قبیلوں میں جنگ چلتی رہی، یہ لوگ بالکل غیر جانب‌دار رہے اور ''نیوٹرل'' کہلائے - صفحہ ۲۹۶

۱۳۲ - یہاں مصنف نے زولو قبیلے کی جنگ‌آزادی کی طرف اشارہ کیا ہے جو ۱۸۷۹ ء سے ۱۸۸۷ ء تک انگریز نوآبادکاروں کے مقابلے پر چلتی رہی -

نوبیہ‌والوں، عربوں اور دوسرے سودانی قبیلوں نے اپنی آزادی کے لئے جو عام بغاوت برپا کی وہ محمداحمد (مہدی سودانی) کی سرکردگی میں ۱۸۸۱ ء سے ۱۸۸۴ ء تک چلتی رہی- اسی شورش کے زمانے میں سودان کی ایک باقاعدہ متحدہ ریاست ابھرآئی - کئی برس بعد ۱۸۹۹ ء میں انگریزوں کا بس چلا اور انھوں نے سودان فتح کر لیا - صفحہ ۲۹۷

۱۳۳ - جائداد غیرمنقولہ کے رہن اور قرقی کا رواج - صفحہ ۳۱۷

۱۳۴ - مطلب ہے meteki (غیرملکی) لوگوں سے جو اٹیکا میں مستقل طور سے رہ پڑے تھے - آزاد رہ کر بھی انھیں ایتھنز کے شہری حقوق حاصل نہیں تھے - یہ لوگ بیشتر تجارت اور حرفت میں لگے ہوئے تھے - انھیں ''سرپرستی'' کے نام پر ایک خاص ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا - پورے حقوق رکھنےوالے شہریوں کی طرف

سے اس سرپرستی کی بدولت وہ انتظامی محکمے تک رسائی پاسکتے تھے۔ صفحہ ۳۲۵

۱۳۵ - بارہ جدول والے قانون — پانچویں صدی قبل مسیح کے وسط میں یہ قانون بارہ جدولوں پر لکھے ہوئے تھے اور ان کے ذریعے روم قدیم کی آبادی کے مختلف طبقوں کے حقوق مقرر تھے۔ پلے‌بین (plebeian) آبادی نے پتریشین (patricians) کے خلاف جنگ کی تو اس کا نتیجہ ان قانونوں کی شکل میں نکلا۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ روم قدیم کے سماج میں صاحب جائداد، صاحب حیثیت حصہ آبادی، غلامی اور غلام‌داری ریاست کا اٹھان کیسے ہوا اور کن مرحلوں سے گزرا۔ صفحہ ۳۳۱

۱۳۶ - پیونک جنگ (پیونی‌جنگیں) روم اور کارتھیج کی قدیم غلام دار بڑی ریاستوں میں جنگیں ہوتی ہیں تاکہ بحرروم کے مغربی علاقے میں اپنا اقتدار قائم کیا جائے، نئے علاقے چھینے جائیں اور غلام‌داری اپنے ہاتھ میں لی جائے۔ دوسری پیونک جنگ ۲۱۸ سے ۲۰۱ ق م تک سترہ سال جاری رہی اور کارتھیج کی مکمل شکست پر تمام ہوئی۔ صفحہ ۳۳۳

۱۳۷ - انگریزوں نے ویلز (Wales) پر ۱۲۸۳ء میں فتح کر لیا تھا، تاہم اس کی خود مختاری (Autonomy) برقرار رہی۔ ۱۶ ویں صدی کے وسط میں اس علاقے کو پوری طرح انگلینڈ میں ملا لیا گیا۔ صفحہ ۳۴۸

۱۳۸ - ۷۰ — ۱۸۶۹ء میں اینگلس نے ایک بڑا تصنیفی کام اپنے ہاتھ میں لیا تھا آئرلینڈ کی تاریخ لکھنے کا، لیکن وہ مکمل نہ ہو سکا۔ کیلٹ نسل کی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت اینگلس نے قدیم ویلز کے قوانین کی بھی چھان بین کر ڈالی۔ صفحہ ۳۴۸

۱۳۹ - مصنف نے یہاں ”ویلز کے قدیم دستور و قوانین“ («Ancient Laws and Institutes of Wales») کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ جلد اول، صفحہ ۹۳، اشاعت ۱۸۴۱ء۔ صفحہ ۳۴۹

۱۴۰ - ستمبر ۱۸۹۱ء میں اینگلس نے اسکاٹ‌لینڈ اور آئرلینڈ کی سیاحت کی۔ صفحہ ۳۵۱

۱۴۱ - ۴۶ — ۱۷۴۵ء میں پہاڑی جرگوں نے اسکاٹ‌لینڈ میں شورش برپا کر دی۔ انگلینڈ اور اسکاٹ‌لینڈ کے جاگیردار اور بورژوازی اپنے فائدے کے لئے مقامی آبادی کو زمین سے بےدخل کرتے جا رہے تھے۔ یہ اس کے خلاف غصہ تھا جو پہاڑیوں کی بغاوت بن گیا اور نسلی برادری کے پرانے چلن کو محفوظ رکھنے کے لئے میدان میں اترآیا۔ بغاوت کچلی گئی تو اسکاٹ‌لینڈ کے پہاڑیوں میں جرگوں کا نظام بھی ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو گیا اور زمین پر خاندان کی پشتینی مشترکہ ملکیت کے بچے کھچے آثار مٹادئے گئے۔ اسکاچ کسان کی زمین سے بےدخلی کی رفتار تیز ہو گئی، گن کی عدالت منسوخ کر دی گئی اور بعض پشتینی رواجوں کی ممانعت ہو گئی۔ صفحہ ۳۵۲

۱۴۲ - L. H. Morgan. «Ancient Society», London, 1877, p. 357—358. صفحہ ۳۵۳

۱۴۳ - ”المانی قانون“ — جرمنی میں المانی قبیلوں کی اس متحدہ تنظیم کے قوانین کا مجموعہ جو پانچویں صدی سے آجکل کے الزاس علاقے، مشرقی سوئٹزرلینڈ، اور جنوب مغربی جرمنی کے علاقوں پر حاوی تھا۔ یہ قانون چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں صدی کے اول اور اٹھویں صدی کے زمانے میں رائج تھے۔ یہاں اینگلس نے اس کی دفعہ ۸۱ کا حوالہ دیا ہے۔ صفحہ ۳۵۴

۱۴۴ - ہلدےبراند کا گیت — آٹھویں صدی کی قدیم رزمیہ جرمن شاعری کی باقیات میں سے ہے جو نامکمل صورت میں صرف ٹکڑوں میں محفوظ رہ گئی ہے۔ صفحہ ۳۵۵

۱۴۵ - جرمن اور گال قبیلوں نے سوی‌لئس کی رہنمائی میں روم کے اقتدار کے خلاف ۷۰ — ۶۹ء میں (اور بعض تاریخوں کے مطابق ۷۱ - ۶۹ء میں) بغاوت کی تھی جو گال کے بیشتر حصوں میں

اور روم کے ماتحت جرمن صوبوں میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ اندیشہ تھا کہ یہ علاقے سلطنت روما کے ہاتھ سے نکل جائیں گے، لیکن باغیوں کو شکست ہوئی اور انھیں مجبور ہوکر روم سے صلح کرنی پڑی۔ صفحہ ۳۵۹

۱۳۶ - «Codex Laureshamensis» لارش خانقاہ کے خاص حقوق اور وقف ناموں کی نقلوں کا مجموعہ جو بارھویں صدی میں مرتب کیا گیا۔ یہ آٹھویں نویں صدی میں کاشتکاری اور زمینداری کی تاریخ معلوم کرنے کے لئے نہایت کارآمد تاریخی دستاویز ہے۔ صفحہ ۳۶۳

۱۳۷ - ایبیرین — وہ قبیلے جو قدیم زمانے میں پیرےنیے کے جزیرہنما کے ایک حصے میں آباد تھے۔ بحرروم کے جزیروں اور موجودہ فرانس کے جنوب مشرقی حصے کے علاقوں میں ان کی بستیاں بھی پھیلی تھیں۔

لیگورین — ان قبیلوں کا نام ہے جو بہت قدیم زمانے میں اپنی جزیرہنما کے بیشتر حصوں میں آباد تھے۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں انھیں اطالیائی قبیلوں نے وہاں سے نکال کر اسی جزیرہنما کے شمالی مغربی حصے اور گال کے جنوب مشرقی علاقوں کی طرف دھکیل دیا۔

ناریکن — ایلی‌ری اور کیلٹ قبیلوں کا گروپ جو روم قدیم کے صوبہ ناریک کے علاقے میں رہتے تھے۔ آجکل یہ علاقہ شٹیری اور کارنٹی کا ایک حصہ ہے۔ صفحہ ۳۷۱

۱۳۸ - اینگلس کا مطلب یہاں جرمن قوم کی مقدس رومن شہنشاہیت سے ہے جو ۹۶۲ میں قائم ہوئی تھی، اٹلی کے ایک حصے اور جرمنی کے تمام علاقے پر پھیلی ہوئی تھی۔ آگے چل کر اسی سلطنت میں سرزمین فرانس کا کچھ حصہ، چیک، آسٹریا، نیدرلینڈ، سوئٹزرلینڈ، اور دوسرے ملک بھی شامل ہو گئے۔ یہ شہنشاہیت با قاعدہ کوئی مرکزی ریاست نہ تھی بلکہ الگ الگ رجواڑوں اور آزاد شہروں کا ڈھیلا سا جوڑ تھا، جو شہنشاہ کے اعلا اختیار کو زبانی تسلیم کرتے تھے۔ ۱۸۰۶ء میں جب

فرانس کے مقابلے میں جرمن شاہی خاندان گابسبورگ کو شکست ہوئی اور انھیں مجبور ہوکر مقدس رومن سلطنت کی شہنشاہی سے انکار کرنا پڑا تو اس سلطنت کا وجود ختم ہو گیا۔ صفحہ ۳۷۵

۱۴۹ - بینی‌فس (beneficium) یا حین حیات معافی کی زمین۔ آٹھویں صدی کے اول نصف میں اس کا عام رواج تھا کہ فرانسیسی سرکار کی طرف سے کاشتکاروں سمیت زندگی بھر استعمال کے لئے زمینیں جاگیریں دی جاتی تھیں اور اس کے عوض انھیں کوئی مقررہ سرکاری خدمت، اکثر فوجی خدمت انجام دینی ہوتی تھی۔ حین‌حیات معافی کی زمینوں کے اس دستور سے زمینیں موروثی ہوتی چلی گئیں۔ جاگیرداروں، خصوصاً چھوٹے اور درمیانی امیروں اور درباریوں کا طبقہ ابھرا، عام کسانوں کی زرعی غلامی بڑھی، پشتینی کسان غلامی اور پشتینی امارت کے طبقے الگ الگ بن گئے۔ صفحہ ۳۷۸

۱۵۰ - گاؤگاؤنٹ (Gaugrafen) — فرانسیسی ریاست میں خاص شاہی منصب‌دار، جنھیں صوبہ‌داریاں سپرد ہوتی تھیں۔ وہ کچہری بھی کرتے تھے، ٹیکس بھی اگھاتے تھے اور مقررہ فوج بھی وقت ضرورت کے لئے تیار رکھتے تھے۔ اس خدمت کے عوض انھیں اس صوبے کے شاہی محاصل میں سے ایک تہائی اور انعام کی خاص جاگیر بادشاہ کی طرف دی جاتی تھی۔ شروع میں بادشاہ کی طرف سے ان کا تقرر ہوتا رہا، پھر رفتہ رفتہ وہ منصب‌داروں سے والیان ریاست بن بیٹھے اور اختیارات خود سنبھالنے لگے۔ ۸۷۷ء کے بعد سے، جب کاؤنٹ کا باقاعدہ موروثی عہدہ مان لیا گیا تو وہ بالکل ہی اپنے اپنے علاقوں کے مختار کل ہو گئے۔ صفحہ ۳۷۹

۱۵۱ - انگارئے — سلطنت روما کی طرف سے باشندوں پر ٹیکس تھا اور وہ پابند تھے کہ وہ سرکاری باربرداری کے لئے گھوڑے اور قلی کی بیگار بھرا کریں۔ آگے چل کر یہ سرکاری بیگار پھیلتے پھیلتے رعایا پر بھاری بوجھ بن گئی۔ صفحہ ۳۸۰

۱۵۲ - ''سرپرستی،، (commendatiion) — یورپ میں آٹھویں نویں صدی سے یہ عام رواج تھا کہ کسان چند مقررہ شرائط پر (مثلاً فوجی خدمات بجالانے، عارضی طور پر قطعہ آراضی رھن رکھوانے کے عوض) بڑے جاگیردار کی ''سرپرستی،، میں آجاتا تھا، بڑے کی ''سرپرستی،، میں رھنےوالے چھوٹے جاگیردار کی بھی یہی صورت تھی۔ اس رواج کی قانونی حیثیت کو commendations (patronage) کہتے تھے۔ اکثر کسانوں کو بمجبوری اس ''سرپرستی،، کا سہارا لینا پڑتا، وہ بڑے جاگیرداروں کے شکنجے میں پڑتے جاتے تھے۔ اس طرح غلامی درغلامی کی بدولت جاگیرداری بندھن مضبوط ھوتے چلے گئے۔ صفحہ ۳۸۲

۱۵۳ - ۱۰۶۶ء میں ھیسٹنگز کی لڑائی — نارمنڈی کے والی ریاست ولہلم کی فوج نے انگلینڈ میں اتر کر اینگلوسیکسن فوج سے جنگ کی (۱۰۶۶ء) اینگلوسیکسنوں کی فوجی تنظیم میں پرانے وقتوں کا برادری ڈھنگ اور دقیانوسی قسم کے ھتھیار چلے آتے تھے، وہ اس لڑائی میں بری طرح شکست کھا گئے، ان کا بادشاہ ھارولڈ میدان جنگ میں کام آیا۔ ولہلم انگلینڈ کا بادشاہ بنا اور ولہلم اول فاتح (ولیم فرسٹ دی وکٹر) کے نام سے تخت و تاج سنبھالا۔ صفحہ ۳۹۲

۱۵۴ - ڈتمارشن (Dithmarschen) — آجکل کے شلیزویگ گولشٹین کے جنوب مغرب کا ضلع تھا۔ قدیم زمانے میں یہاں سیکسن نسل کے لوگ آباد تھے۔ آٹھویں صدی میں شارلی‌مین (Charlemagne) نے اسے فتح کیا۔ بعد میں کبھی گرجاؤں کی جاگیر میں رھا، کبھی امیروں کی۔ ۱۲ویں صدی کے وسط سے ڈتمارشن کی آبادی نے، جس میں زیادہ‌تر آزاد کسان شامل تھے، رفتہ رفتہ خود مختاری کی طرف قدم بڑھایا۔ اور ۱۳ویں صدی کے شروع سے ۱۶ویں صدی کے وسط تک انھوں نے عملی طور پر آزادی حاصل کر لی۔ اس زمانے میں ڈتمارشن کے علاقے میں کسانوں کی ایسی برادریاں آباد تھیں جو اپنے معاملات کی آپ مختار ھوں۔ ان

برادریوں کی بنیاد کثیر حالتوں میں کسانوں کی وہی پرانی موروثی قرابت‌داری تھی۔ ۱۴ ویں صدی تک ڈتمارشن میں اختیاراعلا تمام آزاد زمینداروں کی پنچایت کے ہاتھ رہتا تھا۔ پھر پنچایت کی جگہ تین چنے ہوئے پنچوں نے لےلی۔ ۱۵۰۹ء میں ڈچ بادشاہ فریڈرک دوم کی فوج نے اور گولشٹین کے والیان‌ریاست یوہان اور ایڈولف نے مل کر ڈتمارشن پر چڑھائی کی، اس کی قوت مقابلہ توڑ ڈالی اور یہ ضلع فاتحوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ اس کے باوجود ڈتمارشن ضلع میں برادری کا نظام، اور کسی حد تک اپنے معاملات خود فیصل کرنے کا چلن ۱۹ ویں صدی کے دوسرے نصف تک چلتا رہا۔ صفحہ ۴۰۱

۱۵۵۔ ملاحظہ ہو فلسفی ہیگل کی تصنیف ”فلسفہ حقوق کی بنیادیں“۔ صفحہ ۴۰۲

ناموں کا اشاریہ

— الف —

آردشیر (Artaxerxes) — اخیمینید شاہی خاندان کے تین ایرانی بادشاہوں کا نام ۔ صفحہ ۳۴۲

ارسطائدیز (Aristides) (تقریباً ۵۴۰ سے ۴۶۷ ق ۔ م ۔) — قدیم یونان کا مدبر اور سپہ‌سالار ۔ صفحہ ۳۲۴

ارسطو (Aristotle) (۳۸۴ سے ۳۲۲ ق ۔ م ۔) — قدیم یونانی فلسفی ۔ آئڈیلزم اور مادیت کے نظریات کے درمیان مذبذب رہا ۔ آقاؤں کے طبقے کا ترجمان ۔ صفحات ۹۴، ۳۱۱

ارسطونس (Ariston) (چھٹی صدی ق ۔ م ۔) — اسپارٹا کا بادشاہ تھا (۵۷۴ سے ۵۲۰ ق ۔ م ۔ تک) ۔ انکسندریدس اور وہ بیک‌وقت حکمران تھے ۔ صفحہ ۲۴۹

آرک‌رائٹ (Arkwright)، رچرڈ (۱۷۹۲ء — ۱۷۳۲ء) — ایک انگریز صنعت‌کار جس نے برطانیہ میں کئی ایجادوں کا سرقہ کیا ۔ صفحہ ۶۵

اریسطوفینس (Aristophanes) (تقریباً ۴۴۶ سے تقریباً ۳۸۵ ق ۔ م ۔) — قدیم یونانی ڈرامہ‌نگار ۔ سیاسی موضوعات پر اس نے کئی طنزیہ طربیے لکھے تھے ۔ صفحہ ۲۵۰

اسٹوارٹ (Stuarts) — شاہی خاندان جس نے اسکاٹلینڈ پر (۱۳۷۱ ء سے) اور انگلستان پر (۴۹ — ۱۶۰۳ ء ، ۱۷۱۴ ء — ۱۶۶۰ ء) حکمرانی کی ۔ صفحہ ۶۲

اسپناس (Espinas) ، الفریڈ وکٹر (۱۸۴۴ ء سے ۱۹۲۲ ء) — فرانسیسی فلسفی اور ماہر عمرانیات ۔ ارتقا کے نظریے کا حامی ۔ صفحات ۲۰۵ ، ۲۰۶

اسپینوزا (Spinoza) ، باروخ (بینے دکٹ) (۱۶۳۲ ء سے ۱۶۷۷ ء) — ہالینڈ کا شہرۂ آفاق مادیت پسند فلسفی ، دھریہ ۔ صفحہ ۹۴

اسکاٹ (Scott) والٹر (۱۷۷۱ ء سے ۱۸۳۲ ء) — انگلینڈ کا مشہور ناول نگار ۔ صفحہ ۳۵۲

اشن باخ (Eschenbach) — دیکھئے ولفرام فان اشن باخ ۔

اگاسیز (Agassiz) ، لوئی ژاں رودولف (۱۸۰۷ ء سے ۱۸۷۳ ء) — سوئٹزرلینڈ کا باشندہ ۔ اس نے علم حیوانات ، ارضیات اور معدوم شدہ حیوانات کے فن پر کئی کتابیں لکھیں ۔ وہ اس خیال کا حامی تھا کہ دنیا خدا کی تخلیق ہے اور حادثے غیب سے نازل ہوتے ہیں ۔ صفحہ ۲۳۱

آگسٹس (Augustus) (۶۳ ق ۔ م ۔ سے ۱۴ عیسوی تک) — پہلا رومی شہنشاہ ۔ صفحات ۳۳۱ ، ۳۳۴ ، ۳۷۰

البرخت (Albrecht) ، کارل (۱۷۸۸ ء سے ۱۸۴۴ ء) — ایک جرمن تاجر ۔ اسے " ڈیماگوگوں " (دیکھئے نوٹ نمبر ۹۰) کی مخالفانہ تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے ۶ سال کی سزا ہوئی تھی ۔ ۱۸۴۱ ء کے بعد سے سوئٹزرلینڈ میں بود و باش اختیار کی اور وائیٹلنگ کی طرح یوٹوپیائی کمیونزم سے ملتے جلتے خیالات کا پرچار کرتا تھا لیکن مذہب اور تصوف کے رنگ میں ۔ صفحہ ۱۵۰

الفیلا (Ulfila or Wulfila) (تقریباً ۳۱۱ ء سے ۳۸۳ ء) — مغربی گوتھوں کا عیسائی رہبر ۔ اس نے گوتھ لوگوں کو عیسائی بنایا ۔

گوتھ حروف‌تہجی کا بانی اور انجیل کا گوتھ زبان میں مترجم۔ صفحہ ۳۴۲

امیانس مارسیلینس (Ammianus Marsellinus) (تقریباً ۳۳۲ ء سے تقریباً ۴۰۰ ء تک) — روم کے زوال کے دور میں رومی تاریخ کا مصنف۔ صفحات ۲۵۷ ، ۲۹۱

اناکریون (Anacreon) (چھٹی صدی ق۔ م۔ کے وسط کا زمانہ) — قدیم یونان کا عشقیہ شاعر ۔ صفحہ ۲۶۸

انکساگورس (Anaxagoras) کلازومینائے کا (تقریباً ۵۰۰ سے ۴۲۸ قبل مسیح تک) — قدیم یونانی مادیت‌پسند فلسفی۔ صفحات ۴۶ ، ۷۷

انکسندریدس (Anaxandridas) (چھٹی صدی ق۔ م۔) — ۵۶۰ ق۔ م۔ سے اسپارٹا کا بادشاہ۔ ارسطونس اور وہ بیک وقت حکمراں تھے۔ صفحہ ۲۴۹

اوٹو (Otto) ، کارل وونی‌بالد (پیدائش تقریباً ۱۸۰۹ ء) — جرمن کیمیاداں ، کولون مزدور لیگ کا ممبر (۴۹ — ۱۸۴۸ ء) ، کمیونسٹ لیگ کا رکن۔ کولون میں کمیونسٹوں پر مقدمے میں ماخوذ تھا (۱۸۵۲ ء) ۔ صفحہ ۱۶۳

اودوآکر (Odoacer) (تقریباً ۴۳۳ ء سے ۴۹۳ ء تک) — جرمن فوجی رہنما ، جس نے ۴۷۶ ء میں رومن شہنشاہ کا تختہ الٹ دیا اور اٹلی کی سرزمین پر پہلی ”بربری“ سلطنت کا بادشاہ بن بیٹھا۔ صفحہ ۳۶۷

اورلین (Orleans) شاہزادہ — دیکھئے لوئی فلپ۔

اووین (Owen) ، رابرٹ (۱۷۷۱ ء سے ۱۸۵۸ ء) — یوٹوپیائی (قیاسی) سوشلزم کی مشہور انگریز شخصیت۔ صفحات ۵۰ ، ۷۹ ، ۸۲ ، ۸۹ — ۹۲

ایپیئس کلوڈیئس (Appius Claudius) (۵ ویں صدی قبل مسیح) — رومی مدبر۔ روایت ہے کہ وہ جو بارہ جدول‌والے قوانین کہے جاتے ہیں ، ان کے مصنفوں میں ایک یہ بھی تھا۔ صفحہ ۳۳۳

ایرمینان (Irminon) (سال انتقال تقریباً ۸۲۶ عیسوی) — خانقاہ سین ژرمین‌دی پرے کا ایبے (۸۱۷ء — ۸۱۲ء) - صفحہ ۳۸۰

ایرہارڈ (Ehrhard)، یوگان لڈوگ البرٹ (پیدائش تقریباً ۱۸۲۰ ء) — جرمن تجارتی کلرک ، کمیونسٹ لیگ کا ممبر - کولون کمیونسٹوں پر مقدمے میں ماخوذ تھا (۱۸۵۲ ء) - صفحہ ۱۶۳

ایسکیلس (Aeschylus) (۵۲۵ سے ۴۵۶ ق - م تک) — قدیم یونانی ڈرامہ‌نگار - صفحات ۱۷۳ ، ۱۷۴ ، ۱۷۵ ، ۲۴۸ ، ۳۰۷

ایکاریوس (Eccarius)، یوگان جارج (۱۸۱۸ ء سے ۱۸۸۹ ء) — جرمن درزی ، عالمی مزدور تحریک میں ایک نمایاں شخصیت ، انصاف لیگ کا ممبر - بعد میں کمیونسٹ لیگ کا رکن بن گیا - پہلی انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا ممبر - برطانوی ٹریڈیونین تحریک میں بھی حصہ لیا - صفحہ ۱۵۱

اینگلس (Engels) ، فریڈرک (۱۸۲۰ ء سے ۱۸۹۵ ء) - صفحات ۲۰ ، ۲۷ ، ۲۹ ، ۳۱ ، ۴۷ ، ۴۹ ، ۷۵ ، ۱۱۱ ، ۱۱۴ ، ۱۳۰ ، ۱۳۴ ، ۱۳۹ ، ۱۵۵ ، ۱۶۰ ، ۱۶۴ ، ۱۶۵ ، ۱۶۷ ، ۱۸۸ ، ۲۰۱ ، ۲۱۱ ، ۲۲۵ ، ۲۲۸ ، ۲۴۱ ، ۳۰۴ ، ۳۶۲ ، ۳۹۴ ، ۴۱۴

ایوربیک (Ewerbeek) ، آگسٹ ہرمن (۱۸۱۶ ء سے ۱۸۶۰ ء) — جرمن ڈاکٹر اور ادیب - انصاف لیگ کے پیرس کے فرقوں کا رہنما - بعد میں کمیونسٹ لیگ کا ممبر بن گیا لیکن ۱۸۵۰ ء میں الگ ہو گیا - صفحات ۱۴۸ ، ۱۶۲

— ب —

بابیوف (Babeuf) ، گراخ (اصل نام فرانسوا نوئل) (۱۷۶۰ ء سے ۱۷۹۷ ء) — فرانسیسی انقلابی جو یوٹوپیائی (قیاسی) مکمل ، مساوات‌والے کمیونزم کا خاص ترجمان تھا ، وہی ”مساواتیوں“ کی سازش کا سرغنہ تھا - صفحہ ۷۹

باخوفن (Bachofen)، یوگان یاکب (۱۸۱۵ء سے ۱۸۸۷ء) — سوئٹزرلینڈ کا ماہر قانون اور مؤرخ۔ کتاب ''مادری حقوق'' کا مصنف۔ صفحات ۱۷۰، ۱۷۳، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۹، ۱۸۳، ۱۸۶، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۲۸، ۲۳۰، ۲۳۳، ۲۳۹، ۲۷۵

باربے (Barbès)، آرمان (۱۸۰۹ء سے ۱۸۷۰ء) — فرانسیسی پیٹی بورژوا انقلابی جمہوریت پسند، ۱۸۴۸ء کے انقلاب میں سرگرم حصہ لیا، ۱۵ مئی ۱۸۴۸ء کے واقعات میں حصہ لینے کے سبب عمر قید کی سزا ہوئی جو ۱۸۵۴ء میں معاف کر دی گئی۔ صفحہ ۱۴۰

باؤیر (Bauer)، برونو (۱۸۰۹ء سے ۱۸۸۲ء) — جرمن آئدیلسٹ فلسفی، ہیگل کے نوجوان پرستاروں میں اس کا نام نمایاں ہے، بورژوائی ریڈیکل تھا، ۱۸۶۶ء کے بعد قومی آزاد خیالوں میں مل گیا۔ صفحہ ۲۷

باؤیر (Bauer)، ہنریخ — جرمن مزدور تحریک کی ایک نمایاں شخصیت، انصاف لیگ کا ایک رہنما اور کمیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی کا ممبر۔ ۱۸۵۱ء میں ترک وطن کرکے آسٹریلیا میں آباد ہوگیا۔ صفحات ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۵۵، ۱۵۹، ۱۶۲

برائٹ (Bright)، جان (۱۸۸۹ء — ۱۸۱۱ء) — انگریز مل مالک، آزاد تجارت کا حامی۔ اناج کے قانونوں کی مخالف لیگ بنوانے والا۔ ۱۸۶۰ء کے بعد سے وہ لبرل پارٹی کا ایک لیڈر رہا اور لبرل حکومتوں میں وزارت کے عہدے سنبھالے۔ صفحہ ۷۰

برنتانو (Brentano)، لویو (۱۹۳۱ء — ۱۸۴۴ء) — جرمن بورژوا، لغو ماہرمعاشیات، کتھیڈر سوشلزم کا نمائندہ۔ صفحہ ۴۷

برنشٹائن (Bernstein)، آرنلڈ بیرنحارڈ کارل (۱۸۰۸ء سے ۱۸۴۹ء) — جرمن پیٹی بورژوا جمہوریت پسند، پیرس میں جرمن تارکان وطن کے رضاکارانہ دستے کا ایک رہنما جس نے اپریل ۱۸۴۸ء میں باڈین کی بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ صفحہ ۱۰۵

بسمارک (Bismarck) ، اوٹو (۱۸۱۵ ء سے ۱۸۹۸ ء) — جرمن پرنس - ریاستی معاملات میں نمایاں ، پروشیا اور جرمنی کی طرف سے غیرملکی تعلقات میں سرگرم - پروشیا کے تعلقہداروں کا نمائندہ جو وہاں ۱۸۶۲ ء سے ۱۸۷۱ ء تک منسٹر پریسیڈنٹ تھا - بعد میں ۱۸۷۱ ء سے ۱۸۹۰ ء تک جرمن سلطنت کا ریخ چانسلر (صدر) رہا - صفحات ۱۲۲ ، ۲۴۹ ، ۴۰۵ ، ۴۰۶

بکلینڈ (Buckland) ، ولیم (۱۷۸۴ ء سے ۱۸۵۶ ء) — انگریز ماہر علم الارض اور پادری - اپنی تصنیفوں میں انجیل گورکھ دھندوں کو علم ارضیات کی دلیلوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی - صفحہ ۵۰

بگے (Bugge) ، ایلزیوس سوفوس (۱۸۳۳ ء سے ۱۹۰۷ ء) — ناروے کا باشندہ ، جس نے قدیم اسکینڈی‌نیویا کی زبان ، داستان اور ادب پر تبصرہ اور تحقیق کا کام کیا ہے - صفحہ ۳۵۷

بلان (Blanc) ، لوئی (۱۸۱۱ ء سے ۱۸۸۲ ء) — فرانس کا چھوٹی بورژوازی والا سوشلسٹ ، مؤرخ ، ۱۸۴۸ ء میں عارضی حکومت میں شریک تھا ، لکسمبرگ کمیشن کا چیرمین - اگست ۱۸۴۸ ء کے بعد سے لندن بھاگ جانےوالے چھوٹے بورژوائیوں کا ایک لیڈر - صفحات ۱۵۷ ، ۱۶۱

بلانکی (Blanqui) ، لوئی اوگوست (۱۸۰۵ ء سے ۱۸۸۱ ء) — فرانسیسی انقلابی ، قیاسی کمیونزم کا علمبردار - ۱۸۴۸ ء کے انقلاب کے وقت فرانس کی جمہوری اور پرولتاری تحریک میں انتہائی بائیں بازو کا حامی - کئی بار گرفتار ہوا اور سزائیں کاٹیں - صفحہ ۱۴۰

بلائخرودر (Bleichröder) ، گرسان (۱۸۲۲ ء سے ۱۸۹۳ ء) — برلن میں جرمن بینک کا صدر ، پروشیا کی حکومت کے مالی معاملات میں حصہ لیتا تھا اور بسمارک کا مشیرمال اور بینکر تھا - صفحہ ۴۰۶

بوخنر (Büchner) ، جارج (۱۸۱۳ ء سے ۱۸۳۷ ء) — جرمن مصنف، انقلابی جمہوریت پسند - ۱۸۳۴ ء میں گیسن میں انسانی حقوق کی خفیہ انجمن کا ایک بانی ، ” گیسن کے کسانوں سے اپیل “

کا مصنف جس کا نعرہ تھا ”جھونپڑیوں کے لئے امن اور محلوں کے خلاف جنگ!“۔ صفحہ ۱۴۰

بورن (Born)، اسٹفان (اصلی نام سیمون بٹرسیلخ) (۱۸۲۴ء سے ۱۸۹۸ء) — جرمن مزدور، کمیونسٹ لیگ کا ممبر۔ جرمنی کے ۴۹ — ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے دوران جرمنی مزدور تحریک میں اصلاح‌پسندی کا نمائندہ۔ صفحات ۱۵۷، ۱۵۸

بورن‌شٹیڈ (Bornsted)، ادالبرٹ (۱۸۰۸ء سے ۱۸۵۱ء) — جرمن پیٹی بورژوا جمہوریت‌پسند، ۴۸ — ۱۸۴۷ء میں اخبار «Deutsche Brüsseler Zeitung» کا بانی اور مدیر۔ مارچ ۱۸۴۸ء تک کمیونسٹ لیگ کا ممبر جو بعد میں نکال دیا گیا۔ پیرس میں جرمن تارکان وطن کی رضاکار لیجن منظم کرنےوالوں میں سے ایک جس نے اپریل ۱۸۴۸ء میں باڈین کی بغاوت میں حصہ لیاتھا۔ صفحہ ۱۵۵

بولنگ‌بروک (Bolingbroke)، ہنری (۱۶۷۸ء — ۱۷۵۱ء) — انگریز سیاست‌داں، ٹوریوں کی پارٹی کا ایک لیڈر، فلسفۂ الوہیت کا نمائندہ۔ صفحہ ۶۲

بوناپارٹ (Bonaparte)، نپولین سوم کے نام میں ملاحظہ ہو۔

بوناپارٹ (Bonaparte)، نپولین ژوزف شارل پول (۱۸۲۲ء سے ۱۸۹۱ء) — جیروم بوناپارٹ کا بیٹا اور لوئی بوناپارٹ کا چچازاد بھائی۔ دوسری ریپبلک کے وقت آئین‌ساز اور قانون‌ساز اسمبلی کا ممبر۔ صفحہ ۵۱

بونئے (Bonnier)، شارل (پیدائش ۱۸۶۳ء) — فرانسیسی سوشلسٹ، صحافی۔ صفحہ ۲۱۱

بیڈے ”تقدس مآب“ (Bede the Venerable) (تقریباً ۶۷۳ء سے ۷۳۵ء) — اینگلوسیکسن عالم اور راہب جس نے تاریخ لکھی ہے۔ صفحہ ۳۵۳

بیک (Beck) ، الیکساندر — جرمن درزی ، انصاف لیگ کا ممبر ، لیگ کی سرگرمیوں کے سلسلے میں ۱۸۴۶ء میں گرفتار کر لیا گیا ، کولون میں کمیونسٹوں پر مقدمے میں گواہ تھا۔ صفحہ ۱۴۳

بیکر (Becker) ، آگسٹ (۱۸۱۴ء سے ۱۸۷۱ء) — جرمن صحافی ، وائیٹلنگ کا حامی ، سوئٹزرلینڈ میں انصاف لیگ کا ممبر ۔ جرمنی کے ۴۹ — ۱۸۴۸ء کے انقلاب میں حصہ لیا۔ چھٹے عشرے کے شروع میں ترک وطن کرکے امریکہ میں آباد ہو گیا اور جمہوری اخباروں میں مضمون لکھتا رہا۔ صفحہ ۱۴۲

بیکر (Becker) ، ولہلم ادولف (۱۷۹۶ء سے ۱۸۴۶ء) — جرمن مؤرخ ، لیپزگ میں کلاسیکی آثارقدیمہ کا پروفیسر تھا۔ صفحہ ۳۰۱

بیکر (Becker) ، ہرمن ہنریخ (۱۸۲۰ء سے ۱۸۸۵ء) — جرمن وکیل ، صحافی اور ۱۸۵۰ء سے کمیونسٹ لیگ کا ممبر ۔ ۱۸۵۲ء میں کولون کے کمیونسٹوں پر مقدمے میں ماخوذ تھا ، بعد میں نیشنل لبرل بن گیا۔ صفحہ ۱۶۳

بیکن (Bacon) ، فرانسس ، ویرولام کا بیرن (۱۵۶۱ء سے ۱۶۲۶ء) — عظیم انگریز فلسفی ، انگریز مادیت‌پسند فلسفے کا بانی۔ صفحات ۴۹ — ۴۶ ، ۹۶

بیمے (Böhme) ، یاکب (۱۵۷۵ء سے ۱۶۲۴ء) — جرمن دستکار ، صوفی فلسفی۔ صفحہ ۴۷

بینکرافٹ (Bancroft) ، ہیوبرٹ ہاؤ (۱۸۳۲ء سے ۱۹۱۸ء) — امریکی ماہر علم الاقوام ، شمالی امریکہ کے قبیلوں کا محقق۔ صفحات ۲۲۹ ، ۲۳۲ ، ۳۸۷

بینگ (Bang) ، انتون کرستیان (۱۸۴۰ء سے ۱۹۱۳ء) — ناروے کا مشہور مصنف جس نے اسکینڈی‌نیویا کی فرضی داستانیں جمع کی ہیں اور ناروے میں مسیحیت کی تاریخ لکھی ہے۔ صفحہ ۳۵۷

بیورگرس (Bürgers) ، ہنریخ (۱۸۲۰ ء سے ۱۸۷۸ ء) — ترقی پسند جرمن صحافی - ۴۳ — ۱۸۴۲ ء میں «Rheinische Zeitung» میں مضامین لکھتا رہا ، پھر «Neue Rheinische Zeitung» کا مدیر ہو گیا - ۱۸۵۰ ء سے کمیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی کا ممبر تھا - ۱۸۵۲ ء میں کولون میں کمیونسٹوں پر مقدمے میں ماخوذ تھا - بعد میں پروگریسسٹ بن گیا - صفحہ ۱۶۳

— پ —

پالمرسٹن (Palmerston) ، ہنری جان ٹمپل ، وائی کاؤنٹ (۱۷۸۴ ء سے ۱۸۶۵ ء) — برطانوی ریاستی کارکن - ابتدا میں وہ ٹوری رہا ، پھر ۱۸۳۰ ء سے وھگوں کا لیڈر ہو گیا - وزیرخارجہ (۳۴ — ۱۸۳۰ ء ، ۴۱ — ۱۸۳۵ ء ، ۵۱ — ۱۸۴۶ ء) - وزیر داخلہ ۱۸۵۹ء (۵۵ — ۱۸۵۲ء) - وزیر اعظم (۵۸ — ۱۸۵۵ء ، ۶۵ —) - صفحہ ۳۲

پرسیئس (Perseus) (۲۱۲ ق - م - سے ۱۶۶ ق - م -) —مقیدونیہ کا آخری بادشاہ (۱۶۸ ق - م - سے ۱۷۹ ق - م - تک) - صفحہ ۳۷۰

پرودھوں (Proudhon) ، پیئر ژوزف (۱۸۰۹ ء سے ۱۸۶۵ ء) — مشہور فرانسیسی صحافی اور ماہر معاشیات و عمرانیات ، چھوٹی بورژوازی کا نظریہ ساز - انارکزم یا نراج کا نظریہ تیار کرنےوالوں میں وہ بھی تھا - صفحات ۲۸ ، ۱۵۸

پروکوپیئس (Procopius) ، کیساری کا (پانچویں صدی کے آخر میں پیدائش — تقریباً ۵۶۲ ء میں انتقال) — بازنطینی مؤرخ ، ” ایرانیوں ، ویندالوں اور گوتھوں سے یوستی نیان کی جنگوں کی تاریخ “ کا مصنف - صفحہ ۲۵۸

پریسٹلی (Priestley) ، جوزف (۱۷۳۳ء سے ۱۸۰۴ء) — انگریز کیمیادان ، مادیت‌پسند فلسفی اور ترقی‌پسند سماجی کارکن ۔ صفحہ ۳۹

پگانینی (Paganini) ، نکولو (۱۷۸۲ء سے ۱۸۴۰ء) — عظیم اطالوی وائلن‌نواز اور موسیقار ۔ صفحہ ۱۰

پلوتارک (Plutarch) (تقریباً ۴۶ سے تقریباً ۱۲۵ عیسوی) — قدیم یونانی مصنف اور معلم اخلاق ، آئڈیالسٹ فلسفی ۔ صفحہ ۲۴۹

پلینی گائی سکنڈس (Gaius Plinius Secundus) (۲۳ سے ۷۹ عیسوی) — رومن عالم جس نے علم فطرت کی تاریخ پر ۳۷ کتابیں لکھی ہیں ۔ صفحات ۳۶۴ ، ۳۷۰

پیسیستراتس (Pisistratus) (تقریباً ۶۰۰ سے ۵۲۷ ق ۔ م ۔ تک) — ۵۶۰ سے ۵۲۷ ق ۔ م ۔ تک وقفوں کے ساتھ ایتھنز کا جابر فرماں‌روا رہا ۔ صفحہ ۳۲۹

— ت —

تاسیت (Tacitus) ، پوبلی کارنیلی (تقریباً ۵۵ء سے تقریباً ۱۲۰ء تک زندہ رہا) — روم کا عظیم مؤرخ ، جس کی تصانیف ”جرمنی“ ، ”تاریخ“ ، «Annals» مشہور ہیں ۔ صفحات ۱۶۹ ، ۱۸۲ ، ۱۹۵ ، ۱۹۶ ، ۲۵۶ ، ۳۵۶ ، ۳۵۸ ، ۳۵۹ ، ۳۶۰ ، ۳۶۱ ، ۳۶۲ ، ۳۶۳ ، ۳۶۵ ، ۳۶۷ ، ۳۶۹

تریر (Trier) ، گیرسن (پیدائش ۱۸۵۱ء) — ڈنمارک کا سوشل ڈیموکریٹ ، سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے اندر انقلابی اقلیت کا ایک لیڈر ۔ پارٹی کے موقع‌پرست بازو کے خلاف جدوجہد کی ۔ اینگلس کے تصانیف کا ڈینی زبان میں ترجمہ کیا ۔ صفحہ ۱۷۱

تھوروالڈسن (Thorwaldsen) ، برتل (۱۷۶۸ء سے ۱۸۴۴ء) — ڈنمارک کا مشہور سنگتراش ۔ صفحہ ۱۰

تھیوڈوریک (Theodorich) — تین گوتھک بادشاہوں کا نام - دو ویسٹ گوتھک بادشاہ تھے تھیوڈوریک اول (حکومت کا زمانہ تقریباً ۴۱۸ ء سے ۴۵۱ ء تک) اور تھیوڈوریک دوم (حکومت کا زمانہ تقریباً ۴۵۳ ء سے ۴۶۶ ء تک) - اوسٹ گوتھک بادشاہ بھی تھیوڈوریک تھا (حکومت کا زمانہ ۴۷۳ سے ۵۲۶ ء تک) - صفحہ ۳۴۲

تھیوسیڈیڈیز (Thucydides) (تقریباً ۴۶۰ سے تقریباً ۳۹۵ ق - م - تک) — قدیم یونان کا زبردست مؤرخ جس نے ” پیلوپونین جنگ کی تاریخ “ لکھی ہے - صفحہ ۳۱۱

تھیوکریٹس (Theocritus) (تیسری صدی قبل مسیح) — قدیم یونانی شاعر - صفحہ ۲۶۷

— ٹ —

ٹارکوئی نیئس سوپربس (Tarquinius Superbus) (۵۳۴ سے ۵۰۹ ق - م -) — قدیم روم کا نیم افسانوی آخری (ساتواں) بادشاہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ عوامی بغاوت نے اسے جلاوطنی پر مجبور کر دیا تھا - بعد میں روم نے ریپبلک کا نظام اختیار کیا - صفحات ۳۴۲ ، ۳۴۵

ٹامسن (Thomson) ، ولیم - ۱۸۹۲ ء سے لارڈ کیلون (Lord Kelvin) (۱۸۲۴ ء سے ۱۹۰۷ ء) - مشہور انگریز طبیعیات‌داں - thermodynamics ، الکٹروٹکنیک ، ریاضیاتی طبیعیات کے میدانوں میں تحقیقات کی - ۱۸۵۲ ء میں ” کائنات کی حرارتی موت “ کا عینیت پسند نظریہ پیش کیا - صفحہ ۱۳

ٹائی بیریئس (Tiberius) (۴۲ ق - م - سے ۳۷ عیسوی) — روم کا شہنشاہ (۱۴ ء سے ۳۷ ء) - صفحہ ۳۴۲

ٹیلر (Taylor) ، ایڈورڈ برنیٹ (۱۸۳۲ ء سے ۱۹۱۷ ء) — انگریز ماہر علم‌الانسان ، ثقافت اور علم‌الانسان کی تاریخ کے ارتقائی مکتب کا بانی - صفحہ ۱۷۲

— ج —

جولیا (Jaliuses) — رومی شرفا (پیتریشین) کے ایک گن کا نام۔ صفحہ ۳۵۴

— چ —

چارلس اول (Charles I) (۱۶۰۰ ء سے ۱۶۴۹ ء) — انگلستان کا بادشاہ (۱۶۴۹ ء — ۱۶۲۵ ء) ، سترھویں صدی کے انگریز بورژوا انقلاب کے زمانے میں اس کو سر کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ صفحہ ۵۹

— د —

دانتے (Dante) ، الی گیئری (۱۳۲۱ ء — ۱۲۶۵ ء) — اطالیہ کا عظیم شاعر ۔ صفحہ ۲۶

دانیالس (Daniels) ، رولینڈ (۱۸۱۹ ء سے ۱۸۵۵ ء) — جرمن ڈاکٹر ، کمیونسٹ لیگ کا ممبر ۔ کولون میں کمیونسٹوں پر مقدمے میں ماخوذ تھا (۱۸۵۲ ء) ۔ طبعی سائنس پر جدلی مادیت کا اطلاق کیا ۔ مارکس اور اینگلس کا دوست ۔ صفحہ ۱۶۳

دایونی سیئس ، ہیلی کارنے سس کا (Dionysius of Halicarnassus) (پہلی صدی ق ۔ م — پہلی صدی عیسوی) — قدیم یونان کا مؤرخ اور خطیب ، ”قدیم روم کی تاریخ“ کا مصنف ۔ صفحہ ۳۰۷

دتس (Dietz) ، یوگان ہنریخ ولہلم (۱۸۴۳ ء سے ۱۹۲۲ ء) — جرمن سوشل ڈیموکریٹ ، سوشل ڈیموکریٹ اشاعت گھر کا بانی ، ۱۸۸۱ ء سے جرمن پارلیمنٹ کا ممبر ۔ صفحہ ۱۷۰

دولیشال (Dolleschall) ، لورینتس (پیدائش ۱۷۹۰ ء) — کولون میں پولیس افسر (۴۷ — ۱۸۱۹ ء) ۔ «Rheinische Zeitung» کو سنسر کرنے والا ۔ صفحہ ۲۶

دیپرے (Deprez) ، مارسل (۱۸۴۳ء سے ۱۹۱۸ء) — فرانسیسی طبیعیات‌داں ، بجلی کا انجنیر ، طویل فاصلے پر بجلی کی قوت پہنچانے کے مسئلے پر کام کرتا رہا ۔ صفحہ ۱۳۶

دیدرو (Diderot) ، دینی (۱۷۱۳ء سے ۱۷۸۴ء) — عظیم فرانسیسی فلسفی ، میکانکی مادیت‌پسند فلسفی ، فرانسیسی انقلابی بورژوازی کا ایک نظریہ‌داں اور انسائیکلوپیڈسٹوں کا رہنما ، علم کی روشنی پھیلانے والا ۔ صفحہ ۹۵

دیکارت (Descartes) ، رینے (۱۵۹۶ء سے ۱۶۵۰ء) — فرانس کا ثنویت‌پسند (dualist) فلسفی ، ماہر علم ریاضی و طبیعیات ۔ صفحہ ۹۴

دیکیارکس (Dicaearchus) (چوتھی صدی ق ۔ م ۔) — قدیم یونانی مؤرخ ، سیاست‌داں اور ماہر جغرافیہ ۔ ارسطو کا شاگرد ۔ صفحہ ۳۰۱

دیموستھینیز (Demosthenes) (۳۸۴ سے ۳۲۲ ق ۔ م ۔) — قدیم یونانی خطیب اور سیاسی معاملات میں نمایاں شخصیت ۔ صفحہ ۳۰۰

دیموکریتس (Democritus) (تقریباً ۴۶۰ — تقریباً ۳۷۰ قبل مسیح) — قدیم یونانی مادیت‌پسند فلسفی ، نظریۂ سالمات (atomistic theory) کے بانیوں میں سے ایک ۔ صفحہ ۴۶

دیودورس ، سسلی کا (Diodorus of Sicily) (پہلی صدی ق ۔ م ۔) — قدیم یونانی مؤرخ ۔ مشرق ، یونان اور روم کی تاریخ پر ایک کتاب کا مصنف ۔ صفحات ۳۵۶ ، ۳۶۹

دیورو دے لەمال (Dareau de la Malle) ، ادولف ژول سیزر اوگوست (۱۷۷۷ء سے ۱۸۵۷ء) — فرانسیسی مؤرخ اور شاعر ۔ صفحہ ۳۴۴

— ڈ —

ڈارون (Darwin)، چارلس (۱۸۰۹ء سے ۱۸۸۲ء تک) — شہرۂ آفاق انگریز سائنس‌داں، جس نے ارتقائے وجود کے نظریے کی بنیاد رکھی۔ صفحات ۷، ۱۰، ۱۸، ۹۹، ۱۱۵، ۱۳۵، ۱۸۵

ڈزرئیلی (Disraeli)، بنجامن، لارڈ بیکنس‌فیلڈ (۱۸۰۴ء سے ۱۸۸۱ء) — انگریز سیاست‌داں اور ادیب، قدامت‌پرست، ۱۸۶۸ء میں اور ۱۸۷۴ء سے ۱۸۸۰ء تک انگلستان کا وزیراعظم۔ صفحہ ۷۱

ڈنس (Duns)، اسکاٹس یوحانس (تقریباً ۱۲۶۵ء سے ۱۳۰۸ء) — ازمنہ وسطی کا ماہر علم کلام، فلسفۂ اسمیت کا ایک نمائندہ جو اس زمانے میں مادیت‌پسندی کی پہلی شکل تھی۔ ''آکسفورڈ تصنیف''، نامی کتاب کا لکھنےوالا۔ صفحہ ۴۶

ڈوڈویل (Dodwell)، ہنری (تاریخ وفات ۱۷۸۴ء) — انگریز مادیت‌پسند فلسفی۔ صفحہ ۴۹

ڈونکر (Duncker)، فرانز (۱۸۲۲ء سے ۱۸۸۸ء) — جرمن بورژوا سیاست‌داں اور پبلشر۔ صفحہ ۳۲

ڈیورنگ (Dühring)، یوگینی کارل (۱۸۳۳ء سے ۱۹۲۱ء) — جرمن فلسفی (eclectic philosopher) اور معاشیات کا ایک گھٹیا ماہر، پیٹی بورژوازی کے رجعت پرستانہ سوشلزم کا ترجمان۔ اس کے فلسفے میں آئڈیلزم بھی ہے اور گھٹیامادیت‌پسندی بھی، پوزیٹوزم (مثبتیت) بھی ہے اور ما بعد الطبیعیات بھی۔ برلن یونیورسٹی میں اعلےٰ پروفیسر (۱۸۷۷ء — ۱۸۶۳ء)۔ صفحات ۴۴ — ۴۲

— ر —

راوے (Ravé)، آنری — فرانسیسی صحافی، اینگلس کی تصانیف کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ صفحہ ۱۷۱

رائٹ (Wright)، اشیر (آرتھر) (۱۸۰۳ء سے ۱۸۷۵ء) — امریکن مشنری۔ ۱۸۳۱ء سے ۱۸۷۵ء تک ریڈ انڈین قبیلوں میں زندگی بسر کی اور ان کی زبان کی لغت تیار کی۔ صفحہ ۲۲۷

رفائیل (Rafael)، سانٹی (۱۴۸۳ء سے ۱۵۲۰ء) — نشاۃثانیہ کا عظیم اطالوی مصور۔ صفحہ ۱۰

روزر (Röser)، پیٹر گیرہارڈ (۱۸۱۴ء سے ۱۸۶۵ء) — جرمن مزدور تحریک کا ایک کارکن۔ کولون مزدور لیگ کا نائب صدر (۴۹ — ۱۸۴۸ء)۔ کمیونسٹ لیگ کا ممبر، کولون کے کمیونسٹوں پر مقدمے میں ماخوذ (۱۸۵۲ء)۔ بعد میں لاسال کا چیلا ہو گیا۔ صفحہ ۱۶۳

روسو (Rousseau)، ژاں ژاک (۱۷۱۲ء سے ۱۷۷۸ء) — فرانس کا مشہور روشن‌خیال، جمہوریت‌پسند، فلسفی، انقلابی پیٹی‌بورژوازی کا نظریہ‌ساز۔ صفحات ۷۸، ۸۰، ۹۵

روگے (Ruge)، آرنلڈ (۱۸۰۲ء سے ۱۸۸۰ء) — جرمن اہل قلم۔ ہیگل کا نوجوان پرستار۔ بورژوا ریڈیکل۔ ۱۸۴۸ء میں وہ فرانکفورٹ کی قومی اسمبلی کا ممبر اور بائیں‌بازو کا آدمی تھا۔ ۱۸۵۰ء کی دہائی میں چھوٹی بورژوازی کے ان لوگوں کا لیڈر رہا جو اپنا وطن جرمنی چھوڑ کر انگلینڈ چلے گئے۔ ۱۸۶۶ء کے بعد نیشنل لبرل ہو گیا۔ صفحات ۲۷، ۱۶۱

رینان (Renan)، ارنسٹ (۱۸۲۳ء سے ۱۸۹۲ء) — فرانسیسی ماہرلسانیات، عیسائیت کا مؤرخ، عینی‌فلسفی۔ صفحہ ۱۵۸

ریئف (Reiff)، ولہلم جوزف (پیدائش ۱۸۲۴ء) — کولون مزدور لیگ کا ممبر اور کمیونسٹ کارکن جس سے وہ ۱۸۵۰ء میں نکال دیا گیا۔ کولون کے کمیونسٹوں پر مقدمے میں ماخوذ تھا (۱۸۵۲ء)۔ صفحہ ۱۶۳

— ز —

زوریتا (Zurita) ، الونسو — ۱۶ صدی کے وسط میں سینٹرل امریکہ کی نوآبادیوں میں ہسپانوی عہدہدار ۔ صفحہ ۲۴۴

زی کنگین (Sickingen) ، فرانز (۱۵۲۳ ء — ۱۴۸۱ ء) — جرمن نائٹ (knight) جس نے اصلاحات کی تحریک میں (Reformation) حصہ لیا ۔ ۱۵۲۲ ء میں نچلے طبقہ اشرافیہ کی بڑے بڑے شاہزادوں کے خلاف بغاوت کا رہنما ۔ صفحہ ۸۰

— ژ —

ژیرا تیولوں (Giraud—Teulon) ، الیکسس (پیدائش ۱۸۳۹ ء) — ابتدائی سماج کا مؤرخ ، جنیوا میں پروفیسر ۔ صفحات ۱۸۴ ، ۱۸۷ ، ۲۰۴ ، ۲۰۶ ، ۲۴۷

— س —

سالویانس (Salvianus) (تقریباً ۳۹۰ ء سے تقریباً ۴۸۴ ء تک) — مارسیلز کا پادری اور ادیب ، جس نے ایک اہم کتاب تصنیف کی «De gubernatione Dei» ۔ صفحات ۳۷۶ ، ۳۸۰

سانکی (Sankey) ، ایرا ڈیوڈ (۱۸۴۰ ء سے ۱۹۰۸ ء) — امریکی مبلغ انجیل اور موڈی کا رفیق کار ، احیائے مذہب کی تحریک کا ایک بانی ۔ صفحہ ۶۷

سرویئس ٹولیئس (Servius Tullius) (۵۷۸ سے ۵۳۴ ق ۔ م ۔) — قدیم روم کا بادشاہ جس کے بارے میں روایت ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں حکومت کرتا تھا ۔ صفحہ ۳۴۴

سکندر اعظم (Alexander of Macedon) (الیکساندر ماکیدونیائی) ۳۵۶ ق ۔ م ۔ سے ۳۲۳ ق ۔ م ۔) — یونان کا مشہور سپہسالار اور صاحب تخت و تاج ۔ صفحہ ۲۴۴

سوسورے (Saussure) ، آنری (۱۸۲۹ ء سے ۱۹۰۵ ء) — سوئٹزرلینڈ کا عالم اور ماہر حیوانات ۔ صفحہ ۲۰۴

سوگن ہائم (Sugenheim) ، سیموئل (۱۸۱۱ ء سے ۱۸۷۷ ء) — جرمن بورژوا مؤرخ ۔ صفحہ ۲۳۳

سولون (Solon) (تقریباً ۶۳۸ سے تقریباً ۵۵۸ ق ۔ م ۔) — ایتھنز کا مشہور قانون‌ساز ۔ اس نے عام لوگوں کے دباؤ سے کچھ ایسی اصلاحات کی تھیں جن سے قبائلی اشرافیہ کے اختیارات پر ضرب پڑتی تھی ۔ صفحات ۳۰۳ ، ۳۱۷ ، ۳۲۲ ، ۳۲۳ ، ۳۲۴ ، ۳۴۴ ، ۳۱۱

سوی‌لئس (Civilis) ، جولی (پہلی صدی عیسوی) — جرمن قبیلے بتاوین کا رہنما جس نے روما سلطنت کے خلاف جرمن اور گال قبیلوں کی بغاوت کی رہنمائی کی (۷۰ — ۶۹ عیسوی یا ۷۱ — ۶۹ ء) ۔ صفحہ ۳۵۹

سیزر (Caesar) ، گائی جولیس سیزر (زمانہ اندازاً ۱۰۰ سے ۴۴ ق ۔ م ۔ تک) — روم کا شہرۂ آفاق سپہ‌سالار ، سیاسی رہنما اور مصنف ۔ اس کی تصنیف ”گالوں سے جنگ کی روداد“ مشہور ہے ۔ صفحات ۱۸۲ ، ۱۹۶ ، ۲۱۶ ، ۲۸۸ ، ۳۵۰ ، ۳۵۳ ، ۳۶۱ ، ۳۶۲ ، ۳۶۳ ، ۳۶۶ ، ۳۶۹

سین‌سائمون (Saint-Simon) ، آنری (۱۷۶۰ ء سے ۱۸۲۵ ء) — یوٹوپیائی (قیاسی) سوشلزم کی زبردست فرانسیسی شخصیت ۔ صفحات ۷۹ ، ۸۲ ، ۸۶ — ۸۳ ، ۱۰۱

— ش —

شاپیر (Schapper) ، کارل (۱۸۱۲ ء سے ۱۸۷۰ ء) — جرمن اور بین‌الاقوامی مزدور تحریک کی نمایاں شخصیت ، انصاف لیگ کا ایک رہنما ، کمیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی کا ممبر ، جرمنی میں ۴۹ — ۱۸۴۸ ء کے انقلاب میں حصہ لیا ۔ ۱۸۵۰ ء میں

تنگ‌نظر مہم‌باز گروپ کے لیڈروں میں سے تھا جب کمیونسٹ لیگ میں پھوٹ پڑی۔ ۱۸۵۶ء میں پھر مارکس کے ساتھ ہو گیا۔ پہلے انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا ممبر۔ صفحات ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۵۵، ۱۵۹، ۱۶۲، ۱۶۳

شارلی‌مین (Charles the Great or Charlemagne) (تقریباً ۸۱۴ء — ۷۴۲ء) — ۷۶۸ء سے ۸۰۰ء تک فرانک کا بادشاہ اور ۸۰۰ء سے ۸۱۴ء تک شاہنشاہ۔ صفحات ۳۸۱ — ۳۷۹

شافٹسبری، انٹونی، ڈیوک (۱۷۱۳ء — ۱۶۷۱ء) — انگریز فلسفی، فلسفہ میں نمایاں الوہیت پرست، سیاستداں، وھگ۔ صفحہ ۶۲

شٹیبر (Stieber)، ولہلم (۱۸۸۲ء — ۱۸۱۸ء) — پروشیا کا پولیس افسر۔ ۶۰ — ۱۸۵۰ء کے دس برس سیاسی پولیس کا انچارج رہا۔ کمیونسٹ لیگ کے ممبروں پر جو تاریخی مقدمہ (۱۸۵۲ء) کولون میں چلا گیا، اس کی ساری تیاری اسی شخص نے کی تھی اور وہی خاص گواہ بھی تھا۔ صفحہ ۱۳۹، ۱۵۳

شورز (Schurz)، کارل (۱۸۲۹ء سے ۱۹۰۶ء) — جرمن پیٹی بورژوا جمہوریت‌پسند۔ ۱۸۴۹ء میں بادین پفالتس کی بغاوت میں حصہ لیا۔ پھر وطن چھوڑ کر پہلے سوئٹزرلینڈ اور پھر امریکہ چلا گیا۔ وہاں مدبر بن گیا۔ صفحہ ۱۶۰

شومان (Schömann)، گیورگ فریڈرک (۱۷۹۳ء سے ۱۸۷۹ء) — جرمن، ماہر علم زبان اور مؤرخ، قدیم یونان کے بارے میں کئی کتابوں کا مصنف۔ صفحات ۲۴۹، ۳۰۸

— ف —

فارسٹر (Forster)، ولیم ایڈورڈ (۱۸۸۶ء سے ۱۸۱۸ء) — برطانوی کارخانے‌دار اور سیاست‌داں، پارلیمنٹ کا لبرل ممبر۔ آئرلینڈ کے

سکریٹری آف اسٹیٹ (۸۲ — ۱۸۸۰ ء) کی حیثیت سے قومی تحریک آزادی کو سختی سے کچلا - صفحات ۶۸ ، ۷۰

فرڈیننڈ پنجم (Ferdinand V) کیتھولک (۱۴۵۲ ء سے ۱۵۱۶ ء) — کیسٹیل کا بادشاہ (۱۵۰۴ ء — ۱۴۷۴ ء) اور حکمراں (۱۵۱۶ ء — ۱۵۰۷ ء) اور فرڈیننڈ دوم کے نام سے آراگاں کا بادشاہ (۱۵۱۶ ء — ۱۴۷۹ ء) - صفحہ ۲۳۳

فریڈرک ولہلم سوم (Frederick William III) (۱۷۷۰ ء سے ۱۸۴۰ ء) — پروشیا کا بادشاہ (۱۷۹۷ ء سے ۱۸۴۰ ء تک) - صفحات ۲۶ ، ۱۲۳

فری‌من (Freeman) ، ایڈورڈ اوگسٹس (۱۸۲۳ ء سے ۱۸۹۲ ء) — انگریز بورژوا آزادخیال مؤرخ - آکسفورڈ یونی‌ورسٹی کا پروفیسر - صفحہ ۱۶۹

فریلی گراتھ (Freiligrath) ، فرڈیننڈ (۱۸۱۰ ء سے ۱۸۷۶ ء) — جرمن شاعر جو پہلے رومانوی تھا پھر انقلابی ہو گیا - ۴۹ — ۱۸۴۸ ء میں «Neue Rheinisehe Zeitung» کا مدیر ، کمیونسٹ لیگ کا ممبر - چھٹے عشرے میں انقلابی تحریک سے کنارہ کش ہو گیا - صفحہ ۱۶۳

فلوکن (Flocon) ، فرڈیننڈ (۱۸۰۰ ء سے ۱۸۶۶ ء) — فرانسیسی سیاست‌داں ، صحافی ، پیٹی بورژوا جمہوریت‌پسند ، «Réforme» اخبار کا ایک مدیر ، عارضی حکومت کا ایک رکن (۱۸۴۸ ء) - صفحات ۲۹ ، ۱۵۶

فورئے (Fourier) ، شارل (۱۷۷۲ ء سے ۱۸۳۷ ء) — فرانس کا زبردست یوٹوپیائی (قیاسی) سوشلسٹ - صفحات ۷۹ ، ۸۲ ، ۸۸ — ۸۶ ، ۱۱۶ ، ۱۱۹ ، ۱۲۰ ، ۱۸۷ ، ۲۶۰ ، ۳۸۴ ، ۴۱۳

فوستیل دی کولانژے (Fustel de Coulanges) ، نوما دینی (۱۸۳۰ ء سے ۱۸۸۹ ء) — عہد قدیم اور وسطی زمانے کی فرانس کی تاریخ کا فرانسیسی مؤرخ - صفحہ ۳۰۶

فوگٹ (Vogt)، کارل (۱۸۹۵ء — ۱۸۱۷ء) — جرمن نیچرلسٹ۔ گھٹیا مادیت‌پسند۔ پیٹی بورژوا جمہوریت‌پسند۔ ۴۹ — ۱۸۴۸ء کے انقلاب جرمنی میں شریک ہوا۔ ۶۰ — ۱۸۵۰ء کے برسوں میں جب تارک‌وطن تھا لوئی بوناپارٹ کا خفیہ زرخرید ایجنٹ ہو گیا۔ صفحہ ۳۲

فے بین (Fabiuses) — رومی شرفا (پیتریشین) کے ایک گن کا نام۔ صفحہ ۳۴۰

فیسون (Fison)، لاریمر (۱۸۳۲ء سے ۱۹۰۷ء) — انگریز مشنری جس نے فیجی کے جزیروں اور آسٹریلیا کے قبیلوں کے بارے میں کئی کتابیں لکھیں۔ آسٹریلیا میں سائنسی تحقیقات کا بانی۔ صفحات ۲۱۹، ۲۲۲

فینڈر (Pfänder)، کارل (۱۸۱۸ء سے ۱۸۷۶ء) — جرمنی اور بین الاقوامی مزدور تحریک کا ایک رہنما، فن‌کار، ۱۸۴۵ء سے لندن میں بس گیا۔ لندن میں جرمن مزدوروں کی تعلیمی انجمن کا ممبر، کمیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی کا رکن، پہلی انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا ممبر (۶۷ — ۱۸۶۴ء، ۷۲ — ۱۸۷۰ء)۔ مارکس اور اینگلس کا دوست اور رفیق۔ صفحہ ۱۵۱

— ک —

کارٹ‌رائٹ (Cartwright)، ایڈمنڈ (۱۷۴۳ء سے ۱۸۲۳ء) — انگریز میکانک، پہلی کپڑا بننے کی مشین کا موجد۔ صفحہ ۶۵

کارلائل (Carlyle)، تھومس (۱۷۹۵ء سے ۱۸۸۱ء) — انگریز مصنف اور تاریخ‌داں، عینیت پسند فلسفی، ٹوری پارٹی کا حامی۔ ۱۸۴۸ء کے بعد رجعت‌پرست بن گیا۔ اپنی تحریروں میں وہ ہیروپرستی کا پرچار کرتا تھا۔ اس نے رجعت‌پرست رومانیت‌پسندی کے نقطۂ‌نظر سے انگریز بورژوازی کی تنقید کی۔ صفحہ ۸۱

کالوین (Calvin)، ژاں (۱۵۰۹ء سے ۱۵۶۴ء) — تحریک اصلاح دین کا مشہور رہنما، جس نے مسیحی مذہب میں پروٹسٹنٹ ازم کے ایک الگ فرقے ''کالوین ازم'' کی بنیاد رکھی۔ یہ تحریک سرمایہ جمع ہونے کے ابتدائی مرحلے میں بورژوا مفاد کی ترجمان تھی۔ صفحات ۵۸، ۵۹

کانٹ (Kant)، ایمانوئیل (۱۷۲۴ء سے ۱۸۰۴ء) — کلاسیکی جرمن فلسفے کا بانی مبانی، عینیت پرست فلسفی۔ صفحات ۵۳، ۵۴، ۸۸، ۱۰۰

کاورڈ (Coward)، ولیم (۱۷۲۵ء — ۱۶۵۶ء) — انگریز مادیت پسند فلسفی، ڈاکٹر۔ صفحہ ۴۹

کریگے (Kriege)، ہرمن (۱۸۲۰ء سے ۱۸۵۰ء) — جرمن صحافی، ''سچے سوشلزم'' کا نمائندہ۔ پانچویں عشرہ کے آخر میں ''سچے جرمن سوشلسٹوں'' کے گروپ کا نیویارک میں رہنما۔ صفحات ۱۴۹، ۱۵۰

کلائستھینز (Cleisthenes) — ایتھینز کا مدبر۔ ۵۰۷ — ۵۱۰ ق۔م۔ کے دوران اس نے ایسی اصلاحات کی تھیں جن کا مقصد گن نظام کا خاتمہ اور ایتھینز میں غلامی کا نظام قائم کرنا تھا۔ صفحہ ۳۲۵

کلوڈیا (Claudia) — رومی شرفا (پیٹریشین) کے ایک گن کا نام۔ صفحہ ۳۳۱

کلیئن (Klein)، یوگان یاکب (پیدائش ۱۸۱۸ء) — کولون کا ایک ڈاکٹر، کمیونسٹ لیگ کا ممبر۔ کولون کے کمیونسٹوں پر مقدمے میں (۱۸۵۲ء) ماخوذ تھا۔ صفحہ ۱۶۳

کوالیفسکی، م۔م۔ (Kovalevsky) (۱۸۵۱ء سے ۱۹۱۶ء) — روسی ماہر عمرانیات، مؤرخ اور بورژوا لبرل سیاستداں۔ ابتدائی قبائلی تعلقات کے سلسلے میں اپنی تحقیقات کے لئے مشہور ہے۔ صفحات ۳۵، ۲۴۰، ۲۴۲، ۲۴۴، ۲۴۵، ۳۴۷، ۳۵۴، ۳۶۲

کوبڈن (Cobden) ، رچرڈ (۱۸۶۵ ء — ۱۸۰۴ ء) — انگریز صنعت‌کار ، بورژوا سیاست‌داں ، آزاد تجارت کا حامی ، اناج کے قوانین کی مخالف لیگ کا بانی ۔ پارلیمنٹ کا ممبر ۔ صفحہ ۷۰

کوشوت (Kossuth) ، لائی‌اوش (لوڈویگ) (۱۸۰۲ ء سے ۱۸۹۴ ء) — ہنگری کی قومی تحریک آزادی کا رہنما ۔ ۴۹ — ۱۸۴۸ ء کے انقلاب میں بورژوا جمہوریت‌پسندوں کی قیادت کی ، ہنگری کی انقلابی حکومت کا سربراہ تھا ۔ انقلاب کی شکست کے بعد دوسرے دیس میں جا بسا ۔ صفحہ ۱۶۲

کولانژے دی — دیکھئے فوستیل دی کولانژے ۔

کولمبس (Columbus) ، کرسٹوفر (۱۴۵۱ ء سے ۱۵۰۶ ء) — عظیم بحری سیاح جس نے امریکہ دریافت کیا ۔ صفحہ ۲۲

کولنس (Collins) ، انٹونی (۱۷۲۹ ء — ۱۶۷۶ ء) — انگریز مادیت‌پسند فلسفی ، جان لاک کا پیرو ۔ صفحہ ۴۹

کونوف (Cunow) ، ہنریخ ولہلم کارل (۱۸۶۲ ء سے ۱۹۳۶ ء) — جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی میں ترمیمیت کا ایک نظریاتی رہنما ۔ علم الاقوام کا عالم ، قدیم سماج کی تاریخ پر کئی کتابوں کا مصنف ۔ ۱۸۸۰ ء — ۱۸۹۰ ء میں مارکسی خیالات کی طرف جھکا لیکن بعد میں انحراف کر گیا ۔ صفحہ ۲۴۴

کوہلمین (Kuhlmann) ، گیورگ — آسٹریا کی حکومت کا خفیہ ایجنٹ ۔ اپنے آپ کو ”پیغمبر“ کہتا تھا ۔ پانچویں عشرے میں سوئٹزرلینڈ میں جرمن دستکاروں میں مذہبی رنگ دے کر ”سچے سوشلزم“ کا پرچار کرتا تھا ۔ دستکار وائیٹلنگ کے حامی تھے ۔ صفحہ ۱۵۰

کوئنک‌ٹیلیا — رومی شرفا (پیتریشین) کے ایک گن کا نام ۔ صفحہ ۳۳۲

کیمپ‌ہاؤزن (Camphausen)، لیودولف (۱۸۰۳ء سے ۱۸۹۰ء) — جرمن بنک کا منتظم۔ رائن کا لبرل بورژوا۔ مارچ — جون ۱۸۴۸ء میں پروشیا کا وزیر صدر تھا۔ صفحہ ۲۶

کینکیل (Kinkel)، گوتفرید (۱۸۱۵ء سے ۱۸۸۲ء) — جرمن شاعر اور صحافی، پیٹی بورژوا جمہوریت پسند۔ ۱۸۴۹ء میں باڈین پفالتس کی بغاوت میں حصہ لیا۔ لندن میں پیٹی بورژوا تارکین وطن کا لیڈر۔ مارکس اور اینگلس کا مخالف۔ صفحہ ۱۶۱

کئے (Kaye)، جان ولیم (۱۸۱۴ء سے ۱۸۷۶ء) — ہندستان میں انگریزی عہدہ‌دار۔ اس نے ہندستان کی قوموں اور قبیلوں کے بارے میں، افغانستان اور ہندستان میں انگریزی فوجی کارروائیوں اور معرکوں کے متعلق کئی اہم تصنیفیں چھوڑی ہیں۔ صفحہ ۲۱۶

— گ —

گروٹ (Grote)، جارج (۱۷۹۴ء سے ۱۸۷۱ء) — انگریز مؤرخ۔ اس نے کئی جلدوں میں "تاریخ یونان" لکھی ہے۔ صفحات ۳۰۰ — ۳۰۰

گریگوری تورس کا (Gregory of Tours)، گیورگی فلورینتسی (تقریباً ۵۴۰ء سے تقریباً ۵۹۴ء تک) — مسیحی پادری، حدیث کا عالم، ۵۷۳ء سے تورس کا اسقف۔ "فرینک لوگوں" کا مؤرخ، "معجزوں کی سات کتابوں" کا مصنف۔ صفحہ ۳۶۰

گریم (Grimm)، یاکب (۱۷۸۵ء سے ۱۸۶۳ء) — مشہور جرمن ماہرلسانیات اور تہذیب کا مؤرخ۔ جرمانوی زبان و ادب میں اس نے تحقیقات کی ہیں۔ صفحہ ۳۵۵

گفن (Giffen)، رابرٹ (۱۹۱۰ء — ۱۸۳۷ء) — انگریز بورژوا ماہر معاشیات، اعدادوشمار اور مالیات کا ماہر۔ وزارت تجارت کے خاص اعداد و شمار کے محکمے کا سربراہ (۱۸۹۷ء — ۱۸۷۶ء)۔ صفحہ ۱۳۰

گلیڈسٹن (Gladstone) ، ولیم ایوارٹ (۱۸۹۸ ء — ۱۸۰۹ ء) — مشہور انگریز مدبر ، ۱۹ ویں صدی کے دوسرے آدھے میں لبرل پارٹی کا لیڈر رہا ۔ ۱۸۵۲ ء سے ۱۸۶۶ ء تک دو بار وزیرمالیات اور پھر ۱۸۶۸ ء سے ۱۸۹۴ ء تک وقفوں سے چار بار وزیر اعظم رہا ۔ صفحہ ۳۰۸

گوئیٹے (Goethe) ، یوگان والف‌گانگ (۱۸۳۲ ء — ۱۷۴۹ ء) — جرمن زبان کا عظیم شاعر ، ادیب اور مفکر ۔ صفحات ۵۲ ، ۱۰۶ ، ۲۱۲

گیزو (Guizot) ، فرانسوا پیئر ہیوم (۱۷۸۷ ء سے ۱۸۷۴ ء) — فرانس کا بورژوائی مؤرخ اور ریاستی معاملات میں ممتاز ۔ ۱۸۴۰ ء سے ۱۸۴۳ ء تک فرانس کی اندرونی اور بیرونی سیاست کے تار اسی کے ہاتھ میں رہے ۔ صفحہ ۲۸

گیوس (Gaius) (دوسری صدی عیسوی) — رومن عالم قانون ۔ اس نے رومن قانون پر چند سب سے ابتدائی کتابیں مرتب کی تھیں ۔ صفحہ ۲۴۱

گیوگ (Gögg) ، اساندوس (۱۸۹۷ ء — ۱۸۲۰ ء) — جرمن جرنلسٹ ، پیٹی بورژوازی کا جمہوریت پسند ۔ ۱۸۴۹ ء میں باڈین کی عارضی حکومت میں شریک ہوا ۔ انقلاب کی شکست پر ملک چھوڑ کر نکل گیا ۔ ۱۸۷۰ ء کے بعد سے جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل ہو گیا ۔ صفحہ ۱۶۱

— ل —

لاسال (Lassalle) ، فرڈیننڈ (۱۸۲۵ ء سے ۱۸۶۴ ء) — جرمن پیٹی بورژوازی کا آدمی ، مضمون‌نگار اور وکیل ۔ رائن صوبے میں ۴۹ — ۱۸۴۸ ء کی جمہوری تحریک میں شریک ہوا ۔ ۱۸۶۰ ء کے بعدوالے برسوں میں مزدور تحریک سے مل گیا ۔ ۱۸۶۳ ء

میں ''کل جرمن مزدور یونین،، کی بنیاد ڈالنےوالوں میں سے تھا۔ پروشیا کے سائے میں جرمنی کو ملاکر ایک ملک کرنے کی تحریک کا حامی جس نے جرمن مزدور تحریک میں موقع پرستی کی ٹیڑھ پیدا کر دی۔ صفحات ۴۲، ۴۱۱

لافارگ (Lafargue)، پول (۱۸۴۲ء سے ۱۹۱۱ء) — بین‌الاقوامی مزدور تحریک کی ایک نمایاں شخصیت اور مارکس‌ازم کا پرچارک۔ انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا ممبر، اسپین کا مراسلتی سکریٹری (۶۹ — ۱۸۶۶ء)۔ انٹرنیشنل کی شاخیں فرانس (۷۰ — ۱۸۶۹ء)، اسپین اور پرتگال (۷۲ — ۱۸۷۱ء) میں منظم کیں۔ ہیگ کانگرس میں ڈیلی گیٹ (۱۸۷۲ء)۔ فرانس میں مزدور پارٹی کا ایک بانی۔ مارکس اور اینگلس کا شاگرد اور رفیق‌کار۔ صفحہ ۴۴

لاک (Locke)، جان (۱۶۳۲ء سے ۱۷۰۴ء) — ثنویت کا ماننےوالا مشہور انگریز فلسفی جس نے فلسفے میں محسوسیت کو اہم قرار دیا۔ صفحات ۴۹، ۹۶

لاماتین (Lamartine)، الفونس (۱۷۹۰ء سے ۱۸۶۹ء) — فرانسیسی شاعر، مؤرخ اور سیاسی شخصیت۔ ۱۸۴۸ء میں وزیر خارجہ بھی تھا اور عارضی حکومت کا اصلی سربراہ بھی۔ صفحات ۲۹، ۱۵۶

لانگس (Longus) — دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی عیسوی کی ابتدا کا یونانی مصنف۔ صفحہ ۲۶۷

لانگے (Lange)، کرستیان کونرد لوڈویگ (۱۸۲۵ء سے ۱۸۸۵ء) — جرمن ماہرلسانیات۔ روم قدیم کی تاریخ پر اس نے بہت کچھ لکھا ہے۔ صفحہ ۳۳۹

لپلاس (Laplace)، پیئر سیمون (۱۷۴۹ء سے ۱۸۲۷ء) — فرانس کا ممتاز ماہر فلکیات، ریاضی‌داں اور عالم طبیعیات۔ اس نے کانٹ کی تحقیقات سے بےنیاز ہوکر یہ قیاس علم ریاضی کی بنیاد پر مہیا کی اور اسے ترقی دی کہ ہمارا نظام شمسی ابخرات جیسے دھند میں سے ابھرا ہے۔ صفحات ۵۱، ۱۰۰

لوباک (Lubbock)، جان (۱۸۳۴ء سے ۱۹۱۳ء)، — انگریز حیاتیات کا عالم، ڈارون کا پیرو، لسانیات اور علم آثار قدیمہ کا عالم۔ صفحات ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۴

لوتھر (Luther)، مارٹن (۱۴۸۳ء سے ۱۵۴۶ء) — اصلاح دین کی تحریک کا مشہور رہنما جس نے جرمنی میں پروٹسٹنٹ فرقے کی بنیاد رکھی۔ جرمنی کے چودھری (برگر) ذہن کا نمائندہ۔ صفحات ۵۷، ۵۸، ۲۷۲

لوخنیر (Lochner)، گیورگ (پیدائش تقریباً ۱۸۲۴ء) — جرمن اور بین‌اقوامی مزدور تحریک کی ایک نمایاں شخصیت، پیشے کے لحاظ سے بڑھئی، کمیونسٹ لیگ کا ممبر، پہلی انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا رکن۔ مارکس اور اینگلس کا رفیق‌کار۔ صفحہ ۱۵۱

لوکیان (Lucian)، (تقریباً ۱۲۰ء سے تقریباً ۱۸۰ء) — قدیم یونانی طنزیہ قسم کی کتابوں کا ادیب، دھریہ۔ صفحہ ۲۱۱

لوئی بوناپارٹ (Louis Bonaparte) — ملاحظہ ہو نپولین سوم۔

لوئی فلپ (Louis Philippe)، (۱۷۷۳ء سے ۱۸۵۰ء) — اورلین شاہزادہ، فرانس کا بادشاہ (۱۸۴۸ء — ۱۸۳۰ء)۔ صفحات ۶۰، ۶۸، ۱۴۰

لوئی نپولین (Louis Napoleon) — ملاحظہ ہو نپولین سوم۔

لیتورنیو (Letourneau)، شارل ژاں ماری (۱۸۳۱ء سے ۱۹۰۲ء) — فرانسیسی ماہر عمرانیات اور ماہرعلم‌الاقوام۔ صفحات ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۹

لیتھم (Latham)، رابرٹ گارڈن (۱۸۱۲ء سے ۱۸۸۸ء) — انگریز طبیب، لسانیات کا ماہر، علم الاقوام کا عالم، تقابلی علم الاقوام پر متعدد کتابوں کا مصنف۔ صفحہ ۱۷۸

لیسنر (Lessner)، فریڈرک (۱۸۲۵ء سے ۱۹۱۰ء) — جرمن اور بین الاقوامی مزدور تحریک کی ایک نمایاں شخصیت۔ کمیونسٹ لیگ کا ممبر - ۴۹ — ۱۸۴۸ء کے انقلاب میں حصہ لیا۔ کولون کے کمیونسٹوں پر مقدمے میں ماخوذ (۱۸۵۲ء)۔ ۱۸۵۶ء میں لندن چلا گیا۔ لندن میں جرمن مزدوروں کی تعلیمی انجمن کا ممبر، پہلی انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا رکن، برطانوی انڈپنڈنٹ لیبر پارٹی کا ایک بانی، مارکس اور اینگلس کا دوست اور رفیق۔ صفحات ۱۵۱، ۱۶۳

لیدرو رولین (Ledru—Rollin)، الیکساندر اوگوست (۱۸۰۷ء سے ۱۸۷۴ء) — فرانسیسی اہل قلم، پیٹی بورژوازی کے جمہوریت‌پسند لیڈروں میں سے تھا۔ اخبار «Réforme» کا ایڈیٹر۔ آئین‌ساز اور قانون‌ساز دونوں اسمبلیوں کا ممبر اور وہاں ''مونٹین،، (پہاڑی) پارٹی کا لیڈر۔ بعد میں ملک چھوڑ کر نکل گیا۔ صفحہ ۱۶۱

لینئی (Linnaeus)، کارل (۱۷۰۷ء سے ۱۷۷۸ء) — سویڈن کا مشہور نیچرلسٹ۔ پودوں اور جانوروں کی درجہ‌بندی کا ایک باقاعدہ نظام اسی نے تیار کیا ہے۔ صفحہ ۱۰۲

لیوتپراند (Liutprand)، (تقریباً ۹۲۲ء سے تقریباً ۹۷۲ء) — کریمونا (شمالی اٹلی) کا پادری، ازمنۂ وسطی کا عالم۔ کتاب ''انعام،، («Recompense») کا مصنف۔ صفحہ ۳۷۵

لیوی تیتس (Livy Titus) (۵۹ ق۔ م۔ سے ۱۷ عیسوی) — رومن مؤرخ، ''روم کی تاریخ، شہر کے آغاز سے،، کا مصنف۔ صفحات ۳۳۶، ۳۳۹

— م —

مابلی (Mably)، گیبرائل بونو (۱۷۰۹ء سے ۱۷۸۵ء) — فرانسیسی ماہر سماجیت، مساوات‌پسند یوٹوپیائی کمیونزم کا نظریہ‌ساز۔ صفحہ

مارکس (Marx)، جینی (۱۸۱۴ء سے ۱۸۸۱ء) — گھر کا نام تھا فون ویسٹفالین - کارل مارکس کی بیوی، صحیح معنوں میں شریکِحیات اور مددگار - صفحات ۲۷، ۱۵۰

مارکس (Marx)، کارل (۱۸۱۸ء سے ۱۸۸۳ء) - صفحات ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۱ — ۳۵، ۳۸ — ۴۵، ۴۹، ۶۳، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۱۷، ۱۳۷ — ۱۳۵، ۱۵۱ — ۱۴۹، ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۶ — ۱۶۴، ۲۰۱، ۲۱۱، ۲۲۵، ۲۲۸، ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۷، ۲۵۲، ۲۵۷، ۳۰۴ — ۳۰۱، ۳۰۸، ۳۸۵، ۳۹۴، ۴۱۴

مارگن (Morgan)، لیوئس ہنری (۱۸۱۸ء سے ۱۸۸۱ء) — امریکہ کا مشہور عالم، مؤرخ، جس نے ابتدائی سماج کی تحقیق کی ہے، مادیت کا قائل - صفحات ۱۶۶، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۲۰۰، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۱۰، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۵، ۲۵۳، ۲۷۶، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۵، ۲۹۴، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۸، ۳۱۲، ۳۱۴، ۳۲۶، ۳۴۰، ۳۵۲، ۳۸۵، ۴۱۳، ۴۱۴

مازینی (Mazzini)، جوزپ (۱۸۰۵ء سے ۱۸۷۲ء) — اٹلی کا مشہور انقلابی اور بورژوا ڈیموکریٹ - قومی آزادی کی تحریک کا ایک سرگرم لیڈر - ۱۸۴۹ء میں جب روم کی ریپبلک قرار دی گئی تو عارضی حکومت کا سربراہ وہی تھا - ۱۸۵۰ء میں یورپی ڈیموکریٹوں کی ایک مرکزی کمیٹی لندن میں بنائی گئی تو اس کی تنظیم میں بھی پیش پیش رہا - پہلی انٹرنیشنل قائم ہوئی تو اسے اپنے ہاتھ تلے رکھنے کی کوشش کی، پھر اٹلی میں علاحدہ سے مزدور تحریک کی ترقی میں رکاوٹ ڈالتا رہا - صفحات ۱۴۰، ۱۶۱

مانٹیل (Mantell)، گڈیون اولجیرنن (۱۷۹۰ء سے ۱۸۵۲ء) — علم الارض اور علم معدومیات کا انگریز ماہر جو سائنسی تحقیقات

کے نتائج کو انجیل کی داستانوں سے ہم‌اہنگ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ صفحہ ۵۰

ماورر (Maurer) ، گیورگ لدوگ (۱۷۹۰ء سے ۱۸۷۲ء) — جرمنی کا ایک مشہور بورژوا مؤرخ ۔ اس نے قدیم اور وسطی زمانے کے جرمنی میں سماجی نظام کی تحقیق کی ہے ۔ صفحات ۲۹۴ ، ۳۵۸ ، ۳۶۲

مرتینتی (Martignetti) ، پاسکاؤلے — اطالوی سوشلسٹ ۔ مارکس اور اینگلس کی تصانیف کا اطالوی زبان میں ترجمہ کیا ۔ صفحہ ۱۷۱

موڈی (Moody) ، ڈوائٹ لیمان (۱۸۳۷ء سے ۱۸۹۹ء) — امریکی پروٹسٹنٹ ، مبلغ انجیل ، واعظ ۔ صفحہ ۶۷

موریلی (Morelly) — فرانس میں اٹھارھویں صدی کے مساویانہ یوٹوپیائی کمیونزم کا نمائندہ ۔ صفحہ ۷۹

مول (Moll) ، جوزف (۱۸۱۳ء سے ۱۸۴۹ء) — جرمن اور بین الاقوامی مزدور تحریک میں ایک نمایاں شخصیت ، انصاف لیگ کا ایک لیڈر ، کمیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی کا رکن ۔ ۱۸۴۹ء میں باڈین پفالتس کی بغاوت میں حصہ لیا اور سورگا کی لڑائی میں کام آیا ۔ صفحات ۱۴۱ ، ۱۵۱ ، ۱۵۵ ، ۱۵۹

مولیئر (Molière) ، ژاں باتیست (۱۶۲۲ء سے ۱۶۷۳ء) (اصل نام پوکلین) — فرانس کا عظیم ڈرامہ‌نگار ۔ صفحہ ۳۹۸

مومسن (Mommsen) ، تھیوڈور (۱۸۱۷ء سے ۱۹۰۳ء) — جرمن مؤرخ ، رومی تاریخ اور رومن قانون کی تاریخ پر کئی کتابیں لکھی ہیں ۔ صفحات ۳۰۲ ، ۳۳۴ ، ۳۳۵ ، ۳۳۶ ، ۳۳۷ ، ۳۴۰ ، ۳۴۲

میٹرنک (Metternich) ، کلیمنس وینزل (۱۷۷۳ء سے ۱۸۵۹ء) — رجعت‌پرست آسٹریائی سیاست‌داں، وزیرخارجہ (۱۸۲۱ء — ۱۸۰۹ء)،

چانسلر (۱۸۴۸ء — ۱۸۲۱ء)، ''مقدس معاہدہ'' (Holly Alliance) کے منظم کرنےوالوں میں سے ایک۔ صفحہ ۱۲۲

میکلینن (McLennan)، جان فرگوسن (۱۸۲۷ء سے ۱۸۸۱ء) — اسکاٹ‌لینڈ کا بورژوا سائنس‌داں، پیشہ کے لحاظ سے وکیل اور مؤرخ، خاندان اور شادی کے موضوع پر کئی کتابوں کا مصنف ہے۔ صفحات ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۹۹، ۲۲۶، ۲۴۶، ۲۸۱، ۳۴۷

مینتیل (Mentel) ہرستیان فریڈرک (پیدائش ۱۸۱۲ء) — جرمن درزی، انصاف لیگ کا ممبر۔ ۴۷ — ۱۸۴۶ء میں لیگ کے خلاف مقدمے کے سلسلے میں قید کر لیا گیا۔ صفحہ ۱۴۳

مینرس (Manners)، جان جیمس رابرٹ (۱۸۱۸ء سے ۱۹۰۶ء) — انگریز سیاست داں، ٹوری کا ممبر، بعد میں کنزرویٹو پارٹی کا ممبر۔ کنزرویٹر وزارتوں میں کئی بار وزیر رہا۔ صفحہ ۱۷

میونتسر (Münzer)، تھومس (۱۴۹۰ء سے تقریباً ۱۵۲۵ء) — جرمنی کا زبردست انقلابی، اصلاح‌دین کی تحریک کے زمانے میں اور ۱۵۲۵ء کی کسانوں کی جنگ کے دنوں میں غریب کسانوں کا لیڈر اور ذہنی رہنما۔ یوٹوپیائی مساویانہ کمیونزم کے خیالات کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ صفحہ ۷۹

میئن (Maine)، ہنری جیمس سامنیر (۱۸۲۲ء سے ۱۸۸۸ء) — انگریز ماہر قانون اور مؤرخ، قدیم زمانے کے قوانین کی تحقیقات اور چھان‌بین کی۔ صفحہ ۲۷۱

— ن —

ناتھجونگ (Nothjung)، پیٹر (۱۸۲۱ء سے ۱۸۶۶ء) — جرمن درزی، کولون مزدور یونین کا ممبر، کمیونسٹ لیگ کا رکن۔

کولون کے کمیونسٹوں پر مقدمے میں ماخوذ تھا (۱۸۵۲ء)۔ صفحہ ۱۶۲، ۱۶۳

نپولین اول (Napoleon I)، بوناپارٹ (۱۷۶۹ء سے ۱۸۲۱ء) — فرانسیسی شہنشاہ رہا (۱۸۰۴ء سے ۱۸۱۴ء اور ۱۸۱۵ء میں)۔ صفحات ۸۱، ۹۱، ۱۲۲، ۲۵۵، ۲۸۱

نپولین سوم (Napoleon III)، لوئی نپولین بوناپارٹ (۱۸۰۸ء سے ۱۸۷۳ء) — نپولین اول کا بھتیجا۔ ۵۱ — ۱۸۴۸ء میں دوسری ریپبلک کا صدر تھا۔ پھر ۱۸۵۲ء سے ۱۸۷۰ء تک فرانس کا شہنشاہ بنا رہا۔ صفحات ۵۱، ۶۷

نپولین، شاہزادہ — دیکھئے بوناپارٹ، نپولین ژوزف شارل پول۔

نیارکس (Nearchus) (تقریباً ۳۶۰ ق۔ م۔ سے تقریباً ۳۱۲ ق۔ م، تک) — سکندر اعظم کا رفیق جنگ، بحری بیڑے کا اعلیٰ سردار تھا۔ ہندستان کی مہم میں شریک تھا۔ ہندستان سے میسوپوتامیہ تک سکندر کے معرکوں کا حال اسی نے تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ صفحہ ۲۴۴

نیبور (Niebuhr)، بارتھلد گیورگ (۱۷۷۶ء سے ۱۸۳۱ء) — جرمن مؤرخ، قدیم روم کی تحقیقات کی۔ صفحات ۳۰۲، ۳۰۴، ۳۴۶، ۴۰۱

نیدیج (Nâdejde)، یون (۱۸۵۴ء سے ۱۹۲۸ء) — روبانیہ کا صحافی، مترجم، سوشل ڈیموکریٹ۔ دسویں عشرے میں موقع پرست ہو گیا۔ صفحہ ۱۷۱

نیوٹن (Newton)، اسحاق (آئزک) (۱۶۴۲ء سے ۱۷۲۷ء) — شہرۂ آفاق عالم طبیعیات، انگریز ماہر فلکیت، ریاضی کے علوم پر حاوی، کلاسیکی میکانیکس کا موجد اور بانی۔ صفحات ۱۰۰، ۱۰۲

— و —

واٹ (Watt) ، جیمس (۱۷۳۶ ء سے ۱۸۱۹ ء) — انگریز ماہر طبیعیات، انجنیر ، جدید بھاپ کے انجن کے موجدوں میں سے ایک ۔ صفحہ ۶۵

واٹسن (Watson) ، جان فاربس (۱۸۲۷ ء سے ۱۸۹۲ ء) — انگریز ڈاکٹر ۔ ہندستان پر انگریزی حکومت کا عہدہدار ۔ ۱۸۵۸ ء سے ۱۸۷۹ ء تک لندن میں ہندستان کے میوزیم کا ڈائرکٹر رہا ۔ اس نے ہندستان کے بارے میں کئی کتابیں لکھی ہیں ۔ صفحہ ۲۱۶

وارس (Varus) ، پبلیئس کوئن ٹیلیئس (پیدائش تقریباً ۵۳ واں قبل مسیح ، وفات ۹ واں عیسوی) — رومی سیاسی لیڈر اور سپہسالار (عیسوی کے ساتویں اور نویں برسوں میں) ۔ جرمنی میں رومی گورنر جنرل تھا ۔ جرمن قبیلوں کی بغاوت کے دنوں میں مارا گیا ۔ صفحہ ۳۳۲

واکسمتھ (Wachsmuth) ، ارنسٹ ولہلم گوتلب (۱۷۸۴ ء سے ۱۸۶۶ ء) — جرمن بورژوا مؤرخ ۔ لیپزگ میں پروفیسر تھا ۔ قدیم زمانے کے حالات اور یورپ کی تاریخ پر کئی کتابیں لکھیں ۔ صفحہ ۲۵۰

واگنر (Wagner) ، رخارد (۱۸۱۳ ء سے ۱۸۸۸ ء) — عظیم جرمن نغمہنگار ۔ صفحات ۲۱۱ ، ۲۱۲

والفرام فان اشن باخ (Wolfram von Eschenbach) (تقریباً ۱۱۷۰ ء — تقریباً ۱۲۲۰ ء) — ازسنۂ وسطی کا جرمن شاعر ۔ صفحہ ۲۵۸

وائیٹلنگ (Weitling) ، ولہلم (۱۸۰۸ ء سے ۱۸۷۱ ء) — جرمنی میں جب مزدور تحریک نے سر اٹھایا تو یہ شخص اس کا ایک اہم لیڈر تھا ۔ قیاس پر مبنی مساویانہ کمیونزم کے نظریہ سازوں میں اس کا نام بھی آتا ہے ۔ پیشے کے لحاظ سے درزی تھا ۔ صفحات ۹۳ ، ۱۴۲ ، ۱۴۳ ، ۱۴۵ ، ۱۴۶ ، ۱۴۹ ، ۱۵۰ ، ۱۵۹ ، ۱۶۲

وسٹرمارک (Westermarck) ، ایڈورڈ الیکساندر (۱۸۶۲ ء سے ۱۹۳۹ ء) — عمرانیات اور علم‌الاقوام کا فینی ماہر ۔ ہلسنگفرس یونی‌ورسٹی میں پروفیسر تھا ۔ صفحات ۲۰۴ ، ۲۰۷ ، ۲۰۹ ، ۲۱۰ ، ۲۲۹ ، ۲۳۰

وکٹوریہ (Victoria) (۱۸۱۹ ء سے ۱۹۰۱ ء) — ملکۂ انگلستان (۱۹۰۱ ء — ۱۸۳۷ ء) ۔ صفحہ ۹۱

وولف (Wolff) ، ولہلم (۱۸۰۹ ء سے ۱۸۶۴ ء) — جرمن پرولتاری انقلابی ، مارچ ۱۸۴۸ء سے کمیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی کا ممبر ۔ ۴۹ — ۱۸۴۸ ء میں «Neue Rheinische Zeitung» کا ایڈیٹر ، فرینکفورٹ قومی اسمبلی کا رکن ۔ بعد میں انگلستان چلا گیا ۔ مارکس اور اینگلس کا رفیق کار اور دوست ۔ صفحات ۱۵۲ ، ۱۵۵ ، ۱۵۷

ویرموتھ (Wermuth — ہنوور میں پولیس ڈائرکٹر ، کولون کے کمیونسٹوں پر مقدمے میں گواہ (۱۸۵۲ ء) ۔ شٹیبر کے ساتھ ملکر ”انیسویں صدی کی کمیونسٹ سازشیں“ نامی کتاب لکھی ۔ صفحات ۱۳۹ ، ۱۵۳

ویسٹ‌فالین (Westphalen) ، فرڈیننڈ فون (۱۷۹۹ ء سے ۱۸۷۶ ء) — پروشیا کا رجعت‌پرست سیاست‌داں ۔ وزیر داخلہ (۵۸ — ۱۸۵۰ ء) ، جینی مارکس کا سوتیلا بھائی ۔ صفحہ ۲۷

ویلیخ (Willich) ، آگسٹ (۱۸۱۰ ء سے ۱۸۷۸ ء) — پروشیا کا افسر ، کمیونسٹ لیگ کا ممبر ۔ ۱۸۴۹ ء میں باڈین پفالتس بغاوت میں حصہ لیا ۔ تنگ نظر اور سہم‌پرست گروپ کا ایک لیڈر جو ۱۸۵۰ ء میں کمیونسٹ لیگ سے الگ ہو گیا ۔ ۱۸۵۳ ء میں امریکہ چلا گیا جہاں شمال کی حمایت میں خانہ جنگی میں حصہ لیا ۔ صفحات ۱۵۹ ، ۱۶۲ ، ۱۶۳

ویلیدا (Veleda) (پہلی صدی عیسوی) — بروکترین قبیلے کی پجارن اور پیغمبرنی جس نے روما سلطنت کے خلاف سوی‌لئس کی رہنمائی میں جرمن اور گال قبیلوں کی بغاوت میں سرگرمی سے شرکت کی جو

۶۹ ویں — ۷۰ عیسوی یا ۶۹ ویں — ۷۱ ویں میں ہوا۔ صفحہ ۳۵۹

وینیڈئی (Veneday)، یاکب (۱۸۰۵ء سے ۱۸۷۱ء) — ترقی پسند جرمن صحافی۔ ۴۹ — ۱۸۴۸ء میں فرینکفورٹ کی قومی اسمبلی کا ممبر، بائیں بازو کی سیاست کا حامی، بعد میں لبرل ہو گیا۔ صفحہ ۱۳۹

وئیز (Waitz)، گیورگ (۱۸۱۳ء سے ۱۸۸۶ء) — جرمن بورژوا نظریے سے ازمنۂ وسطی کا مؤرخ۔ صفحہ ۳۶۲

— ہ —

ہارٹلی (Hartley)، ڈیوڈ (۱۷۰۵ء — ۱۷۵۷ء) — انگریز ڈاکٹر، مادیت‌پسند فلسفی۔ صفحہ ۴۹

ہارنی (Harney)، جارج جولین (۱۸۱۷ء سے ۱۸۹۷ء) — چارٹسٹ تحریک کے بائیں بازو کا رہنما، اسی تحریک کے لئے رسالوں کا مدیر۔ مارکس اور اینگلس سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ صفحہ ۱۴۸

ہارینگ (Harring)، ہارو (۱۷۹۸ء سے ۱۸۷۰ء) — جرمن مصنف، پیٹی‌بورژوا ترقی‌پسند۔ ۱۸۲۸ء سے کئی ملکوں میں تارک وطن کی حیثیت سے رہا۔ صفحہ ۱۴۹

ہاؤپٹ (Haupt)، ہرمن ولہلم (پیدائش تقریباً ۱۸۳۱ء) — جرمن تجارتی افسر، کمیونسٹ لیگ کا ممبر۔ کولون کے کمیونسٹوں پر مقدمے میں ماخوذ تھا جہاں اس نے غدارانہ شہادت دی۔ بعد میں رہا کر دیا گیا اور برازیل فرار ہو گیا۔ صفحہ ۱۶۲

ہاوٹ (Howitt)، الفریڈ ولیم (۱۸۳۰ء سے ۱۹۰۸ء) — آسٹریلین علم‌الانسان کا ماہر جو ایک انگریزی عہدہ‌دار تھا (۱۹۰۱ء — ۱۸۶۲ء)۔ اس نے آسٹریلیا کے قبائل پر کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ صفحہ ۲۲۲

ہشکے (Huschke) ، گیورگ فلپ ایڈورڈ (۱۸۰۱ ء سے ۱۸۸۶ ء) — جرمن بورژوا عالم‌قانون ۔ رومن قانون پر کئی کتابوں کا مصنف ۔ صفحہ ۳۳۹

ہنری ہفتم (HenryVII) (۱۴۵۷ ء سے ۱۵۰۹ ء) — ۱۴۸۵ ء سے ۱۵۰۹ ء تک انگلینڈ کا بادشاہ ۔ صفحہ ۶۰

ہنری ہشتم (Henry VIII) (۱۴۹۱ ء سے ۱۵۴۷ ء) — ۱۵۰۹ ء سے ۱۵۴۷ ء تک انگلینڈ کا بادشاہ ۔ صفحہ ۶۰

ہنزمان (Hansemann)، ڈیوڈ (۱۷۹۰ ء سے ۱۸۶۴ ء) — جرمن سرمایہ‌دار ، رائن‌صوبے کے لبرل بورژوازی کا ایک لیڈر ۔ مارچ اور ستمبر ۱۸۴۸ ء میں پروشیا کا وزیر مالیات ۔ صفحہ ۲۶

ہوبس (Hobbes) ، تھومس (۱۵۸۸ ء سے ۱۶۷۹ ء) — ممتاز انگریز فلسفی ۔ میکانیکی مادیت پسندی کا نمائندہ ۔ صفحات ۴۹ — ۴۷ ، ۶۲

ہومبولٹ (Humboldt) ، الیکساندر (۱۷۶۹ ء سے ۱۸۵۹ ء) — عظیم جرمن فطرت‌پرست اور سیاح ۔ صفحہ ۲۸

ہومر (Homer) — نیم داستانی قدیم یونانی شاعر ، ”ایلیڈ“ اور ”اوڈیسی“ کا مشہور مصنف ۔ صفحات ۱۹۶ ، ۲۴۸ ، ۲۴۹ ، ۳۰۵ ، ۳۰۷ ، ۳۰۸ ، ۳۱۰

ہیراقلیتس (Heraclitus) (چھٹی صدی قبل مسیح کا اختتام اور پانچویں صدی کا آغاز) — قدیم یونانی مادیت‌پسند فلسفی اور ماہر جدلیات ۔ صفحہ ۹۵

ہیرود (Herod) (۷۳ سے ۴ ق ۔ م ۔ تک) — یہودیوں کا بادشاہ (۴۰ سے ۴ ق ۔ م ۔ تک) ۔ صفحہ ۳۴۲

ہیروڈوٹس (Herodotus) (تقریباً ۴۸۴ سے تقریباً ۴۲۵ ق ۔ م ۔) — قدیم یونانی مؤرخ ۔ صفحات ۲۱۶ ، ۲۵۰

ہیرویگھ (Herwegh)، گیورگ (۱۸۱۷ ء سے ۱۸۷۵ ء) — جرمن شاعر ، پیٹی بورژوا جمہوریت پسند ۔ صفحہ ۱۵۵

ہیگل (Hegel) ، گیورگ ولہلم فریڈرک (۱۷۷۰ ء سے ۱۸۳۱ ء) — کلاسیکی جرمن فلسفے کی سب سے قداور شخصیت ، معروضی آئڈیلسٹ ۔ صفحات ۵۳ ، ۷۷ ، ۸۸ ، ۹۴ ، ۱۰۲ — ۱۰۰ ، ۱۰۴ ، ۳۰۲ ، ۳۱۱

ہیوزلر (Heusler) ، آندریئس (۱۸۳۴ ء سے ۱۹۲۱ ء) — سوئٹزرلینڈ کا بورژوا ماہرقانون ، سوئس اور جرمن قانون پر کئی کتابوں کا مصنف ۔ صفحہ ۲۴۳

— ی —

یاروسلاف عاقل (Yaroslav the Wise) (۹۷۸ ء سے ۱۰۵۴ ء) — کیئف کا عظیم بادشاہ (۱۰۱۹ ء سے ۱۰۵۴ ء تک) ۔ صفحہ ۲۴۳

یاکوبی (Jacoby) ، ابراھام (۱۸۳۰ ء سے ۱۹۱۹ ء) — جرمن ڈاکٹر ، کمیونسٹ لیگ کا ممبر ، کولون کے کمیونسٹوں پر مقدمے میں ماخوذ (۱۸۵۲ ء) ۔ ۱۸۵۳ ء میں ترک وطنی کرکے انگلستان اور بعد میں امریکہ چلا گیا ۔ وہاں اخباروں کے ذریعے مارکسی خیالات پھیلائے ۔ امریکہ کی خانہ جنگی میں شمال کی طرف سے حصہ لیا ۔ کئی طبی اداروں کا پروفیسر اور صدر ، طب پر بہت سی کتابوں کا مصنف ۔ صفحات ۱۶۳

یوری پیڈیز (Euripides) (تقریباً ۴۸۰ سے تقریباً ۴۰۶ ق ۔ م ۔) — قدیم یونانی ڈرامہ نگار ۔ صفحہ ۲۵۰

ادبی اور افسانوی شخصیتیں

— الف —

ابراھیم (Abraham) — انجیل کے مطابق یہودیوں کے پیغمبر اعظم۔ صفحہ ۲۳۶

اپولو (Apollo) — قدیم یونانی دیومالا میں سورج اور روشنی کا دیوتا اور فنون لطیفہ کا سرپرست۔ صفحات ۱۷۴ ، ۱۷۵

آرسطس (Orestes) — قدیم یونانی دیومالا میں آگامنون اور کلیتم‌نسترا کا بیٹا ، جس نے اپنی ماں اور اگیس‌تھس سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لیا۔ ایسکیلس کے المیے ''آرسطیا،، کا ھیرو۔ صفحہ ۱۷۳

ارگوناٹ (Argonauts) — قدیم یونانی دیومالا میں ''ارگو،، جہاز کے ملاح جو یونان سے کولخیدا اس لئے روانہ ہوئے تھے کہ سنہری اون حاصل کریں جس کا محافظ اژدھا تھا۔ صفحہ ۳۵۶

اکیلیس (Achilles or Achill) — قدیم یونانی دیومالا کا سب سے بڑا سورما جس نے ٹرائے کا محاصرہ کیا تھا۔ ھومر کی ڈرامائی نظم ''ایلیڈ،، کا ایک ھیرو۔ دیومالا کے مطابق اکیلیس پاشنہ میں تیر سے مہلک زخمی کیا گیا۔ یہ پاشنہ اس کے جسم کی ایک ھی کمزور جگہ تھا۔ صفحات ۲۴۸ ، ۳۱۰

آگامنون (Agamemnon) — قدیم یونانی دیومالا میں آرگوس کا داستانی بادشاہ ، ''ایلیڈ'' کا ایک کردار ۔ ٹرائے کا محاصرہ کرنےوالے یونانیوں کا سربراہ ۔ ایسکیلس کے لکھے ہوئے المیے ''ٹرائے'' کا ہیرو ۔ صفحات ۱۷۳ ، ۲۴۸ ، ۳۰۵ ، ۳۱۰

اگیس‌تھس (Aegisthus) — قدیم یونانی دیومالا میں کلیتم‌نسترا کا عاشق ، جس نے آگامنون کو قتل کرنے میں حصہ لیا تھا ، ایسکیلس کے لکھے ہوئے المئے ''آرسطیا'' کے پہلے اور دوسرے حصوں کا ہیرو ۔ صفحہ ۱۷۳

آلتھیا (Althaea) — قدیم یونانی دیومالا میں تھیستیئس کی لڑکی اور میلیاگیر کی ماں ۔ صفحہ ۳۵۶

انائیطس (Anaitis) — اناھیتا (Anahita) کا قدیم یونانی نام ، قدیم ایرانی دیومالا میں پانی اور بارآوری کی دیوی ۔ صفحات ۲۳۰ ، ۲۵۳

اوتا ناروے کی (the Norwegian Ute) — قدیم جرمن عوامی رزمیہ‌نظم اور ازمنۂ‌وسطی کی نظم ''گدرون'' کی ہیروئن ۔ صفحہ ۲۶۹

اوڈیسیئس (Odisseus) — ہومر کی رزمیہ نظموں ''ایلیڈ'' اور ''اوڈیسی'' کا ہیرو ، اتھاکا جزیرے کا پراسرار بادشاہ ، جنگ ٹرائے میں یونان کی فوج کا ایک بہادر ، چالاک اور خوش بیان سالار ۔ صفحہ ۳۱۰

ایتزل (Etzel) — قدیم جرمن رزمیہ شاعری اور ازمنۂ‌وسطی کی نظم ''نی‌بیلونگ کا گیت'' کا ہیرو اور ھنوں کا بادشاہ ۔ صفحہ ۲۶۹

ایتھنہ پلاس (Athene Pallas) — قدیم یونانی دیومالا میں ایک اھم دیوی — جنگ کی دیوی ، دانش کا نشان اور ایتھنز کی سرپرست ۔ صفحات ۱۷۴ ، ۱۷۵

ایتیوکلیز (Eteocles) — قدیم یونانی دیومالا میں تھیبیز کے بادشاہ ادیپس کا بیٹا جو حکمرانی میں اپنے بھائی پولینیئس کا شریک تھا ،

جس نے مقابلے میں پولینیئس کو مار ڈالا اور خود بھی بھائی کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہ قصہ ایسکیلس نے اپنے المیے ''تھیبیز کے خلاف سات،، میں بیان کیا ہے۔ صفحہ ۳۰۷

ایرینیئس (Erinyes) — قدیم یونانی دیومالا میں وہ دیویاں جو گناہوں کی سزا دینے کےلئے بھیجی گئی تھیں اور جن کے بال سانپوں کی طرح تھے۔ صفحات ۱۷۳، ۱۷۵

ایفروڈائٹ (Aphrodite) — قدیم یونانی دیومالا میں محبت اور حسن کی دیوی۔ صفحہ ۲۵۳

ایمویئس (Eumeaus) — ہومر کی رزمیہ نظم ''اوڈیسی،، کا ایک کردار۔ اتھاکا جزیرے کے بادشاہ اوڈیسیئس کے سوروں کی دیکھبھال کرنےوالا۔ وہ بادشاہ کی طویل جلاوطنی کے زمانے میں اس کا وفادار رہا۔ صفحہ ۳۱۰

— ب —

برون‌ہلدا (Brunhild) — قدیم جرمن رزمیہ شاعری اور ازمنۂ وسطی کی نظم ''نی‌بیلونگ کا گیت،، کی ہیروئن، آئس‌لینڈ کی ملکہ اور بعد میں برگنڈیوں کے شاہ گنتھر کی بیوی۔ صفحہ ۲۶۹

بوریئڈ (Boreades) — قدیم یونانی دیومالا میں بادشمالی کے دیوتا بورےآس اور شاہ ایتھینز کی بیٹی اوریتھائیا کی اولاد۔ صفحہ ۳۵۷

— پ —

پرومیتھیس (Prometheus) — قدیم یونانی دیومالا میں ایک دیوپیکر نسل کا مرد۔ اس نے دیوتاؤں کی آگ چرا کہ لوگوں کو دیدی جائے۔ سزا میں اسے چٹان سے باندھ دیا گیا جہاں روزانہ عقاب اس کا کلیجہ کھایا کرتے تھے۔ صفحہ ۱۱۷

پولینیئس (Polyneices) — قدیم یونانی دیومالا میں تھیبیز کے بادشاہ ادیپس کا بیٹا۔ اپنے بھائی ایتیوکلیز کے ساتھ وہ سلطنت میں

حصےدار تھا۔ ڈوئل میں بھائی کو مار ڈالا لیکن خود بھی بھائی کے ہاتھوں مارا گیا۔ ایسکیلس نے اپنے المیے ''تھیبیز کے خلاف سات،، میں یہ قصہ بیان کیا ہے۔ صفحہ ۳۰۷

— ت —

تھیستیئس (Thestius) — قدیم یونانی دیومالا کے مطابق ائیتولیا میں پلیورون کا مشہور حکمران۔ صفحہ ۳۵۶

تھیسیئس (Theseus) — قدیم یونانی دیومالا میں ایک اہم ہیرو، ریاست ایتھنز کا بانی اور اس کا والی۔ صفحات ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۵۶

تیلامون (Telamon) — قدیم یونان کی دیومالا میں ایک ہیرو جس نے جنگ ٹرائے میں حصہ لیا تھا۔ صفحہ ۲۴۸

تیلی ماکس (Telamachus) — ہومر کی رزمیہ نظم ''اوڈیسی،، کا ہیرو، اتھاکا جزیرے کے فرمانروا اوڈیسیئس کا بیٹا۔ صفحہ ۲۴۸

تیوکراس (Teukros) — ہومر کی رزمیہ نظم ''ایلیڈ،، کا ہیرو جس نے ٹرائے کے قریب جنگ میں حصہ لیا تھا۔ صفحہ ۲۴۸

— د —

دافنی (Daphnis) — لانگس کے قدیم یونانی ناول ''دافنی اور کلوئی،، کا ہیرو۔ صفحہ ۲۶۷

دیمودوکس (Demodocus) — ہومر کی رزمیہ نظم ''اوڈیسی،، کا ایک کردار، پراسرار بادشاہ الکینوس کے دربار کا اندھا بھاٹ۔ صفحہ ۳۱۰

دینڈن (Dandin)، جارج — مولیئر کی کومیڈی ''جارج دینڈن،، کا خاص کردار۔ ایک بیوقوف مالدار کسان کو چالاکی سے دھوکا

دے کر ایک شکستہ حال لیکن شرفا سے تعلق رکھنےوالی ایک عورت اس سے شادی کر لیتی ہے، یہ ہے اس کی کہانی۔ صفحہ ۳۹۸

— ر —

رومولس (Romulus) — قدیم روم کا داستانی بانی اور اس کا پہلا حکمران۔ صفحات ۳۳۲ ، ۳۳۶

— ز —

زیوس (Zeus) — قدیم یونانی دیومالا میں سب سے بڑا دیوتا۔ صفحہ ۳۱۰

— س —

سف (Sif) — قدیم اسکینڈی‌نیویا کی دیومالا میں بجلی کی گرج کے دیوتا تھور کی بیوی ، قدیم اسکینڈی‌نیویا کی رزمیہ‌نظم ’’ ایلڈر ایڈا ،، کی ایک ہیروئن۔ صفحہ ۳۰۵

سگفرید (Siegfried) — قدیم جرمن رزمیہ‌نظم اور ازمنۂ وسطی کی نظم ’’ نی‌بیلونگ کا گیت ،، کا ایک ہیرو۔ صفحہ ۲۶۹

سگفرید مورلینڈ کا (Siegfried of Morland) — قدیم جرمن رزمیہ‌نظم اور تیرھویں صدی کی عظیم نظم ’’ گدرون ،، کا ہیرو ، گدرون کا ایک ناکام دولھا۔ صفحہ ۲۶۹

سیگبانت آئرلینڈ کا (Sigebant of Ireland) — قدیم جرمن رزمیہ‌نظم اور ازمنۂ وسطی کی عوامی نظم ’’ گدرون ،، کا ہیرو اور آئرلینڈ کا بادشاہ۔ صفحہ ۲۶۹

سینڈریلا — پریوں کی کہانی کی ہیروئن جو تمام دنیا میں مشہور ہے۔ یہ منکسر مزاجی اور محنت پسندی کا نمونہ ہے اور ساتھ ہی مظلومیت کا نشان۔ صفحہ ۱۴۳

— ف —

فریےیا (Freya) — قدیم اسکینڈی‌نیویا کی دیومالا میں بارآوری اور محبت کی دیوی ۔ قدیم اسکینڈی‌نیویا کی رزمیہ نظم ’’ ایلڈر ایڈا ،، میں اپنے بھائی فریٹر کی بیوی ۔ صفحہ ۲۱۱

فینیئس (Phineus) — قدیم یونانی دیومالا میں نابینا پیغمبر ، جس نے اپنی دوسری بیوی کے اکسانے پر اپنی پہلی بیوی کلیوپیٹرا ، بورےآس کی بیٹی کی اولاد کو جسمانی اذیتیں پہنچائیں ۔ دیوتاؤں نے اسے اس کی سزا دی ۔ صفحہ ۳۵۷

— ک —

کریم ہلدا (Kriemhild) — قدیم جرمن رزمیہ‌نظم اور ازمنۂ وسطی کی نظم ’’ نی‌بیلونگ کا گیت ،، کی ہیروئن ، برگنڈیوں کے بادشاہ گنتھر کی بہن ، سگفرید کی منگیتر اور بیوی ، اس کی وفات کے بعد ہنوں کے بادشاہ ایتزیل کی بیگم ۔ صفحہ ۲۶۹

کلوئی (Chloë) — لانگس (دوسری اور تیسری صدی عیسوی) کے قدیم یونانی ناول ’’ دافنی اور کلوئی ،، کی ہیروئن ، بیمار عشق گڈرنی ۔ صفحہ ۲۶۷

کلیتم‌نسترا (Clytemnestra) — آگاممنون کی بیوی ۔ جب شوہر ٹرائے کی جنگ سے لوٹا تو اس نے اسے قتل کر دیا ۔ ایسکیلس کے المیے ’’ آرسطیا ،، کی ہیروئن ۔ صفحات ۱۷۳ ، ۱۷۴

کلیوپیٹرا (Cleopatra) — قدیم یونانی دیومالا میں بادشمالی کے دیوتا بورےآس کی بیٹی ۔ صفحہ ۳۵۷

کیسنڈرا (Cassandra) — قدیم یونانی دیومالا میں پیغمبرنی ، شاہ ٹرائے پری‌آم کی بیٹی جو ٹرائے کی شکست کے بعد آگاممنون کی لونڈی بنا لی گئی ۔ ایسکیلس کے المیے ’’ آگاممنون ،، کا ایک کردار ۔ صفحہ ۲۴۸

— گ —

گدرون (Gudrun) — قدیم جرمن رزمیہ نظم اور تیرھویں صدی کی عظیم نظم ” گدرون “ کی ھیروئن ، ھیگیلنگوں کے بادشاہ ھیتیل اور آئرلینڈ کی ھلدا کی بیٹی ، سیلینڈ کے ھروگ کی منگیتر ۔ اسے اورمانی کے ھارتموت نے تیرہ سال قید میں رکھا لیکن شادی کرنے میں ناکام رھا ۔ آخر میں ھروگ نے اسے رھاکر لیا اور وہ اس کی بیوی بن گئی ۔ صفحہ ۲۶۹

گنتھر (Gunther) — قدیم جرمن رزمیہ شاعری اور ازمنۂ وسطی کی نظم ” نی بیلونگ کا گیت “ کا ھیرو ، برگنڈیوں کا بادشاہ ۔ صفحہ ۲۶۹

گینی میڈ (Ganymede) — قدیم یونانی دیومالا میں نوجوان مردانہ حسن کا پیکر ۔ دیوتا اسے گرفتار کرکے اولمپس لے گئے اور وھاں وہ زیوس کا ساقی بن گیا ۔ صفحہ ۲۵۱

— ل —

لوکی (Loki) — قدیم اسکینڈی نیویا کی دیومالا میں بدی کا بھوت اور آگ کا دیوتا ۔ قدیم اسکینڈی نیویا کی رزمیہ نظم ” ایلڈر ایڈا “ کا ھیرو ۔ صفحہ ۲۱۱

موسی (Moses) — انجیل کے مطابق پیغمبر اور قانون تصنیف کرنےوالے گزرے ھیں ۔ انھوں نے ھی یہودیوں کو مصر میں غلامی سے بچایا اور ان کےلئے ضابطے وضع کئے ۔ صفحات ۱۷۱ ، ۲۳۶

مولیوس (Mulios) — ھومر کی رزمیہ نظم ” اوڈیسی “ میں ایک کردار ، نقیب ۔ صفحہ ۳۱۰

میفسٹوفیلیس (Mephistopheles) — گوئٹے کی المیہ نظم ” فاؤسٹ “ میں ورغلانےوالا شیطان جس کے ھاتھ فاؤسٹ نے اپنی روح بیچ ڈالی تھی ۔ صفحہ ۲۱۱

میلتا (Mylitta) — اشتار (Ishtar) کا قدیم یونانی نام ، بابل کی دیومالا میں محبت اور بارآوری کی دیوی ۔ صفحہ ۲۳۰

میلیاگیر (Meleager) — قدیم یونانی دیومالا میں شہر کیلیدون کے داستانی بادشاہ اینیس اور ملکہ آلتھیا کا بیٹا ۔ اس نے اپنے ماموں قتل کر ڈالے تھے ۔ صفحہ ۳۵۶

— ن —

نستر (Nestor) — قدیم یونانی دیومالا میں جنگ ٹرائے کا سب سے بزرگ اور دانش مند ہیرو ۔ صفحہ ۳۰۵

نیورد (Njord) — قدیم اسکینڈی‌نیویا کی دیومالا میں بارآوری کا دیوتا ، قدیم اسکینڈی‌نیویا کی رزمیہ نظم ''ایلڈر ایڈا،، کا ہیرو ۔ صفحات ۲۱۱ ، ۲۱۲

— و —

ولکان (Hephaestus or Vulcan) — قدیم یونانی دیومالا میں آگ کا دیوتا ۔ لوہار کی دھوکنی کا محافظ ۔ صفحہ ۱۱۷

— ہ —

ہادوبراند (Hadubrand) — قدیم جرمن رزمیہ‌نظم ''ہلدے براند کا گیت،، کا ایک کردار ، اس نظم کے ہیرو کا بیٹا ۔ صفحہ ۳۰۵

ہارتموت (Hartmut) — قدیم جرمن رزمیہ‌نظم اور جرمنی کے ازمنۂ وسطی (تیرھویں صدی) کی نظم ''گدرون،، کا ہیرو ، شاہ اورمانی کا بیٹا اور گدرون کا ناکام عاشق ۔ صفحہ ۲۶۹

ہرقلیس (Heracles) — قدیم یونانی دیومالا کا ایک مقبول ہیرو ، اسپورٹ میں مہارت اور بہادر کارناموں کےلئے مشہور ۔ صفحہ ۳۵۶

ہروگ (Herwig) — قدیم جرمن رزمیہ نظم اور ازمنۂ وسطی کی نظم ”گدرون“ کا ہیرو، زی‌لینڈ کا بادشاہ، گدرون کا سنگیتر اور بعد میں اس کا خاوند۔ صفحہ ۲۶۹

ہلدا (Hilde) — قدیم جرمن رزمیہ نظم اور ازمنۂ وسطی کی مشہور نظم ”گدرون“ کی ہیروئن، شاہ آئرلینڈ کی بیٹی جو بعد میں ہیگیلنگوں کے بادشاہ ہیتیل کی بیوی بنی۔ صفحہ ۲۶۹

ہلدےبراند (Hildebrand) — قدیم جرمن رزمیہ‌نظم ”ہلدےبراند کا گیت“ کا ہیرو۔ صفحہ ۳۹۲

ہیتیل (Hettel) — قدیم جرمن رزمیہ نظم اور ازمنہ وسطی کی نظم ”گدرون“ کا ہیرو، ہیگیلنگوں کا بادشاہ۔ صفحہ ۲۶۹

ہیکتا (Hecate) — قدیم یونانی دیومالا میں تین سر اور تین جسم‌والی چاندنی کی دیوی، تحت‌الارض کے بھوت پلیدوں کی آقا، سحر اور بدی کی سرپرست۔ صفحہ ۳۰۵

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی آپ کا بہت شکر گذار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب کے ترجمے ، ڈیزائن اور طباعت کے بارے میں اپنی رائے لکھیں ۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم ممنون ہوں گے ۔

ہمارا پتہ : زوبوفسکی بلوار ، نمبر ۲۱ ، ماسکو ، سوویت یونین